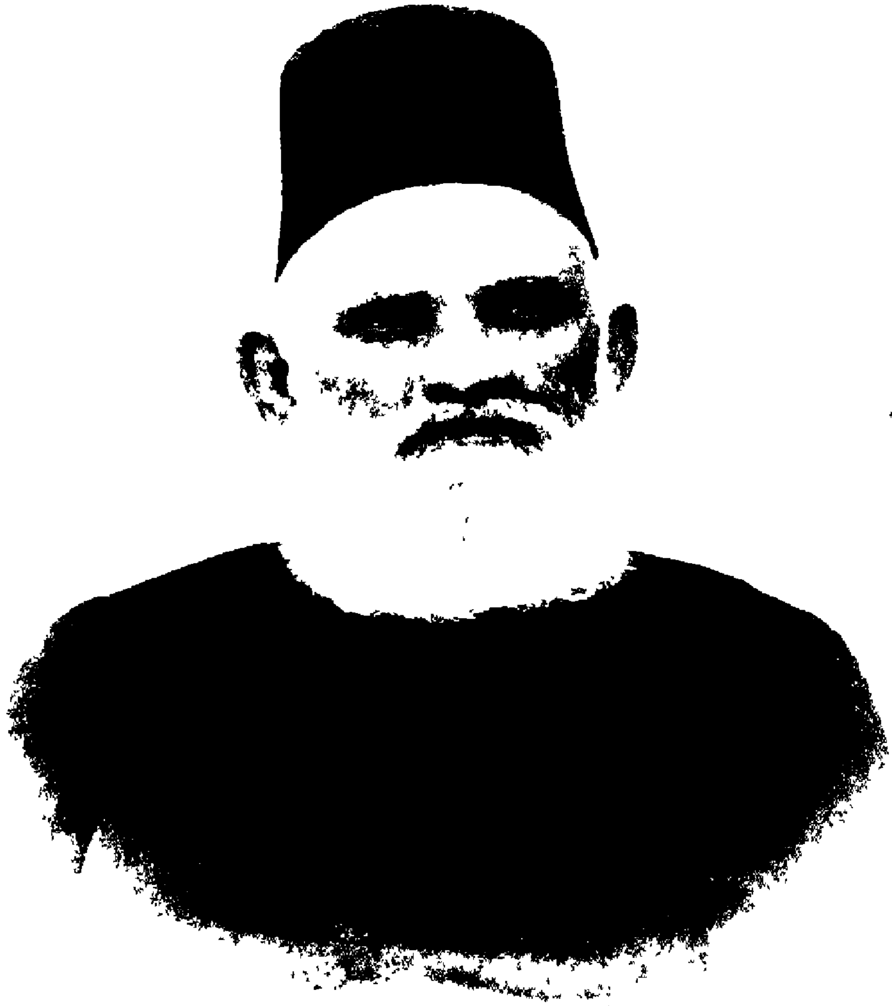


نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں صاحب منیر نواز جنگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام

تمام متکلمین اور حکما کا قول ہے کہ حقائق الاشیاء ثابتۃ یعنی ہر چیز کی فی ذاتہ ایک حقیقت اور ماہیت ہے اور انہیں کا یہ قول ہے کہ تقلیب ماہیت محال یعنی ماہیت کا بدل جانا عقلاً محال ہے اور جو شے عقلاً محال ہو اس کا وقوع بھی ہونا غیر ممکن ۔

پس اگر ہم کسی شے کی حقیقت کو جانتے ہوں لیکن اس کو اس کی ماہیت سے بدلا ہوا پاویں یعنی جو اس کی ذاتی حقیقت اور اصلی حالت تھی اس میں فرق دیکھیں تو ہم کو لازم ہے کہ ہم اس کا سبب دریافت کریں اور ان عوارض خارجی اور اسباب عارضی کی تحقیقات پر متوجہ ہوں جن کے سبب سے اس شئے کی ماہیت ہماری نظروں میں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔

ہر شئے کی ماہیت ثابت اور قائم رہنے کیلئے ضرور ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہے اور کوئی دوسری شئے اس میں نہ ملے ورنہ جہاں ترکیب اور اختلاط نے راہ پائی اور اشیاے مختلفہ ایک دوسری سے ملیں تو پھر ان اشیائے مختلفہ کی ماہیت کا دریافت کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اختلاط سے جس نے ان چیزوں کی حالت اصلی کو بدل دیا شبہ تقلیب ماہیت کا ہوتا ہے ۔

ہر شئے فی نفسہ اپنی ماہیت اور حقیقت میں جُدا جُدا ہے اور کسی دو چیز کی ایک ماہیت نہیں ہے اس لئے کہ جب تک ماہیت دوسری نہ ہوگی تب تک وہ شئے دوسری نہ کہلائیگی پس جب دو چیزیں کہ لا محالہ فی ذاتہ جداگانہ ماہیت رکھتی ہونگی باہم ملیں گی تو ان کے اختلاط سے دونوں کی ماہیت ایک نہ ہو جائے گی گو اُن کی ترکیب باہمی سے ان اشیائے مختلفہ کا ایک نام رکھ دیا جاتے

اصل میں دونوں چیزیں اپنی جُدا گانہ ماہیت پر باقی رہینگی اور اس ترکیب سے اُن کی حقیقت میں کچھ فرق نہ آئے گا ۔

لیکن ترکیب اور اختلاط کے سبب سے اُن اشیائے مختلفہ کی حیثیت ظاہری ایسی بدل جاویگی کہ ان کے اجزائے منفردہ یعنی ہر شئے جُدا گانہ کی حقیقت کا دریافت کرنا نہایت دشوار اور قریب بہ محال ہوگا اور پھر جب تک کہ وہ ترکیب کسی عمدہ تدبیر سے دُور نہ کی جاوے اور ہر شئے اپنی اصلی حالت پر نہ لائی جاوے تب تک ماہیت کا دریافت کرنا احیطۂ امکان سے خارج ہوگا ۔

پس اگر ہم کسی شئے کی حقیقت دریافت کرنے پر مستعد ہوں تو پہلا کام ہمارا یہ ہے کہ ہم اس حالتِ موجودہ پر نظر کریں کہ آیا وہ اپنی اصلی حالت مجرّد پر باقی ہے یا کہ اور چیزیں بھی اس میں ملی ہوئی ہیں اگر ہم اور چیزوں کو اصلی اُس میں ملا پاویں تو دوسرا کام ہمارا یہ ہوگا کہ اُن چیزوں کو جدا کرکے اُس شئے کو اُن سے علیحدہ کرکے اُس کی اصلی حالت پر لانے کا قصد کریں ۔ اور جب ہم اُس شئے کو اور چیزوں سے جُدا کرنے کا قصد کریں تو تیسرا کام ہمارا یہ ہوگا کہ ہم اس آلہ اور ذریعہ کو پیدا کریں جس سے وہ اختلاط کما حقہٗ دُور ہوسکے ۔ اگر ہم اپنے ان تینوں کاموں میں غلطی نہ کرینگے تو ضرور اس شئے کی حقیقت دریافت کرسکینگے ۔

جب ہم کسی چیز کے حسن و قبح کی تحقیقات پر آمادہ ہوں تو ہم کو لازم ہے کہ پہلے ہم اُس شئے کی حقیقت جس طرح اوپر ہم نے بیان کی ثابت کرلیں بعد اُس کے اپنی رائے اُس شئے کی بُرائی بھلائی کی نسبت قائم کریں ورنہ اگر ہم بغیر دریافت کرنے اُس کی حقیقت کے کسی مرکب شئے کو جوہر مجرّد سمجھ کر اُس پر اپنی رائے قائم کریں تو ہم غلطی اور دھوکے میں رہیں گے ۔ اور وہ رائے ہماری نسبت اُس شئے کے نہ ہوگی بلکہ نسبت اُن اشیائے مختلفہ کے ہوگی جن کو اختلاط نے ظاہر میں ایک کر دیا ہے ۔

جب ہم موجودات خارجی میں سے کسی کو دیکھتے ہیں تو سرسری نظر میں ہم کو ہر شئے بسیط معلوم ہوتی ہے اور ہماری پہلی نگاہ اُس کی ترکیب اور اختلاط پر نہیں جاتی لیکن جس قدر ہم غور کرتے جاتے ہیں ۔ اُسی قدر ہم کو اُس کے اجزائے مرکبہ کی کیفیت معلوم ہوتی جاتی ہے یہانتک کہ آخر ہم کو یقین ہوجاتا ہے کہ کوئی شئے اُن میں سے جوہر بسیط اور مجرّد محض نہیں ہے اور سب میں اشیائے متضاد ملی ہوئی ہیں ۔ آخر ہم کو اُس آلہ اور ذریعہ سے کام لینا پڑتا ہے جس سے اُس ترکیب کو باطل کرکے ہر شئے کو جُدا جُدا کریں ۔

جو کیفیت ہم نے اعیان موجودات کی بیان کی وہی حال ہماری مدرکات اور معلومات اور

معتقدات کا ہے کہ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جو کچھ ہم مانتے ہیں اُس کی نسبت صحت اور سچائی کا یقین نہیں کرسکتے اور اُس کو غلطی اور خطا اور وہم اور شک کی آمیزش سے خالی نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم اُس کو کسی سچے ذریعہ اور کارآمد آلہ سے جانچ نہ لیں اور اُس کے اجزاء مرکبہ کو علیحدہ علیحدہ کرکے نہ دیکھ لیں پس جس طرح موجودات خارجی میں سے کسی شے کی حقیقت کے جاننے کا دعوے کرنا بغیر اس کے کہ اُس کو اپنی اصلی حالت پر لاکر امتحان کرلیں نادانی ہے اسی طرح ہم کو اپنے معتقدات میں سے کسی اعتقاد کی صحت پر یقین کرنا قبل اس کے کہ ہم اس کو توہمات اور خیالات سے جدا کرلیں بڑی غلطی ہے ٭

جیسا کہ ہم کو کسی موجودات کی حقیقت معلوم کرنے پر یقین نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم نے خود اُس کو مذکورہ تدبیروں سے نہ جانچا ہو اسی طرح ہم کو اپنے معتقدات کی صحت پر اعتقاد کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم نے بذاتہ اُس کو اسی طرح دریافت نہ کیا ہو۔ اور اگر ہم نے ایسا کرلیا ہو تو پھر ہمارا اعتقاد بھی صحیح ہوگا اور اُس پر ہم کو یقین بھی ایسا ہوگا کہ اگر ساری دنیا ہماری مخالف ہو اور تمام جہان ہم کو مجنوں اور دیوانہ بتاوے تو ہمارے اس یقین اور اعتقاد میں کچھ خلل نہ ہوگا٭

بغیر اپنی ذاتی تحقیقات اور جانچ کے جو کچھ ہم سمجھیں اور جو کچھ اعتقاد کریں وہ صرف سنا ہوا ہوگا اور کبھی غلطی کے احتمال سے محفوظ نہ رہیگا اور اطمینانِ قلبی جس شے کا نام ہے وہ کبھی حاصل نہ ہوگی ہماری مثال ٹھیک ایک اندھے کی ہوگی جس کو کوئی ہاتھ پکڑے لئے جاتا ہو کہ اگر سمت سیدھے راہ بتانے والا اچھا مل گیا خیریت گذری۔ ورنہ کسی گڑھے غار میں گر کر مٹی خراب ہوئی ٭

تحقیق کرنے والے کو ہر چیز کی تحقیقات کے لئے ضرور ہے کہ جو کچھ لوگوں سے اُس کی حقیقت کی نسبت سنا ہو یا جو کچھ اُس نے خود سمجھ رکھا ہو اُس سے اول اپنے دماغ کو خالی کرے اور کسی کی حقیقت اور صحت پر پہلے سے یقین نہ کرے اس لئے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو یا تحقیقات کرنے پر اُس کو توجہ نہ ہوگی اسلئے کہ وہ اپنے خیالات کو یقینیات سمجھ کر اپنے آپ کو مستغنی سمجھیگا یا تحقیقات کرتے وقت اُس کو توہمات اور خطرات ایسے پیدا ہونگے کہ وہ اُس کی تحقیق میں خلل ڈالینگے ٭

ایسی تحقیقات کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اُن سب باتوں کو جو لوگوں سے سنی ہوں یا جو کچھ اُس کے دل میں گذری ہوں پیشِ نظر رکھے اور بغیر پیدا کرنے یقین کے کسی پر وہ اُن کی تحقیق بذریعہ اُس آلہ اور ذریعہ کے جو اُس کے امتحان کے لئے ہوا کرے تاکہ اُس کو خود معلوم ہووے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ٭

تمثیلاً ہم بیان کرتے ہیں کہ حکمائے یونان کا قول تھا کہ عناصر چار ہیں جن کا نام اُن کی اصطلاح میں اسطقسات اربعہ تھا اور ان کے جوہر بسیط ہونے پر ہزارہا آدمی معتقد تھے اور ہزاروں برس

سے اب تک متقدمین اور اب حکمائے یورپ کا قول ہے کہ وہ مرکب ہیں۔ پس ہم جس کی بات کو بغیر امتحان اور جانچ کے مان لینگے گو وہ فی نفسہ صحیح ہوگی ہمارا بے جانچے مان لینا ہی ہماری غلطی ہے۔ اس لئے ہم کو لازم ہے کہ ہم دونوں کے دلائل سنیں اور جو ذریعے اور آلات اُن کے حقائق دریافت کرنے کے دونوں کے پاس ہوں لے کر خود امتحان کریں تب ہم خود یقین کر لینگے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا اور اگر ہم ایک کے قول کو پہلے ہی صحیح مان لیں اور دوسرے کی بات تک نہ سنیں تو ہم درحقیقت جاہل بلکہ جہل مرکب میں گرفتار سمجھے جاوینگے۔ اور گو وہ قول جس کو ہم نے بے سوچے سمجھے مانا ہے درست ہی ہو لیکن ہم غلطی اور دھوکا میں پڑے ہونے سے عقلاً کے نزدیک بری نہ ہونگے ۔

یہاں مقدمات کی ترتیب و تمہید سے مطلب ہمارا اپنی قوم کی موجودہ حالت پر غور کرنا اور اُس کی حقیقت اور ماہیت دریافت کرنا ہے پس ہم اُس حالت موجودہ کو ایک شئے قرار دیتے ہیں جو نام سے اسلام کے متعارف ہے اور سرسری نظر میں شئے واحد سمجھی جاتی ہے اور ہمارے تمام عقائد اور اعمال اور حرکات و سکنات اور چال چلن پر مسلمانی کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے لیکن غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہزاروں اجزا سے مرکب اور بے شمار چیزوں سے مخلوط ہے اور وہ جوہر نورانی جس کا نام اسلام ہے اور جو فی ذاتہ ہر برائی سے پاک اور ہر تیرگی سے صاف ہے اجزائے کثیفہ کے مل جانے سے مکدر اور تاریک ہو رہا ہے اور اُس کا اصلی نور اُس تکدر کے سبب سے چھپ گیا ہے ۔

ہر ملک میں عرب سے لے کر ہند تک اور ہر قوم میں سادات و شیوخ سے لے کر محترفہ بازاری تک اور ہر مذہب میں اہل سنت سے لے کر معتزلہ تک اور ہر فریق میں علما سے لیکر جہلا تک اُس نورانی جوہر کا جداگانہ جلوہ دکھائی دیتا ہے اور اس کلی طبعی کا مضمون ہر فرد میں ایک علیحدہ طور سے نظر آتا ہے پس جو شخص سرسری نگاہ سے دیکھتا ہے وہ ان سب کو ایک ہی شئے جان کر اُسکو اسلام سے تعبیر کرتا ہے اور ہمارے عقائد اور رسمیات کو اصل اسلام سمجھ کر اُن کے حسن و قبح سے بحث کرتا ہے ۔

پس اگر ہم اُس مجموعہ کو مع جمیع افراد اسلام کہیں تو یہ کہنا ہمارا محض غلط ہے اور اگر اُس سے کلیۃً انکار کریں تو بھی انکار ہمارا نادرست ہے اس لئے ہم کو سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں کہ ہم انہیں اصول موضوعہ کو جو اوپر بیان کئے گئے پیش نظر رکھ کر اسکی ترکیب اور اختلاط کے دور کرنے کی فکر کریں اور کسی نہایت سچے ذریعہ اور مفید تدبیر سے ہر ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ کر کے اسلام جس شئے کا نام ہے اسکو الگ کریں تب اُس کی حقیقت معلوم ہونے پر تعین کر کے اُن اجزائے مختلفہ کو جو اس مجموعہ مرکب کے حسن و قبح کی نسبت ہے دیکھیں تاکہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ اُن اجزائے مختلفہ کا

تعلق فقط اصل اسلام سے ہے اور کس قدر ان اشیائے خارجی سے جو اسلام میں مختلط ہو گئی ہیں ۔

غرضکہ اس کام کے لئے ہم کو کوئی سچا اور کارآمد آلہ درکار ہے جو کہ اس ترکیب کو دور کرے اور وہ سچا اور کارآمد آلہ کیا ہے۔ رسول صلعم کی ذات ہے جن کا لقب احمد مجتبےٰ اور جن کا نام محمد مصطفےٰ ہے صلے اللہ علیہ وسلم ۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ وہ آلہ ہمارے پاس نہیں ہے بلکہ بالکل صحیح و سالم ہمارے پاس اب تک موجود ہے اور قیامت تک موجود رہیگا ہاں اُس کے اجزا کا سمجھنا اور اُس سے کام لینے کا طریقہ جاننا ضرور ہے ۔

اُس آلہ سے مراد وہ صورت شخصی نہیں ہے جس میں اور لوگ بھی مشابہت صوری رکھتے تھے۔ بلکہ خاص وہ منصب اور ہے جس میں کوئی کچھ مناسبت نہیں رکھتا یعنی نبوت اور ہدایت کہ اُس کے دو جزو ہیں ایک ایسا سچا کہ کسی طرح کا اُس میں شک اور شبہ نہیں دوسرا ایسا کہ جس کی سچائی پر کسی قدر صحت اور سند اور تحقیقات کی حاجت ہے۔ پہلے جزو سے مراد کتاب اللہ ہے۔ دوسرے جزو سے مراد حدیث ہے پس جس کے پاس یہ دونوں جزو موجود ہوں اُس کے پاس ہر وقت ہر ساعت وہ آلہ گویا بذاتہ اور بنفسہ موجود ہے۔ مشرق میں ہو خواہ مغرب میں۔ شمال میں ہو خواہ جنوب میں ؎

شاخ گل ہر جا کہ روید ہم گل است خم مل ہر جا کہ جوشد ہم مل است
گر ز مغرب بر زند خورشید سر عین خورشید است نے چیزے دگر

پس ہم کو اپنے تمام حالات کا دینی ہوں یا دنیاوی۔ اصلی ہوں یا فرعی۔ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے امتحان کرنا لازم ہے اور امتحان کا طریق یہ ہے کہ اُس کی تطبیق کتاب اللہ اور سنت سے کریں جس کو اُس کے مطابق پاویں اُس کو اسلام سمجھیں اور جس کو مخالف پاویں اُس کو اسلام سے خارج جانیں ۔

اسلام کو ہماری ذات سے دو قسم کا تعلق ہے ایک متعلق عقائد کے جس کو حکما حکمت بالغریا کمال علمی کہتے ہیں۔ دوسرا متعلق اعمال کے جسکو عقلا قدرت فاضلہ اور کمال علمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے امر کو جو درحقیقت اصول ہے کتاب و سنت نے ایسا صاف کر دیا ہے کہ اب کسی دوسرے سے پوچھنے بتلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مراتب توحید اور نبوت اور معاد کی کامل تشریح کر دی ہے۔ دوسرے امر کو جو درحقیقت فرع ہے اُس کے اصول بھی تصریح کے ساتھ بیان کر دئے ہیں اس لئے ہم کو اپنی دونوں باتوں کو کتاب و سنت سے ملانا چاہئے تب معلوم ہوگا کہ کتنی باتیں ہم میں اسلام کی ہیں اور کتنی اُس سے خارج اور کون کون سا عمل ہمارا موافق اُس کے ہے اور

کونسا مخالف ہے ؛

ہمارے حالات دنیوی بھی مذہب کے تعلقات سے آزاد نہیں ہیں بلکہ ہر حالت میں خواہ وہ سیاست مدن سے متعلق ہو خواہ اُس کو حکمت منزلی سے علاقہ ہو ہم کو شریعت کی پابندی ہی ہمارا تمدن اور معاشرت اور برتاؤ آزاد انہ یعنی بلا قید شریعت کے نہیں ہو سکتا جو برتاؤ دنیاوی ہمارا ہوگا وہ بھی مذہبی ہوگا اور ہماری ہر بات اور ہر چال اور ہر فعل اور ہر عمل میں جلوہ اسلام کا جھلکیگا اگر وہ برتاؤ مطابق شریعت کے ہے تو وہ نور اسلام ہے اور اگر مخالف ہے تو وہ داغ اسلام ؛

شریعت نے ہم کو رہبانیت کی تعلیم نہیں کی - جوگی بننے کی اجازت نہیں دی بلکہ فرمایا ہے کلوا من الطیبات و اعملوا صالحا اس لئے اگر دل بایار اور دست بکار ہو تو عین صواب ہے شریعت نے دائرہ معیشت کو تنگ نہیں کیا - زینت دنیا سے ممنوع نہیں گردانا - ہم سب مسلمان محرمات سے بچکر اپنی زندگی کو نہایت آرام سے بسر کر سکتے ہیں ۔ اور اپنی اوقات کو اور اپنے مال کو اگر اپنے بھائیوں کی بھلائی میں صرف کریں تو کسی عبادت میں اس سے زیادہ ثواب کے مستحق نہیں ہو سکتے لیکن ہم نے اپنی بدبختی سے دین کو ترک و بدعت کے عقیدوں سے خراب اور دنیا کو غفلت اور جہالت کے سبب سے برباد کر رکھا ہے - نہ دین کے ہوئے نہ دنیا کے ؎

بیت

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

جب ہم خلفائے راشدین کے اصول سیاست اور طریق معاشرت اور اخلاق اور عادات اور چال چلن اور برتاؤ کو دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے بہت سی عجیب و غریب چیزیں پھر جاتی ہیں اور بہت سے عقدے ہمارے حل ہو جاتے ہیں اس لئے ہم کچھ مختصر سا حال خلفائے راشدین کی خلافت کا لکھتے ہیں لیکن صرف اُن باتوں کو جو کہ متعلق سیاست اور معاشرت کے ہیں تاکہ اس سے فوائد ذیل حاصل ہوں ؛

اوّل معلوم ہونا اُن کے اصول سیاست کا کہ وہ کیسے تھے اور کن قواعد پر مبنی تھے ؛

دوسرے ظاہر کرنا اُنکے اخلاق و عادات کا کہ وہ کیسی صفائی اور سچائی اور راستی ہر معاملہ میں رکھتے تھے اور غیر مذہب والوں سے کس طور سے پیش آتے تھے ؛

تیسرے ظاہر کرنا اُنکے مختلف قواعد انتظامیہ کا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موافق ضرورت وقت اور حال زمانہ کے اصول سیاست اور تمدن اور معاشرت کے مقرر کرنا اور وقتاً فوقتاً ان میں اصلاح کرنا اور نئے نئے ضابطے جو پہلے جاری نہ تھے منضبط کرنا اور امور مفیدہ عام کے اجرا میں کوشش کرنا

(بشرطیکہ کوئی نص کتاب و سنت سے اُسکے منع اور حرمت پر نہ ہو) اُنکے نزدیک بدعت نہ تھا ۔

چوتھے مخالفت اُن سلاطین اسلامیہ کی شریعت سے جنہوں نے اپنی حرکات ظالمانہ اور افعال جابرانہ سے اپنے بیجا تعصب اور غلط غضب کو سلطنت کے کاموں میں دخل دیا اور ناجائز طور سے اپنے اختیارات شاہی کو برتا اور اسلام کو بٹہ لگایا ۔

پانچویں واقف کرنا اپنے بھائی مسلمانوں کو اُن کے پیشواؤں کے اخلاق اور عادات سے اور اُنکے قواعد انتظامیہ اور قوانین حکمیہ سے تاکہ اُن کو معلوم ہوئے کہ وہ امورات انتظام سلطنت میں کیسی استعداد رکھتے تھے اور وہ تہذیب اور شائستگی کی ترویج میں کیسی سعی بلیغ کرتے تھے ۔

خلفائے راشدین کے اصول سیاست اور احکام اور اخلاق اور عادات کا بیان

میں خلفائے راشدین میں سے صرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات لکھتا ہوں اس لئے کہ ان کا زمانہ کمال کا زمانہ تھا اور ان کی ذات سے اصول سیاست کا اختراع ہوا اور اُن کے وقت میں کچھ فتنہ و فساد بھی پیدا نہیں ہوا ۔

پہلا اصول جس پر بنا خلافت تھی اجتماع تھا یعنی امام اور خلیفہ کا مقرر ہونا تمام اُمت اور رعیت کی مرضی پر موقوف تھا قرابت اور رشتہ اور وراثت کو اُس میں کچھ دخل نہ تھا چنانچہ جب وقت وفات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قریب ہوا تو لوگوں نے کہا کہ آپ اپنے بیٹے عبد اللہ کو اپنا جانشین کر دیجئے ۔ حضرت نے فرمایا اُس کا کچھ حق نہیں ہے ۔

درحقیقت اُس وقت کی خلافت کو سلطنت جمہوری سمجھنا چاہیئے جس کی خوبی اور عمدگی پر آج تمام شائستہ قوم یورپ کو اتفاق ہے ۔

دوسرا اصول خلیفہ کو آزادی اور خود مختاری کا حاصل نہ ہونا ۔ امام اور خلیفہ اجرائے احکام اور انتظام امورات سلطنت میں آزاد اور خود مختار نہ تھا اور اپنی خواہشات اور ارادوں کو بلا تقید شریعت کے پورا کرنا کیسا ظاہر بھی نہ کرسکتا تھا کتاب و سنت کا پابند ہوتا تھا چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جبکہ وہ خلیفہ مقرر ہوئے جو پہلا خطبہ پڑھا وہ یہ تھا کہ اے مسلمانوں میں آدمی ہوں ویسا ہی جیسے کہ

(۱) ان حالات کو ہم نے ان کتابوں سے منتخب کیا ہے :-

(۱) تاریخ یافعی ۔ (۲) تاریخ الخلفاء سیوطی ۔ (۳) ازالۃ الخفاء ۔ (۴) طبری ۔

م ہو۔ نہ خطاؤں سے معصوم ہوں نہ غلطیوں سے محفوظ۔ نہ تم سب سے بہتر اور اچھا ہوں اس لئے تم میری خبرداری رکھنا۔ جو باتیں میرے خدا اور اسکے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے موافق ہوں اُن میں میری بیعت کرنا اور جن میں مجھے لغزش کرتے ہوئے دیکھنا سنبھالنا ؛

دُوسرا اصول درحقیقت پہلے اصول کا نتیجہ ہے بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں بعد خلافت راشدہ کے پہلا اصول قائم نہ رہا اور سلطنت حق موروثی ہو گیا اسی واسطے دوسرا اصول بھی ٹوٹ گیا اور بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے لگے اور بغیر پابندی قوانین شریعت اور ضوابط امامت کے اپنی خواہشات کو پورا کرنے لگے ؛

تیسرا اصول رعایا کو آزادی حاصل ہونا۔ سوائے شریعت کے احکام کے رعایا کو کسی قسم کے امام اور خلیفہ کی طرف سے پابندی نہ تھی اور خلیفہ کو کسی پر کچھ اختیار سوائے اُس کے جو قانون شریعت سے جائز تھا حاصل نہ تھا بلکہ ذاتی معاملات میں خلیفہ خود مدعی اور خود مدعا علیہ ہوتا تھا اور کوئی عامل اور صوبہ اسی اصول کی پابندی سے اپنے اختیارات کو ناجائز طور سے استعمال میں نہیں لا سکتا تھا ؛

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے دعوےٰ کیا کہ فلاں حاکم نے مجھے بے قصور شرعی سو کوڑے مارے ہیں حضرت عمرؓ نے بعد ثبوت کے اس حاکم کو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا عمرو ابن عاص نے سفارش کی تب جواب دیا کہ جب پیغمبر خدا علیہ التحیتہ والثنا اپنی ذات کو قصاص اور احکام شرعی سے مستثنےٰ نہیں سمجھتے تھے تو پھر میں یا یہ کون ہیں ؛

کوئی شخص اپنی عزت اور جان اور مال میں کسی کا خائف نہ تھا اور سوائے ان ذریعوں کے جو شرعاً جائز ہیں کسی سے خلیفہ وقت کچھ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا بلکہ جو امور مصلحت وقت سے خلیفہ جاری کرنا چاہتا اور کوئی اُس کی اباحت ثابت کر کے اُس سے انکار کرتا تو خلیفہ کو سوائے سکوت کے کچھ چارہ نہ ہوتا ؛

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے مہر کے زیادہ باندھنے کی ممانعت پر خطبہ پڑھا کہ ایک بڑھیا عورت نے آیت قنطارا مقنطرۃ پڑھ کر کہا کہ جس چیز کو خدا جائز اور مباح کرے تم کیونکر منع کرتے ہو حضرت عمرؓ نے انصاف کیا اور فرمایا کہ کل الناس افقہ من عمر حتی المخدرات ؛

آزادی کا درجہ یہاں تک پہنچا تھا کہ اگر خلیفہ کسی شخص کو شرعی جرم میں ماخوذ کرتے لیکن بغیر ضابطہ معین کے تو مجرم عذر کرتا اور اپنے آپ کو بچا لیتا ؛ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ رات کو مدینہ کا گشت کرتے کرتے ایک ایسے گھر کے پاس پہنچے کہ وہاں سے آواز گانے کی آتی تھی۔ وہ اُس گھر کے اندر دیوار کی راہ سے گھس گئے وہاں ایک عورت کو دیکھا کہ شراب رکھی ہوئی

ہے اور وہ گاتی ہے حضرت عمرؓ نے اس کو پکڑا۔ اُس عورت نے کہا کہ میں نے اگر ایک جرم کیا ہے تو تم نے تین جرم کئے ہیں ؛

اوّل۔ خدا نے فرمایا ہے کہ لا تجسسوا کہ تم تجسس نہ کرتے پھرو۔ سو تم نے تجسس کیا ؛

دوسرے۔ خدا نے فرمایا ہے لیس البر بان تاتوا البیوت من ظهورها کہ دیوار کے پیچھے سے کسی مکان میں گھسنا اچھا نہیں ہے اور تم دروازہ بند پاکر پشت مکان سے داخل ہوئے ؛

تیسرے۔ خدا فرماتا ہے لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم۔ کہ اپنے گھر کے سوا دوسرے کے گھر میں نہ جاؤ۔ اور تم بغیر میری اجازت کے چلے آئے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کو چھوڑ دیا ؛

حضرت عمرؓ باوجود اپنے زہد اور ورع کے کہ جس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا عام لوگوں کو مباحات سے منع نہ کرتے تھے اور کھانے پینے آرام کرنے میں وہ آزاد مطلق تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابو عبیدہ جرّاح نے انطاکیہ شہر کو فتح کیا اور بسبب پاک صاف ہونے اس شہر کے اور پانے عمدہ چیزوں کے مسلمانوں نے وہاں چند روز ٹھہرنے کا قصد کیا تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ میں اس شہر میں ٹھہرنا پسند نہیں کرتا ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کو اس کی آب ہوا پسند آجائے اور محبت دنیا کی ان پر غالب ہوجاوے۔ بجواب اُس کے حضرت عمرؓ نے لکھا کہ خدا نے پاک چیزوں کو حرام نہیں کیا تم کیوں حرام کرتے ہو ؛

چوتھا اصول شوریٰ۔ اس کی اصل قرآن مجید سے ہے کہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی الله کہ جو کام پیش آوے اس میں صلاح و مشورہ کرنا اور پھر جب عزم مصمم ہوجاوے تو خدا پر بھروسہ کرکے اس کو شروع کرنا ؛

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اصول کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور نہایت خوبی سے اسکی پابندی کی جب وہ کوئی کام کرتے تو سب سے مشورہ اور صلاح کرتے اور پھر سب کو میزان عقل میں تولتے اور بعد ایک رائے پر نہایت استقلال سے قائم ہوجاتے اسی واسطے تدبیر مملکت میں انہوں نے دھوکا نہ پایا اور ان کی سب تدبیریں مفید پڑیں ؛

حضرت عمرؓ کو اس اصول کا یہاں تک لحاظ تھا کہ اگر کسی فروعی مسئلہ میں وہ نص صریح کتاب و سنت کی نہ پاتے تو وہ مشورہ کرتے چنانچہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی آنکھ سے ایک شخص کو زنا کرتے ہوئے دیکھا تو باہم مشورہ کیا کہ خلیفہ کو اپنی رویت پر تعزیر کرنے کا اختیار ہے یا نہیں حضرت علیؓ نے کہا کہ جب نص صریح موجود ہے کہ چار گواہ ہونے چاہئیں تو کیونکر صرف اپنی رویت پر اختیار تعزیر کا ہوگا ؛

یہ چوتھا اصول بھی دوسرے اصول کا ثمرہ ہے اس لئے کہ جب بادشاہ کو آزادی اور خودمختاری

نہ ہوگی تو لامحالہ وہ صرف اپنی مرضی سے کام نہ کر سکے گا اور اس کو ضرورت ان لوگوں سے پوچھنے کی ہوگی جو کہ صائب الرائے ہوں ◆

یہ اصول وہی ہے جو کہ اب تربیت یافتہ قوموں میں یورپ کی جاری ہے جس کو باختلاف لغت اور زبان کے کونسل کہتے ہیں ◆

پانچواں اصول خلیفہ کو ملک کی آمدنی کا سوائے حق معین کے اپنے صرف میں نہ لانا۔ ملک کی آمدنی خواہ وہ جزیہ کی ہوتی ہو یا خراج کی یا عشر کی وہ سب بیت المال میں جمع ہوتی خلیفہ کو کسی قسم کا اختیار اس پر نہ تھا صرف روزینہ یا تنخواہ مقرری کے سوا وہ کچھ نہ لے سکتے تھے۔ ابتدائے عہد خلافت میں حضرت صدیق اکبرؓ کو صرف کھانا کپڑا ملتا تھا اور جب آمدنی زیادہ ہوئی تب دو ہزار پانچ سو درم ملنے لگے۔ اور حضرت عمرؓ بھی اپنی ذات کے واسطے صرف اسی قدر لیتے جس قدر اور مہاجرین و انصار کو دیتے تھے ◆

جو آمدنی ملک کی ہوتی وہ خزانہ میں جمع ہوتی اور فوج کے سرداروں اور سپاہیوں اور مہاجرین و انصار کو اس سے شاہرہ مقررہ اور فقرا اور مساکین کو آذوقہ کافی دیا جاتا اور بوقت ضرورت عام فائدہ کے کاموں میں صرف کی جاتی جس طرح پر کوفہ اور بصرہ وغیرہ شہروں کی آبادی اور عمارت میں یا وقت ایام قحط مدینہ کے جس کا نام قحط رمادہ ہے غلہ کے باہر سے منگانے میں صرف کی گئی ◆

ملک کی آمدنی سے جس طرح مسلمان فقراء و مساکین کو حصہ دیا جاتا اسی طرح پر اہل کتاب وغیرہ کو کچھ تخصیص مسلمانوں کی نہ تھی ◆

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بڈھے اندھے یہودی کو ایک جگہ سوال کرتے دیکھا اور وقت استفسار کے معلوم ہوا کہ جزیہ کے مطالبہ کے واسطے وہ سوال کرتا ہے اسی وقت اس کا ہاتھ پکڑ کر نہایت اخلاق سے اپنے گھر لائے اور کچھ اس کو دیا اور جزیہ کے تحصیل کرنے والوں کو حکم دیا کہ اس کا اور اس قسم کے لوگوں کا خیال رکھنا یہ کون انصاف ہے کہ اسکی جوانی کی کمائی تو ہم کھاویں اور بڑھاپے میں اسکو ذلیل کریں اور اس کی کچھ بھی خبر نہ لیں اس لئے آئندہ سے ایسے لوگوں سے مطالبہ نہ کرو اور ان کو جزیہ سے معاف جانو اور بیت المال کے داروغہ کو حکم دیا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ انما الصدقات للفقراء والمساکین اور یہ بھی مساکین اہل کتاب سے ہیں اس لئے ان کو دینا چاہیے ◆

چھٹا اصول وقت لشکر کشی کے کسی ملک پر مراعات اور حسن سلوک کا لحاظ رکھنا اور کسی پر بیجا زیادتی نہ کرنا اور جہانتک ممکن ہو نرمی سے پیش آنا ◆

؎ عاملوں کی تنخواہ بارہ ہزار دینار سالیانہ تک ہوتی تھی اور اہل شوریٰ کو پانچ ہزار درم ماہواری مقرر تھے ◆

جب کسی ملک کے فتح کرنے کے لئے لشکر بھیجا جاتا تھا تو اس لشکر کے سردار کو جو احکام دئے جاتے تھے اُن میں امور مفصلہ ذیل پر نہایت تاکید کی جاتی تھی ۔

اوّل ۔ کوئی عورت اور لڑکا اور بڈھا اور ضعیف نہ مارا جائے ۔

دوسرے ۔ کسی کا ناک کان نہ کاٹا جائے ۔

تیسرے ۔ عبادت کرنے والے گوشہ نشین قتل نہ کئے جاویں اور انکے عبادتخانے نہ کھودے جاویں ۔

چوتھے ۔ کوئی درخت پھل دار نہ کاٹا جائے ۔ کوئی کھیت نہ جلایا جائے ۔

پانچویں ۔ کوئی عمارت اور آبادی ویران نہ کی جائے ۔

چھٹے ۔ کسی جانور بکری ۔ اونٹ وغیرہ کی کونچیں نہ کاٹی جاویں ۔

ساتویں ۔ کوئی کام بغیر صلاح و مشورہ کے نہ ہوئے ۔

آٹھویں ۔ ہر ایک کے ساتھ طریقہ انصاف و عدل نہ بتایا جائے کسی پر ظلم اور جبر نہ کیا جائے ۔

نویں ۔ جو عہد و پیمان غیر مذہبیوں سے کیا جائے اس میں بے وفائی نہ کی جائے ۔ اور وہ ٹھیک وفا کیا جائے ۔

دسویں ۔ جو لوگ اطاعت قبول کریں اور جزیہ دیں اُن کی جان و مال مسلمانوں کی جان و مال کے برابر سمجھی جاویں اور ان کے دشمنوں سے انکی حفاظت کی جائے اور تمام معاملات میں اُن کے احکام مثل مسلمانوں کے تصور کئے جاویں ۔

گیارھویں ۔ جب تک کہ اسلام کے قبول کرنے کی دعوت نہ کی گئی ہو فتنہ لڑنا نہ چاہئے ۔

ان احکام پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مقابلہ اور لشکر کشی کے وقت کیسی نیکی اور رحم اور نرمی کی رعایت کی جاتی تھی اور غدر اور فریب اور بدعہدی پر کس قدر تہدید ہوتی تھی ۔ کوئی بادشاہ نیک سا نیک اور رحیم سا رحیم کیوں نہ ہو لشکر کشی کے وقت اس سے زیادہ نرمی نہیں کر سکتا ۔

ساتواں اصول ۔ امورات ریاست اور انتظام سلطنت کے عمدہ انصرام کیلئے لائق عہدہ داروں اور اہلکاروں کا منتخب کرنا اور انکو وقت مقرر کے ہدایات خاص کرنا اور ہمیشہ ان کی نگرانی رکھنا ۔

جس عامل کو حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ مقرر کرتے اسکو احکام ذیل سُناتے اور اُس کی تعمیل کی تاکید کرتے ۔

اوّل ۔ چوبدار اور حاجب رکھنا کسی متغیث کو آنے کی روک ٹوک کا ذریعہ پیدا نہ کرنا گویا حکم تھا کہ در عدالت کو ہر وقت کھلا رکھنا ۔

دوسرے ۔ جب کوئی استغاثہ کرے اُس کو سُننا اور مدعی سے گواہ عادل اور منکر سے قسم لے کر اُس کو فیصلہ کرنا ۔

جس شخص پر حد شرعی جاری نہ ہوئی ہو یا جھوٹی شہادت میں مشہور نہ ہو یا اُس پر محبت اور وراثت کی تہمت نہ ہو وہ عادل سمجھا جاویگا ۔

اگر گواہوں کی حاضری کے واسطے مہلت مانگی جائے تو مہلت دینا ۔

تیسرے۔ مقدمات کا جلد فیصلہ کرنا تاکہ ایسا نہ ہو کہ مدعی دیر کے سبب اپنا دعوےٰ چھوڑ بیٹھے ۔

چوتھے۔ باہم مصالحہ اور رضامندی کو منظور کرنا بشرطیکہ اُس سے تحلیل حرام اور تحریم حلال نہ ہو ۔

پانچویں۔ متخاصمین پر سختی اور درشتی اور غصہ نہ کرنا ۔

چھٹے۔ رعب قائم رکھنا مگر نہ اتنا کہ وہ منجر بہ جبر ہو اور اخلاق و نرمی کرنا مگر نہ اس قدر کہ حکومت میں سستی اور بدنظمی ہو ۔

ساتویں۔ ہمیشہ عدل و انصاف کرنا اور حق بحقدار پہنچانا ۔

عدل و انصاف پر یہاں تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عمل رہتا تھا کہ وہ مسلمان اور کافر میں کچھ تفرقہ نہ کرتے تھے چنانچہ سعید بن مسیب سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک یہودی اور ایک مسلمان مخاصمہ کرتے ہوئے آئے اور انکے نزدیک حق یہودی کا ثابت ہوا اُس کے حق میں فیصلہ کیا۔ وہ یہودی اس عدل کو دیکھ کر مدح و ثنا کرنے لگا ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلے اُن کے عاملوں کے واسطے بطور نظیر کے ہوتے تھے اور اکثر اُن میں نرمی اور رحم شامل ہوتا تھا چنانچہ اکثر بجائے جسمانی تعزیر کے مالی تعزیر کا حکم دیتے تھے جیسا کہ عبدالرحمن ابن حاطب سے منقول ہے کہ ایک شخص نے ایک کا ناقہ چرایا اول حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تجویز ہاتھ کاٹنے کی کی آخر مدعی سے پوچھا کہ کیا کیا قیمت ہے اُس نے چارسو درم بتلائے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آٹھ سو درم کا جرمانہ مجرم پر کر کے مدعی کو دلایا اور مجرم کو رہا کر دیا ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس طرح پر اپنے عاملوں کو تاکید کرتے تھے اُسی طرح پر رعایا کو بھی آگاہ کر دیا کرتے تھے کہ بجز شریعت کے احکام کے کسی ادنیٰ سے اعلیٰ حاکم کو ادنیٰ سے ادنیٰ رعیت پر کچھ اختیار نہیں ہے اگر کوئی عامل کچھ کسی پر بے وجہ زیادتی کرے میں اُسکو اُسی طرح پر مجرم سمجھونگا جیسا کہ ادنیٰ رعیت کو سمجھتا ہوں اور اُسکو سزا دونگا سب اپنی عزت اور جان اور مال میں سوائے احکام شرعی کے آزاد اور خودمختار رہیں اور حاکم اور رعیت سب برابر ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عاملوں کو خودمختار اور آزاد نہ ہونے دیتے تھے ۔ اُن کی نگرانی رکھتے ہمیشہ اُن کی تبدیلی کیا کرتے اُن سے اگر خطا ہو جاتی تو معزول کر دیا کرتے ۔ جوابدہی

کے لئے دارالخلافہ میں طلب کرتے بعض قصوروں میں اُن پر جرمانہ کرتے ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عاملوں کی تنخواہ زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار دینار سالیانہ تک تھی جو یزید ابن ابوسفیان امیر شام پاتے تھے ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کے سے لائق اور نیک اور کارگذار عہدہ دار پھر دوسری خلافت میں نہیں ہوئے ۔

آٹھواں اصول امور مملکت کے انتظام کی نظر سے قوانین اور ضوابط جدیدکا جاری کرنا اور وقتاً فوقتاً موقع اور مصلحت وقت دیکھکر اُسکی اصلاح و ترمیم کرنا بشرطیکہ کوئی نص صریح اُس کی حرمت پر کتاب وسنت کی موجود نہ ہو ۔ ہم جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کو غور کرتے ہیں تو اُس کو ہزاروں عمدہ قواعد اور مفید ضوابط سے بھرا ہوا پاتے ہیں درحقیقت ان کی رائے نہایت عمدہ اور ان کے کام نہایت عجیب و غریب ہوتے تھے جو کچھ انہوں نے سلطنت کے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔

آجکل کے زمانہ میں جہاں کسی نے کوئی نئی بات کی گو اُس کو ثواب اور عذاب سے علاقہ نہ ہو لوگ بدعت کہنے لگتے ہیں اور اُسکو حرام اور منع بتلاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ جس بات کو شرع نے حرام کر دیا ہے اسکو چھوڑ کر سب چیزیں مباح ہیں سیئے کہ الاصل فی اشیاء الاباحۃ اور یہ نہیں سوچتے کہ ان امور میں جو کہ متعلق سیاست مدن اور معاشرت کے ہیں ہمیشہ اختلاف زمانہ سے اختلاف ہوتا رہتا ہے اور ان کا ترمیم کرنا اور ان میں اصلاح دینا ضروری ہو جاتا ہے ان میں اُسی قاعدہ کا لحاظ کرنا چاہیے جس کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت میں کیا یعنی محرمات منصوصہ کو چھوڑ کر اُن باتوں کو اختیار کرنے میں جو کہ انکے زمانہ کے مناسب حال تھیں کچھ ذرا سا بھی تامل نہ کیا اور کسی نے اُسکو بدعت نہ کہا ۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب احیاء میں کیا عمدہ معنی بدعت کے لکھے ہیں جن کا نقل کرنا ہم اس موقع پر مناسب سمجھتے ہیں ۔

قیل اربع احدث بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الموائد[۱] والمناخل[۲] والاشنان[۳] والشبع[۴] واعلم انا وان قلنا الاکل علی السفرۃ اولی فلسنا نقول الاکل علی المائدۃ منھی عنہ نہی کراھۃ او تحریم اذ لم یثبت فیہ نھی وما یقال انہ ابدع بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلیس کل ما ابدع منھیا بل المنھی بدعۃ تضاد سنۃ ثابتۃ وترفع امرا من الشرع مع بقاء علتہ بل الابداع قد یجب فی بعض الاحوال اذا تغیرت الاسباب ولیس فی المائدۃ الا رفع الطعام عن الارض لتیسیر الاکل وامثال ذلک مما لا کراھۃ فیہ ۔

دلوگ کہتے ہیں کہ بعد پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ چار چیزیں جاری ہوئیں ۔

[۱] واحد اس کا مائدہ ہے دسترخوان [۲] واحد اس کا منخل ہے چھلنی [۳] اشنان بضم اول ایک گھانس ہے جو شور والی زمین میں اُگتی ہے اسی کو جلا کر سجی یعنی سجی بنائی جاتی ہے [۴] شبع بکسر اول وسکون ثانی ۔ مندجوع ۔ پیٹ بھر کر کھانا کھانا ۔ (احمد مخدومی)

(۱) خوان پر رکھ کر کھانا کھانا۔ (۲) میدہ اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی (۳) اشنان (۴) پیٹ بھر کے کھانا ۔

لیکن اگرچہ ہم بھی کہتے ہیں کہ کھانا سفرہ پر بہتر ہے لیکن یہ ہمارا قول نہیں کہ کھانا خوان پر حرام ہے یا مکروہ ہے اسلئے کہ کوئی نہی صریح اس باب میں نہیں ہے اور جو لوگ کہ اُس کو بدعت کہتے ہیں سو یہ غلط ہے اسلئے کہ جو بعد حضرت کے ہوئی ہو وہ بدعت نہیں ہے نہ وہ ممنوع ہے - بلکہ بدعت وہ ہے جو کہ ضد اور مخالف کسی سنت ثابتہ کے ہو اور جس سے کوئی حکم شرعی باوجود موجود ہونے اسکی علت کے مرتفع ہو۔ بلکہ بعض حالتوں میں اور بعض ضرورت کے سبب سے ایسی نئی بات کا کرنا جو کہ حضرت کے وقت میں نہ تھی واجب ہو جاتا ہے اور خوان میں سوائے اُس کے اور کچھ نہیں ہے کہ کھانا بنظر آسانی کے زمین سے بلند کر کے اُس پر رکھا جاتا ہے اور یہ بات اور مثل اس کے وہ وہ چیزیں ہیں جن میں کچھ کراہت شرعی نہیں ہے ۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ امور جو دینیات سے نہیں ہیں اور جن پر شارع نے عذاب اور ثواب مقرر نہیں کیا ہے وہ سب مباحات میں ہیں اُن پر اطلاق بدعت کا کرنا نادانی ہے اور اس کا ثبوت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے امور انتظام مملکت میں کیسی کیسی اختراعات کیں کہ اُس کو ہم بیان کرتے ہیں ۔

پہلا نیا کام جو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کیا وہ دفتر اور کچہری کا مقرر کرنا اور لشکریوں اور ملازموں اور روزینہ والوں کا نام لکھا جانا اور انکی تنخواہیں مقرر کرنا ہے قبل حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے جو مال غنیمت کا آتا تھا ویسا ہی تقسیم کر دیا جاتا تھا نام پانے والے کا نہ تعداد اُس مال کی لکھی جاتی تھی مگر جبکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو اس قاعدہ میں ترمیم کی حاجت معلوم ہوئی تب مشورہ کیا۔ ولید ابن ہشام نے کہا کہ میں نے بادشاہان شام کے ہاں دیکھا ہے کہ وہ دفتر رکھتے ہیں اور اس میں سب حساب کتاب تحریری رہتا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اس کو پسند کیا اور عقیل ابن ابی طالب اور مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو بطور منشی کے مقرر کیا اور سب کے نام لکھنے کا اُن کو حکم دیا اور یہ کام حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے سنہ ۲۰ ہجری محرم کے مہینے میں کیا ۔

دوسرا کام جو انھوں نے کیا وہ تاریخ ہجری کا جاری کرنا ہے اُس کا پہلے انکے رواج نہ تھا ۔

تیسرا کام اُن کا خزانہ کا مقرر کرنا ہے جسکو ہماری اصطلاح میں بیت المال کہتے ہیں ۔

چوتھا کام اُن کا تقسیم اختیارات اور عہدوں کا ہے اس سے پہلے جو کام ہوتا تھا وہ ایک ہی شخص کرتا تھا مگر بخیال اس کے کہ اُس میں چند قباحتیں نظر آئیں اُس کو بدلدیا اور تین قسم کے عہدہ دار مقرر کئے ایک امیر جس کے متعلق انتظام کل امور ریاست کا ہوتا تھا اور جس کے اختیار میں فوج

رہتی تھی ۔ دوسرا قاضی کا کام انفصال خصومات اور تصفیہ حقوق تھا تیسرا تحویل دار جسکی سپردگی میں خزانہ رہتا تھا اور ایک دوسرے کے کام سے کچھ تعلق نہ تھا ۔

پانچواں کام اُن کا جو سُننے والوں کو متعجب کرتا ہے مقرر کرنا قواعد خراج اور محصول کا تھا ۔

محصول لینے کے چند طریقے رکھے گئے تھے ایک جزیہ اگر وہ برضامندی دینے والے کے ٹھہرتا تو اس میں کمی بیشی نہ ہوتی ورنہ بشرح مختلف لیا جاتا مگر چار درم ماہواری سے زیادہ نہیں ۔

دوسرا محصول مال تجارتی پر جس کی شرح یہ تھی ۔ ذمیوں سے پانچ روپیہ سیکڑا اور حربیوں سے دس روپیہ سیکڑا لیکن یہ محصول سالانہ ہوتا تھا اگر وہ مال سال بھر میں چند مرتبہ آوے تو پھر کبھی اس سے نہ لیا جاتا تھا اور اگر کوئی تحصیل کنندہ غلطی سے لیتا تو وہ واپس کردیا جاتا جیسا کہ ایک عیسائی تاجر کو پھیر دیا گیا ۔

تیسرا محصول زمین کا ۔ اس محصول کے اُس وقت باقاعدہ مقرر ہونے پر لوگوں کو تعجب ہوگا کہ وہ فی جریب شرح مقرر پر بعد پیمائش اراضی کے اکثر جگہ لیا جاتا تھا چنانچہ جب ملک عراق کا فتح ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حکم دیا کہ اس زمین کی پیمائش کی جاوے چنانچہ عثمان ابن حنیف اور حذیفہ ابن یمان اس کام پر مقرر ہوئے بعد پیمائش کے معلوم ہوا کہ کُل اراضی تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب ہے ، اُس پر موافق حیثیت پیداوار اراضی کے شرح مقرر کی گئی عامر شعبی لکھتے ہیں کہ وہ شرح یہ تھی ۔

اراضی قابل زراعت پر فی جریب .. .. ایک درم سالیانہ

ترکاری کی زمین پر فی جریب .. .. پانچ درم سالیانہ

انگور اور چھوہارے کی زمین پر فی جریب .. .. .. دس درم سالیانہ

اور یہ صرف عراق میں جاری نہیں ہوا بلکہ شام اور دیگر جزائر میں بھی اسی طور پر کیا گیا لیکن سب ملک مقبوضہ میں اس کا رواج نہیں ہونے پایا ۔ محصول کے تحصیل کرنے میں نہایت آسانی کا حکم تھا اور تکلیف جسمانی دینے کی سخت ممانعت تھی چنانچہ ایک دفعہ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے وقت مراجعت سفر شام کے دیکھا کہ ایک قوم کی قوم کو تحصیل کرنے والے محصول کے ستاتے ہیں آپ نے اُن کو چھڑا دیا اور فرمایا کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ دنیا میں عذاب دیتے ہیں وہ قیامت میں عذاب کیئے جاوینگے ۔

جو ملک فتح کیا جاتا اور مصالحہ کیا جاتا تو یہ شرطیں عہدنامہ میں داخل ہوتیں ۔

اوّل ۔ خراج کی تفصیل ۔

دوسرے ۔ جو مسلمان انکے ملک میں گذرے اُسکی تین[1] روز تک مہمانی کرنا ۔

تیسرے ۔ راہ بتلانا ۔

[1] معلوم نہیں کہ مسلمان ان لوگوں کے ہاں کا یا اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے یا خشک سیدھا لے لیا کرتے تھے ۔

چوتھے ۔ دشمنوں سے سازش نہ کرنا ۔

پانچویں ۔ مجرم کو پناہ نہ دینا ۔

چھٹا کام اُن کا زمین کی آبادی میں سعی کرنا حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ جو زمین بنجر کو مزروعہ کرے وہ زمین اسی کی ہو جاوے گی غرض اس حکم سے یہ تھی کہ لوگ زراعت کرنے لگیں ۔

ساتواں کام اُن کا شہروں کی آبادی ۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اُس جگہ پر جہاں اب بصرہ شہر آباد ہے بنیاد آباد کرنے کی ڈالی اور بصرہ کو آباد کیا اس لئے کہ وہ مقام ایسا تھا کہ جہاں جہاز اور کشتیاں عجم اور ہند کی لنگر کرتی تھیں بنظر حفاظت ملک کے دشمنوں سے اور بنظر فائدہ تجارت کے اس شہر کو آباد کیا اور وہاں ایک فوج کی چھاؤنی مقرر کی ۔

دوسرا کوفہ بھی آباد کیا ہوا اُن کا ہے اُس کے آباد کرنے کا یہ سبب ہے کہ جب مسلمان شہر مدائن میں بہت سے ہوگئے تو وہاں کی آب ہوا بگڑ گئی اور لوگ بیمار ہوگئے تب سعد ابن وقاص کو عمدہ جگہ تلاش کرنے پر مقرر کیا اور شہر کوفہ آباد کرایا اس شہر میں اول کچی اینٹ کی عمارت اور پھونس کے چھپر کا حکم دیا لیکن پھر اُس میں پختہ عمارت بنانے کی بھی اجازت دی ۔

علاوہ ان شہروں کے شام اور مصر اور چند جزائر میں شہر آباد کئے ۔

آٹھواں کام اُن کا تجارت کی آزادی ہے تمام لوگوں کو بلحاظ مذہب اور دین کے تجارت کرنے کی اجازت تھی بلکہ حربیوں کو حکم عام تھا کہ وہ مجاز ہیں کہ دارالاسلام میں آویں اور مسلمانوں سے خرید فروخت کریں ۔ منبج شہر کے حربیوں نے درخواست کی کہ ہم کو عشر لے کر آنے کی اجازت ہو چنانچہ اُنکو اجازت دی گئی ۔

یہ امور جن کو ہم نے بیان کیا وہ بطور نمونہ کے ہیں اگر حالات تفصیلی لکھے جاویں تو ایک بڑی کتاب ہو جاوے لیکن ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ اُس کو نظر غور سے دیکھیں اور ان اصول اور ضوابط کے علل اور وجوہ پر نظر کریں کہ بلحاظ ضرورت اور مناسبت حال زمانہ کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متورع اور زاہد اور تابع سنت نے کیسے کیسے کام کئے بلکہ استیعاب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے معاویہ امیر شام کو جو کہ ہزار دینار ماہواری پاتے تھے اور ملک شام کی حکومت اُنکے متعلق تھی دیکھا کہ نہایت شان و شوکت اُنکے لشکر میں پائی جاتی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا سبب پوچھا امیر شام نے جواب دیا کہ میں ایسے ملک میں ہوں جہاں دشمن کے جاسوس آتے ہیں اگر اس طرح نہ رہوں تو اُنکی آنکھوں میں عزت نہ ہووے آپ نے جواب دیا کہ خیر نہ میں منع کرتا ہوں نہ اس کی اجازت دیتا ہوں امیر شام نے کہا کہ صاف حکم دینا چاہیے تب حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ کیا کہوں ایسا جواب تم نے دیا کہ میں بند ہو گیا گو ایک زبردست کے پنجہ میں گرفتار ہو گیا ۔

ہم اگر ان اصول اور احکام پر غور کریں تو ہزاروں نتیجے اُس سے حاصل ہوتے ہیں تعجب ہے مسلمانوں پر کہ اپنے پیشواؤں کے حالات پر غور نہیں کرتے اور ان سے واقفیت پیدا نہیں کرتے اور دینی اور دنیاوی ذلت میں رہنا پسند کرتے ہیں ✦

اگر ہم ویسی باتوں سے واقفیت حاصل کریں تو ہم کو اپنے دین و مذہب کی حقیقت معلوم ہو جاوے اور تمام عزتیں دینی اور دنیاوی ہم کو نصیب ہو سکیں لیکن افسوس ہے کہ ادبار نے ہم کو غافل کر دیا اور غفلت نے ہم کو ذلت کی حالت پر پہنچا دیا حقیقت میں ہمارے اس ادبار کا کوئی سبب نہیں ہے مگر غفلت ۔ مگر غفلت ۔ مگر غفلت ✦ ؎

ایں ہستی و بیہوشی نہ حد بادہ بود　　با حریفاں ہر چہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

لیکن ہم کو صرف اس کہنے پر قناعت نہ کرنی چاہیے اُس غفلت کا علاج اور اس ادبار سے نکلنے کی تدبیر کرنی لازم ہے تاکہ ہم خود ادبار کی حالت سے نکلیں اور اپنے بھائیوں کو زبردستی اُس سے نکالیں ؏

گر نیاید بخوشی موے کشانش آرید

اس ادبار سے نکلنے کی کوئی تدبیر اس سے بہتر نہیں ہے کہ اوّل ہم اس امر کی تنقیح کریں کہ کونسے کام کرنے کی ہم کو ممانعت شرعی ہے اور کس کی اجازت اور کس کی پابندی ہمارے پیشواؤں نے جائز رکھی ہے اور کس میں آزادی ہے بعدہٗ ہم کوئی عملی تدبیر کریں کہ اس علم سے فائدہ اٹھاویں ✦

افسوس ہے کہ بعض ہمارے دوست ہماری ان باتوں اور ان تدبیروں کو لغو محض جانتے ہیں بلکہ اُسکو سفسطہ اور جنون سمجھتے ہیں اور ایسے مضمون کے لکھنے والوں اور تدبیروں کے بتانے والوں کو آزکلیہ کہتے ہیں اگر ہم اُن کی ان باتوں کو سنیں اور خاموش ہو جاویں تو سوائے اسکے اور کچھ نتیجہ نہ نکلے کہ جو تحریک ایسی تحریروں اور تقریروں سے ہوتی ہے وہ بھی نہ ہووے پس سب کے سب ہاتھ منہ پر رکھے ہوئے بیٹھے رہیں اور اپنی قوم کے ادبار و ذلت کا تماشا دیکھتے رہیں ۔ اگر ہمارے دوست ہم کو غلطی پر بھولا ہوا جانتے ہیں وہی کوئی تدبیر مفید ہم کو بتاویں لیکن افسوس ہے کہ نہ وہ کچھ کرتے ہیں نہ کچھ کہتے ہیں نہ بتاتے ہیں بجز اس کے کہ ہم کو مجنوں اور دیوانہ اور آزکلیہ کہکر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور ہمارا دل جلاتے ہیں ✦

اس بات کا کوئی انکار نہیں کرتا کہ ہماری قوم روز بروز ہر بات میں تنزل کرتی جاتی ہے اور ہر لحظہ اور ہر ساعت ادبار اور جہالت میں ترقی کرتی جاتی ہے پھر بھی ان لوگوں کی خاموشی کو جو کچھ کر سکتے ہیں ہم کس بات پر محمول کریں ۔ اگر ہم دیوانے اور مجنون ہیں خیر ہوں لیکن انکی خاموشی اور سکوت کا کیا سبب ہے ؎

گیرم کہ وقت فرح طپیدن گناہ من　　دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

خدا ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو اس خواب غفلت سے جگاوے اور کچھ کرنے پر متوجہ کرے وھو ولی التوفیق وما توفیقی الا باللہ ✦

امام حجۃ الاسلام غزالیؒ

منجملہ ان مشہور شخصوں کے جو کہ مسلمانوں میں ہوئے ہیں امام غزالی ہیں۔ ہماری قوم میں سے کیا عالم کیا جاہل چند ہی ایسے لوگ ہونگے جو اُن کے نام سے واقف اور ان کے کمالات سے آگاہ نہ ہوں مگر اکثر لوگ انکے ذاتی حالات سے اطلاع نہیں رکھتے اسلئے ہم ان کا مختصر حال لکھتے ہیں ۔

اُن کا نام زین الدین ابو حامد محمد بن محمد بن محمد بن احمد ہے اور غزالہ کے رہنے والے ہیں جو کہ ایک قصبہ طوس[1] کے قصبات سے ہے اسی واسطے انکو غزالی کہتے ہیں۔ شہر طوس میں ۴۵۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۵۵ برس کے ہوکر ۵۰۵ھ ہجری میں رحلت کی۔ اُنھوں نے اول طوس میں احمد رازکانی سے تعلیم پائی بعدہٗ نیشاپور میں آئے اور امام الحرمین ابو المعالی جوینی سے علم حاصل کیا۔ چونکہ ذہن اور عقل اُن کو خدا نے اعلیٰ درجہ کی دی تھی اسلئے تھوڑے ہی عرصہ میں علوم معقول و منقول کے جامع اور اپنے اُستاد کے جیتے جی مشہور اور نامور ہوگئے اور کتابوں کی تالیف بلکہ تصنیف کرنا شروع کیا۔ جب ان کے اُستاد ابو المعالی نے انتقال کیا تب وہ نیشاپور سے چلے اور وزیر نظام الملک سے ملے اس نے انکی نہایت ہی تعظیم و تکریم کی اور اُس کی مجلسوں میں اکثر علما و محدثین سے نوبت مناظرہ کی پہنچی جب انکے علم و کمالات کی شہرت ہوگئی تب وزیر نے ان کی قابلیت و استعداد دیکھکر مدرسہ عالیہ نظامیہ کو جو بغداد میں تھا انکے متعلق کیا چنانچہ ۴۸۴ھ ہجری میں انہوں نے انتظام اور تدریس اس مدرسہ کی اپنے ذمہ لی۔ اور تمام اہل عراق انکی طرف رجوع کرنے اور ان سے علوم معقول و منقول تحصیل کرنے لگے چار برس تک وہ خدمت انہوں نے اپنے متعلق رکھی ۴۸۸ھ ہجری میں اپنے بھائی احمد غزالی کو اپنا قائم مقام کر کے اُس سے دست کش ہوئے اور زہد اختیار کر کے بیت المقدس کو چلے گئے بعد اسکے شام اور دمشق اور مصر اور اسکندریہ کی سیاحت کی اور بسواری جہاز کے دیار مغرب کی طرف گئے اور حج کر کے اپنے وطن طوس کو لوٹ آئے ۔

ان کی تالیفات و تصنیفات چارسو زیادہ ہیں منجملہ انکے مشہور کتابیں یہ ہیں۔ **فقہ** میں وسیط بسیط وجیز۔ **اصول فقہ** میں مستصفی منخول منتحل۔ **علم کلام** میں تہافۃ الفلاسفہ۔ محک النظر۔ معیار العلم مقاصد مضنون بہ علی غیر اہلہ مشکوٰۃ الانوار۔ منقذ من الضلال۔ **تفسیر** میں یاقوت التاویل جس کی چالیس جلدیں ہیں **علم اخلاق و تصوف** میں احیاء العلوم اسرار علم الدین۔ منہاج العابدین درۃ فاخرہ فی کشف علوم الآخرہ۔ انیس فی الوحدت۔ کتاب القربۃ الی اللہ۔ اخلاق الابرار و نجاۃ من الاشرار۔

[1] آجکل طوس کو مشہد کہتے ہیں (احمد یا محنعمی) [2] جگہ کا نام ہے (ایضاً)

بدایۃ الہدایہ۔ جواہر القرآن۔ اربعین فی اصول الدین۔ المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ۔ میزان العمل القسطاس المستقیم۔ التفرقہ بین الاسلام والزندقہ۔ کتاب الذریعہ الی مکارم الشریعہ۔ کتاب المبادی و الغایات کیمیائے سعادت۔ تدلیس ابلیس نصیحۃ الملوک۔ کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد۔ شفاء العلیل فی القیاس والتعلیل۔ اساس القیاس۔ کتاب المقاصد۔ کتاب لجام العوام عن علم الکلام۔ کتاب الانتصار۔ کتاب المآخذ۔ القول الجمیل فی الرد علی من غیر الانجیل۔ کتاب المستظہری۔ کتاب الامالی۔ کتاب فی علم اعداد الوفق محدودہ۔ کتاب غفصد الخلاف۔ اور ایک چھوٹا سا رسالہ فی الرد علی المنکرین فی بعض الفاظ احیاء علوم الدین ٭

تمام علما کا اتفاق ہے کہ منجملہ مؤلفات امام غزالیؒ کے احیاء العلوم کیا باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا بلحاظ مضامین او معانی کے عمدہ ترین کتابوں سے ہے جس میں انہوں نے تمام علوم نقلی کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اور دلائل عقلی سے مسائل شرعی کو مدلل کیا ہے اور منقول کو معقول سے ملایا ہے۔ یہ طرز جدید انہیں سے جاری ہوا اور اسرار و نکات مسائل شرعیہ کے بیان کی تا انہیں کی ذات سے شروع ہوا۔ اس کتاب کو انہوں نے نیشاپور میں ایک ہزار پانسو پچیس میں تالیف کیا چونکہ انہوں نے احیاء العلوم میں نیا طریقہ اختیار کیا یعنی تقلید کو چھوڑا اور تحقیق پر مستعد ہوئے اور الفاظ کے معنی اور مطالب اصلی بیان کئے اور بخلاف اُس وقت کے فقہا کے دقائق و حقائق ظاہر کرنے پر آمادہ ہوئے نظر بریں بہت سے متعصبین و مقلدین نے اُن کی کتاب کو ناپسند کیا اور اُس کے الفاظ و عبارت کو خلاف اپنے طریقہ کے جان کر ان پر الحاد کا الزام لگایا بلکہ فقہا جہال نے ان کے کفر کا فتوےٰ دیا اور انکی کتاب احیاء العلوم کے دیکھنے کو حرام بتلایا اور اسکے جلا دینے کا حکم دیا اور اس امر کے استفتا تحریری علما و فضلا کے پاس آنے لگے چنانچہ الشیخ کبیر عارف باللہ ابو العباس نے یہ فرمایا کہ انا نشہد لہ بالصدیقیۃ العظمیٰ کہ ہم امام غزالی کی صدیقیت پر شہادت دیتے ہیں اور شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اپنے وقت کے قطب تھے یہ کہا کہ من کانت لہ الی اللہ تعالیٰ حاجۃ فلیتوسل بہ الیہ بالامام احمد غزالی اور ابو الفدا اسمٰعیل بن محمد حضرمی کے پاس فقہا جہال نے ایک ایک استفتا شعر طعن و تدح امام غزالی کے بھیجا جس میں انہوں نے یہ لکھا تھا ھل یجوز قرأۃ کتب الغزالی کہ آیا پڑھنا غزالی کی کتابوں کا جائز ہے انہوں نے یہ جواب لکھا کہ انا للہ و انا الیہ راجعون الغزالی سید المصنفین علاوہ ان مختصر جوابوں کے اس وقت کے علماء نے منکرین امام غزالی کے اعتراضات کے تفصیلی جواب لکھے اور ان کے تعصبات کو رد کیا بلکہ خود امام غزالی نے ان اعتراضات کو جو الفاظ و عبارات پر احیاء العلوم کے فقہا نے کئے تھے ایک علیحدہ رسالہ لکھ کر رد کیا مگر بایں ہمہ لوگ اُن پر اعتراض کرنے سے باز نہ آئے چنانچہ علی بن یوسف

مؤلف کتاب مغرب نے جو نہایت دیندار اور متشرع مشہور تھا اور جو پلے سرے کا عابد تھا اور جس کے پاس اکثر سوائے علماء اور فضلاء کے اور کوئی نہ ہوتا تھا ۵۰۳ھ ہجری میں یہ فتویٰ دیا کہ کتاب احیاء العلوم کا نام و نشان نہ رہے اور بالکل جلا دی جاوے تاکہ مسلمانوں کے عقائد میں اس سے کچھ خلل نہ آوے۔

یہ حال چند ہی روز رہا اور نیا طریقہ دیکھکر لوگوں کو جو اول اول تنفر ہوا آخر وہ امام غزالی کی مؤلفات دیکھ دیکھ کر جاتا رہا اور لوگوں نے احیاء العلوم کے خلاصے کرنا شروع کئے چنانچہ ابوزکریا یحییٰ نے جو ۵۵۲ھ میں مرے اور امام احمد برادر امام حجۃ الاسلام نے جنہوں نے ۵۲۰ھ میں وفات پائی احیاء العلوم کو مختصر کیا بعدہ اور لوگوں نے بھی اس سے فائدے حاصل کئے اور ہزاروں عالموں نے اس کتاب کی تعریف میں اشعار اور قصیدے کہے اور منکرین امام غزالی پر اعتراضات کئے چنانچہ شیخ الاسلام قطب الدین محمد ابن الشیخ الامام ابی العباس قسطلانی نے ایک بڑی کتاب معترضین امام غزالی کے رد میں تصنیف کی اور اس میں معترضین کے اعتراضات کو بیان کرکے بخوبی باطل کیا اور ابی الفتح شیخ فقیہ نے امام غزالی کی نہایت تعریف لکھی اور اُن کی کتابوں کو بسبب تطبیق معقول و منقول کے بہترین کتب سے تصور کیا۔

امام غزالی ہی پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے نیا طریقہ تطبیق بین المعقول و المنقول کا نکالا اور عقائد اور اعمال کے اسرار و حقائق کو بیان کیا اس طریقہ کے اختیار کرنے اور اسرار و حقائق کے بیان کرنے میں جو کچھ اُن پر اعتراضات ہوئے اُس کو انہوں نے جابجا اپنی تالیفات میں ذکر کیا ہے اور ان متعصبین و متقشفین فقہا پر جو منقول میں عقل اور دخل دینا حرام جانتے ہیں بہت ملامت کی ہے اور جنہوں نے شریعت کو صرف ظاہر پر محمول کیا ہے اور اسکے اسرار و حقائق سے انکار کیا ہے اُن پر نہایت افسوس فرمایا ہے چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں[۱] کہ علوم شرعی کے ظاہر و باطن پر منقسم ہونے سے کوئی صاحب بصیرت انکار نہیں کر سکتا سوائے ان کوتاہ فہموں کے جنہوں نے لڑکائی میں کوئی چیز سن لی اور اس پر جم گئے اور مقامات عالیہ پر نہ پہنچے حالانکہ خود حضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قرآن ظاہر و باطن کا جامع ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالے عنہ نے

[۱] واعلم ان انقسام هذه العلوم الى خفية وجلية لا ينكرها ذو بصيرة وانما ينكرها القاصرون الذين تلقفوا فى اوائل الصبى شيئا وجمدوا عليه فلم يكن لهم ترقٍ الى شأو العلاء ومقامات العلماء والاولياء وذالك ظاهر من ادلة الشرع قال صلے الله عليه وسلم ان للقران ظاهرا وباطنا وحدا ومطلقا و قال ابن عباس فى قوله عز وجل الله الذى خلق سبع سموات ومن الارض مثلهن لو ذكرت تفسيره لرجمتمونى وفى لفظ اخر لقلتم انه كافر۔

اس آیت کی تفسیر میں جس میں ذکر سات آسمانوں و زمین کا ہے یہ فرمایا ہے کہ اگر میں اُس کی تفسیر کروں تو لوگ مجھے سنگسار کر دیں یا کافر کہنے لگیں ۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیفات میں قبل بیان کرنے اسرار و حقائق شریعت کے ایک نہایت عمدہ بیان نسبت اختلاف شریعت کے ظاہر اور باطن کے کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ نا سمجھ ہیں وہ شریعت کے حقائق سنتے ہیں تو حیران ہو کر پوچھتے ہیں کہ اگر حقیقت خلاف شریعت ہے تو کفر ہے اور اگر موافق اُسکے ہے تو پھر اس میں کیا فرق ہے حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ ظاہر اور باطن شریعت کے اختلاف کے چند سبب ہیں اور اسکی اُنہوں نے پانچ قسمیں کی ہیں ۔

پہلی قسم کہ شئے فی نفسہا ایسی دقیق ہو کہ اکثر لوگ اُسکے سمجھنے سے عاجز ہوں اور اُس حقیقت کے بیان کرنے سے اُن کو توہمات لغو پیدا ہوں تو ایسی شئے کی حقیقت بیان کرنے سے شارع نے احتراز کیا ہے اور اس کو ظاہر نہیں کیا مثل حقیقت روح کے ۔

دوسری قسم اگرچہ شئے فی نفسہٖ دقیق نہ ہو کہ اکثر لوگ اس کو سمجھ نہ سکیں لیکن عام سننے والوں کے حق میں اُس کے سننے سے اندیشہ ضرر پیدا ہونے کا ہو اس واسطے اُس شئے کی حقیقت کو شارع نے ظاہر نہیں کیا مثل مسئلہ جبر و قدر کے ۔

تیسری قسم اگرچہ اُس شئے کی حقیقت ظاہر کرنے سے احتمال ضرر پیدا ہونے کا بھی نہ ہو لیکن استعارہ اور رمز میں بیان کرنے سے اسکی وقعت عام لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہو جیسا کہ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اما یخشی الذی یرفع راسہ قبل الامام ان یحول اللہ راسہ راس حمار ۔ کہ جو شخص امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے کیا وہ اس سے نہیں ڈرتا کہ خدا اس کا سر گدھے کا سا کر دے پس باعتبار صورت کے آدمی کا سر گدھے کا سا ہو جانا نہ ہوا ہے نہ ہو گا لیکن مقصود اس سے صورت گدھے کی نہیں ہے بلکہ خاصیت اسکی ہے یعنی حماقت ۔ یا حضرت نے فرمایا قلب المومنین بین اصبعین من اصابع الرحمان کہ مومن کا دل خدا کی دو انگلیوں کے بیچ ہوتا ہے ۔ یہ کلام بھی باعتبار ظاہر کے نہیں ہے اس لئے کہ اگر کسی کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کوئی دیکھے تو ایک انگلی کا نشان بھی نہ ملیگا تو یہاں بھی انگلیوں سے مراد قدرت ہے ۔

چوتھی قسم کہ کسی شئے کی ہیئت اجمالاً بیان کر دیجائے اور اسکی حقیقت کی تفصیل اہل ذوق کی طبیعتوں پر چھوڑ دیجائے کہ وہ اجمال بمنزلہ ظاہر کے اور وہ تفصیل بمنزلہ باطن کے ہوگی ۔

پانچویں ۔ کہ کسی شئے کا بیان بزبان حال کیا جائے اور اس سے ظاہری نطق و بیان مراد نہ ہو بلکہ اسکی کیفیت اور حقیقت مقصود ہو جیسا کہ خدا فرماتا ہے ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین کہ خدا نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں

خوشی سے چلے آؤ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں۔ تو اُس سے مراد باہم خدا اور زمین و آسمان کے گفتگو ہونا نہیں ہے بلکہ ان کی تسخیر اور اطاعت مراد ہے اور اسی قبیل سے ہے خدا کا فرمانا کہ ان من شیٔ الا یسبح بحمدہ۔ کہ کوئی چیز نہیں ہے جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ تو اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ جمادات بھی حیات اور عقل و نطق رکھتے ہیں اور سبحان اللہ سبحان اللہ بولتے ہیں بلکہ مراد اس سے انکا وجود ہی ہے کہ وہ اپنے صانع اور پیدا کرنے والے کی پاکی پر شاہد ہیں اور انکی ہستی زبان حال سے اپنے صانع کی قدرت بیان کر رہی ہے ؎

امام غزالی نہایت تعجب اپنا نسبت اُن لوگوں کے ظاہر کرتے ہیں جو فقط تقلید پر چلتے ہیں۔ اور خود تحقیق کو دخل نہیں دیتے اور اپنی عقل کو بیکار کر دیتے ہیں اُن کا مقولہ ہے کہ وہ صفت جس سے انسان انسان ہوا اور جس نے اُسکو حیوان سے جدا کر دیا ھوالذی استعد بہ لقبول العلوم النظریۃ وتدبیر الصناعات الخفیۃ الفکریۃ وہ ایک استعداد قبول کرنے علوم نظریہ کی اور پیدا کرنے تدبیر صنعتوں پوشیدہ کی ہے اور اسی استعداد کا نام عقل ہے اور کوئی انسان نہیں ہے جسکو یہ استعداد نہ دی گئی ہو تمام علوم اور جمیع فنون اسی سے پیدا ہوتے ہیں گویا وہ سب اس میں پوشیدہ ہیں اور صرف ایک سبب کی حاجت ہے جو ان علوم کو اُس سے پیدا کرے کوئی علم اور فن نہیں ہے کہ جو اُس سے خارج ہو اور اس میں پوشیدہ نہ ہو عقل کی اور علوم کی اُس میں پوشیدہ ہونے کی مثال بعینہ پانی اور مٹی کی ہے کہ کوئی زمین نہیں ہے جس میں پانی نہ ہو مگر اُس کا نکلنا محتاج کھودنے اور نکالنے اوپر کی مٹی کا ہے یا اُسکی تمثیل مثل روغن کے ہے کہ وہ ہر دودھ میں موجود ہے مگر اس کا پیدا ہونا ایک تدبیر خاص پر موقوف ہے پس جو شخص اُس استعداد کو کام میں لاوے اور عقل کو بیکار کر دے وہ درحقیقت اُس استعداد کو ضائع کرتا ہے جو خدا نے اسکو دی ہے اور وہ انسان ہو کر اپنے آپ کو حیوان بناتا ہے ؎

وہ کہتے ہیں کہ کسی کے علم اور صناعت اور فن کے اوپر یقین نہ کرنا چاہئے کہ جو کچھ معلوم ہو گیا یا جو ظاہر ہو چکا وہی اُس کا کمال ہے اور اب اس سے زیادہ لحاظ ہونا غیر ممکن ہے اور نہ کبھی کسی خاص قوم یا فرقہ یا شخص کی نکالی ہوئی بات پر یہ بھروسہ کرنا چاہئے کہ وہ اخیر درجہ اس استعداد کے ظہور کا ہے بلکہ ہمیشہ اسکو ابتدائی حالت سمجھے اور اس میں ترقی کرے اور اس استعداد کے ظہور کے ختم ہونے کا معتقد نہ ہووے اور جو امر عقل کے خلاف ہووے اُس کو کبھی نہ مانے اور کسی شرعی مسئلہ کو مخالف عقل کے نہ سمجھے اور اگر اُس کی سمجھ قاصر ہووے تو اس کے اسرار اور اسباب دریافت کرے اور اس مغز کو جو الفاظ کے پوست میں چھپا ہوا ہو باہر نکالے اور اس پانی کو جو مٹی کے اندر موجود ہو کھود کھود کر پیدا کرے ؎

اُس استعداد کا کمال اور ترقی تجربہ اور تحقیقات اور محنت پر موقوف ہے قدرت نے بدو فطرت

ہیں وہ قوت سب کو دی ہے جو اُس کو کام میں لاتے ہیں۔ وہ اُس کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور اُس کے ثمرات اور نتایج کا لطف اُٹھاتے ہیں جو اُس کو کام میں نہیں لاتے وہ اُس کی حقیقت ہی کے منکر ہو جاتے ہیں اور اُس کو استعمال میں لانے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے سے محروم رہتے ہیں ❖

امام غزالی آیت الست بربکم قالوا بلی کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ فرمانا خدا کا کہ ہم نے بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا روز ازل میں اقرار لیا اور ان سے کہا میں تمہارا خدا نہیں ہوں تو سبھوں نے اقرار کیا اُسی استعداد کے عطا کرنے کا بیان ہے کہ انسان کو روز ازل میں جو وہ استعداد دی ہے جس سے ان کی ذات نے میری ربوبیت پر ازل کے دن اقرار کیا اس اقرار سے مراد زبانی اقرار نہیں ہے اس لئے کہ ازل کے روز نہ جسم تھا نہ زبان بلکہ وہی استعداد مراد ہے اور اس قرار او میثاق کا بھلا دینا او ریاد رکھنا اشارہ اسی استعداد کے کام میں لانے اور نہ لانے پر ہے یعنی جو اس استعداد سے کام لیتے ہیں وہ میری ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں اور جو اُسکو استعمال میں نہیں لاتے خواہ تقلید آبا و اجداد کے سبب سے یا اپنی غفلت اور کاہلی کے سبب سے وہ میری ربوبیت سے انکار کرتے ہیں۔ اور یہی مطلب ہے خدا کے اس قول کا کہ لئن سالتہم من خلقھم لیقولن اللہ کہ اگر تو پوچھے لوگوں سے تو سب یہی کہیں گے کہ ہم کو خدا نے پیدا کیا حالانکہ باعتبار ظاہر کے یہ کلیہ صحیح نہیں ہے اسلئے کہ بعض فرقے بالکل خدا کے منکر ہیں ❖

فمعناہ ان اعتبرت احوالھم شھدت بھذا نفوسھم و بواطنھم فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا ای کل انسان فطر علی الایمان باللہ عز وجل بل علی معرفۃ الاشیاء علی ما ھی علیھا پس مطلب اس کا یہی ہے کہ ان کی ذاتیں خود اس کی مقر ہیں کہ ہم کو خدا نے پیدا کیا ہے اور خدا نے ہر آدمی میں استعداد ایمان کی بلکہ تمام چیزوں کی حقیقت کماھی ہی دریافت کرنے کی دی ہے اگر ان کو ایسی استعداد نہ دی ہوتی تو تکلیف ایمان کی اور اُس کے قبول پر جزا اور اس کے انکار پر سزا دینا جائز نہ ہوتا ❖

امام غزالی ان آیات کو اور اس کی مانند اور آیات کی تفسیر بیان کرکے لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو تقلید سے نہیں نکلتے اور اپنی اس استعداد کو کام میں نہیں لاتے ایسی آیتوں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں اور اُس کا مطلب جب انکی سمجھ میں نہیں آتا تو اُس یقین سے جو ہونا چاہئے حقیقت میں پھر جاتے ہیں اور اپنے نزدیک ان کو غیر صحیح سمجھتے ہیں گو زبان سے اُس کی تصدیق کرتے رہیں حقیقت میں ان کی مثال ایک ایسے آدمی کی ہے جو کہ آنکھ بند کرکے کسی محل میں داخل ہو اور وہاں اسباب زینت رکھا ہوا اور وہ اُس سے ٹھوکر کھاوے اور کہنے لگے کہ کیسے وہ لوگ ہیں جنہوں نے راہ میں تنول

کو رکھ دیا ہے حالانکہ وہ چیزیں سب اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہیں مگر یہ اسی کا قصور ہے کہ آنکھ موجود ہے اور پھر اُس سے کام نہیں لیتا اور اندھا بن کر چلتا ہے۔ تو وہ کیونکر ٹھوکریں نہ کھاوے ۔

وہ کہتے ہیں کہ اسی استعداد کا نام عقل ہے اور اسی کا خطاب بصیرت ہے اور اسی کا لقب نور ہے اور اسی کو ایمان کہتے ہیں وہ سب ایک ہی چیز ہے صرف نام علٰحدہ علٰحدہ ہیں جس شخص نے اس کو دنیا میں استعمال کیا وہ آخرت میں بھی بینا ہے جس نے اُس سے یہاں کام نہ لیا اور وہاں بھی اندھا ہے اور یہی معنی ہیں اس آیت کے من کان فی ھذہ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی واضل سبیلا ۔

وہ ایک سوال لکھتے ہیں کہ جب عقل بہترین مخلوقات ہے تو کیوں بعض علما نے اُس کو شریعت کے مسائل میں دخل دینے سے منع کیا ہے اور پھر خود ہی یہ جواب دیتے ہیں کہ یا تو وہ منع کرنیوالے خود بے عقل تھے اور انھوں نے اپنی عقل کو بیکار کر دیا تھا یا کہ وے لوگوں کی عقل پر توہمات کا اطلاق کرتے پاتے تھے جیسا کہ بعض اہل کلام نے عقائد دینی میں اپنے توہمات اور خیالات کو دخل دیا اور اس کا نام عقل رکھا تو صرف اُن کا منع کرنا اصلی عقل کے استعمال سے نہ تھا بلکہ ان توہمات اور خیالات کے دخل دینے سے ۔

اُنھوں نے اس شک کو کہ عقل اور وہم میں کیا فرق ہے اور اُس میں کیونکر تمیز ہو سکتی ہے نہایت خوبی سے رفع کیا ہے اور اس مشکل مسئلہ کو نہایت عمدہ تمہیدات اور تمثیلات سے حل فرمایا ہے چنانچہ کتاب منقذ من الضلال اور احیاء علوم الدین اور مشکوٰۃ الانوار کے دیکھنے سے اُس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے ۔

مگر وہ اپنے اس قول پر نہایت مضبوطی سے قائم رہے ہیں کل قلب فھو بالفطرۃ صالح لمعرفۃ الحقایق لانہ امر ربانی شریف فارق سائر جواھر العالم بھذہ الخاصیۃ والشرف والیہ الاشارۃ بقولہ عز وجل انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا کہ جو دل ہے وہ باعتبار اپنی فطرت کے صلاحیت اور استعداد حقائق اشیا کے دریافت کرنے کی رکھتا ہے اور اسی صلاحیت اور استعداد سے مراد وہ امانت ہے جو آیت انا عرضنا الامانۃ میں مذکور ہے کہ یہ استعداد نہ آسمان میں ہے نہ زمین میں ۔ نہ پہاڑ میں نہ کسی میں سوائے انسان کے وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہر انسان کے دل کی لوح پر اپنے قدرت کے قلم سے حقیقت اشیا کو لکھ دیا ہے اور اسی کی طرف اشارہ اپنی اس آیت میں کیا ہے کہ الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم پس جس طرح پر جو کچھ کتاب میں

لکھا ہو وہ وہی پڑھ سکتا ہے جس نے محنت اور تجربہ سے اُس استعداد کو ظاہر کر لیا ہو۔ اسی طرح پر حقائق اشیا کو جو دلوں پر انسان کے بقلم قدرت منقوش ہے یعنی اُن کو صلاحیت اُس کے سمجھنے کی ہے وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اُس صلاحیت کو مشق اور تجربہ اور طریق معین سے لائق کام میں لانے کے بنا لیا ہو۔ مثال اسکی بعینہ ایک پڑھے اور بے پڑھے آدمی کی ہے کہ دونوں کی آنکھیں بینائی میں برابر ہیں مگر کیا سبب ہے کہ پڑھا ہوا اُن لکیروں کو جو سیاہی کا غذ وغیرہ پر کھینچی ہوئی ہیں سمجھ لیتا ہے اور بن پڑھا ہوا اُسکو اور لکیروں میں کچھ تمیز نہیں کر سکتا اور وہ اُن کی حقیقت پر نہیں پہنچ سکتا یہی سبب ہے، کہ پڑھے ہوئے آدمی نے اپنی آنکھ کی استعداد کو جو واسطے سمجھنے ان نقوش مرئیہ کے قدرت نے دی تھی ظاہر کر دیا اور بن پڑھے ہوئے نے ظاہر نہیں کیا۔

وہ کہتے ہیں کہ بڑے نادان وہ لوگ ہیں جو علوم اور حقائق کے دریافت کرنے میں سعی نہیں کرتے اور وہ علوم دینی یا دنیاوی ان میں اوروں کی بتلائی ہوئی باتوں پر قناعت کرتے ہیں۔ حالانکہ دین میں کسی کو سوائے نبی کی بتلائی ہوئی بات کے اور کسی پر کلیتہً اعتماد کرنا اور لوگوں کی بنائی ہوئی کتابوں پر اپنے یقین کو قائم نہ کرنا چاہیے اور رسول کی بتلائی باتوں کے اسرار اور حقائق کے دریافت کی فکر کرنا لازم ہے اس لئے کہ ان اکتفی بالحفظ مایقال کان وحار اللعسم ولا عالما۔ کہ اگر اُس نے اُس کی حقیقت نہ جانی تو وہ اس علم کا برتن ہوا نہ عالم پس کیا سبب ہے، کہ انسان باوجود ہونے استعداد کے حقیقت اشیا کے دریافت سے غافل رہے اور اپنے آپ کو جاہل رکھے۔

وہ ان فقہا اور علما پر نہایت افسوس کرتے ہیں جو تقلید پر قانع ہیں اور جنہوں نے صفات نفس اور حالات قلب کا علم چھوڑ کر وعظ اور قصہ گوئی پر قناعت کر لی ہے اور علم یقین کو چھوڑ کر مجادلہ اور مناظرہ میں پڑ گئے ہیں اور جنہوں نے تعصب اور تقشف کو دینداری سمجھ رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ان علما کے حالات بالکل مخالف صحابہ کے ہیں اور جہلا اور متعصبین آج کل علما کہلائے جاتے ہیں[۱]۔

وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ تعصب کو دینداری سمجھتے ہیں وہ احمق ہیں اس لئے کہ احمق اُسی کو کہتے ہیں جس کی غرض تو صحیح ہو مگر اُس کے حصول کا طریق غلط ہو اور جس راہ سے اُس مقصود تک پہنچنا ممکن ہو اس سے وہ منحرف ہوئے۔

[۱] کما قال رحمۃ اللہ علیہ فصار یسمی المجادل المتکلم عالما والقاص المزخرف الکلام بالعبادات المسجعۃ عالما ھکذا اضعف الدین فی قرون سالفۃ فکیف الظن بزمانک ھذا وقد انتہی الامر الی ان مظھر الانکار نسبتہ ھذہ النسبۃ الی الجنون فالاولی ان یشتغل الانسان بنفسہ ویسکت۔

یہی حال متعصب کا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ میں اپنے دین میں کامل اور اپنے مذہب میں مضبوط اور شریعت پر قائم ہوں اور اس سے وہ درجہ عزت کا جو خدا نے کاملوں کے لئے مقرر کیا ہے مجھے ملیگا حالانکہ جس طور سے وہ دین اور مذہب پر چلتا ہے اور جس طرح سے وہ شریعت کو لیتا ہے اُس میں وہ غلطی پر ہے متعصب ہمیشہ اوروں کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور لوگوں سے بغض اور عداوت رکھتا ہے جو کچھ اُس کے توہمات اور خیالات ہیں اُنہیں کو یقینیات سمجھتا ہے جو جھوٹے تخیلات دینی خود اُس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ تعصب کے سبب سے اس کی آنکھوں کو سچے عقائد کی صورت پر دکھلائی دیتے ہیں اور جو بیہودہ وسوسے اور وہمی مذہبی اُس کی سمجھ کی غلطی سے اُسکی خاطر میں گذرتے ہیں وہ اُس کو خدا کے تبلائے ہوئے اور نبی کے فرمائے ہوئے مسئلے معلوم ہوتے ہیں تعصب اس کے دل کو غرور اور تکبر سے ایسا گھیر لیتا ہے کہ انصاف اور سوچ اور سمجھ کی رسائی بھی اس تک نہیں ہوتی نصیحت یا ملامت کسی کی اس کے دل کے کنارہ تک پہنچنے نہیں پاتی اُس کی آنکھوں کے سامنے تعصب مثل ایک سیاہ کثیف غبار کے ہر وقت چھایا رہتا ہے جس سے وہ کسی چیز کی بُرائی بھلائی کو دیکھ نہیں سکتا۔ وہ کسی شئے کی حقیقت سے واقف نہیں ہوسکتا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو بُرا اور احمق اور فاسق سمجھتا رہتا ہے اور جسکو اپنا سا سخت اور متعصب نہیں جانتا اس کو دین میں ضعیف اور سست جانتا ہے اور چونکہ غرور اور تکبر انسان کی جبلی عادت ہے اسلئے وہ اپنے غرور کے سبب سے اور بھی احمق ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اصل دینداری یہی ہے جو سمجھ میں ہے وہ شیطان کا کھیل ہو جاتا ہے شیطان اُس کے دل میں یہ وہم پیدا کر دیتا ہے کہ جو میں جانتا ہوں اور جو میں سمجھتا ہوں وہی اصل دین اور عین مذہب ہے اور اُس سے اُس کے دل میں ایک حلاوت اور چاشنی پہنچتی ہے اور جس کو وہ کبھی کسی کے کہنے سے چھوڑ نہیں سکتا اور اپنی اس حماقت پر نہایت خوش رہتا ہے کما قال بعضھم فاذا خیل الیہ الشیطان ان ذالک ھو الحق وکان موافق الطبع غلبت حلاوتہ علی قلبہ فاشتغل بہ بکل ھمتہ وھو بذالک فرحان مسرور ویظن انہ یسعی فی الدین وھو ساعی فی اتباع الشیاطین برخلاف اسکے جو شخص سچا دیندار ہوگا وہ کبھی کسی کو ذلت سے نہ دیکھیگا کسی کی حقارت نہ کریگا۔ ہمیشہ اپنے دل کو لوگوں کی باتوں کے سننے کے لئے کھول رکھے گا ہر ایک کی بات پر غور کرے گا۔ ہر چیز کی حقیقت اور ماہیت دریافت کرنے کی فکر میں رہیگا۔ ہر شئے کی وجوہات اور اسباب کی تحقیق کرے گا۔ انصاف اور سچائی اور راستی اور محبت کو ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے گا وہ اصول شریعت میں خاص خدا اور اُس کے رسول ؐ کے قولوں پر تمسک ہوگا اور اس کے حقائق اور اسرار کو دریافت کرے گا۔ وہ کبھی

اپنے آپ کو برائیوں سے پاک اور عیبوں سے صاف نہ سمجھیگا۔ وہ مذہب اور شریعت کو اپنے مطالب کی تحصیل کا ذریعہ نہ گردانے گا۔ وہ جاہ وعزت کا مذہب کے حیلہ سے خواہاں نہ ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو کامل نہ جانے گا۔ وہ سب کو شفقت کی نظر سے دیکھیگا۔ وہ ہمیشہ اپنے دل کے پاک کرنے اور اپنے نفس کے مہذب کرنے پر متوجہ رہیگا ؛

وہ کہتے ہیں کہ تعصب نے لوگوں کو اپنے سچے دین اور اصلی مذہب کی خوبیوں کو چھپا دیا ہے اور برائیوں کو بھلائی اور بھلائیوں کو برائی سمجھ رکھا ہے اگر کسی متعصب کے سامنے کوئی شریعت کے اسرار اور مصالح بیان کرے وہ اسکے دشمن ہوجاتے ہیں اور اس کو ملحد اور زندیق سمجھتے ہیں ان کے نزدیک شریعت میں کوئی خوبی ہے نہ اس میں کوئی مصلحت ہے۔ جتنے احکام شریعت کے ہیں وہ سب جبری ہیں۔ اور خدا نے بلا کسی حکمت اور سبب کے اپنے بندوں کو اپنے احکام کا مقید کردیا ہے اُس کے نزدیک خدا مثل ایسے جابر بادشاہ کے ہے جو بلا سبب اپنے نوکروں کو کسی بیہودہ کام کے کرنے کا حکم دے اور اس سے صرف اُس کی اطاعت کا امتحان لینا منظور ہو حالانکہ یہ بڑی تہمت خدا پر ہے کوئی حکم اور کوئی مسئلہ شریعت کا علت اور سبب اور مصلحت سے خالی نہیں ہے ہاں وہ مسئلے اور وہ باتیں جو لوگوں کی ایجاد اور اختراع ہیں اور جن کا کچھ نشان شریعت میں نہیں ہے وہ بیشک بے فائدہ ہیں اور جبکہ تعصب سے وہ اپنی نکالی ہوئی باتوں یا اپنے بزرگوں کے سُنے ہوئے مسئلوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس کو بے فائدہ اور لغو جانتے ہیں۔ تو اُسی سے اُن کو یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ سب احکام خدا کے ایسے نہیں ہیں ورنہ اگر وہ آنکھ کھولکر دیکھیں اور تعصب کے پردہ کو اپنی بصیرت قلبی سے اٹھاویں اور اپنے مسئلوں اور خدا کے حکموں کو جدا کرکے اس کی حقیقت کے دریافت کرنے پر متوجہ ہوں تب ان کو اس کی ماہیت معلوم ہوجاوے ؛

اکثر متعصب اپنے تعصب پر قائم رہنے کے لئے یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے دین مذہب کا مدار تعصب پر ہے اگر تعصب کو ہم برا جانیں تو ہم ملحد اور لامذہب ہوجاویں اور اپنے عقائد دینی میں شک کرنے لگیں۔ اگر تعصب منع ہوتا تو اصحاب رسول کیوں اپنے دین میں سخت ہوتے اُن کا یہ کہنا تعصب و دینداری میں اور یقین اور شک میں ما بہ الامتیاز نہ سمجھنے سے ہے اس لئے ہم انکی حقیقت بیان کرتے ہیں ؛

جو تصور اور خیال دل میں آئے خواہ وہ خود اُس کے دل میں پیدا ہوا ہو خواہ وہ کسی سے سُنا ہو اُس کی تین حالتیں ہیں ؛

اوّل یہ کہ اُس کی صحت اور غلطی دل میں ایک سی ہو۔ نہ اُس کی تصدیق کو غلبہ نہ تکذیب کو رجحان ہووے تو اُس حالت کا نام شک ہے ؛

دوسرے یہ کہ اُس کی صحت اور غلطی میں سے کسی کا دل پر غلبہ ہوئے اور ایک کو دوسرے پر رجحان ہوئے لیکن اسکی ضد و نقیض کے امکان سے انکار نہ ہو اس حالت کو ظن کہتے ہیں ٭

تیسرے یہ کہ اسکی صحت اور غلطی میں سے کسی جانب کو دل پر ایسا غلبہ ہوئے کہ اُس کی ضد اور نقیض کے امکان سے بھی انکار ہو۔ اس حالت کو یقین کہتے ہیں ٭

پھر یقین کی دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اگرچہ اُس کے خلاف کو دل قبول نہ کرے لیکن اس کا یقین کسی اصل صحیح پر مبنی نہ ہو بلکہ وہ اسباب جس نے اس کے دل میں اس تصور اور خیال کو مضبوط کر دیا ہے اور اُس کو صحیح ٹھہرا دیا ہے غلط ہوں ٭

دوسرے یہ کہ وہ یقین کسی اصل صحیح پر مبنی ہوا اور وہ امور جس نے اسکی صحت پر دل کو قوی کر دیا ہے وہ بالکل صحیح اور سچے ہوں ٭

پس جو خیالات دینی کسی شخص کے دل میں پیدا ہوں اگر وہ اول قسم کے ہیں یعنی وہ شخص نہ اُن کی تصدیق کرے نہ تکذیب تو اُس پر اطلاق اعتقاد کا نہ ہوگا نہ وہ خیال کرنے والا خود اپنے آپ کو اُس کا معتقد جانے گا۔ اور اگر وہ دوسری قسم کے ہیں یعنی گو اُس کو انکی صحت پر گمان غالب ہوئے مگر اُس کے خلاف کے ہونے سے منکر نہ ہوئے تو اُس کا اعتقاد ظنی کہلایا جاویگا اور اگر وہ تیسری قسم کے ہیں یعنی ان خیالات کے صحیح ہونے پر وہ دل سے یقین رکھے مگر اسکی بنا اصول صحیحہ پر نہ ہو تو اُس کا اعتقاد تو پکا اور مضبوط کہلایا جاوے گا لیکن غلط اور غیر صحیح۔ اور چوتھی قسم وہ ہے کہ ان خیالات کی بناء اصول صحیحہ پر ہو تو اُس کے اعتقاد کو مضبوط اور کامل بھی کہیں گے اور صحیح اور درست بھی ٭

پس تعصب اس حالت کا نام ہے جو تیسری قسم میں مذکور ہے یعنی ان خیالات کی صحت پر یقین ہونا جس کی بناء غلط اصول پر ہے۔ اور دینداری اُس حالت کو کہتے ہیں جس کا ذکر چوتھی قسم میں ہوا یعنی ان خیالات کی صحت پر یقین ہونا جس کی بناء صحیح اصول پر ہے ٭

متعصب اپنے خیالات کی صحت پر گو یقین رکھتا ہے مگر اُس کا یقین مثل ایک دیندار کے یقین کے نہیں ہوتا اس لئے کہ متعصب کے خیالات کی بنا صحیح نہیں ہوتی اس لئے ممکن ہے کہ کبھی وہ اپنے خیالات کی بناء کے غلط ہو جانے پر آگاہ ہو جاوے اور تب اپنے خیالات کے غلط ہونے پر متنبہ ہوئے اور دیندار کے خیالات کی بنا ہمیشہ ان مضبوط اور صحیح دلیلوں پر ہوتی ہے جن میں احتمال بھی غلطی کا نہیں ہوتا اور شک و ظن کا اُس میں دخل نہیں ہوتا اس لئے کبھی وہ اپنے یقین سے پھر نہیں سکتا ٭

متعصب جس طرح پر اول اپنی سمجھ کی غلطی سے اپنے خیالات کو غلط اصول پر قائم کر لیتا ہے اس طرح پر اخیر تک اُسی غلطی میں گرفتار رہتا ہے یعنی وہ کبھی اپنے خیالات پر غور اور تامل نہیں کرتا جو لوگ

اُس کی غلطی بیان کرنے میں اُن کے سُننے کا تحمل نہیں ہوتا اپنے مخالفوں کی آواز مخالفت اپنے کان میں آنے نہیں دیتا اور اسی سبب سے اُسکو کبھی موقع اُس غلطی سے نکلنے اور اس بلا سے چھوٹنے کا نہیں ملتا بخلاف ایک دیندار کے کہ وہ اول ہی اپنے خیالات کی بنا صحیح اصول پر قائم کرتا ہے اور اخیر تک اُس پر عمل کرتا ہے جو کوئی اُس کے مخالف بات کہتا ہے اُس کو سُنتا ہے اور سوچتا ہے جو کوئی اُس کے یقین میں شکوک پیدا کریں اور اُس کی غلطی بیان کریں وہ اُن سے نفرت نہیں کرتا بلکہ ان کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور تامل کرتا ہے اور جبکہ ان شکوک اور اعتراضات کو بالکل غلط پاتا ہے تو وہ اپنے یقین کی صحت پر اور بھی زیادہ خوش ہوتا ہے اور ان غلط خیال کرنے والوں کو ذریعہ اپنے یقین کے اصول پر مطلع کرنے کا پیدا کرتا ہے ؞

پس جو لوگ تعصب اور دینداری میں فرق نہیں کرتے اور اپنے تعصب کو دین سمجھتے ہیں اور اپنی حالت کو ظاہری حالت سے صحابہ کی ملاتے ہیں یہ غلطی اُن کی ناواقفیت اور جہالت کی ہے وہ بے شک اپنی جھوٹی دینداری پر مضبوط ہونے میں صحابہ کی سچی صلابت فی الدین سے مشابہت پیدا کرتے ہوں مگر وہ مشابہت جھوٹے موتی کی سچے موتی سے ہے کہ جو صرف صورت ظاہری میں ہے نہ حقیقت باطنی میں ؞

تعصب ایک ایسی بُری خصلت ہے کہ جس سے صرف متعصب ہی کی ذات کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اُس کا بد اثر دوسروں کی طبیعت پر پہنچتا ہے اور سادی سچی طبیعتوں کو بھی بگاڑتا ہے تعصب ایک زہر آمیز چیز ہے کہ وہ اچھے صاف میدے کو بھی تھوڑی ہی دیر میں اپنا سا کر لیتا ہے اور اُس شئے کو جو باعث زندگی انسان ہے اس کی موت کا سبب کر دیتا ہے دین و مذہب انسان کی اُس روحانی زندگی اور چین کا ذریعہ ہے جو بعد اس جسمانی حیات کے ملنے والی ہے اور تعصب اسی زندگی کا مٹانے والا ہے اور اسی چین کا کھو دینے والا ہے ؞

اس لئے کہ اُس نے باطل کو حق اور غلط کو صحیح سمجھ رکھا ہے اس کی سختی اور درشتی کسی مخالف کو موقع ان باتوں کے ظاہر کرنے کا نہیں دیتی جو ان کے دلوں میں ہے اور جس کے ظاہر ہونے سے اگر وہ غلط ہیں ان کی اصلاح ممکن ہے متعصب کی یہ حالت دیکھ کر اُس کا مخالف بھی متعصب ہو جاتا ہے اور وہ بھی اپنے خیالات کو صحیح سمجھ کر ان کی حقیقت کا اعتقاد کرنے لگتا ہے چنانچہ تعصب ہی تمام مذاہب باطلہ کی بنا اور تمام عقائد فاسدہ کی جڑ ہے اور ایک جہان اسی مرض میں مبتلا اور اسی بیماری میں گرفتار ہے اسی لئے خدا نے اور شارع نے اور تمام دیندار عالموں اور دانشمند حکیموں نے اس کی بُرائی بیان کی ہے ؞

دین کی تحریف

ابتدائے پیدائش آدم علیہ السلام سے شیوع اسلام تک جتنے دین جاری ہوئے اور جتنی شریعتیں قائم ہوئیں اور جن کا علم ہم کو ہے اُن کی نسبت یہ سمجھنا کہ ہر ایک دین اور ہر ایک شریعت ایک زمانہ معین تک جاری اور قائم رہی اور جب اُس میں تحریف نے راہ پائی اور اس دین کے قبول کرنے والوں نے اس کو اپنی اصلی حالت پر نہ رکھا تب خدا نے بذریعہ دوسرے پیغمبر کے دوسری شریعت قائم کی بہت آسان ہے لیکن اُن اسباب کا سوچنا جن سے دین میں تحریف ہوئی اور ان وجوہ کو سمجھنا جن سے شریعت اپنی اصلی حالت پر نہ رہی نہایت ہی مشکل ہے اور ان سب باتوں سے واقف ہو جانا انسان کی قدرت سے باہر ہے اسی واسطے بہت ہی تھوڑے لوگ گذرے ہیں جنہوں نے اس طرف توجہ کی ہو یا ان وجہوں اور علتوں کو لکھا ہو بلکہ بعضوں نے تو ایسے اسرار اور حکمتوں میں غور کرنے ہی کو برا جانا ہے اور بعضوں نے اُس کو قدرتِ بشری سے خارج سمجھ کر لغو محض تصور کیا ہے اور بعضوں نے پچھلے بزرگوں کو ایسی باتوں پر متوجہ نہ دیکھ کر اُس کو بدعت خیال کیا ہے لیکن حقیقت میں نہ اُن باتوں پر غور کرنا برا ہے اور نہ لغو اور عبث ہے اور نہ بدعت ہے بلکہ وہ چیز جس سے حکیم مطلق کی کامل حکمت کا دل پر یقین ہوئے اور خدا کے احکام کے معلل بالمصالح ہونے پر اعتقاد ہووے وہ یہی ہے کہ اُس کے احکام اور افعال پر جہاں تک انسان کی طاقت ہو غور کرے اور اس کے اسرار اور وجوہ کو سوچے اسلیئے ہم اپنے مذہب کے ایک بڑے نامی محقق کے کلام سے اس مضمون کو کہ ادیان سابقہ اور شرائع گذشتہ میں کیونکر تحریف ہوئی اور کس ضرورت سے بجائے اس کے دوسری شریعت قائم ہوئی اخذ کر کے لکھتے ہیں:۔

جب ہم کسی دین اور کسی مذہب پر خیال اور اس کی ترقی اور تنزل اور زوال کے تاریخی حال پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جب کسی پیغمبر کے ذریعہ سے خدا نے کوئی دین اور مذہب جاری کیا اور لوگوں کو اس کا تابع بنایا تو وہ طبقہ جو خاص اُس پیغمبر سے تعلیم پاتا ہے اور جو اپنے کانوں سے اس کی باتیں سنتا ہے اور اپنے دل میں بے واسطہ اور بغیر علاقہ دوسرے کے اس کے احکام اور مسائل کو جگہ دیتا ہے تو وہ ہر طرح پر اشاعت دین میں ساعی ہوتا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ٹھیک ٹھیک اپنے نبی کے قدم پر چلتا ہے اور یہ پہلا طبقہ ہر برائی سے پاک اور ہر عیب سے صاف ہوتا ہے اس طبقہ کے تھوڑے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو عادت اور سیرت میں اپنے نبی سے مشابہت اور اخلاق اور اعمال میں اپنے پیغمبر سے مناسبت نہ ہو بعد اس کے دوسرے طبقہ کا زمانہ آتا ہے جنہوں نے نہ اپنی آنکھوں سے پیغمبر کو دیکھا نہ اپنے کانوں سے اُس کی وعظ و نصیحت کو

سُنا نہ بلا واسطہ خود انکو تعلیم اُس پیغمبر کی نصیب ہوئی بلکہ طبقہ اولیٰ کو انہوں نے دیکھا اور اُن کی باتوں کو سُنا اور اُن سے دین میں تعلیم پائی تو اگرچہ یہ کل طبقہ دین میں کامل اور مذہب میں مضبوط ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ پہلا طبقہ تھا لیکن تب بھی بسبب اس کے کہ صرف ایک ہی واسطہ بیچ میں ہوتا ہے اور طبقہ اولیٰ کی تعلیم اور ہدایت میں بھی ایک کامل تاثیر ہوتی ہے اس لئے یہ دوسرا طبقہ بھی اچھی حالت پر رہتا ہے لیکن جس قدر نئے لوگ بڑھتے گئے اور امت کثرت سے ہوتی گئی اور اغراض اور خواہشیں دنیاوی پیدا ہونے لگیں اور امتداد مدت اور اختلاف طبائع سے اتفاق میں خلل پڑنے لگا اُتنا ہی وہ مذہبی جوش اور دینی ولولہ جو سب کو ایک ہی ذات پر یعنی اشاعت دین پر متوجہ رکھتا ہے کم ہونے لگتا ہے اور دلوں کی وہ پاکی اور نیتوں کی وہ صفائی جو طبقہ اولیٰ کے اکثر افراد میں ہوتی ہے وہ اس طبقہ ثانیہ کے تھوڑے ہی شخصوں میں پائی جاتی ہے ۔

بعد اس کے جو زمانہ آتا جاتا ہے اور جس میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے خود نہ بانئ مذہب کو نہ اُس کے دیکھنے والوں کو دیکھا اور نہ اپنی سعی اور اپنے شوق سے اُس دین و مذہب کو اختیار کیا بلکہ اپنے باپ دادا کی میراث میں جہاں اور چیزیں پائیں منجملہ ان کے دین و مذہب کو بھی پایا اور ان کے اور صاحب شریعت اور بانئ مذہب کے بیچ میں واسطے اور علاقے بھی بہت ہو گئے تو سوائے تھوڑے آدمیوں کے اکثر تو ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ اس دین اور مذہب کی خود قدر نہیں جانتے اور سوائے حمیت نسبی کے اصلی دینی حمیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اُن کے دل اصلی روشنی سے اور ان کے سینے حقیقی نور سے مذہب کے خالی ہوتے ہیں اور ان پر مضمون خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشہوات کا ٹھیک ٹھیک بلا کم و کاست صادق ہوتا ہے ۔ اس طبقہ میں بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں کہ اُس دین اور مذہب کو جس کے وہ پابند ہیں تحقیق کر کے اور سمجھ بوجھ کر اختیار کرتے ہوں بلکہ اپنے باپ دادا کا طریقہ سمجھ کر اُس کی حقیقت کے معتقد ہوتے ہیں اور بجائے تحقیق اور تلاش کے بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا پر قانع ہوتے ہیں اور جس طرح طبقہ اولیٰ کے ایمان والے اصلی اور سچی باتوں پر دین کی مضبوطی سے اعتقاد رکھتے اور عمل کرنے پر دیندار کہلاتے اور قابل تعریف سمجھے جاتے ہیں اُسی طرح اس طبقہ کے لوگ میراثی اور جھوٹی باتوں پر تقلید کے سبب یقین رکھتے اور اُس کی پابندی کرنے پر متعصب اور جاہل اور لائق مذمت تصور کئے جاتے ہیں اور جس قدر نبوت کا زمانہ دور ہوتا جاتا ہے اُسی قدر دین و مذہب میں پیغمبر سے علاقہ چھوٹتا اور اوروں کا واسطہ بڑھتا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ جتنا زمانہ گذرتا گیا اور غرضیں بڑھتی گئیں اور خواہشیں زیادہ ہوتی گئیں اور طبیعتوں میں خود پسندی اور نفسانیت کا غلبہ ہوتا گیا اُسی قدر ہر شخص موافق اپنی حالت اور ضرورت اور حاجت اور خواہش کے

اُس دین میں تحریف اور تبدیل کرنے لگتا ہے اور خدا کے کلام اور نبی کے اقوال کو اپنی خواہشوں کا عرضہ بنا لیتا ہے اُس کے لفظوں اور عبادت کو بدلنا یا اپنی طرف سے بنا کر اس کی طرف منسوب کر دینا اگر ممکن ہوا تو اُس میں بھی دریغ نہیں ہوتا ورنہ اُس کے معنی اور مطلب کو اپنی سمجھ اور اپنی غرض کے مطابق پھیر دینے میں تو کچھ تامل نہیں ہوتا اور جب تک یعنی جتنے عرصہ تک خدا کو اپنے نزدیک اُس دین کا قائم رکھنا منظور ہوتا ہے تب تک ایسے تغیر اور تحریف سے کم و بیش خدا اپنے علم اور ارادہ کے موافق بچاتا ہے اور اخیر پر تو اس تحریف اور تغیر سے اس دین کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اپنی اصلی حالت پر کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اگر کوئی اس کے اوّل حال سے آخر حال کو ملاوے تو زمین و آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے پیغمبر کی کتاب جس پر مذہب کا دارمدار ہے وہ تو برائے نام قسم کھانے کے لئے اور عزت سے طاق میں رکھنے کے لئے ہوتی ہے کوئی اس سے اپنے دینی عقائد اور مذہبی مسائل کو نہیں ملاتا۔ اپنے بزرگوں یا اپنے پیروں کے اقوال اور افعال کو مستند سمجھ کر اپنے مذہبی سلسلہ کو اسی پر ختم کر دیتے ہیں اور انہیں کو معصوم اور مثل نبی کے سمجھ کر اپنا پیشوا اور ہادی اور شفیع اور نجات دہندہ سمجھنے لگتے ہیں جب طبقۂ اولے کا زمانہ ہوتا ہے اُس وقت رسم اور رواج پر عمل کرنے کا کچھ ذکر نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ اس کے جانی دشمن ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنی پرانی رسموں اور خاندانی چال چلن کو صرف پیغمبر کی ہدایت سے چھوڑ کر اُس کے دین میں آتے ہیں اور ان کے بھائی بند یار دوست رسموں ہی کے چھوڑنے پر اُن کو برادری سے خارج کر دیتے ہیں اور ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ وہی طبقہ جس نے ایک خدا کے خوف سے رسموں کو چھوڑا اور اپنے بھائیوں سے علاقہ نہ رکھا اور صرف اپنی نجات کی امید پر پیغمبر کا تابع ہوا ہو وہ خود رسموں پر عمل کریگا یا اُس طبقہ میں سوائے خدا اور رسولؐ کے حکم کے کسی دوسری بات کو دخل ہوگا لیکن جتنا زمانہ گذرتا جاویگا اُتنی ہی آمیزش اور چیزوں کی ہوتی جاوے گی کچھ باتیں دنیا کی دین میں داخل ہو جاوینگی کچھ چیزیں غیر قوموں کی اُس میں خلط ملط ہو جاویں گی اور اس سب مجموعہ پر دین کا اطلاق ہوگا اور چونکہ ظاہر ہے کہ جب دین میراثی اور آبائی ہوگا تو دل میں وہ دینی ولولہ جو کہ پہلے طبقہ کو ہوتا ہے نہ رہیگا اور وہ مذہبی جوش جو خاص پیغمبر سے تعلیم پانے والوں کو ہوتا ہے ٹھنڈا پڑ جاویگا تو پھر ایسی حالت میں ہر شخص جس کو خدا نے عقل سلیم دی ہے سمجھ سکتا ہے کہ لامحالہ رسم و رواج ہی پر مدار مذہب کا آ رہیگا اور قومی چال چلن اور خاندانی طریقہ ہی دین سمجھا جاوے گا چنانچہ جتنے پہلے دین گذر گئے اُن سب کا یہی حال ہوا کہ لوگوں نے پیغمبر کی کتاب کو چھوڑ دیا اور رسم و رواج پر مدار مذہب کا ٹھہرا لیا اور انا وجدنا علیہ آباءنا اور بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا کہہ کر

تحقیق سے ہاتھ اٹھا لیا عقیدہ اسی کو سمجھنے لگے جو آباؤ اجداد سے سنا عمل اسی پر کرنے لگے جو بھائی بندوں کو کرتا ہوا دیکھا۔ خاندانی طریق پر چلنے کو سنت اور اس کو چھوڑ کر اصلی دین کی باتوں کی تحقیق کرنے کو بدعت کہنے لگے ۔

چنانچہ جب کل یا اکثر آدمی کسی دین و مذہب کے ایسے ہو گئے اور انہوں نے دین میں ایسی تحریف اور تغیر کر دی تو جو خوبی اس مذہب کی تھی وہ جاتی رہی اور غفلت اور پابندی رسم و رواج اور تقلید آباؤ اجداد کی بدولت اس دین کی اصلی حالت باقی نہ رہی تب خدا نے اس کی اصلاح کرنے کیلئے دوسرا پیغمبر مبعوث کیا جس نے ان خرابیوں کو دور کیا اور جو تحریف و تغیر اس دین کے لوگوں نے اپنی غفلت اور تقلید کے سبب کی تھی اس کو ظاہر کیا اور رسم و رواج پر چلنے والوں کو متنبہ اور باپ دادا کے چال چلن پرستا پڑنے والوں کو ہوشیار کیا اور لوگوں کو غفلت سے نکالا اور ان سے تقلید کو چھڑایا لیکن غفلت اور تقلید ایسی بری اور اپنی برائی میں ایسی کامل ہے کہ تمام انبیا کو اپنی نبوت کے زمانہ میں لوگوں کے دلوں سے رسم و رواج کی پابندی کے مستحکم زنجیر اور غفلت اور تقلید کی مضبوط قید کے توڑنے سے زیادہ کوئی مصیبت اور دقت نہیں ہوئی ۔

کیسی ہی محبت سے اپنی قوم کو سمجھایا اور کیسے نرم اور ملائم لفظوں سے ان کو نصیحت کی اور ان کے دلوں کی صفائی کرنی چاہی لیکن اس قوم کے کانوں کو کوئی اور سخت اور ہولناک اور عجیب آواز ایسی معلوم نہ ہوتی تھی جیسی کہ نبی کے پاک منہ سے رسم و رواج کی برائی کی آواز اور ان کے پتھر سے زیادہ سخت دلوں پر کسی اور چیز کا اتنا سخت صدمہ نہ ہوتا تھا جتنا کہ اپنے باپ دادا کے چال چلن چھوڑنے کا۔ اسی کمبخت رسم و رواج کی پابندی نے ان کو ایمان سے محروم رکھا اور جان بوجھ کر انہوں نے اپنے آپ کو دوزخ کا کندہ بنایا۔ اخترت النار علی العار کہتے لیکن اپنے پرانے طریقوں کے چھوڑنے پر جرأت نہ کر سکتے اور اپنی گردنوں کو تقلید کی رسی سے باہر نہ نکالتے حقیقت میں اگر رسم و رواج کی پابندی کو ایسا کامل اثر نہ ہوتا اور اس کا چھوڑنا دوزخ میں جانے سے زیادہ سخت نہ ہوتا تو کبھی کسی پیغمبر کو ہدایت کرنے میں کچھ تکلیف نہ ہوتی بلکہ اتنے پیغمبروں کی بعثت کی حاجت ہی نہ ہوتی ایک لاکھ اسی ہزار یا جس قدر پیغمبر آئے اور جو کچھ انہوں نے مصیبتیں اور تکلیفیں پائیں وہ اسی رسم و رواج کی بدولت ۔

تمام اولو العزم پیغمبروں کے حالات پر غور کرنے سے ہمارے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے اس لئے کہ جب ہم کسی پیغمبر کی کتاب کو دیکھتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو نبی آیا اس نے اول پچھلے دین کی اصلاح کی اور جو تحریف اور تغیر لوگوں نے اس دین میں کی تھی اسے بیان کیا اور جس قدر باتیں رسم و رواج کی لوگوں نے دین میں شامل کر دی تھیں ان کو علحدہ کیا بعدہ ان جدید

احکام کو جو خدا نے اس وقت کے مناسب دیکھے جاری کیا پس بڑا سبب دین اور مذہب کے زوال کا حقیقت میں غفلت اور تقلید ہی ہوتی ہے ۞

یہ کیفیت جو دین میں خلل آنے اور مذہب کے خراب ہونے کی ہم نے بیان کی یہ ایسی کھلی ہوئی اور صاف ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا اور جو کوئی دین کی کتاب اٹھا کر دیکھے وہ اس کی تصدیق کر سکتا ہے لیکن وہ بہت سے سبب جن سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن کو دین کے خلل اور مذہب کے زوال کا مادہ کہنا چاہیئے وہ ایسی ور اتنی ہیں کہ ہر شخص ان کو سمجھ سکتا اسلئے اب ہم ان کو بیان کرتے ہیں[1] ۞

پہلا سبب بانئے ملت اور صاحب شریعت کے اعمال اور اقوال سے چشم پوشی کرنا اور اپنے عقائد اور اعمال میں اس کے عقائد اور اعمال سے مخالفت کرنا ۞

دوسرا سبب اغراض فاسدہ کا پیش آنا اور ان کے حاصل کرنے کے لئے اصل بانئے مذہب کے کلام میں تاویل باطل کرنا ۞

تیسرا سبب تعمق یعنی تکلف بے جا کرنا کوئی شخص شارع کی کسی امر و نہی کی علت پر غور کرے اور بعض وجوہ کو اس کے کسی دوسرے شئے پر اپنے نزدیک مطابق کر کے اپنی طرف سے مثل شارع کے اس شئے کی امر و نہی کا حکم قائم کرے یا نبی کے تمام اعمال اور افعال کو عبادت سمجھ کر جو کچھ انہوں نے عادۃً بھی کیا ہو اس کو بھی فرائض و واجبات میں داخل کرے ۞

چوتھا سبب تشدد یعنی ان عبادات شاقہ کا اختیار کرنا جس کا شارع نے حکم نہ کیا ہو یا سنن اور آداب کا مثل فرائض و واجبات کے التزام کرنا اور یہی وہ بیماری ہے جس میں یہود اور نصاریٰ گرفتار ہو گئے تھے اور جن کو رہبان کہتے تھے ۞

پانچواں سبب اجماع کا اتباع کرنا یعنی اگر کسی بات پر بہت سے عالم اور مولوی متفق ہو جاویں انکے اتفاق ہی کو اس امر کے ثبوت کی دلیل قاطع سمجھنا ۞

یہ بات یاد رہے کہ اجماع کی دو صورتیں ہیں ایک وہ اجماع جس کا مستند کتاب و سنت ہو یہ اجماع واجب الاتباع ہے دوسرا وہ اجماع کہ جس کا مستند کتاب و سنت نہ ہو بلکہ رسم و رواج نے بہت لوگوں کو ایک بات پر جمع کر دیا ہو۔ اس اجماع سے مخالفت کرنا بعض حالات میں واجب اور بعض صورتوں میں جائز ہے اور وہ اجماع جس کی برائی جا بجا خدا نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے اور جس کے اتباع سے لوگوں نے دین اسلام کو قبول نہیں کیا اور جس کے التزام کو بل نتبع ما الفینا علیہ اٰباءنا کہکر اپنے اوپر واجب جانا یہی دوسری قسم کا اجماع تھا ہندوستان

[1] یہ اسباب شاہ ولی اللہ صاحب محدث نے حجۃ البالغہ میں لکھے ہیں ۞

میں ہمارے ہم مذہب اجماع کی ان دونوں قسموں میں کچھ فرق نہیں کرتے اور بلا تمیز ایک کا اطلاق دوسرے پر کرتے ہیں اپنے بزرگوں کی رسموں اور اپنی خاندانی عادتوں کو جن کے وے پابند ہورہے ہیں اجماع کی دلیل سے واجب العمل جانتے ہیں اور ان باتوں کو جو صریح کتاب و سنت کے ہیں مخالفت اجماع کے ڈر سے ترک نہیں کرتے ⁂

چھٹا سبب غیر معصوم کی تقلید کرنا یعنی کسی مجتہد کی یہ سمجھ کر کہ تمام مسائل میں اس کا اجتہاد صحیح اور درست ہے اور جو کچھ اس نے کتاب و سنت سے استنباط کیا ہے وہ خطا اور غلطی سے محفوظ ہے ایسی تقلید کرنا کہ اگر کسی مسئلہ میں جس کا اس نے استخراج کیا ہو اسکی غلطی ثابت ہو اور کوئی حدیث صحیح صریح مخالف اسکے موجود ہو اس حدیث کو چھوڑ کر اس کے اجتہاد پر عمل کرنا ⁂

یہ تقلید وہ نہیں ہے جس پر اُمت کا اجماع ہے یعنی اکثر علما نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ مجتہدین کی تقلید جائز ہے اور اُنکے استخراجی مسائل پر عمل کرنا درست ہے بلکہ اکثر حالات میں نہایت مفید اور بعض صورتوں میں نہایت ضرور ہے مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ سمجھنا کہ مجتہد اپنے اجتہاد میں خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ دوسرے منصوصات نبوی پر اس کو مقدم نہ کرنا یعنی اگر کسی مسئلہ میں حدیث صحیح مخالف اس مجتہد کے اجتہاد کے مل جاوے تو حدیث کا اتباع کرنا اور تقلید کا ترک کر دینا ⁂

بغیر ان شرائط کے غیر معصوم کی تقلید کرنا نہایت ہی نقصان دین کا سبب ہے اور اگلے اہل کتاب ایسی ہی تقلید کرتے تھے جس کی بُرائی خدا نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے حیث قال تبارک وتعالیٰ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ یعنی اہل کتاب نے اپنے عالموں اور پیروں کو اپنا رب ٹھہرا لیا ہے اور خدا کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ کوئی اہل کتاب اپنے عالموں اور پیروں کی عبادت نہ کرتا تھا مگر ان کو ایسا معصوم سمجھ لیا تھا کہ جس کو وہ حلال کر دیتے تھے اسی کو حلال جانتے تھے جس کو وہ حرام کر دیتے تھے اسی کی حرمت کے معتقد ہو جاتے تھے اور اپنے نبی کے اقوال اور احکام پر بمقابلہ اُنکے قولوں اور حکموں کے عمل نہ کرتے تھے ⁂

ساتواں سبب ایک مذہب کا دوسرے میں خلط کرنا یعنی کسی دوسرے دین کی باتوں کو لے کر کسی ضعیف وجہ یا موضوع سند سے اس کا جواز ثابت کر کے اپنے مذہب میں اس طرح داخل کر دینا کہ پھر کچھ تمیز نہ رہے کہ یہ باتیں کس مذہب کی ہیں بلکہ وہ باتیں اسلام ہی کی معلوم ہوں جیسے بنی اسرائیل کے علوم اور یونان کی حکمت وغیرہ کو مسلمانوں نے اپنے دین و مذہب میں داخل کر لیا ہے اور اپنی تفسیروں اور کلام کی کتابوں کو انہیں روایات اور مسائل سے بھر دیا ہے ⁂

ل اس کے متعلق اگلے مضمون میں دلائل و تشریح دیکھنی چاہئیں۔ (محمد)

یہ اسباب دین میں نقصان اور خلل پیدا کرنے کے جو ہم نے بیان کئے ہیں وہ ہیں جنہوں نے پرانے دینوں کو خراب کر دیا تھا اور جن کے سبب سے بہت سے اولوالعزم پیغمبر یکے بعد دیگرے بھیجے گئے قطع نظر ملت حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی ملت کے جس کا اب کوئی فرقہ بالتخصیص پابند نہیں ہے دین موسوی کو انہیں باتوں نے بگاڑا اور انہیں باتوں سے احبار یہود نے اپنی کتاب میں تحریف کی اور اپنے دین کو تغیر اور تبدیل کر دیا اور دین عیسوی میں بھی انہیں وجوہ سے نقصان آیا اور رہبانوں نے انہیں باتوں سے اپنے کو اصلی حالت پر نہ رہنے دیا۔ اب اگر کوئی پوچھے کہ کیا ایسی تحریف اسلام میں بھی ہوئی ہے تو اُسے خود اسلام کی حالت پر غور کرنا چاہیے کہ جو نور ایمان کا طبقہ اوّل کے ہر شخص کی پیشانی پر چمکتا تھا وہ نور دوسرے طبقہ میں نہ رہا لیکن اس کا عکس دوسرے طبقہ کے اکثر آدمیوں کے دل پر پڑا اور اُس طبقہ کے اکثر آدمیوں نے اپنے عقائد اور اعمال کو صحابہ کے مطابق رکھا۔ اُس کے بعد تیسرے طبقہ میں بھی کچھ کچھ رونق اسلام کی رہی بلکہ بعض شخصوں نے اسلام کے قائم رہنے کے لیے احادیث کے جمع کرنے اور اقوال رسول کے اکٹھا کر دینے سے سب پیغمبر صاحب کے اس قول کی کہ یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا تصدیق کرا دی مگر بعد اُس کے جس قدر زمانے آتے گئے اُن میں فساد ہی بڑھتا گیا اور جدال اور جہل کا زور ہی ہوتا گیا مگر جس طرح پر خدائے جل شانہٗ نے حضرت موسیٰؑ کے دین کو رسولوں اور پیغمبروں کو اُن کے بعد بھیج کر ایک عرصہ تک قائم رکھا اسی طرح پر دین محمدی کو علمائے ربانی کے پیدا کر دینے سے تحریف سے بچایا یعنی جب کبھی لوگوں نے کچھ تحریفیں کیں اور کچھ نقص پیدا کیا خدا نے کسی نہ کسی عالم کو جس کے حق میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل صادق ہے کھڑا کر دیا اور اُس نے محرفین کی تحریفات اور جہلا کی جہالتوں کو ظاہر کیا اور اصل راستہ شریعت اور دین محمدیؐ کا کھول دیا۔

اس بات کا بیان کرنا کہ وہ تحریفات کیا ہیں جو اسلام میں لوگوں نے کیں ہم نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور اس مضمون کو بطور مقدمہ کے لکھتے ہیں آئندہ اُس کی تصریحات کریں گے شاید خدا ہم کو اور ہمارے زمانہ کے لوگوں کو توفیق دے اور سنت کی سیدھی راہ پر چلا دے۔
وما توفیقی الا باللہ۔

تقلید اور عمل بالحدیث

تھوڑے دن ہوئے کہ میں نے اپنے مذہب کے ایک بڑے محقق کے کلام سے اخذ کر کے ایک مضمون دین میں تحریف ہونے کا لکھا تھا اور وہ ایک پرچہ میں تہذیب الاخلاق کے چھپا ہے اُس میں جہاں ذکر تقلید کا تھا وہاں میں نے وعدہ کیا تھا کہ اُس کو آئندہ بہ تفصیل لکھونگا چنانچہ اب اس کو لکھتا ہوں ۔

اس مضمون میں سات تذکرے ہیں

اوّل۔ مذاہب اربعہ کے جاری ہونے سے پہلے زمانہ کا حال ہے ۔

دوسرے۔ مذاہب اربعہ کی بنیاد پڑنے کا زمانہ اوراُس کا سبب ۔

تیسرے۔ ان چاروں مذہب کی پابندی کامل طرح سے کب ہوئی ۔

چوتھے۔ ان چاروں مذہبوں میں اختلاف ہونے کا باعث ۔

پانچویں۔ اجتہاد اور عمل بالحدیث میں کیا فرق ہے ۔

چھٹے۔ تقلید اور عمل بالحدیث پر مقلد اور غیر مقلد کا مباحثہ ۔

ساتویں۔ قول فیصل نسبت تقلید اور عمل بالحدیث کے ۔

مذاہب اربعہ کے جاری ہونے سے پہلے زمانہ کا حال

پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثناء کے عہد کرامت عہد میں جبکہ قرآن مجید کے مسائل شریعت اور احادیث اور احکام کے جمع کرنے کا کسی کتاب یا نسخہ میں رواج نہ تھا پس اُس وقت میں کسی نے کوئی حدیث کی کتاب لکھی نہ فقہی مسائل یا شرعی احکام کو کسی صحابی نے جمع کیا نہ کبھی علم کے اصول و قواعد اُس وقت مقرر ہوئے ۔ اُس زمانہ میں عمل کی یہ صورت تھی کہ صحابہ جیسا حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو کرتا ہوا دیکھتے ویسا ہی خود کرتے ارکان اور آداب اور تدقیقات فقہی پر کچھ توجہ نہ کرتے اور ان کی تعلیم کی یہ کیفیت تھی کہ جو کچھ سرور کائنات علیہ التحیات والصلوات فرماتے یا کسی معاملہ میں فتوے یا کسی سوال کا جواب دیتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سنتے اور یاد رکھتے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عادات اور مباحات اور نیز عبادات میں اکثر ایک ہی امر کے پابند نہ رہتے اور مثل فرائض کے ان کا التزام نہ رکھتے اور نیز ہر وقت

اور ہر حال میں سب صحابہ بھی خدمت میں برابر حاضر رہتے اس لئے جس نے جو حضرتؐ کو کرتے ہوئے دیکھا اُسے یاد کیا یا جو کچھ ارشاد فرماتے سُنا۔ اُس کی کوئی وجہ اور علت اپنے نزدیک سمجھ لی اور صرف اطمینان قلبی پر نہ استدلال کے طریقوں پر بھروسہ کر کے اُسے ذہن نشین کیا پس جو شخص صحابہ میں سے اُن باتوں کے یاد رکھنے اور اس پر غور کرنے کا زیادہ شائق تھا وہی ان میں زیادہ فقیہ ہوا یا جس نے پیغمبر خدا کی صحبت میں رہ کر ان باتوں کی زیادہ تعلیم پائی وہ بہ نسبت اوروں کے زیادہ واقف ہوا۔

جب آنحضرتؐ کا زمانہ گذرا اور صحابہ کا زمانہ آیا تب انہوں نے اپنی دیکھی سُنی ہوئی باتوں پر خود عمل کیا اور اگر کوئی بات جدید پیش آئی تو اوروں سے پوچھ لیا۔ اگر کسی بات میں کوئی حکم صریح کتاب و سنت سے نہ ملا تو منصوصات کتاب و سنت پر غور کیا اور اُس کی علت کو دریافت کر کے اسی پر پیش آئے ہوئے معاملہ کو قیاس کیا اور اگر کوئی مسئلہ مشکل ہوا تو اپنے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے اُس کو طے کر لیا۔

صحابہؓ کے زمانہ میں جو لوگ نئے پیدا ہوئے یا نئے ایمان لائے انہوں نے صحابہ سے اُسی طور پر علم دین حاصل کیا جس طرح پر صحابہؓ نے آنحضرتؐ سے سیکھا تھا یعنی جس نے جس صحابی کو پایا اور اُسے فقیہ جانا اس سے مسائل شریعت کو اخذ کیا اور احادیث نبوی کو سیکھا اور چونکہ بعد آنحضرتؐ کے صحابہؓ دور دور ملکوں میں پھیل گئے تھے اور بجائے ایک مکہ یا مدینہ کے سدہا کوس کے فاصلہ پر پھیل گئے تھے اور ایک دوسرے سے جدا ہو کر منتشر اور متفرق شہروں میں جا بسے تھے اس لئے اس زمانہ کے لوگوں نے اپنے ہی شہر اور اپنے ہی ملک کے بلکہ اپنے ہی محلہ کے رہنے والے صحابی سے امور دینی کی تحقیق کی اور انہیں سے احادیث نبویؐ اور مسائل شرعی کو سیکھا اور چونکہ اکثر اصحابؓ نبویؐ فقیہ تھے اور نامی گرامی اصحاب بھی بڑے بڑے شہروں میں موجود تھے اور ضروری مسائل بھی اُن کو یاد تھے اور جھگڑے قصے کی باتیں بھی اُس وقت تک شروع نہ تھیں۔ اور نئی نئی مذہبی باتیں اور جدید جدید مصطلحات کا بھی رواج نہ ہوا تھا اور علم بھی الفاظ غریبہ کی دقت اور اصطلاحات عجیبہ کی دہشت سے پاک تھا اور فقیہ ہونا بھی دلائل ظنی کے جاننے اور اصول قطعی سے واقف ہونے پر منحصر نہ تھا اس لئے اس زمانہ کے سیدھے سادے پاک اور نیک لوگوں کی روزمرہ کی کارروائی اور حاجت براری کے لئے ہر شہر میں ایک عالم موجود تھا اور بسبب نہ رائج ہونے مناظرہ اور مجادلہ اور کلام کے کوئی کسی پر کسی طرح کا الزام بھی نہ دیتا تھا اور بسبب صفائے طینت اور پاکئ نفس کے فضیلت اور نعمت کا بھی اظہار کسی کو منظور نہ تھا اس لئے تابعین میں سے جو لوگ عوام تھے وہ وقت پیش آنے ضرورت کے اپنے شہر کے نامی

مشہور صحابی سے سند پوچھ لیا کرتے اور جو کچھ وہ کہدیتے اُس پر عمل کرتے اور جو لوگ علم دین کے شائق تھے وہ اُنہیں سے علم دین کو تحصیل اور مسائل شریعت کی تحقیق کرتے پس جب کہ صحابہ کا زمانہ نہ رہا تو وہی لوگ اپنے اپنے شہر کے عالم اور محدث ہوگئے اور وہی مفتی اور فقیہ مشہور ہوئے ٭

بعد تابعین کے جو زمانہ تبع تابعین کا آیا اُنھوں نے بھی اسی طور سے اپنے شہر کے مشہور اور نامی فقیہ سے جو تابعین میں سے تھے تعلیم پائی اور فقہ حدیث کو سیکھا پس اُس وقت میں ہر شہر کا ایک علحدہ امام اور ہر مقام کا ایک خاص عالم اور فقیہ تھا جو لوگ اُس کی باتوں کو مانتے یا اُسکے فتووں پر عمل کرتے یا اُس کی سند سے احادیث کو روایت کرتے وہ اُسکی طرف منسوب ہوتے اور اس عالم کے مذہب پر چلنے والے کہلاتے ٭

تابعین کے وقت تک مذہب سے صرف لغوی معنی مراد لئے جاتے تھے نہ اصطلاحی معنی جو آجکل لوگوں کے ذہنوں میں ہیں اُس کی تخصیص بھی کسی فرقے اور گروہ پر نہ تھی بلکہ ہر شخص پر موافق اُس کی رائے اور طریقے کے اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا چنانچہ مذہب فلاں کذا بجائے قولہ یا عملہ کذا کے بولا جاتا اور جو عالم نامی گرامی ہوتا وہ فقیہ اور امام کہلایا جاتا بایں اعتبار اُس وقت میں مذہب بھی بہت سے تھے اور امام صاحب مذہب بھی بہت سے اُس وقت کے مذہبوں اور اماموں کا حال بعینہ اپنے زمانہ کے مولویوں اور اُن کے عقائد اور اعمال کے حال پر قیاس کرنا چاہیے کہ جس شہر میں مشہور مولوی ہے اُسی سے لوگ استفتا کرتے ہیں اُسی سے علم سیکھتے ہیں اُس کی باتوں پر عمل کرتے ہیں اور اُسی کے فتووں پر چلتے ہیں اور جس طرح پر آج کل ایک ملک کے لوگ ایک ہی شہر کے مولوی یا ایک ہی عالم کے پابند نہیں ہیں بلکہ اپنے اپنے شہر کے مولویوں کی راہ پر چلتے ہیں اسی طرح پر اُس زمانہ میں تمام عرب و عجم کے لوگ کسی ایک یا چند معین فقیہوں کے پابند نہ تھے بلکہ ہر شہر کے آدمی اپنے اپنے فقیہ اور مفتی اور محدث کے قول پر عمل کرتے اور اُس سے فتوے لیتے اور علم سیکھتے غرضیکہ جس طرح پر آج کل لکھنؤ کے مولوی الگ ہیں اور دہلی کے علحدہ اور جونپور کے جدے اسی طرح اُس وقت بھی مکّہ اور مدینہ اور بصرہ اور کوفہ کے فقیہوں کی صورت تھی چنانچہ اُس زمانہ میں مدینہ منورہ کے فقیہ اور صاحب مذہب سعید بن مسیب اور سالم بن عبداللہ بن عمر تھے۔ اور بعد اُنکے زہری اور قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن ہوئے اور مکّہ میں عطا ابن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی اور بصرہ میں حسن بصری اور یمن میں طاؤس بن کیسان اور شام میں مکحول امام اور مجتہد تھے۔ یہ صورت دوسری صدی کے اوسط تک یعنی ۱۴۳ھ ہجری تک قائم رہی اور لوگوں نے مسائل شریعت میں کسی شخص معین کی کامل پابندی نہ کی مگر بعد اس

کہ وہ زمانہ شروع ہوا جس میں ان مذاہب اربعہ کی بنیاد پڑی اور جس سے مذہب کے وہ اصطلاحی معنی قرار پائے جیسے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی بعض تالیفات میں لکھا ہے کہ "مذہب نام راہیست کہ بعض اُمتیاں را در فہم شریعت کشادہ شود و بعقل خود چند قاعدہ قرار دہد کہ موافق آں قواعد استنباط مسائل شرعیہ از ماخذ آں نمایند"۵۷۔

مذاہب اربعہ کی بنیاد پڑنے کا زمانہ اور اُس کے رائج ہونے کا سبب

تبع تابعین کے زمانہ میں حدیث وفقہ کی تعلیم وتعلّم کی صورت تو وہی تھی جو تابعین کی تھی لیکن اُس وقت میں بہ سبب کثرت مسلمانوں کے اور شروع ہونے جھگڑے اور فساد کے اور جاہل ہو جانے خلفائے وقت کے اور شائع ہونے جھوٹ اور افترا کے اور واقع ہونے اختلاف کے خدا نے لوگوں کو مسائل کے جمع کرنے اور اصول وقواعد کے منضبط کرنے اور ارکان اور آداب عبادات کی تشریح کرنے اور اجتہاد اور استنباط اور استخراج کے قاعدے ترتیب دینے پر راغب کیا اور اُس وقت کے نیک اور پاک لوگوں کو حدیث اور فقہ کی تدوین کا شوق دیا چنانچہ دوسری صدی کے اوسط سے جس شہر میں جو نامی فقیہ اور عالم تھا اس میں بعض بعض نے حدیث کی تالیف پر اور فقہ کی تدوین پر کمر باندھی اور مسائل کا جمع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ نے اور مدینہ میں امام مالکؒ اور محمد بن عبدالرحمٰن ابن ابی ذئب نے اور کوفہ میں ثوری نے اور بصرہ میں ربیع ابن صبیح نے اوّل اوّل حدیث میں تالیف اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک وغیرہ نے فقہ کی تدوین شروع کی۔

سب سے پہلے حنفی مذہب کی بنیاد پڑی اس لئے کہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو خدا نے اجتہاد اور استنباط مسائل اور استخراج فروعات کی ایک خاص قسم کی استعداد دی تھی اور وہ زہد اور ورع میں بھی کامل تھے پس انہوں نے اپنے شہر کے امام وفقیہ ابراہیم نخعی کی احادیث و اقوال اور روایات پر اپنے مذہب کی بنا قائم کی اور انہیں کے اصول پر استخراج کرنا جزئیات مسائل کا شروع کیا چنانچہ یہ امر بخوبی اُس شخص پر ظاہر ہے جس نے امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب الآثار اور جامع عبدالرزاق اور مصنف ابی بکر ابن شیبہ کو دیکھا ہے اور پھر ابراہیم نخعی کے اقوال کو امام ابوحنیفہ کے مذہب سے ملایا ہے۔

۵۷ تحفہ اثنا عشریہ۔

غرضکہ جب امام ابو حنیفہؒ نے اس طور پر فقہ کی تدوین شروع کی تب لوگوں نے اُن کی طرف رغبت کی اور اُن کے اصول فروع کو پسند کر کے اُسے سیکھا اور فقہائے کوفہ نے انکے اجتہاد کو قبول اور ان کے استخراجی مسائل پر عمل کیا اور جب قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما سے دو شاگرد انکے ہوگئے تب پہلے شاگرد کی عمارت و قضا کے سبب سے اور دوسرے شاگرد کے علم اور تالیف کی برکت سے امام کا مذہب سارے عراق اور خراسان اور ماوراءالنہر میں پھیل گیا ؛

حنفی مذہب کے بعد بنیاد مالکی مذہب کی پڑی کہ امام مالکؒ محدث اور فقہ اور زہد اور پرہیزگاری میں بڑے مشہور تھے اور ان کو احادیث نبوی بہت سی یاد تھیں اور وہ اس کے ضعف اور قوت سے بھی بخوبی واقف تھے چنانچہ اُنہوں نے نہایت عمدہ اور صحیح اور جامع کتاب حدیث کی لکھی جس کا نام موطا ہے۔ اس کی قبولیت اعلےٰ درجہ پر پہنچی اور ہزاروں آدمیوں نے اُس وقت کے اُس کی سند امام مالک سے حاصل کی پس امام مالک کی اس کتاب کی برکت سے ایسا فائدہ لوگوں نے پایا کہ جس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا پس جہاں جہاں ان کے اصحاب اور شاگرد پہنچے اور ان کی کتاب کو لوگوں نے دیکھا اُن کے مذہب پر عمل کرنا شروع کیا پھر تو ان کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کے مذہب کے اصول اور دلائل کو ترتیب دیا اور ان کی کتاب کے خلاصے کئے اور ان کے کلام اور فتووں کی شرح کی یہانتک کہ آخر ان کا بھی ایک جدا مذہب قرار پایا اور نواح مغرب کی طرف جہاں اُنکے تلامذہ زیادہ ہوئے مالکی مذہب پھیل گیا ؛

ان دونوں مذہبوں کی بنیاد پڑ چکی تھی کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے ۔ اُنہوں نے دونوں مذہب کے اصول و فروع کو دیکھ کر اور ان کے کلیات و جزئیات پر نظر کر کے ان باتوں کو جو ان مذہبوں میں ناقص تھیں پورا کیا اور نئی طرز سے اصول اور قواعد کو ترتیب دیا ؛

امام شافعی نے سب سے اوّل ایک کتاب اصول کی تالیف کی اور اُس میں احادیث مختلف کے جمع کرنے کے قاعدے مرتب کئے اور احادیث مرسل اور منقطع پر استناد کرنے کا بغیر پائے جانے اُس کی شرائط کے التزام ترک کیا چنانچہ جو کچھ اُنہوں نے حنفی اور مالکی مذہب سے اختلاف کیا اکثر ان باتوں میں تھا ؛

اوّل ۔ احادیث مرسل اور منقطع پر استناد نہ کرنا ۔ امام شافعی نے حنفی اور مالکی مذہب والوں کو بعض احادیث مرسل اور منقطع پر استناد کرتے ہوئے دیکھ کر یہ اصول قائم کیا ۔ کہ ایسی احادیث پر جب تک اس کی شرائط پائی نہ جاویں سند نہ کی جاوے اس لئے کہ ترک حدیث کے جمع کرنے سے بخوبی ظاہر ہوا کہ بعض احادیث مرسل محض بے اصل ہیں اور بعض مسند کے مخالف ہیں ؛

دوسرے! احادیث مختلفہ کے جمع کرنے کے اصول قائم کرنا! امام شافعی سے پہلے احادیث کی وہ کثرت نہ تھی جو ان کے زمانے میں ہوئی اس لئے کہ ہر شہر کے رہنے والے اپنے ہی شہر کے عالموں اور اماموں سے احادیث کو اخذ کرتے اور اسی کو روایت کرتے مگر جب اس علم کی تدوین شروع ہوئی اور لوگوں نے ایک شہر کے دوسرے شہر میں جاکر احادیث کو سیکھا اور متفرق متفرق لوگوں کو جو کچھ حدیثیں یاد تھیں اُن سے سنا تو احادیث کی کثرت ہوگئی اور پھر اُن میں اختلاف بھی معلوم ہوا تو ضرور ہوا کہ اس اختلاف کے رفع کرنے اور احادیث مختلفہ کے جمع کرنے کے قاعدے مقرر کئے جاویں چنانچہ اسی واسطے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اصول کی کتاب تالیف کی ؛

تیسرے! احادیث صحیحہ کے ترک کرنے سے پرہیز کرنا۔ پچھلے لوگوں نے جن جن بزرگوں سے فتوے کو حاصل کیا اور جنکے اقوال پر اپنے مذہب کی بناء قائم کی ان کو اُس وقت تک بعض احادیث صحیحہ نہیں پہنچیں اور ان کو بسبب معلوم نہ ہونے ان احادیث کے جن سے مسائل بتصریح نکلتے تھے قیاس سے کام لینا پڑا پس جبکہ امام شافعی رح نے دیکھا کہ بعض احادیث صحیحہ پر عمل کرنا پچھلے مذہبوں بلکہ مجبوری رہ گیا ہے تو امام شافعی رح نے اس امر کو صاف بیان کیا کہ وقت مل جانے حدیث صحیح کے قیاس کو چھوڑ دینا اور حدیث صحیح پر عمل کرنا ضرور ہے! اور انہوں نے ثابت کیا کہ یہی طریقہ صحابہؓ اور تابعین کا تھا کہ وے ہمیشہ احادیث کی جستجو کرتے جب کوئی حدیث نہ ملتی تب استدلال اور قیاس سے کام لیتے اور اگر پیچھے اُن کو حدیث پہنچ جاتی تو اُسی وقت قیاس کو چھوڑ دیتے اور عمل بالحدیث کرنے لگتے ؛

اس بات سے کہ امام ابوحنیفہ یا امام مالک وغیرہ کو سب احادیث پر اطلاع نہیں ہوئی درحقیقت ان کی پاکی اور بزرگی اور علم میں کچھ الزام نہیں آتا اس لئے کہ اُس وقت تک وہ مادہ حدیث کا نہ تھا۔ جو پیچھے کہ امام شافعی کو ملا اور اس کا عذر علماء متحققین حنفیہ نے خود کیا ہے چنانچہ امام شعراوی لکھتے ہیں کہ ان عذر ابی حنیفۃ فی کثرت القیاس عدم بلوغ الاحادیث الصحیحۃ الیہ فی زمنہ یعنی امام ابوحنیفہ کا عذر کثرت قیاس میں یہ ہے کہ سب احادیث صحیحہ اُن کو اُن کے وقت میں نہ پہنچیں تھیں اور علامہ احمد بن عبدالسلام اپنی کتاب رفع الملام عن الائمۃ الاعلام میں لکھتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جو کہ خود خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کو نہیں پہنچیں اور علماء اُن کے اور اصحاب ان سے واقف ہوئے پس اگر بعد اُنکے کسی امام کو احادیث صحیحہ پر اطلاع نہیں ہوئی تو کچھ جائے تعجب نہیں اور اس مضمون کو لکھ کر علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ فمن اعتقد ان کل حدیث صحیح قد بلغ کل واحد من الائمۃ او اماما معینا فھو مخطی خطاء افحشا قبیحا۔ یعنی جس نے

یہ اعتقاد کیا کہ ساری صحیح حدیثیں ہر ایک امام کو پہنچ گئیں یا کوئی خاص امام ان سب سے مطلع ہوا تو ایسا اعتقاد کرنے والا کھلی ہوئی نہایت قبیح خطا پر ہے اور یہ بھی وہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ کیونکر سب احادیث نبوی پر اطلاع نہیں ہوسکتی تھی جبکہ احادیث کی تدوین ہو چکی تھی تو یہ بھی بڑی غلطی ہے لان هذه الدواوين المشهورة في السنن انما جمعت بعد انقراض الائمة المتبوعين اس لئے کہ یہ کتابیں مشہور بعد گزرنے اُن اماموں کے مدون ہوئی ہیں جن کی لوگ تقلید کرتے ہیں اور یہ کہ دینا مقلدین کا کہ ہر مسئلہ میں ہمارے امام کے پاس ایک حدیث تھی اور ایک خاص دلیل وان لم نعرفه ونعتقده یعنی گو ہم اس کو نہیں جانتے حقیقت میں ایسا دعویٰ ہے جس کو سفسطہ محض اور جہالت قبیح کے سوا کچھ نہیں کہ سکتے۔

اور رق بر منہج کے باب تبری الائمة من اقوالهم اذا خالفت الشريعة میں امام شعراوی نے صاف لکھ دیا ہے کہ لو عاش ابوحنيفة الى تصحيح الاحاديث لترك القياس یعنی اگر امام ابوحنیفہ اتنی زندگی پاتے کہ تصحیح حدیث کر سکتے تو ضرور وہ قیاس کو چھوڑ دیتے۔

غرضکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان مسائل میں قیاس کو چھوڑا جن میں بسبب نہ پانے حدیث کے اگلے اماموں نے اجتہاد کیا تھا اور صرف حدیث پر عمل کیا۔

چوتھے اقوال صحابہؓ پر بوجہ مخالفت حدیث کے استدلال نہ کرنا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں صحابہ کے اقوال بھی لوگوں نے جمع کر لئے تھے اور وہ باہم مختلف تھے اور بعض بعض احادیث صحیح کے مخالف تھے اس لئے امام شافعی نے ان کے اقوال پر بعد پانے حدیث صحیح کے استدلال کرنے کو ترک کیا اور صاف کہہ دیا کہ هم رجال ونحن رجال کہ وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔ اُن سے غلطی ہوسکتی تھی پس بعد پانے حدیث کے اُن کے اجتہاد پر عمل کرنا ضرور نہیں بلکہ ان کا ترک کرنا اور حدیث پر عمل کرنا لازم ہے کما قال شارح سفر السعادة ابوحنیفہ تقلید صحابی را در آنچہ صحابی باختیار خود گوید واجب انگارد و شافعی گوید هم رجال ونحن رجال ما و ایشاں در اجتہاد برابریم و ہمہ مجتہد انیم مجتہد را تقلید مجتہد دیگر نہ رسد۔

پانچویں رائے اور قیاس میں تمیز کرنا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں اکثر لوگ ایسے تھے جو اجتہاد میں رائے کو دخل دیتے اور اُسی کو وہ قیاس سمجھتے جو شرعاً جائز ہے حالانکہ قیاس جو شرعاً جائز ہے اور جو صحابہ اور تابعین میں جاری تھا وہ صرف یہ ہے کہ کسی حکم منصوص سے اُس کی علت نکالنا اور جس میں وہ علت پائی جاوے اُس پر اُسی حکم کو قائم کرنا مثلاً خدا کی کتاب میں شراب کی حرمت مذکور ہے نہ کسی اور مسکرات کی تو حرمت شراب کی حکم منصوص ہے اور سکر اس کی حرمت

کی علت[۱] ہے پس جس چیز میں وہ علت پائی جاوے یعنی سکر اُس پر حرمت کا حکم قائم کرنا حقیقت میں قیاس ہے اور رائے یہ ہے کہ کسی تراشی ہوئی بات کو اصول میں قائم کرنا اور اُسی کو علت حرمت و علت کی بنا ٹھہرانا مثلاً مظنہ حرج یا مصلحت عام کو کسی حکم کی علت ٹھہرانا پس ایسے قیاس کو جو کہ در حقیقت رائے ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ترک کیا اور صاف کہہ دیا کہ من استحسن فانہ اراد ان یکون شارعا۔ کہ جو قیاس استحسان کو شریعت میں دخل دیتا ہے وہ دراصل اپنے آپ کو صاحب شریعت بنایا چاہتا ہے۔

غرضیکہ یہ کھلی ہوئی اور صاف باتیں ہیں جس سے امام شافعی نے اپنے پچھلے ایمہ سے اختلاف کیا اور بیچ کے ذریعہ اور واسطے چھوڑ کر اصل ماخذ سے فقہ کو لیا اور کتاب و سنت ہی پر مدار اپنے مذہب کا رکھا اور کسی خاص شہر کے عالم یا کسی معین قوم کے فقہ کے قواعد اصول پر اپنے اجتہاد کی بنا قائم نہ کی اور حقیقت میں یہ طریقہ ان کا نہایت ہی اچھا تھا لوگوں کو حد سے زیادہ پسند ہوا اور بڑے بڑے فقہا اور محدثین نے ان کے مذہب کی خوبی پر اقرار کیا اور اس کو اختیار کر لیا اور اس طور سے بعد حنفیہ مذہب شافعی رائج ہوا۔

جو کیفیت حنفی اور مالکی اور شافعی مذہب کی بنیاد کی ہوئی قریب قریب اُسی کے امام احمد بن حنبل کے مذہب کی بنیاد پڑنے کی ہے۔

اس مسلسل مختصر بیان سے سمجھنے والے کو نہ صرف یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ بنیاد ان چاروں مذہب کی کب اور کیونکر پڑی بلکہ یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ کسی نے مجتہدات چاروں امام کے اپنے مذہب کو لوگوں کی تقلید کے لئے نہیں بنایا اور اپنے آپ کو صاحب مذہب بنانے کے لئے اجتہاد اور استنباط نہیں کیا بلکہ انھوں نے صرف اپنی ذات کے لئے اجتہاد کیا اور اپنے دین کے شوق میں فقہ کو تدوین کیا کسی نے ان میں سے یہ نیت نہیں کی کہ ہم مقتدا بنیں اور ہم کوئی خاص مذہب ٹھہرا کریں اور لوگوں کو اُس پر راغب کر کے کچھ شہرت یا عزت حاصل کریں۔ اُن بزرگوں کی نیت ایسی کدورتوں سے بالکل پاک اور ان کے دل ایسے خطرات سے بالکل صاف تھے اُن کو سوائے اپنے ذاتی فائدے کے کوئی دوسری غرض نہ تھی اسی واسطے اپنی تقلید سے منع کرتے رہتے اور جب کوئی خلیفہ اور بادشاہ ان کی تالیفات کو لوگوں کے عمل کرنے کے لئے مشتہر کرنا چاہتا وہ منع کر دیتے چنانچہ لوامع الانوار القدسیہ میں لکھا ہے واعلم ان ما علمہ المجتہدون من الکتاب والسنۃ انما کان لانفسہم لا الخلق الا لا لا[illegible] مجتہد یوجب تقلید نفسہ علی کل فرد من افراد العالم بل من الائمۃ من نہی عن تقلید۔

---

[۱] مگر ضرور ہے کہ اس علت کا علت ہونا بھی نص سے ثابت ہوا ہو نہ کسی انسان کی عقل سے۔

فقس وام تحصیل رتبۃ النظر

پس وہ اثر جو اُن بزرگوں کی نیک طبیعت اور پاک طینت کا ہمارے دلوں پر ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ خود متبوع اور صاحب شریعت بننے کا قصد نہ رکھتے تھے اور اپنے اجتہاد اور استنباط کو سارے جہان کے لوگوں سے قبول کرانے کا شوق نہ رکھتے تھے بلکہ جہاں تک اُن سے اپنی ذات کی بھلائی اور لوگوں کے نفع کے واسطے ہوسکتا تھا وہ احادیث نبوی یا اقوال فقہا سے مسائل کو تخریج کرتے اور لوگوں کی ضرورت اور حاجت کو رفع کرتے اور صاف صاف کہہ دیا کرتے کہ اگر کوئی مسئلہ اور کوئی جزئیہ ہمارا حدیث کے خلاف پاؤ یا کسی قیاس اور رائے کو ہماری کتاب و سنت کے برخلاف دیکھو اُسے ہرگز نہ مانو اور اُس پر عمل کرنے کو حرام سمجھو۔

مگر خدا نے اپنے قانون قدرت میں یہ قاعدہ رکھ دیا ہے کہ ہر شئے آہستہ آہستہ شروع ہوتی ہے اور تھوڑی تھوڑی بڑھتی ہے جب اُس کی ترقی پورے درجہ پر اور اپنی معین حد پر پہنچ جاتی ہے تب اُس کی ترقی رُک جاتی ہے اور گھٹنے لگتی ہے اور پھر درجہ بدرجہ اُس میں خرابی آتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر سوائے لفظوں کے کچھ حقیقت اُس شئے کی باقی نہیں رہتی اور پھر نام کے کوئی خوبی اُس میں پائی نہیں جاتی پس اسی قاعدہ کا اثر ان مذاہب پر ہوا کہ اول تو آہستہ آہستہ ائمہ دین نے فقہ اور حدیث کو جمع کیا اور اجتہاد اور استخراج کو درجہ بدرجہ کمال پر پہنچایا اور اپنی نیتوں کو پاک اور اپنے ارادوں کو نیک رکھا اور پھر آخر لوگوں نے تحقیق اور تصحیح کو چھوڑ دیا اور جس امر کا دعویٰ اُن اماموں نے خود نہیں کیا اُسے اُن کی طرف منسوب کیا اور ان کو مثل صاحب الشریعت کے صاحب مذہب بنا دیا اور ان کو معصوم اور محفوظ من الخطا سمجھ کر اُن کی باتوں کے سامنے اصل صاحب الوحی کے قولوں پر تمسک کرنا چھوڑ دیا یہاں تک آخر اپنے آپ کو پیغمبر سے نسبت کرنا بھی زمانہ سے اُٹھ گیا اور بجائے محمّدی اور احمّدی کے حنفی اور شافعی کہنے پر مذہب کا مدار آگیا اور پھر جیسا زمانہ گذرتا گیا اور دین تبدیل ہوتا گیا اتنی ہی یہ خرابی بڑھتی اور دین و مذہب کی حقیقت چھپتی گئی یہاں تک کہ اب جس زمانہ میں ہم کو خدا نے پیدا کیا ہے اور جس میں شاد و ناشاد زندگی کے دن کاٹتے ہیں کسی امام کے مذہب کو ترک کرنا یا کسی اُس کے قول کو نہ ماننا اسلام سے پھرنا اور نبیؐ کے کلام کا انکار کرنا سمجھا جاتا ہے اور تحقیق کا نام لینے والا اور کتاب و سنت پر عمل کرنے والا بدعتی اور فاسق اور دشمن اسلام کا تصور کیا جاتا ہے۔

چونکہ ہم اجتہاد کی ترقی کے زمانہ کو بیان کر چکے اور مذاہب اربعہ کی بنیاد پڑنے کے زمانہ اور سبب کو بھی لکھ چکے اس لئے اب ہم اُس کے تنزل کے زمانہ کو اور اس کے وجوہ کو لکھتے ہیں۔

چاروں مذہب کی پابندی کامل طرح سے جاری ہونے اور اجتہاد ترک کرنے کے زمانہ اور سبب کا بیان

تواریخ اور کتابوں کے دیکھنے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ اگرچہ تقلید کی بنیاد دُوسری صدی کے اوسط سے شروع ہوئی لیکن تیسری تک پوری پوری جاری نہ ہوئی اور چوتھی صدی سے پہلے کسی ایک معین مذہب پر کامل تقلید لوگوں نے اختیار نہ کی چنانچہ ابوطالب مکی نے قوت القلوب میں لکھا ہے کہ چوتھی صدی سے پہلے مذاہب اربعہ کی تقلید کامل طرح سے رواج نہ تھا اور حنفی شافعی کہلائے جانے کا بہت زور شور نہ تھا۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر لوگ مسائل شرعی کس طرح تحصیل کرتے تھے اور فقہ کو کس طرح سیکھتے اور اس پر کیونکر عمل کرتے تھے اس لئے ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ اُس وقت تک جو لوگ تھے وہ دو حال سے خالی نہ تھے یا ذی علم تھے یا جاہل۔ پس جو لوگ جاہل تھے وہ اپنے گھر میں روزہ نماز وغیرہ عبادات کے مسئلے سیکھتے اور اس پر عمل کرتے۔ اگر ضرورت کسی مسئلہ کے پوچھنے یا فتوے کے لینے کی ہوتی تو جس عالم کو وہ افضل اور بہتر جانتے اُس سے پوچھ لیتے اور اسکی بات پر عمل کرتے بلالحاظ اسکے کہ وہ عالم حنفی ہوتا یا شافعی یا مجتہد۔ اور جو لوگ خود ذی علم تھے اُن کی دو صورتیں تھیں بعضے اہل حدیث تھے بعضے صاحب اجتہاد۔ جو اہل حدیث تھے اُن کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کتاب الٰہی اور احادیث نبوی اور آثار صحابہ پر عمل کرتے اور اگر کسی مسئلہ میں ضرورت ہوتی تو کسی فقیہ کے کلام پر رجوع کرتے خواہ وہ فقیہ مدنی ہوتا یا مکی۔ کوفی ہوتا یا بصری اور جو صاحب اجتہاد تھے وہ اجتہاد اور تخریج کرتے اور اصول اور قواعد کلیہ کو پیش نظر رکھ کر اُسی سے فروعات کا استنباط کرتے پس اگر وہ اصول پہلے سے کسی خاص امام یا اُس کے فرقہ کے ساتھ مخصوص ہوتے تو لوگ اس مجتہد کو بھی اسی امام کی طرف منسوب کرتے اور اس مجتہد کو بھی ان اصول کا پابند پاکر شافعی یا حنفی سمجھتے۔

یہ صورت تیسری صدی کے اخیر تک قائم رہی اُس وقت تک نہ عمل بالحدیث پر کوئی طعنہ کرتا نہ اجتہاد پر الزام دیتا۔ مگر جب جہالت کا زور ہوا اور اختلاف اُمت میں پڑ گیا اور طبیعتوں سے تحقیق کا مزا جاتا رہا اور صاحب شریعت تک واسطے در واسطے ہو گئے تب چوتھی صدی میں لوگوں نے سیدھا رستہ چھوڑ دیا اور دائیں بائیں چلنا شروع کیا اور سلاطین کے سامنے مناظرہ اور مجادلہ میں اپنے ہمسروں پر غالب آنے کا شوق پیدا ہوا۔ علم کو دنیا کی

تحصیل کا ذریعہ گردانا۔ اپنی ناموری اور عزت اور شہرت کے لئے اُن مسائل کو جن میں نہایت نیک نیتی کے سبب سے باہم ائمۂ اربعہ کے اختلاف ہوا تھا ذریعہ بحث کا بنایا اور اپنے اپنے اماموں کے اقوال کو نہ صرف اس وجہ سے کہ حقیقت میں وہ اُنہیں کو صحیح اور دوسرے کو غلط جانتے تھے مثل کتاب و سنت کے مستند گردانا بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ خود اُس مذہب سے منسوب تھے اور اس امام کے مقلد کہلائے جاتے تھے۔ ان اقوال کے اثبات کو اپنی غزارت علم کے اظہار کا سبب تصور کیا تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ ایسے بڑے مولوی اور فقیہ ہیں۔ کہ جن باتوں پر یہ عمل کرتے ہیں اور جن قولوں کو یہ واجب العمل جانتے ہیں وہی صحیح اور درست ہیں۔ اور ان کے پاس بہت سی دلیلیں اُس کے اثبات پر موجود ہیں اور اس سے ان کے علم اور تفقہ کی شہرت ہو اور جب ایسے لوگوں نے اپنی اپنی تقریر اور تحریر کے زور سے اور اپنی فصاحت اور بلاغت کے بھروسہ پر ایک چیز کا التزام کر لیا اور اپنے ہمعصروں سے ان باتوں میں مباحثہ اور مناظرہ شروع کر دیا اور بڑے بادشاہوں اور امیروں کی مجلسوں میں اس کی بحثیں ہونے لگیں تو تعصب نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور غرور نے ان کے دل سے نیک نیتی اور صفا طینت کو نکال لیا اپنے دل میں اپنے قول اور اپنے عقیدہ کی سفاہت پر قائل ہو جاتے مگر زبان سے اقرار نہ کرتے اور اس سے پھرنے کو اپنی ہتک سمجھتے اور جان بوجھ کر کتاب و سنت کو چھوڑ کر اپنی بات پر قائم رہتے اور پوچ دلیلوں اور بیہودہ اور خرافات باتوں یا ضعیف سندوں سے اُسی کے ثابت کرنے پر قائم رہتے اور اُسی کو استقلال اور صلابت فی الدین اور غزارت علم سمجھ کر ابطال حق اور احقاق باطل کر کے بمقتضائے اختر النار علی العار دنیا کی شرم کو عاقبت کی شرم پر اختیار کرتے چنانچہ اُسی وقت میں ایک ایک عقیدہ پر سو سو ورق کی کتابیں تالیف ہو گئیں اور ایک ایک فقہی مسئلہ پر ہزار ہزار صفحے سیاہ ہو گئے۔ فقہ اور حکمت اور علم کی اصلی حقیقت تو جاتی رہی اس کے ناموں پر مدار دین کا آ گیا اور مباحثات اور مناظرات کا نام استنباط و دقائق شرح رکھا گیا تالیفات اور تحریرات کی وہ کثرت ہوئی کہ ہر جاہل صاحب تالیف اور ہر عامی صاحب تصنیف بن گیا اور ایک ایک دنیا طلب مولوی اپنے آپ کو عالم ربانی سمجھنے لگا فقہ کے مسئلوں اور علم کلام کے فرضی عقیدوں کے اثبات کا نام اعلاء کلمۃ اللہ ہو گیا یہاں تک نوبت پہنچی کہ جو بڑا بکنے والا ہوتا اسی کو لوگ بڑا مولوی سمجھتے جو سب سے زیادہ خوش گپ ہوتا اسی کو لوگ عمدہ واعظ جانتے جو لڑنے جھگڑنے میں خوب مشاق ہوتا وہی محقق کہلایا جاتا جو نہایت فضول اور لغو ہوتا وہی جامع منقول سمجھا جاتا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء میں فرماتے ہیں۔ فصار یسمی المجادل المتکلم عالما والقاص المزخرف کلامہ بالعبارات المسجعۃ عالما ھکذا

ضعف الدین فی قرون سالفۃ فکیف الظن بزمانک ہذا وقد انتہی الامر الی مظہر الانکار لیستہدف لنسبتہ الی الجنون فالاولی ان یشتغل الانسان بنفسہ ویسکت

یعنی جو شخص جھگڑنے والا۔ بڑی بات چیت کرنے والا ہوتا اُسی کو لوگ عالم جانتے اور جو بیہودہ قصے کہنے والا اور مزخرفات بکنے والا ہوتا اُسی کو سب مولوی سمجھتے پس جبکہ پچھلے اماموں میں دین ایسا ضعیف ہو گیا تو اب اِس زمانہ کا حال کیا بیان کیا جاوے کہ اب تو وہ زمانہ آگیا ہے کہ جو ان مولویوں اور عالموں کی باتوں کو نہ مانے وہی تیر ملامت کا نشانہ ہوتا ہے اور جو حق بات بیان پر لاوے وہی مجنوں اور دیوانہ ٹھہرتا ہے پس انسان سوائے اس کے کیا کرے کہ اپنا کام کرے اور چپ چاپ رہے۔

غرض کہ اسی زمانہ میں تقلید کی جڑ مضبوط ہوگئی اور وہ چیونٹی کی سی چال تقلید کی جو لوگوں کے دلوں میں دوسری صدی سے شروع ہوئی تھی چوتھی صدی میں پوری ہوگئی اور سوائے چند علمائے ربانی کے سب کے دلوں میں کامل طرح سے اُس نے جگہ کرلی۔

ہمارے اس بیان سے غور کرنے والے کو تقلید پر پورے طور پر عمل کرنے کا سبب تو بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے لیکن ہم اس امر کو کہ تقلید نے کتاب و سنت پر استناد کرنے کا طرز پسندیدہ کیوں متروک کرا دیا اور بجائے قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسول کے قال زید و قال عمرو کیوں رائج کیا۔ چند لفظوں میں بیان کرتے ہیں سبب اس کا یہ ہے کہ جب علما اور فقہا باہم بحث کرنے لگے اور اپنی سخن پروری اور نفسانیت کے سبب اوروں پر حق ناحق غلبہ پانے کے شائق ہوئے اور ایک دوسرے کو حسد کی نظر سے دیکھنے لگے اور لوگ اُسی سے رجوع کرنے کے عادی ہو گئے جو وقت مباحثہ کے غالب رہتا اور اپنی طرف مقابل کو ہرا دیتا تو اُس وقت مباحثہ اور مناظرہ کی کثرت ہوئی اور سوائے شاذونادر نیک پاک لوگوں کے ایک نے دوسرے کے کلام کی تردید شروع کی یہاں تک کہ ایک عالم دوسرے کے فتوے کو رد کرتا اور ایک فقیہ دوسرے کی بات کو کاٹ دیتا اور چونکہ اس کے لئے ضرورت کسی دلیل اور برہان کی ہوتی پس فقہ اور دین میں سوائے نقل کے صرف عقلی دلیل کافی نہ تھی اور بغیر کسی سند اور قول کے بات نہ بنتی تھی پس دلائل و براہان کی جستجو کرنی پڑی اور اپنی اپنی باتوں پر سند لانے کی حاجت ہوئی جب ان لوگوں نے کتاب و سنت پر توجہ کی تو کوئی دلیل ایسی کہ جو صرف اُن کی بات کو ثابت اور دوسرے کے قول کو رد کرے نہ ملی تو اپنے اپنے بزرگوں اور فقیہوں اور شیوخ کے قولوں ہی کو سند لانا شروع کیا اور صرف اپنے اپنے فرقہ کے نامی نامی عالموں کے اقوال و اعمال کو حجت گردانا۔ پس جب کسی ایک فریق نے کتاب و سنت کو چھوڑ کر غیر معصوم کے کلام یا عمل کو دلیل میں پیش کیا تو

دوسرے فریق نے بھی یہی طرز اڑایا اور مضمون الکیل بالکیل اور کما تدین تدان کا ادا کیا
اُس نے بھی اپنے قول کی سند میں عالموں اور مولویوں کی باتوں ہی کو پیش کیا پس اس طرز جدید
کے شروع ہوتے ہی کی دیر تھی کہ مثل تیز بارود کے جس میں آگ لگنے ہی کی دیر ہوتی ہے نہ اُڑنے
اور اُڑانے کی اُس کا اثر ساری طبیعتوں پر ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں از شرق تا غرب یہ
طریقہ جاری ہو گیا۔ اس بری مذہب کے خراب کرنے والے طریقہ کا صرف یہی بد اثر نہیں ہوا
کہ لوگوں نے علما و فقہا کے اقوال کو مستند گردانا بلکہ چند ہی روز میں اُس کا یہ بُرا نتیجہ ظاہر
ہوا کہ لوگوں نے اگلے علما و فقہا پر تہمت کرنا شروع کیا اور جو بات انہوں نے اپنی زبان
سے نہیں نکالی اور جو چیز اُن کے دل میں بھی نہیں آئی اُس کو اُن کی طرف منسوب کر دیا اور اپنی
بات قائم رکھنے اور ہر لعنت پر عیاری و فریب کے غالب ہونے پر اقاویل باطلہ اور اسناد کاذبہ نقل
کرنا شروع کیا ۔

چنانچہ ایک مجلس میں امام احمد حنبلؒ گئے وہاں دیکھا کہ ایک شخص یہ قصہ بیان کرتا تھا ایک امر کو اُن کی
طرف منسوب کر رہا ہے و حدثنی فلان عن فلان کہہ کر خاتمہ اس کا اُن تک کر رہا ہے وہ یہ سنکر غرق
حیرت ہوئے اور خاموش رہ گئے آخرش ان سے نہ رہا گیا اور اُس شخص سے کہا کہ میں احمد حنبلؒ
ہوں میں نے یہ بات نہیں کہی۔ اُس عیار کی چالاکی قابل آفرین کے ہے کہ اسی وقت اپنی بات
قائم رکھنے اور جھوٹ چھپانے کے لئے کہا کہ تم بڑے احمق ہو۔ کیا تم ہی اکیلے احمد حنبل ہو دوسرا اس
نام کا نہیں ہے وہ احمد حنبلؒ جس سے میں روایت کرتا ہوں دوسرے ہیں ۔

پس یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ حدیث پر لوگوں کی نہایت توجہ اور [illegible] استناد اور دلیل
لائی جاتی تھی بدباطنوں اور خبیث طینتوں نے جھوٹی حدیثیں بنائیں اور [illegible] احادیث کو
صاحب الشریعت کی طرف منسوب کیا۔ اسی طرح سے اس زمانہ میں جب علما اور فقہا کے اقوال سند
میں پیش ہونے لگے ان عالموں اور فقیہوں کی طرف جھوٹی جھوٹی باتوں کو منسوب کیا [illegible] اُن قول
کی تقویت اور شہرت زیادہ ہو بقید اسناد اس کا سلسلہ عن فلان عن فلان کہہ کر صاحب قول تک پہنچا دیا گیا ۔
احادیث وضعی کو اس سبب سے کہ احادیث حقیقت میں قابل استناد کے ہیں اور مدار شریعت کا
اُن پر ہے پچھلے محققین نے اصلی حدیثوں سے علیحدہ کر دیں اور موضوعات کے رسالے لکھ کر ان
کی غلطی اور موضوعیت کو بیان کر کے قوی کو ضعیف سے اور موضوع کو صحیح سے جدا کر دیا مگر علما
اور فقہا کے اقوال موضوعہ کو اُن کے اقوال صحیحہ سے جدا کرنے پر اس طرح کسی نے توجہ نہ کی اس لئے
کہ ان پر محنت کرنا محض فضول تھا اس لئے کہ بالفرض اگر وہ کلام انہیں کا ہوتا تو وہ کسی پر حجت نہیں
ہو سکتا تھا اور بسبب نہ معصوم ہونے ان کے اُس کی غلطی پر فقط غلط کہہ دینا ہی اُس کا اور

نہ ماننا اُس کا کافی تھا لیکن سوائے چند محققین کے ایسی نقل اور سند سے عوام کو بڑا نقصان پہنچا اور دین میں بڑا رخنہ پڑ گیا۔ لوگوں کی طبیعتیں ایسی اسناد اور استناد کی ایسی عادی ہو گئیں کہ بغیر کسی مولوی کے قول کے اور بغیر کسی عالم کی سند کے کتاب و سنت کی باتوں کا ماننا ہی جاتا رہا اور بجائے قال اللہ اور قال الرسول کے قال زید و قال عمرو پر مدار دین و مذہب کا آگیا۔

اس خرابی نے اس سے زیادہ اور بھی ترقی پائی کہ جو لوگ حقیقت میں لائق اسناد نہ تھے بلکہ جن کے اقوال و اعمال لائق اجتناب کے تھے وہ بھی قابل استناد کے ٹھہر گئے اور اہل بدعت اور منافق اور جاہل صاحب سند ہو گئے۔ اور اگر کسی شہر یا کسی فرقہ یا کسی خاندان میں کوئی نامور ہوا اور اُس کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آگیا اور کچھ تالیف و تصنیف کرنے سے اُس کی عزت بھی بڑھ گئی تو اُس شہر کے رہنے والوں اور اُس فرقہ اور خاندان کے آدمیوں نے اپنے شہر اور اپنے خاندان کی عزت اسی میں جانی کہ اسی کی بات کو مانیں اور اسی کے کہنے پر چلیں پس انکے دلوں میں یہ بات ایسی جم گئی کہ اُس کے قول سے پھرنا گویا خدا کے قول سے پھرنا ہے اس لئے وہ اسی کی باتوں کے مقلد ہو گئے اور قدم بقدم اُس کے طریقہ پر چلنے لگے اور اسی طرح سے جب اُس کے مقلد اور تابع زیادہ ہو گئے اور وہ مقتدا اور متبوع کسی فرقہ اور گروہ کا ہو گیا تو پس وہ صاحب الکتاب ٹھہرایا گیا۔ اگر اُس سے کوئی صریح غلطی ہو جاتی یا اُس سے کوئی فعل مخالف کتاب و سنت کے ہو جاتا تو اُس کے مقلدین و اصحاب اُس کی توجیہات کرتے اور اُس کی تاویلات کرتے یہانتک کہ آخر اُس کے حالات اور سیرمیں کتابیں لکھی جاتیں اور اُس کے معجزے اور کرامتیں اور زہد اور پرہیزگاری کی حالتوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے جاتے اور جو کچھ جھوٹ اور خرافات اُس میں ہوتا اُس کو اُس کے معتقدین اور مقلدین نصوص قرآنی کی طرح واجب الاذعان جانتے ہیں اور خدا کی کتاب رسولؐ کے کلام کو چھوڑ کر اُسی کو حرز جان بناتے اور ہر مسئلہ اور ہر عقیدہ کے لئے اپنی لال کتاب کو دیکھنے لگ بجائے اس کے کہ جو کچھ ان کے حضرت نے فرمایا ہے اور جو کچھ اُن کے پیرو مرشد نے ارشاد کیا ہے یا جو کچھ اُن کے شیخ و بزرگ نے عمل کیا ہے اُس کو کتاب و سنت پر عرض کرتے اور خدا اور رسولؐ کی کتاب کو معیار صحت بناتے۔ ان بدبختوں نے برعکس اُس کے ساری شریعت اور تمام مذہب کو اپنے ہی پیرو مرشد کی تالیفات اور اپنے حضرت کے ملفوظات و مکتوبات پر عرض کرنا شروع کیا پس جو کچھ اُس کے مطابق پاتے اُس پر عمل کرتے ویسا ہی عقیدہ رکھتے جو کچھ اُس کے برخلاف دیکھتے اُسے چھوڑ دیتے اور کتاب و سنت کے امتحان کے لئے اُسی کو کسوٹی بناتے پس ایسی حالت میں جو کچھ دین کی خرابی ہو سکتی ہے ہوئی اور جو کچھ

شریعت میں ان باتوں سے خلل پیدا ہو سکتا ہے ہوا۔ ان چیزوں نے یہاں تک دلوں پر اثر کیا کہ اس کے برخلاف کوئی کلمہ زبان پر لانا کفر کے کلمہ سے کم نہ سمجھا جاتا اور ان باتوں کا منکر خارق اجماع اور بدعتی اور فاسق ٹھہرتا پس کیا زمانہ نے انقلاب پایا کہ کتاب و سنت کو لوگوں نے پس پشت ڈال دیا اور اپنے بزرگوں کے صحیفوں کو سامنے کر لیا اور پھر جس نے کتاب و سنت کا نام لیا اور اس پر چلنے کا قصد کیا وہ فعل اس کا بدعت ٹھہرا اور جس نے ان صحیفوں کو واجب العمل جانا اور اس پر عمل کیا وہ فعل اس کا سنت قرار پایا فاصبح کل واحد منھم لعاجل حظہ مشغوفاً فصار یری المعروف منکرا والمنکر معروفا اس خرابی کا باعث ایک بہت ہی بڑا غلط خیال ہوا جس کو شیطان نے لوگوں کے دلوں میں ڈالا اور جس کو مقلدین نے عقل و ایمان کی مدد سے نہ نکالا یعنی وہ لوگ جن کی باتوں پر لوگوں نے عمل کیا نیک اور پاک تھے اور علم اور فقہ میں کامل تھے پس ان کے مقلدین کے دل میں یہ خیال سمایا کہ پس جب ایسے نیک اور پاک اور امام اور عالم ایسا کہہ گئے ہیں اور ایسا کرتے رہے ہیں تو ہم کو نہ ان کے سے نیک ہیں نہ ویسا علم رکھتے ہیں کیونکہ اس کے برخلاف چل سکتے ہیں حالانکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ گو نیک اور پاک تھے مگر معصوم نہ تھے اور گو وہ عالم اور فقیہ تھے مگر علم لدنی کے عالم نہ تھے۔ جبرئیل ان پر نازل نہیں ہوتے تھے۔ خدا نے واسطہ ان پر وحی نہ کرتا تھا۔ وہ بھی آخر اپنی سمجھ بوجھ ہی سے کام لیتے تھے اور اپنی قدرت اور طاقت ہی کے موافق راہ حق پر چلتے تھے ان سے غلطیوں کا ہونا نہ صرف ممکن تھا بلکہ یقینی ان سے خطا ہونے کا نہ احتمال ہی احتمال تھا بلکہ ضروری۔ تو پھر باوجود ایسی حالت کے ان کی سب باتوں کو ماننا اور ان کے کلام میں سے حق و باطل کو جدا نہ کرنا اور ان کے اقوال و اعمال کے رطب و یابس میں تمیز نہ دینا اور سب کو تلقی بالقبول کرنا حقیقت میں ان کو صاحب شریعت اور اپنے آپ اس پر ایمان لانے والا بنانا ہے اگر یہ غلط خیال دلوں میں نہ سماتا تو کبھی تقلید کی ایسی جڑ مضبوط نہ ہوتی۔ اور یہ خرابی پیدا نہ ہوتی اور جس کسی کو خدا نے توفیق دی اور وہ تحقیق پر متوجہ ہوا اس نے اول اسی غلط خیال کو دل سے نکالا اور تحقیق کے درجہ پر پہنچنے کے لئے اول اسی زینہ پر قدم رکھا چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی احیا کے شروع میں پہلے ہی یہی لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کے لکھنے کا واسطہ زندہ کرنے علوم دین کے ارادہ کیا ہے اور میں نے اپنا عزم مصمم کر لیا ہے اور چونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسی بات کو سنکر لوگ تعجب کریں گے اور مقلدین اور جہلا شور و غل مچائیں گے اور ہم پر لعنت و ملامت کریں گے اور تحقیق کو بدعت بتلا دیں گے اور اسی تحقیق کو خارج اجماع کہیں گے اس لئے وہ اول ہی سے اس متعجب اور ملامت کرنے والے کی طرف متوجہ ہو کر کہتے ہیں کہ انتدب لنظم تعجبک رالعاذلیھا العاذل الغالی فی العذل من بین زمرۃ الجاھلین المسرف فی التقریع والانکار من بین طبقات

المنکرین الغافلین فلقد حل عن لسانی عقدۃ الصمت وطوت عنی عہدۃ الکلام وفلتۃ النطق ما انت مثابرہ علیہ من العمی عن جلیلۃ الحق مع اللجاج فی نصرۃ الباطل وتحسین الجہل والتشغیب علی من اثر النزوع قلیلاً عن مراسم الخلق ومال میلاً یسیراً عن ملازمۃ رسمہم الی العمل بمقتضی العلم طمعاً فی نیل ما یعبد اللہ تعالی بہ من تزکیۃ النفس واصلاح القلب کے لئے ملامت کرنے والے منکر ہمنشیں تیرے تعجب کے قطع کرنے پر متوجہ ہوتا ہوں اور اپنی زبان سے خاموشی کی گرہ کھولتا ہوں اور جس بات پر تو اپنے اندھے پن سے جما ہوا ہے اور باطل کی مدد کر رہا ہے اور جہل کو اچھا سمجھ رہا ہے اُس کو رد کرتا ہوں اور نیز اُس زور شور اور غل مچانے کو نہیں سنتا جو تو اُس پر کرتا ہے جو کہ ذرا رسم و رواج کی پابندی سے نکلنا اور بھائی بندوں کی رسمیات کو ترک کرکے خاص خدا کے لئے عمل کرنا چاہتا ہے *

جب امام غزالیؒ اپنے وقت میں پابند بیٹے رسم و رواج پر ایسی داد بیداد کرتے ہیں اور اُس سے نکلنے کو جہاد سمجھتے ہیں تو ولے بر حال ہمارے زمانہ کے کہ اب تو بات بھی زبان سے نکالنا دشوار ہے اور بھائیوں کی رسموں میں سے کسی رسم کا چھوڑنا بھی مشکل نہیں۔ وہی باتیں جو امام غزالیؒ اور بڑے بڑے محققین کہہ گئے ہیں اگر ہم اُنہیں کو نقل کریں تو ابھی کافر ہوتے ہیں اور ساری برادری سے نکالے جاتے ہیں خیال کرنے کا مقام ہے کہ دین کی بنا کس چیز پر تھی اور کس چیز پر آگئی اور مذہب کی حقیقت کیا تھی اور اب اُس کی کیا ضرورت ہوگئی جب ہم کسی دوسرے دین پر افسوس کرتے ہیں تو ہمارا سب سے زیادہ افسوس اسی بات پر ہوتا ہے کہ اُس دین کے لوگ اپنے بانیٔ مذہب کی بات پر عمل نہیں کرتے اور اپنی اصلی کتاب کو نہیں دیکھتے بلکہ اپنی بیچ کی بنائی ہوئی کتابوں پر چلتے ہیں تو کیسے افسوس کی بات ہے کہ جب یہی خرابی ہم میں بھی موجود ہو اور وہی نقص ہمارے دین میں بھی پڑ گیا ہو پس اگر ہم اپنے عیب کو نہ دیکھیں اور اپنے دین و مذہب کو اس نقص سے پاک صاف نہ کریں تو ہمارا دوسروں پر طعنہ کرنا اور غیر دین والوں کو بُرا کہنا عقل اور انصاف کے خلاف ہے *

اس زمانہ میں جب ہماری زبان سے کوئی بات خلاف کسی مشہور عالم یا نامی محدث کے نکلے تو ہم پر ملامت کے تیروں کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور ہمارا نام منکر علما اور دشمن فقہا مشہور ہوتا ہے کوئی یہ خیال نہیں کرتا کہ ایک دو عالم کی مخالفت کا کیا ذکر ہے اگر سارے عالم کے علما سے مخالفت ہو لیکن ہمارا قول یا فعل کتاب و سنت کے موافق ہو تو ہم اُس ثواب کے مستحق ہیں جو کہ کتاب و سنت پر عمل کرنے والے کو ہو سکتا ہے پس ہم کو ہمیشہ خدا اور رسول کی مخالفت کا خیال رکھنا

لازم ہے نہ علما فقہا کی مخالفت کا اور خدا کو قیامت کے دن اسی کی مخالفت کا جواب دینا پڑیگا نہ زید و عمرو کی مخالفت کا ۔

ہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ سارے علما اور کل فقہا امت کا کسی ایسے امر پر اجماع کرنا ۔ جو بالکل مخالف کتاب و سنت کے ہو غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے چنانچہ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا وہ صرف فرضی صورت ہے لیکن ہم ایک بات بھی ایسی زبان پر نہ لاوینگے جس کی مخالفت کل علما و فقہا سے ثابت ہو بلکہ وہی بات کہینگے جس کی سند اور محققین کے قولوں سے ہوتی ہو مگر اس اصول کا ہمارے پاس کچھ جواب نہیں ہے جس کو فقہا نے راجح اور مرجوح سے تعبیر کیا ہے یعنی جس کو بہت سے مولویوں نے مانا وہ قول واجب العمل ہے اور جس کو چند محققین نے مانا وہ واجب الترک ہے گو وہ کیسا ہی عمدہ اور اچھا ہو چنانچہ اس کو ہم ایک علیحدہ بحث میں بیان کرینگے ۔

اصل یہ ہے کہ جب کسی امر کا دینی ہو یا دنیوی رسمًا کامل طور پر رواج ہو جاتا ہے اور سب یا اکثر آدمی پابند اس کے ہو جاتے ہیں تو درحقیقت اس سے مخالفت کرنا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے اور اس کی تردید پر گو وہ امر نہایت ہی صحیح اور درست ہو ہر شخص آمادہ ہو جاتا ہے اور اس مخالفت کی دلائل کو گو وہ کیسی ہی سچی اور اچھی ہوں نہایت ضعیف سندوں سے ہر متنفس باطل کرنے پر مستعد ہوتا ہے ۔

مثلاً ہم اگر تقلید کے التزام کو برا بتلاویں تو اول یہی اعتراض ہوگا کہ خلاف اجماع ہے جب اس قول کو بھی ہم رد کر دیں اور بڑے بڑے صوفیوں اور محققین اور اماموں کی سند لاویں تو یہ جواب ہوگا کہ فلاں بزرگ تو صوفی تھے ان کی باتوں کو کون سمجھے اور فلاں صاحب بڑے محقق تھے ان کی سی تحقیقات کس کو نصیب ہے اور فلاں شخص بڑے متورع اور پرہیزگار تھے ان کا زہد کسے حاصل ہو اور سوائے نامی گرامی لوگوں کے اور لوگ جو رہ جاویں ان کی نسبت یہ کہہ دیا جاوے کہ وہ بدعتی اور فاسق تھے ہمارے علما نے ان کے کلام کو رد کر دیا ہے ۔ پس صوفی تو تصوف کی برکت سے اور محققین تحقیق کے سبب سے اور زاہد اور متورع اپنے زہد کے ذریعہ سے محفوظ رہے اور ان کے اقوال پر عمل کرنا سب بدعتوں کی مخالفت کے جائز نہ ٹھہرا پس اگر ہم ایسی حالت میں کتاب و سنت کو ہاتھ پر نہ اٹھالیں اور اپنے دل سے ان سب باتوں کو نکال کر خدا اور رسول کے کلام پر رجوع نہ کریں تو حقیقت میں ہم دین کو شرم کے ہاتھ پر بیچنے والے اور خدا کو پابندیٔ رسم و رواج کے سبب چھوڑنے والے اور اپنے دل کو نور ایمان سے خالی کرنے والے ہونگے ۔ اسی حالت کو دیکھکر امام غزالیؒ احیا میں فرماتے ہیں ۔ کہ

فلا یغرنک قول من یقول الفتویٰ عماد الشرع ولا یعرف علله الا بعلم الخلاف انما یشتغل بہ من
یشتغل بطلب الصیت والجاہ فکن من شیاطین الجن فی امان واحترز من شیاطین الانس فانہم
اراحوا شیاطین الجن من الناس فی الاغواء والاضلال یعنی مت مغرور ہو اس قول پر فقہا کے فتوے
شرع کا ستون ہے اور اس کی علتوں کا بغیر علم کلام کے جاننا دشوار ہے ایسی باتوں پر وہی متوجہ ہوگا
جسکو دنیا کی عزت اور شہرت منظور ہوگی پس ایسے شیطانوں کے ہوتے ہوئے اصل شیطانوں سے
بےخوف ہو جاؤ اور ان کا خوف رکھو اسلئے کہ ان شیاطین الانس نے اصل شیطانوں کو سلا دیا ہے اور
ان کی خدمت اپنے ذمہ لیکر لوگوں کو گمراہ کرکے اصل شیطانوں کو چین دیدیا ہے کہ وہ تو سوتے ہیں اور یہ
ان کا کام کرتے ہیں اور مثل اسی کے اور محققین نے بھی فرمایا ہے جیسا کہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی
رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ فتنۃ ہذا الجدال والخلاف والتعمق قریبۃ من الفتنۃ
الاولیٰ حین تشاجروا فی الملک وانتصر کل رجل لصاحبہ فکما اعقبت تلک ملکا عضوضا
فکذلک اعقبت ہذہ جہلا واختلاطا وشکوکا ووہما مالہا من ارجاء ثم نشأت بعدہم
قرون علی التقلید الصرف لا یمیزون الحق من الباطل ولا الجدال عن الاستنباط فالفقیہ یومئذ
ہو الثرثار المتشدق الذی حفظ اقوال الفقہاء قویہا وضعیفہا من غیر تمییز والمحدث من
عد الاحادیث صحیحہا وسقیمہا وہذہا کہذ الاسمار بقوۃ لحییہ ولا اقول ذلک کلیا
مطردا فان للہ طائفۃ من عبادہ لا یضرہم من خذلہم وہم حجۃ اللہ فی ارضہ وان قلوا ولم
یات قرن بعد ذلک الا وہو اکثر فتنۃ واوفر تقلیدا واشد انتزاعا للامانۃ من صدور الرجال
حتی اطمأنوا بترک الخوض فی امر الدین بان یقولوا انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارہم مقتدون
یعنی جو فتنہ علم جدال و کلام کے سبب سے علما نے پیدا کیا اور جو فساد ان کے تکلفات سے دین میں پھیلا
وہ اس فتنہ سے کم نہیں ہے جو کہ خلافت و ریاست میں ہوا تھا جس طرح پر اس جھگڑے کا یہ نتیجہ ہوا کہ
بعد اس کے سلطنت ظلم و جبر کی قائم ہوئی اسی طرح پر اس کلام و جدال کا یہ نتیجہ ہوا جہالت اور شکوک
اور توہمات کی ایسی زیادتی ہوگئی جس کی کوئی حد نہیں اور پھر تو ایسا زمانہ آگیا جس میں لوگ محض تقلید پر
قانع ہوگئے اور حق کو باطل سے جدا نہ کرسکے فقیہ وہ کہلانے لگا جو اقوال فقہا کو یاد کرکے بیہودہ بکے
اور تکلف کی باتیں کرے محدث وہ ٹھہرنے لگا جو کہ احادیث صحیح اور غلط کو حفظ کرکے بے سمجھے بوجھے
کہانیوں کی طرح نقل کرے اور سوائے چند شاذ آدمیوں کے جو خاص خدا کے بندے تھے اور جو
کسی کے ذلیل کرنے سے ذلیل نہیں ہوسکتے تھے بلکہ وہ خدا کی زمین میں اس کی حجت تھے۔
سب کے سب ایسے ہوگئے اور پھر جو زمانہ آتا گیا اس میں فتنہ بڑھتا ہی گیا اور تقلید کا زور شور
ہی ہوتا گیا یہاں تک کہ آخرکار معاملات دینی میں تحقیق کرنے کی عادت بھی جاتی رہی اور ان بزرگوں

کی رسموں ہی پر وینداری رہ گئی ؛

چونکہ میں اس مقام پر تقلید کے کمال اور تحقیق اور اجتہاد کے ترک ہونے کا حال بیان کر رہا ہوں اس لئے وہ تنزلات جو علم اور تحقیق نے اس تقلید کے سبب سے پائے اُس کو ایک بڑے فقیہ کے قول سے ثابت کرتا ہوں ؛

محقق ابن کمال باشا نے فقہا کے طبقات کو جس طور پر ذکر کیا ہے اُس میں سے نقل کرتا ہوں تاکہ ثابت ہو کہ تقلید میں بھی کتنے درجے اُس فقیہ نے قائم کئے ہیں محقق موصوف نے فقہا کے سات طبقے بیان کئے ہیں ؛

پہلے طبقہ کا نام مجتہدین فی الشرع ہے جن کا کام ہے استخراج کرنا مسائل کا کتاب سنت سے ا۔ قائم کرنا قواعد اور اصول کا واسطے استخراج مسائل کے ؛

اس طبقہ میں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور امام مالک اور امام احمد حنبل رضی اللہ تعالے عنہم داخل ہیں ؛

دوسرے طبقہ کو مجتہدین فی المذہب کہتے ہیں اس طبقہ میں وہ لوگ داخل ہیں جو مجتہدین فی الشرع کے بنائے ہوئے اصول و قواعد کی تقلید کرتے ہیں اور بہ تسلیم اُن قواعد اور اصول کے احکام و مسائل کا استخراج کرتے ہیں اور گو کہ اس طبقہ کے لوگ مجتہدین فی الشرع سے بعض احکام فروعی میں مخالفت کرتے ہیں مگر وہ مجتہد اور امام کے اصول پر چلتے ہیں اُسی کے مذہب میں داخل سمجھے جاتے ہیں اور معارضین فی المذہب سے علیحدہ سمجھے جاتے ہیں مثلاً قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہما اور دیگر یاران امام ابوحنیفہ رح اس طبقہ کے لوگ ہیں اس لئے کہ وہ اُنہیں اصول سے جو امام ابوحنیفہ کے قائم کئے ہوئے ہیں استخراج مسائل کرتے ہیں اور مثل امام شافعی وغیرہ کے اُن سے اصول میں مخالفت نہیں کرتے مگر بلحاظ اصول مقررہ اُن کے احکام میں اُن سے مخالف ہو جاتے ہیں ؛

تیسرا طبقہ مجتہدین فی المسائل کہلایا جاتا ہے اس طبقہ میں وہ لوگ داخل ہیں جو اپنے امام کی کسی شئے میں مخالفت نہیں کرتے نہ اصول میں نہ فروع میں اُن کو استخراج مسائل کی قدرت نہیں ہوتی مگر جن مسائل کو صاحب مذہب نے صاف بیان نہیں کیا اُن کو اپنے امام کے مقرر کئے ہوئے اصول اور قواعد کی پابندی سے استنباط کر سکتے ہیں اس طبقہ میں داخل ہیں خصاف اور اور ابو جعفر طحاوی اور ابو الحسن کرخی اور شمس الائمہ حلوانی اور شمس الائمہ سرخسی اور فخر الاسلام بزدوی اور فخر الدین قاضی خاں وغیرہ ؛

۵۱ شامی حاشیہ درمختار ؛

چوتھا طبقہ اصحاب تخریج کہلایا جاتا ہے اس طبقہ میں وہ مقلدین داخل ہیں جو کسی قسم کے اجتہاد کی قدرت نہیں رکھتے۔ اصول اور قواعد کا بنانا اور مسائل کا استخراج کرنا اور پچھلے طبقہ سے مخالفت کرنا کیسا وہ کسی طرح پر اجتہاد کا نام ہی نہیں لیتے مگر بسبب ضبط رکھنے اور قواعد کے ان کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ کسی قول مجمل ذو وجہین کی تفصیل اور کسی حکم مبہم محتمل امرین کی تشریح کر دیں مگر وہی قول اور وہی حکم جو کہ صاحب مذہب سے یا اُن کے اصحاب سے منقول ہو اور اس میں اُن کو اپنے امام کے اصول پر نظر رکھنا اور اسی قسم کی دوسری فروع پر قیاس کرنا اور دیگر نظائر اور امثال کا خیال رکھنا ضروریات سے ہے اس طبقہ میں امام رازیؒ اور مثل اُن کے اور شخص داخل ہیں اور جو ہدایہ میں لکھا ہے کذا فی تخریج الکرخی و تخریج الرازی وہ اسی قبیل سے ہے۔

پانچواں طبقہ اصحاب ترجیح کہلایا جاتا ہے۔ یہ وہ مقلدین ہیں جو بعض روایات کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں مثل ابو الحسن قدوری اور صاحب ہدایہ وغیرہ کے جن کو اس کہنے کی قدرت ہے کہ هذا اولیٰ هذا اصح هذا اوفق للناس۔

چھٹا طبقہ ان مقلدین کا ہے جو کہ قوی اور ضعیف کی تمیز میں قدرت رکھتے ہیں اور اقوال مردودہ اور روایات ضعیفہ کی نقل نہیں کرتے مثل صاحب کنز اور صاحب مختار اور صاحب وقایہ اور صاحب مجمع وغیرہ اہل متون کے۔

ساتواں طبقہ ان مقلدین کا ہے جو اس کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور موٹے دُبلے میں کچھ تمیز نہیں کر سکتے۔

اب جو شخص ان طبقات فقہا پر غور کرے وہ خود سوچ سکتا ہے کہ تقلید کی ابتدا کب تھی اور انتہا کیا ہوئی زیادہ تشریح کی کچھ حاجت نہیں ہے اس بات پر خیال کر کے لوگوں نے تقلید کو اختیار کیا اور اجتہاد اور عمل بالحدیث سے ہاتھ اُٹھا لیا کہ جب بڑے بڑے علما کہ جو امام اور شمس الائمہ کہلائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے مؤلف جن کی کتابوں کے پڑھنے سے لوگ عالم اور فقیہ ہو جاتے ہیں چھٹے طبقہ اور پانچویں طبقہ میں پڑے ہوئے ہیں تو پھر دوسرا کون ہے جو اجتہاد کر سکتا ہے یا کتاب و سنت سے مسائل کا استخراج کر سکتا ہے اور اس امر کو کہ یہ قول اُن کا صحیح ہے۔ یا غلط ہم پیچھے بیان کرتے ہیں۔

جو کہ ہمارے اس بیان سے اجتہاد کے خاتمہ کا زمانہ اور تقلید محض پر عمل کرنے کا حال بخوبی معلوم ہو گیا اس لئے اب ہم اس امر کو بیان کرتے ہیں کہ باہم ائمہ کے مسائل فقہی میں اختلاف کیوں ہوا اگرچہ جو مختصر کیفیت بنا مذاہب کی ہم نے اوپر بیان کی اس سے سبب اختلاف کا

بھی معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ اس اختلاف کو دیکھ کر لوگوں کو بہت سے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور ایک دین اور ایک شریعت میں ایسی کثرت سے اختلاف ہونے پر ہر شخص کو حیرت ہوتی ہے کوئی پوچھتا ہے کہ جب قرآن اور حدیث پر سب کا عمل ہے تو پھر کیا قرآن و حدیث میں باہم اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جب تبع تابعین کے مذہب کی بنا تابعین پر اور تابعین کی صحابہ پر ہے تو کیا صحابہؓ باہم مختلف تھے اگر تھے تو باوجودیکہ سب نے ایک ہی نبیؐ کو دیکھا اور ایک ہی پیغمبر سے دین کو لیا تو پھر آپس میں ان کے اختلاف کیونکر ہوا اور باوجود اس اختلاف کے جب لوگ یہ سنتے ہیں کہ چاروں مذہب حق ہیں اور جو اختلاف ان میں ہے وہ رحمت ہے تو اور بھی زیادہ تعجب ہوتا ہے اور دل میں اور ہی کچھ خیال کرکے ہر شخص ساکت ہو جاتا ہے اس لئے ہم اس اختلاف کے اسباب کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں سے شبہات دور ہوں۔ اور وہ اس اختلاف فروعی کو اصول کا اختلاف سمجھ کر دل میں اپنے دین کی حقیقت میں شک نہ کرنے لگیں۔

یہ بات تو ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ تبع تابعین کے مذہب کی بنا تابعین پر اور انکی صحابہؓ پر ہے تو اختلاف باہم صحابہ کے ہوا وہی اختلاف تبع تابعین میں چلا آیا اور جب تبع تابعین نے مذہب کی بنیاد ڈالی تو ان کے آپس میں بھی وہی اختلاف رہا اسلئے ہم اول صحابہ میں باہم اختلاف ہونے کا سبب بیان کرتے ہیں۔

پہلے اس امر کو ذہن نشین کرنا چاہیے کہ اختلاف جو مسلمانوں میں بعد زمانۂ نبوت کے ہوا وہ دو قسم کا ہے۔ ایک اختلاف عقائد اور اصول میں دوسرے اختلاف مسائل اور فروع میں۔ اختلاف عقائد اور اصول کا وہ ہے جو کہ اصول دین میں ہو مثل توحید اور نبوت اور معاد اور فرضیت روزہ اور نماز اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے یا کسی عقیدہ میں عقائد دین کے ہو مثل خلافت اور حقیقت اجماع صحابہ اور وجوب محبت اہلبیتؑ اصحابؓ و عدم تکفیر اہل قبلہ اور مرتکبان کبائر کی اور مثل اس کے اور عقائد جن پر اعتقاد کرنا بنصوص صریح ضروری ہے پس جو شخص عقائد اور اصول میں مخالف ہے وہ جماعتی اور اہل سنت کے گروہ سے خارج ہے مثل معتزلہ اور قدریہ اور مرجیہ اور شیعہ اور خوارج کے اور نہ صحابہ میں اور نہ تابعین میں اور نہ تبع تابعین میں نہ کسی امام میں ائمہ اربعہ سے ایسا اختلاف ہوا بلکہ سب اصول اور عقائد میں متفق ہیں اور ایک امر میں بھی ضروریات دین سے اور ایک عقیدہ میں بھی اعتقادات اہل سنت سے باہم مختلف نہیں ہیں اس لئے چاروں مذہب اہل سنت ہی کہلائے جاتے ہیں۔

دوسرا اختلاف مسائل اور فروع میں۔ مسائل اور فروع سے فقہ کے مسائل مراد ہیں۔ اور اُن میں چاروں مذہب البتہ باہم مخالف ہیں اور صحابہ بھی باہم مخالف تھے اس لئے اختلاف کے اسباب بیان کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ صحابہ میں بعد زمانہ نبوت کے کیونکر اختلاف ہوا ۞

مدار صحابہؓ کے اقوال اور افعال اور احکام اور مسائل کا قرآن و حدیث پر تھا اور چونکہ قرآن پیغمبرؐ صاحب ہی کے سامنے جمع ہو گیا تھا اسلئے کسی ایسے مسئلہ میں جو قرآن میں صاف موجود ہے باہم اختلاف نہیں ہوا اور احادیث پیغمبر صاحب کے روبرو جمع نہ ہوئی تھیں اس لئے جن مسائل کا استخراج حدیث پر موقوف تھا اور ہے اُنہیں میں اختلاف ہوا۔ اور اُس کے کئی سبب[۵۱] ہیں ۞

اوّل اختلاف سماعت یعنی ایک صحابی کا کسی حدیث یا حکم نبویؐ کو سُننا اور دوسرے کا نہ سُننا مثلاً پیغمبر صاحب نے کوئی حکم دیا یا کچھ فرمایا یا کوئی فتویٰ دیا تو جو موجود تھا اُس نے سُنا اور دیکھا اُس نے تو اُسی پر عمل کیا دوسرے صحابی نے اُسے نہ سُنا نہ دیکھا جس صحابی نے سنا اور دیکھا تھا اُس سے اُس دوسرے صحابی کو روایت نہ پہنچی تو اُس دوسرے صحابی نے جب ویسا ہی معاملہ پیش آیا خود اجتہاد کیا پس اگر اُس حدیث کے موافق ہوا تو دونوں صحابی متفق ہوتے اور اگر اجتہاد میں خطا ہوئی تو اُن میں اختلاف ہوا ۞

دوسرے ترک اجتہاد یعنی صحابی کا اپنے اجتہاد سے پھر جانا مثلاً صحابی نے کسی امر میں اجتہاد کیا اس سبب سے کہ کوئی حدیث اُس کو نہ پہنچی تھی اور پھر اُس کو کسی سے وہ حدیث پہنچ گئی تو اُس نے اپنے اجتہاد کو ترک[۵۲] کیا اور حدیث پر عمل کیا لیکن جن لوگوں نے پہلے اجتہاد کو صحابی کے سنا اور اُس سے رجوع کرنے کی خبر اُنہیں نہ ملی اُنھوں نے صحابی کے پہلے ہی قول پر عمل کیا ۞

تیسرے اشتباہ فی الحدیث یعنی حدیث کی صحت میں شک رہنا اور اُس پر کسی صحابی کا عمل نہ کرنا یہ تو صحابی نہیں کر سکتا تھا کہ باوجود صحت کسی حدیث کے اُسکو ترک کرتا اور اپنے اجتہاد پر عمل کرتا مگر جب اُس کی کسی حدیث کو ضعیف اور قابل کامل اعتبار کے نہ ہوتا تو صحابی اپنے اجتہاد پر قائم رہتے اور اُس حدیث کو صحیح نہ جان کر اُس پر عمل نہ کرتے اور بعض حدیث کا نام سُنتے ہی اُس پر عامل ہو جاتے اور اُس کے ضعف اور قوت کو نہ دیکھتے ۞

چوتھے سمجھ میں اختلاف ہونا یعنی چند صحابیوں نے پیغمبر خدا کو ایک کام کرتا ہوا دیکھا کسی نے اُس کو عبادت پر کسی نے اُس کو عادت پر کسی نے اُسکو قربت پر کسی نے اُس کو

---

[۵۱] دیکھو حجۃ البالغہ ۞

[۵۲] اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود اُس اجتہاد میں کچھ نقص پایا اور اُس کو چھوڑ دیا ۞

اباحت پر محمول کیا اور اس سے باہم اختلاف ہوا۔

پانچویں سہو و نسیان یعنی کسی صحابی نے گو خود پیغمبر صاحب سے کچھ سنا یا کچھ کرتے دیکھا مگر اُسے یاد نہ رہا اور بھول گیا۔

چھٹے اختلاف ضبط یعنی پیغمبر صاحب نے کسی امر میں کچھ فرمایا یا حکم دیا اور کوئی صحابی اُس کا مطلب اور ہی کچھ سمجھا جیسا کہ حضرت عمرؓ یا حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ مردہ کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے کہ اس حدیث کو سُنکر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے راوی نے غلطی کی ہے بلکہ حقیقت اُس کی یہ ہے کہ پیغمبر صاحب ایک یہودیہ کے جنازہ پر گذرے کہ اُس کے گھر والے روتے تھے حضرت نے فرمایا کہ یہ تو روتے ہیں اور وہ قبر میں عذاب دی جاتی ہے پس مطلب یہ تھا کہ یہ تو اُس کے لیے روتے ہیں اور وہ اپنے عذاب میں مبتلا ہے نہ وہ مطلب ہے جو راوی نے سمجھا اور جس سے عذاب کو رونے کا معلول سمجھ کر ہر مردہ کی نسبت اس حکم کو عام تصور کیا۔

ساتویں علت حکم میں اختلاف ہونا یعنی پیغمبر صاحب نے کوئی حکم دیا یا کوئی کام کیا اور دیکھنے والوں نے اپنے نزدیک اُس کی علت[۵۱] اور وجہ قائم کی اور اُس میں اختلاف ہوا مثلاً پیغمبر صاحب ایک جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے تو کسی نے قیام کی علت تعظیم ملائکہ خیال کی۔ کسی نے ہول موت اُس کی علت سمجھی اور اپنی اپنی سمجھ کے موافق اُس کی تعمیم در تخصیص کی رائے قائم کی۔

آٹھویں مختلف حدیثوں کے جمع کرنے میں اختلاف ہونا ۔ جو کہ عادات اور مباحات اور سنن میں ایک ہی امر کی پابندی حضرت کو نہ تھی اور احکام میں بھی تکمیل اور اصلاح مناسبت ہوتی رہتی تھی اس لئے جو قول یا فعل یا حکم مختلف ہوتا اُس کے توافق میں صحابہ میں اختلاف ہوتا۔ کوئی اباحت کو بسبب ضرورت کے اور نہی کو بوجہ انقضاء ضرورت کے خیال کرتا۔ کوئی ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ سمجھتا۔ اور جو صحابی صاحب فراست اور صاحب علم تھے وہ عادات کو عبادات سے اور سنن کو واجبات سے جُدا کرتے اور ایک کو دوسرے میں نہ ملاتے اور جو اس میں تمیز نہ کرتے وہ سب کو عبادات اور واجبات ہی خیال کر کے اختلاف عادات کو اختلاف فی العبادت جانتے۔

جو کہ ہم اختلاف مذاہب کا سبب بھی بیان کر چکے اس لئے ہم اُس فرق کو بیان کرتے ہیں جو اجتہاد اور عمل بالحدیث میں ہے۔

[۵۱] یہ خرابی اس لئے پڑتی ہے کہ علت کا علت ہونا نص سے قرار نہیں پایا بلکہ اپنی سمجھ سے قرار دیا۔

عمل بالحدیث اور اجتہاد میں جو فرق ہے اُس کا بیان

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جن کو عمل بالحدیث اور اجتہاد میں فرق نہیں معلوم ہوتا بلکہ جب وہ سُنتے ہیں کہ جو لوگ حدیث پر عمل کرتے ہیں اور اصحاب حدیث کہلائے جاتے ہیں ان مسائل کو جن کی تصریح حدیث میں نہیں ہے اپنے قیاس سے استخراج کرتے ہیں اور جو لوگ اجتہاد کرتے ہیں اور اصحاب الرائے کہلائے جاتے ہیں وہ بھی اُن مسائل میں جو بتصریح کتاب و سنت میں موجود ہیں اجتہاد نہیں کرتے اور اُسی پر عمل کرتے ہیں اور دونوں کا ماخذ کتاب و سنت ہے اور دونوں کو قیاس سے کام لینا پڑتا ہے تو یہ دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے اس لئے دونوں میں جو فرق ہے اُس کو میں بیان کرتا ہوں ٭

اگلے زمانہ میں یعنی تابعین اور تبع تابعین کے وقت میں دو قسم کے عالم تھے ایک تو وہ جو رائے اور قیاس سے بہت بچتے تھے اور فتوے اور استخراج سے بہت ڈرتے تھے اور سوائے اشد ضرورت کے استنباط کرنے کو پسند نہ کرتے تھے اُن کی ساری ہمت اس طرف مصروف رہتی تھی کہ احادیث نبوی کی روایت کریں۔ اور جہاں تک ہوسکے تمام احکام اور مسائل کو انہیں سے ثابت کردیں اور وہ اسی واسطے احادیث کے جمع کرنے میں بہت سی محنت کرتے تھے چنانچہ جب انہوں نے احادیث کو جمع کرلیا اور ضعیف اور قوی کو علٰحدہ کرلیا تو انہوں نے کتاب سنت ہی کو اصول استخراج مسائل کا ٹھہرالیا اور اسی کی تصحیح اور تنقیح کے لئے قواعد مقرر کئے تاکہ معلوم ہوجاوے کہ کون سی حدیث اصلی ہے اور کون سی بے اصل ہے ٭

پس اس طبقہ کے لوگوں کو جب ضرورت کسی مسئلہ کی ہوتی تو وہ قرآن سے رجوع کرتے اگر اُس سے بصراحت نکل آتا تو پھر کسی اور طرف توجہ نہ کرتے اگر اُس سے معلوم نہ ہوتا یا اُس میں اور احتمالات ہوتے تو وہ سنت پر رجوع کرتے اور جو کچھ حدیث میں پاتے اس پر عمل کرتے اور حدیث پر عمل کرنے کے لئے نہ وہ اُس کا لحاظ کرتے کہ اور فقہا اُس پر عمل کرتے ہیں یا نہیں اور سب لوگ اُس پر چلتے ہیں یا نہیں اور مجتہدین کا اجتہاد اُس کے مطابق ہے یا نہیں بلکہ وہ اُس کی بھی پرواہ نہ کرتے کہ صحابہؓ اور تابعین نے بھی اُس پر عمل کیا ہے یا نہیں بلکہ اگر کوئی حدیث ایسی ہوتی کہ ایک ہی شہر کے لوگ اُس سے واقف ہوتے یا ایک ہی گھر کے لوگ اُس پر عامل ہوتے تب وہ اپنے عمل کی سند کے لئے اُسے لے لیتے اور سوائے اس کے کہ وہ حدیث کی صحت ثابت کرلیں اور کسی طرف توجہ نہ کرتے اور نہ کسی اصول اور کسی قاعدہ کی پابندی کرتے ٭

اگر حدیث سے اُس کا پتہ نہ چلتا تو وہ صحابہ اور تابعین کے اقوال پر نظر کرتے پس اگر اُس بات

پر جمہور صحابہ اور تابعین کو متفق پاتے تو فبہا ورنہ بلا لحاظ کسی قوم اور کسی شہر اور کسی فرقہ کے جس کو وہ اپنے نزدیک زیادہ عالم اور فقیہ اور متقی جانتے اُس کے قول کو اختیار کرتے۔

اگر اُس سے بھی مطلب نہ نکلتا یعنی اُس مسئلہ کا قول صحابہ و تابعین سے حال معلوم نہ ہوتا تو وہ قیاس کرتے مگر اُن کا قیاس منطقی قیاس کی مانند نہ ہوتا تھا اور اس کیلئے کچھ دقیق اصول اور مشکل قواعد کی پابندی نہ تھی بلکہ ان کا قیاس یہ تھا کہ وہ عمومات کتاب و سنت اور اُس کے اشارات اور مقتضیات پر تامل کرتے اور صرف اپنے یقین اور اطمینان قلبی پر لحاظ کرتے اُس کی علت نکال لیتے اور جہیں میں وہ علت پاتے اور اس پر وہی حکم لگاتے اور اور مسائل کی نظیریں اور مثالیں دیکھکر اپنا کام چلا لیتے۔

یہ طریقہ ان کا ٹھیک ٹھیک اصحاب سلف کا سا تھا اور یہی قاعدہ استخراج مسائل کا صحابہ میں جاری تھا اور اُس کے ثبوت میں ہزارہا اقوال صحابہ کے موجود ہیں جن میں سے کچھ کچھ ہم آئندہ بیان کرینگے۔

غرضیکہ اس طور پر مسائل کے استخراج کرنے والے اصحاب حدیث کہلائے گئے اور چونکہ وہ کسی اصول اور کسی قاعدہ کے پابند نہ ہوئے اس لئے ان کا قیاس بھی قیاس اور رائے میں داخل نہ ہوا۔ چنانچہ اسی گروہ میں سے ہوئے ہیں عبدالرحمٰن بن مہدی اور یحییٰ بن سعید اور یزید بن ہارون اور عبدالرزاق اور مسدد اور ہناد اور امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ اور فضل بن دکین اور علی مدنی وغیرہ کہ یہ سب اصحاب حدیث میں داخل ہیں۔

اِس بات کے سُننے سے بھی لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اتنی حدیثیں کہاں سے ملی ہونگی جن سے سب مسائل نکل آئے ہوں اور بغیر اُس قیاس اور رائے کے جسے مجتہدین نے اختیار کیا ان کا کام چلا ہو لیکن اُن کا تعجب اِس سے رفع ہوسکتا ہے کہ وہ انکی کتابوں کو دیکھیں اور جو کچھ محنتیں انہوں نے احادیث کے جمع کرنے میں اپنے اوپر اُٹھائیں اُس پر خیال کریں تاکہ اُن کو معلوم ہو کہ جن لوگوں نے اس قاعدہ پر فقہ کی تدوین کی ہے اُن کو کوئی ایسا مسئلہ جس کو اگلے لوگوں نے نکالا تھا یا اُن کے وقت میں مجتہدین نے قیاس سے استخراج کیا تھا ایسا نہ ملا جس میں کوئی حدیث مرفوع یا متصل یا مرسل یا موقوف صحیح یا حسن یا لائق اعتبار نہ ملی ہو یا خلفائے راشدین کے آثار اور فقہائے نامی کے اقوال سے اُس کا ثبوت نہ ہوتا ہو یا اُن کے عمومات اور اشارات سے اُس کا استنباط نہ ہوسکتا ہو بے شک اس میں یہ بڑی دقت تھی کہ بہت سی احادیث کرنی پڑتیں اور انکی تصحیح اور تنقیح کی محنت اُٹھانی پڑتی اور اُن کے ناسخ اور منسوخ کا لحاظ رہتا اور جو مختلف حدیثیں ہوتیں اُن کا اختلاف دُور کرنا یا اُسکے وجوہات کا دریافت کرنا پڑتا۔

جو کوئی اصحاب حدیث کی فقہ کی تدوین پر غور کرتا ہے اُس کی آنکھوں کے سامنے بہت سی عجیب غریب باتیں پھر جاتی ہیں اور اُس کے دل پر فنون احادیث پر تامل کرنے سے ایک ورہی قسم کی تاثیر ہوتی ہے ٭

افسوس ہے کہ جس مضمون کو ہم نے لکھنا شروع کیا ہے اُس کیلئے دفتر کے دفتر چاہئیں اور اگر مختصر طور پر بھی کچھ کچھ ہم لکھیں تو بھی ایک بڑی کتاب ہو جاوے اور ہم چند صفحوں میں اُسے ختم کیا چاہتے ہیں اس لئے بہت ہی مختصر طور پر اب ہم اُس کو بھی بیان کرتے ہیں کہ اصحاب حدیث نے تدوین فقہ کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا اور پھر اُس کے کتنے درجے اور طبقے ہوگئے پس پہلا[۱] طبقہ اہل حدیث کا وہ ہوا جس نے احادیث کو جمع کیا اور فقہی مسائل کا اس پر مدار رکھا۔ اس طبقہ کے لوگوں کے نام اوپر ہم لکھ چکے ہیں۔ پھر دوسرا طبقہ وہ ہوا جس نے حدیث کے دوسرے فن پر توجہ کی یعنی اُن حدیثوں کو جن کی صحت پر بڑے بڑے اہل حدیث کا اجماع تھا علیحدہ کیا اور ان حدیثوں کو جو متعلق فقہ کے تھیں جن پر شہروں کے فقیہ اور قصبوں کے عالم اپنا مذہب چلاتے تھے جدا کر کے ہر حدیث کو باعتبار اُس کے اقسام کے ترتیب دیا۔ اس طبقہ میں امام محمد اسمٰعیل بخاری اور مسلم اور ابو داؤد اور عبد بن حمید اور دارمی اور ابن ماجہ ابو یعلی اور ترمذی اور نسائی اور دار قطنی وغیرہ داخل ہیں ٭

تیسرے طبقہ میں وہ لوگ داخل ہیں جو بخاری اور مسلم کے پہلے تھے یا ان کے زمانہ میں یا اُن کے بعد ہوئے اور جنہوں نے مسانید اور جوامع اور مصنفات کو تالیف کیا۔ اُنہوں نے جو حدیث پائی اُسے جمع کر دیا نہ اُس کو چھانٹا نہ اُس میں اقسام حدیث کو بیان کیا نہ اُس کی کچھ ترتیب ایسی کی کہ جس پر عمل آسانی سے ہو سکے اور پھر پیچھے بھی محدثین نے اُس کی صحت و سقم پر چنداں توجہ نہ کی۔ چنانچہ اسی طبقہ میں ابو علی اور طیالسی اور بیہقی اور عبد الرزاق اور ابی بکر ابن شیبہ اور عبد بن حمید اور طحاوی اور طبرانی ہیں ٭

چوتھے طبقہ میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے بہت عرصہ کے بعد حدیث کی کتابوں کو لکھنا شروع کیا اور جو حدیثیں پہلے اور دوسرے طبقہ میں جمع نہ ہوئیں اور مسانید اور جوامع میں چھپی ہوئی پڑی تھیں یا اُن واعظوں اور خوش گپ عالموں کو یاد تھیں جو ضعفا میں داخل تھے اور جن کی حدیث کو محدثین محققین پایہ اعتبار سے ساقط جانتے تھے اُن کو انہیں نے جمع کر دیا اور آثار صحابہ و تابعین کو اور اخبار بنی اسرائیل کو اور کلام حکما اور وعاظ کو بھی شامل کر دیا چنانچہ عمدہ حدیث اس طبقہ کی وہ ہے جو کہ ضعیف محتمل ہو اور موضوعات کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی طبقہ

[۱] اسکی تفصیل ہم نے ایک علیحدہ مضمون میں جو بہ نسبت کتابوں کے لکھا ہے کی ہے وہ بھی عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ چھپیگا ٭

مادہ ابن جوزی کی کتاب موضوعات کا ہے ۔

پانچویں طبقہ میں وہ لوگ داخل ہیں جنھوں نے ان باتوں کو جو فقیہوں اور صوفیوں اور مورخوں کی زبانوں پر تھیں اور جن کی کچھ اصل چاروں طبقات میں نہ تھی لے کر حدیث میں داخل کر دیا اور انہیں احادیث پر اہل بدعت اور معتزلہ وغیرہ نے سند کر کے اہل سنت پر اعتراضات کرنا شروع کیا اور بہت سے عالموں نے دھوکا کھایا خصوصاً ان حدیثوں میں جنکو کلام بلیغ اور فصیح میں ادا کیا تو ان احادیث سے سوائے بڑے محقق محدث کے ہر شخص نے دھوکا پایا جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں ومنها ما دسه الماجن في دينه العالم بلسانه فاتى باسناد قوى لا يمكن الجرح فيه وكلام بليغ لا يبعد صدوره عنه صلى الله عليه وسلم فاثار في الاسلام مصيبة عظيمة لكن الجهابذة من اهل الحديث يوردون مثل ذلك على المتابعات والشواهد فتهتك الاسناد ويظهر العوار غرضکہ سوائے چوتھے اور پانچویں طبقہ کے باقی طبقات اہل حدیث کے ایسے ہیں کہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں اس عمل کرنے سے آدمی اہل حدیث ہو سکتا ہے اور اپنی فقہ اور مسائل کا مدار طبقہ اولیٰ اور ثانیہ کی کتابوں پر کر سکتا ہے اور جو لوگ اب تک اصحاب حدیث ہوئے اور ہیں اُن کا اسی پر عمل تھا اور ہے ۔

یہ کیفیت جو باختصار ہم نے اہل حدیث کی بیان کی سمجھنے والے کیلئے اصحاب حدیث کے طریق تدوین فقہ کے لئے کافی ہے اس لئے اب ہم مجتہدین اور اصحاب الرائے کے طریق اور ان کے اصول کو بیان کرتے ہیں ۔

اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگلے زمانہ میں دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو رائے اور قیاس سے بہت بچتے تھے اور فتوائے استخراج سے بہت ڈرتے تھے اور حدیثوں ہی کو جمع کر کے انہیں سے مسائل نکالتے تھے اور اس فرقہ کو اصحاب حدیث کہتے تھے چنانچہ اس کا حال اوپر مذکور ہو چکا ۔

دوسری قسم میں وہ لوگ داخل تھے جو کہ فتوائے اور استخراج ہی کو دین سمجھتے تھے اور رائے اور قیاس سے مسائل کا استنباط کرنا ہی اچھا جانتے تھے اور فقہ کو دین کی بنا گنتے تھے اور اس کے پھیلانے ہی کو دین کا پھیلانا سمجھتے تھے اور احادیث نبوی کا بہت لحاظ کرتے تھے اور ان میں کمی بیشی ہو جانے سے بہت ڈرتے تھے اُن کا قول تھا کہ ہم پیغمبر صاحب تک اپنے مسائل کا سلسلہ نہیں پہنچاتے بلکہ ان سے پیچھے ہی پر ختم کر دینے کو پسند کرتے ہیں تاکہ جو کچھ نقصان یا زیادتی ہو وہ اُنہیں لوگوں کی گردن پر رہے ہم مواخذہ سے محفوظ رہیں چنانچہ ابراہیم نخعی کا مقولہ تھا کہ قال عبد الله وقال علقمه احب الينا کہ یہ کہنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کہا عبداللہ نے ایسا اور کہا علقمہ نے ویسا پس ان لوگوں کو جب ضرورت فقہ کی تدوین کی ہوئی تو اُن

کے پاس اتنی حدیثیں پیغمبر کی اور آثار صحابہ کے نہ تھے جس سے وہ اپنے مسائل کو ان سے نکال سکیں اور صرف انہیں چند آسان اصول کی پابندی سے جن سے اہل حدیث احکام نکال لیتے تھے اپنا کام چلا سکیں انکے لوگوں نے اس بات کو بھی قبول یا پسند نہ کیا کہ وہ اپنے اپنے شہروں کے علما اور فقہا کے قولوں کے پابند رہیں اور اور شہروں اور مقاموں کے فقہا اور علما کے اقوال کی تحقیق کرکے اُن سب کو ملاویں اور ان سے بحث کرکے اپنا کام نکالیں بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو براہ کسر نفسی اس لائق نہ جانا اور اپنے اماموں اور استادوں کو اعلیٰ درجہ پر پہنچا ہوا سمجھ کر اوروں کی طرف رجوع کرنا یا اُن کے اقوال کو تحقیق کرنا فعل عبث تصور کیا اور اپنی ہمت کو اپنے ہی شہروں کے علما اور اپنے ہی استادوں اور اماموں کے اقوال پر قناعت کر لینے پر ختم کر دیا۔ چنانچہ کسی نے کہا کہ عبد اللہ سے زیادہ کوئی محقق نہیں ہے کسی نے کہا کہ علقمہ سے اچھا کوئی نہیں ہے۔ غرضکہ ایسے لوگوں کے پاس مادہ احادیث اور آثار کا بہت سا نہ تھا اور ان کا علم چند شخصوں ہی کے علم پر محدود تھا پس جب ایسے لوگوں کو فقہ کی تدوین کی ضرورت ہوئی اور خدا نے ان کے ذہن کی تیزی اور عقل کی چالاکی ایسی دی تھی کہ وہ اپنی فطانت اور فراست اور سرعت انتقال سے تخریج مسائل کی قدرت کامل رکھتے تھے اور چند ہی اصول سے وہ بے انتہا جزئیات نکال سکتے تھے تو انہوں نے اپنی ہی اصحاب اور یاروں اور استادوں کے اقوال اور احادیث کو مدار فقہ کا بنایا اور اُسی تھوڑے سے سرمایہ سے فقہ کی دولت کو بڑھانا چاہا۔ تو اُنہوں نے فقہ کو تخریج کے قاعدہ پر ترتیب دیا اور ہزاروں احادیث کے یاد کرنے اور خیال رکھنے سے اپنے تئیں بچایا۔

تخریج کا قاعدہ کیا تھا یہ تھا کہ اُنہوں نے اپنے اُستاد یا امام جسکو وہ قابل استناد سمجھتے اُس کی کتاب اور اقوال کو پیش نظر رکھا اور مسائل کو انہیں سے استخراج کرنا شروع کیا۔ اگر کوئی مسئلہ اس میں بہ تصریح ہوتا تو خیر ورنہ اُن کے کلام کے عمومات پر لحاظ کرنے اور اُسی صورت پر اُس مسئلہ کو نکال لیتے یا اُن کے کلام کے اشارات ضمنی پر خیال کرنے اور اُس سے استنباط کرتے پس اُن کے کلام یا اشارات اور مقتضیات ایسے ہوتے کہ اُس سے مطلب نکل آیا یا اُن میں ایسے مسائل بہ تصریح مذکور ہوتے کہ مثل اس کے اور مسائل اُسی نظیر کے اُس پر محمول کر لئے جاتے۔ اگر اُن سے بھی کام نہ چلتا تو ان کے کھوئے ہوئے حکموں کی علت دریافت کرتے اور جن مسائل کی اُنہوں نے تصریح نہ کی تھی اُسی علت کے اتحاد سے اُس پر حکم قائم کر لیتے یا اُن کے بعض کلام ایسے ہوتے کہ اگر دو کو ملا دیں تو بموجب قیاس اقترانی یا شرطی کے نتیجہ نکل آتا اور اُس سے مسئلہ معلوم ہو جاتا یا ان کے کلام ایسے ہوتے کہ جن کا مطلب مثالوں ہی میں مذکور ہوتا اور کوئی

حد جامع مانع اُس کی نہ ہوتی تو ایسے کلام کی تحقیق کے لئے اہل زبان کی طرف رجوع کرنا پڑتا اور تحصیل قوانیات اور ترتیب مقدمات اور ضبط مہمات اور تمیز مشکلات کے لئے تکلفات علمی کرنا پڑتے یا اُن کا کلام دو وجہوں کا متحمل ہوتا تو ایک کی دوسرے پر ترجیح کرنے یا ایسا ہوتا کہ جس کی دلالت پوشیدہ ہوتی اُس کو صرف بیان کرنے یہاں تک کہ ایسی تخریج کرنے والوں میں سے بعضے ایسے ہوئے ہیں کہ جنہوں نے اپنے اماموں ہی کے فعل اور سکوت سے مسائل میں استدلال کیا ہے اسی واسطے اُن کی کتابیں ایسے لفظوں سے بھری ہوئی ہیں جن سے ہمارے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً القول المخرج لفلان کذا او یقال علی مذہب فلان او علی اصل فلان او علی قول فلان جواب المسئلۃ کذا او کذا پس جس طرح پر اصحاب حدیث اپنے مسئلوں کو احادیث ہی سے نکالنا پسند کرتے تھے اور اسی طرح پر اصحاب تخریج اپنے مسائل کو اپنے ہی ائمہ کے اقوال سے نکالتے تھے اور چونکہ اصحاب حدیث کی نظر بہت سی حدیثوں پر تھی اور اُن کو اکثر سب مسائل میں احادیث نبوی یا آثار صحابہ سے کوئی حدیث یا اثر مل جاتے تھے اس لئے ان کو استخراج اور استنباط کے اصول اور قواعد بنانے اور رائے اور عقل سے کام لینے کی نوبت نہ آئی اور اصحاب تخریج چونکہ اپنے ہی ائمہ کے اقوال پر قناعت کرتے تھے اور اُسی سے سارے مسئلے نکالنا چاہتے تھے اس لئے اُن کو اس استخراج اور استنباط کے دقیق دقیق اصول اور باریک باریک قاعدے بنانے پڑے اور اُن میں رائے اور عقل سے کام لینا پڑا ۔

پس شروع شروع زمانہ میں تو اصحاب تخریج بھی احادیث ہی پسند کرتے تھے گو وہ حدیثیں ہی ہوں جو اُن کے استادوں اور پیشواؤں سے انہیں پہنچی تھیں اور اُس وقت میں وہ باریکیاں جو پیچھے کر کے نکلیں نہ نکلی تھیں لیکن پیچھے کر کے تو اصحاب تخریج نے قیامت ہی برپا کر دی اور فقہ کو یونانی حکمت اور فلسفہ کا ہمسر بنا دیا لفظوں سے معنی کا نکالنا اور عبارت سے مقصد سمجھنا بغیر اُن کے اصول مقررہ کے غیر ممکن ہو گیا بلکہ الفاظ بیک طرف حرفوں کی تبدیلی سے مطلب میں فرق آنے لگا۔ (ف) اور (و) پر استدلال اور کلمہ کی تقدیم اور تاخیر سے مطلب اور کا اور ہونے لگا اور پھر جس قدر زمانہ بڑھتا گیا اور نبوت کا عہد دور اور فلسفہ اور معقولات کا مسلمانوں میں رواج ہوتا گیا اُسی قدر رائے اور قیاس کو زیادہ دخل ہوا اور منقولات میں معقولات کا ایسا خلط ہو گیا کہ بغیر منطق کے قواعد سیکھنے اور فلسفہ کے پڑھنے کے فقہ کی کتابوں کا سمجھنا مشکل ہو گیا چنانچہ اب تک ہمارے آپس میں مشہور ہے کہ بغیر منطق میں کامل استعداد رکھنے کے کوئی ہدایہ سمجھ نہیں سکتا اور بلا واقف ہونے محاورات جدیدہ جدلیہ کے کوئی مبسوط سرخسی اور تبیین کا مطلب بیان نہیں کر سکتا۔

پس حقیقت میں اصحاب رائے وہی ہیں جو احادیث اور آثار کا تتبع نہیں کرتے اور متقدمین

...ں سے کسی کے اصول پر مسائل کی تخریج کرتے ہیں اور نظیر کو نظیر ہی پر محمول کرتے ہیں اور یہ مطلب ...ب رائے سے نہیں ہے کہ جو سمجھ اور عقل کو دخل دیتے ہیں اور قیاس اور استنباط سے کام لیتے ہیں ...ں لئے کہ اگر رائے سے مراد نفس فہم اور عقل ہو تو کوئی اہل حدیث نہ ہو اور سب کے سب صاحب الرائے ...ملائے جاویں حالانکہ ایسا نہیں ہے امام احمد حنبل اور اسحاق بن راہویہ بلکہ امام شافعی بھی اصحاب ...رائے سے خارج اور اہل حدیث میں داخل سمجھے جاتے ہیں لیکن آخر وہ بھی استنباط کرتے تھے ...ر قیاس سے کام لیتے تھے۔

غرضکہ مابہ الامتیاز دونوں میں یہ ہے کہ جو کتاب و سنت کو بلا پابندی کسی شخص کے اصول ...کے پیش نظر رکھ کر اُن سے مسائل کو لے یا استنباط کرے وہ اہل حدیث ہے اور جو کتاب و سنت ...ر عمل کو پہلوں ہی پر ختم سمجھے اور کسی شخص یا کسی فرقہ کے اصول اور کلام ہی پر مدار فقہ کا رکھے۔ ...ر اُسی کے مقرر کئے ہوئے اصول اور بتلائے ہوئے قاعدوں پر استخراج کرے وہ صاحب الرائے ہے۔

چھٹے تقلید اور عمل بالحدیث پر ایک مقلد اور غیر مقلد کا مباحثہ

مقلد سائل: "حضرت حنفی ہیں کہ شافعی"؟

غیر مقلد مجیب: "میں محمدی ہوں۔ نہ حنفی ہوں نہ شافعی اس لئے کہ میں جس پیغمبر پر ایمان ...یا اور جس کی نبوت کا معتقد ہوا اُسی سے اپنے آپ کو منسوب کرتا ہوں"۔

مقلد: "معلوم ہوا کہ آپ غیر مقلد ہیں اور تقلید کو آپ واجب نہیں جانتے ہیں"؟

غیر مقلد: "بلاشک میں تقلید کو واجب نہیں جانتا۔ اس لئے کہ نہ خدا کی کتاب سے اُس کا ...جوب ثابت ہوتا ہے نہ رسول خدا کی کسی حدیث سے"۔

مقلد: "تقلید کا وجوب اجماع سے ثابت ہے اور اجماع کا اتباع واجب ہے اور ...س کا منکر کافر ہے"۔

غیر مقلد: "اجماع کی تعریف کیا ہے"؟

مقلد: "الاجماع هو فی اللغة الاتفاق وفی الشریعة اتفاق مجتهدین صالحین من امة محمد علیه الصلوٰة والسلام فی عصر واحد علی امر قولی او فعلی یعنی لغت میں اتفاق کے معنی ہیں ...نفاق کے اور شریعت کی اصطلاح میں اتفاق کرنا نیک اور صلاحیت رکھنے والے مجتہدین کا امت محمدی سے ...کسی ایک زمانہ میں اوپر کسی امر قولی یا فعلی کے"۔

غیر مقلد: "مجتہدین اور صالحین کے قیود کی وجہ بیان کیجئے"؟

مقلد:۔ المراد بالمجتہدین جمیع المجتہدین الکائنین فی عصر من الاعصار واحترز بہ عن اتفاق المقلدین و احترز بقولہ صالحین عن اتفاق مجتہدین ذوی ھوی و فاسقین (حاشیہ نور الانوار) وقید بالمجتہدین اذ لا عبرۃ باتفاق العوام وعرف بلام الاستغراق احترازا عن اتفاق بعض مجتہدین عصر (تلویح) **واھل الاجماع من کان مجتہدا صالحا الا فیما یستغنی عن الرأی** (نور الانوار) اسی سے معلوم ہوا کہ تمام ان مجتہدین کا اتفاق ضرور ہے جو کہ نیک ہوں اور صلاحیت رائے دینے کی رکھتے ہوں اور فاسق اور بدعتی نہ ہوں۔

غیر مقلد:۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ بعض ائمہ اربعہ کے کتنے مجتہدین صالحین کا اجماع تقلید کے وجوب پر ہوا ہے! اول تو تقلید کی بدولت کسی مجتہد کا اطلاق آپ کر ہی نہیں سکتے دوسرے جو مجتہد ہوئے ہیں وہ تقلید کے عدم وجوب کے معتقد رہے ہیں۔ خیر اب یہ فرمائیے کہ اجتہاد کی تعریف کیا ہے اور مجتہد ہونے کے لئے کیا شرط ہے؟

مقلد:۔ والاجتہاد ھو فی اللغۃ تحمل الجہد الی المشقۃ وفی الاصطلاح استفراغ الفقیہ الوسع لتحصیل ظن بحکم شرعی ومعنی استفراغ الوسع بذل تمام الطاقۃ بحیث یحس من نفسہ العجز عن المزید علیہ وشرط الاجتہاد ان یجمع العلم بامور ثلثۃ الاول الکتاب والمراد بالکتاب قدر ما یتعلق معرفۃ الاحکام الثانی السنۃ قدر ما یتعلق بالاحکام ووجوہ القیاس بشرائطہا واقسامہا واحکامہا (تلویح) پس جو شخص کتاب و سنت کو بس قدر کہ متعلق احکام کے ہو اور وجوہ قیاس کو جانے وہ مجتہد ہے۔

غیر مقلد:۔ اگر کسی بات پر ایک زمانہ کے مجتہدین نے اجماع کیا اور دوسرے زمانہ کے مجتہدین کا اجماع برخلاف اس کے ہو تو دوسرا اجماع بھی واجب الاتباع ہے یا نہیں؟

مقلد:۔ قیل یشترط للاجماع اللاحق عدم الاختلاف السابق عند ابی حنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ ولیس کذلک فی الصحیح بل الصحیح انہ ینعقد عندہ اجماع متاخرین ویرتفع الخلاف السابق من الاجماع اللاحق (نور الانوار) قولہ انہ ینعقد عندہ ای عند الامام الاعظم اجماع متاخر اذ المعتبر انما ھو اتفاق مجتہدی العصر ھو او تقدم الخلاف اولا والدلائل الدالۃ علی حجۃ الاجماع لیست بمقیدۃ بعدم الاختلاف السابق قولہ ویرتفع الخلاف السابق لان دلیل السابقین المخالفین لم یبق دلیلا بعد بعد ما انعقد الاجماع علی خلافہ کما اذا انزل نص بعد العمل بالقیاس (حاشیہ نور الانوار) یعنی دوسرا اجماع خلاف اجماع سابق کے جائز ہے اور پہلا اجماع مرتفع ہو کر دوسرے اجماع کا اتباع واجب ہے۔ اس لئے کہ دوسرے اجماع نے پہلے اجماع کو ایسا باطل کر دیا جس طرح کہ

نص کے ملجانے سے قیاس کا حکم باطل ہو جاتا ہے۔

غیر مقلد۔ حضرت نسخ میں اور اس میں کچھ فرق ہے ولا نسخ بعد انقطاع الوحی۔

مقلد۔ اجیب بجوازہ فیما یثبت بالاجتہاد علی معنی انہ لما انتہی ذلک الحکم فانتہا المصلحۃ وفق اللہ المجتہدین للاتفاق علی القول الاخر ورفع الخلاف وان لہ یعبر فوامدا الحکم وتبدل المصلحۃ تلویح۔ کہ ایسا نسخ ان معنی کر کے جائز ہے کہ وہ حکم بسبب رہنے مصلحت کے تمام ہو گیا تب خدا نے دوسرے زمانہ کے مجتہدین کو دوسرے قول پر متفق کر دیا گو وہ مدت حکم کی اور مصلحت کی تبدیل کے سوا سے واقف نہ ہوں لیکن لاامۃ اذا اختلفوا فی مسئلۃ فی اے عصر کان علی اقوال کان اجماعا منہم علی ان ما عداہا باطل یجوز لاحد بعدہم احداث قول اخر وقیل ہذا فی الصحابۃ خاصۃ وہذا یسمی اجماعا مرکبا نورالانوار۔ پس جب کسی مسئلہ میں کسی زمانہ کے لوگوں میں اختلاف ہو چکا تو ان قولوں کے سوا تیسرا قول باطل ہے اور پھر بعد اُن کے آنے والے لوگوں کو نئی بات کا نکالنا جائز نہیں ہے اور بعضوں نے یہ کہا کہ یہ مخصوص ساتھ صحابہ کے ہے۔

غیر مقلد۔ اس اصول کے قائم کرنے سے غرض حضرات فقہا کی یہی ہے کہ انحصار مذاہب کا انہیں چار میں ہو جاوے لیکن اگر اختلاف سے مراد ایک ہی زمانہ کا اختلاف ہے تو وہ ان مذاہب میں بھی موجود ہے کہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ دونوں ہمعصر تھے اور باہم مخالف تھے۔ اور اگر ایک زمانہ کے اختلاف کی خصوصیت نہیں ہے پس کیونکر ہمارا اختلاف معتبر نہ ہوگا جس طرح کہ امام شافعی اور احمد حنبل رح کا اختلاف معتبر ہوا[1] اور موافق اصول ماعداہا باطل کے باطل نہ ٹھہرا۔

مقلد۔ الجواب عن صعب (نورالانوار) بے شک یہ ذرا مشکل بات ہے الا ان یقال الاختلاف المعتبر ہو الذی فی زمان احمد والشافعی وغیرہ اذا قالوا قولا انما یقولان اذا جدی یہ لا اہے ابی یوسف ومحمد مع ابی حنیفۃ اوکان اختلاف بین الصحابۃ فاخذ ابوحنیفۃ رحمۃ اللہ بقول صحابی ومالک والشافعی بقول صحابی اخر (تفسیر احمدی) پس اختلاف معتبر وہی ہے جو ایک زمانہ میں ہوا اور اس سے مذہب شافعی رح وغیرہ کا باطل نہیں ہونا اس لئے کہ جو کچھ انہوں نے اختلاف کیا ہے یا تو وہی ہے جس میں پہلے سے امام ابوحنیفہ رح کے شاگرد اُن سے مخالف تھے یا وہ اختلاف صحابہ میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔

غیر مقلد۔ خدا کے لئے انصاف کرو کہ یہ کیسی بارد دلیل ہے اور اس کا بیان کرنا عقلا کی شان سے کیسا بعید ہے کہ ایک زمانہ کا اجماع دوسرے زمانہ کے اجماع کو منسوخ کر دے اور وہ لطف

[1] یہ تقریر نورالانوار کی ہے۔

الٰہی سمجھا جائے اور ایک زمانہ کے دو مختلف قولوں کے بعد دوسرے زمانہ میں تیسرے قول کا نکالنا جائز ہی نہ ہو بلکہ باطل ٹھہرے۔

مقلد: "کیا آپ اجماع کے منکر ہیں"؟

غیر مقلد: "اجماع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مستند اس کا کتاب سنت ہو دوسرے یہ کہ فقط علما اور فقہا کا اتفاق ہی اتفاق ہو خواہ کسی ضرورت سے خواہ کسی مصلحت سے پہلی صورت کا اجماع واجب الاتباع ہے اور درحقیقت وہ کتاب سنت کا اتباع ہے اور دوسری قسم کا اتباع نہایت ہی برا ہے"۔

مقلد: "ہماری غرض بھی اجماع سے پہلا ہی اجماع ہے لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ ہم ہر اجماع کی نسبت ثابت کر سکیں کہ مستند اس کا کتاب سنت ہے مگر چونکہ بے ایسے استناد کے علما کا اجماع کرنا محال ہے اس لئے ہر اجماع کو پہلی ہی قسم کا اجماع سمجھنا چاہیئے"۔

غیر مقلد: "یہی آپ کی غلطی ہے"۔

مقلد: "دلیل اس غلطی کی بیان کیجئے"۔

غیر مقلد: "سنئے خدا فرماتا ہے کہ اذا قیل لھم امنوا بما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا کہ جب کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم اسی کی پیروی کرتے ہیں جو ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا پس وہ بھی اپنے بزرگوں کے اجماع کو ایسے ہی خیال سے واجب الاتباع جانتے تھے"۔

دوسری آیت میں خدا فرماتا ہے کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ کہ یہودیوں عیسائیوں نے اپنے احبار اور رہبانوں کو اپنا رب ٹھہرا لیا ہے۔ حالانکہ نہ کوئی یہودی نہ کوئی عیسائی کسی رہبان کو رب کہتا تھا بلکہ اُن کی نسبت ایسا خوش عقیدہ رکھتے تھے کہ جو وہ حلال کہہ دیتے اُس کو حلال جانتے جو وہ حرام کہہ دیتے اُس کو حرام سمجھتے[1]۔

اگر خدا کی کتاب پر اطمینان نہ ہو تو فقہا اور علما کے قول سنئے۔ قال الشعبی ماحدثوک ھؤلاء عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فخذ بہ وما قالوہ برایھم فالقہ فی الحشیش (ازالۃ الخفا) کہ جو لوگ پیغمبر خدا کی طرف سے کہیں اسے قبول کرو اور جو اپنی رائے سے کہیں اُسے پاخانہ میں ڈال دو۔

عن عبد اللہ ابن عباس وعطاء ومجاھد ومالک بن انس رضی اللہ عنہم انہم کانوا یقولون ما من احد الا وھو ماخوذ من کلامہ ومردود علیہ الا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] دیکھو ترمذی شریف۔

عبداللہ ابن عباس اور عطا اور مجاہد اور مالک ابن انسؓ ان سب کا قول تھا کہ کوئی شخص نہیں ہے مگر اُس کا کلام لیا جا سکتا ہے اور ترک بھی ہو سکتا ہے سوائے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے۔

قال بعض السلف ما جاء نا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلناہ علی الراس والعین وما جاء نا عن الصحابۃ رضی اللہ عنہم فناخذ منہ ونترک وما جاء نا عن التابعین فہم رجال ونحن رجال کہ جو کچھ پیغمبر خدا نے فرمایا ہے وہ تو ہمارے سر پر اور ہماری آنکھوں پر اور جو کچھ صحابہؓ نے کہا اور کیا ہے اُس سے ہم لیتے ہیں اور چھوڑتے بھی ہیں اور جو کچھ تابعینؒ نے کہا اور کیا ہے تو وہ آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔ ومنہا ان یکون اعتمادہ فی علومہ علی بصیرتہ وادراکہ بصفاء قلبہ لا علی الصحف والکتب ولا علی تقلید ما یسمعہ من غیرہ وانما المقلد صاحب الشرع صلوات اللہ علیہ وسلامہ ومن انکشف عن قلبہ الغطاء واستنار بنور الھدایۃ صار فی نفسہ متبوعا مقلدا فلا ینبغی ان یقلد غیرہ کہ عالم کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے علوم میں اپنی بصیرت اور ادراک پر زیادہ بھروسہ کرے نہ صحیفوں اور کتابوں پر اور نہ دوسرے کی تقلید پر کیونکہ وہ شخص جس کی تقلید ضرور ہے صرف صاحب شریعت ہے پس جو شخص نورِ ہدایت سے اپنے دل کو روشن کریگا وہ خود متبوع ہوگا نہ کہ مقلد تو کیونکر دوسروں کی تقلید کرنا زیبا ہوگا۔

ومنہا ان یکون شدید التوقی من محدثات الامور وان اتفق علیہ الجمہور فلا یغرنہ اطباق الخلق علی ما احدث بعد الصحابۃ رضی اللہ عنہم (احیاء العلوم) یعنی ہمیشہ محدثات امور سے بچتا رہے گو سب کے سب اُس پر متفق ہوں اور ہرگز اجماع خلائق پر بعد صحابہ کے فریفتہ نہ ہو اس لئے کہ یہ بڑا دھوکا ہے فان الناس رأوا بافیما ہم فیہ لمیل طباعہم الیہ ولم تسمح نفوسہم بالاعتراف بان ذلک سبب الحرمان من الجنۃ فادعوا انہ لا سبیل الی الجنۃ سواہ غرضکہ یہ قوال اور مثل اس کے ہزار اقوال اور ہیں جن سے بُرائی اُس اجماع کی ثابت ہوتی ہے جس کا مستند کتاب و سنت نہ ہو۔"

مقلد: "وجوب تقلید پر جو اجماع ہے وہ پہلی ہی قسم کا ہے کہ اُس کا مستند کتاب و سنت ہے۔"

غیر مقلد: "یہ آپ کی غلطی ہے تقلید پر جو اجماع ہے وہ وہ اجماع نہیں ہے جس کا مستند کتاب و سنت ہو۔"

مقلد: "اُس کو ثابت کیجئے۔"

غیر مقلد: سُنئے اجماع کو جو اہل اصول نے مثل کتاب و سنت کے شرعی حجت قرار دیا ہے اُس پر غور کرنا ضرور ہے کہ سبب اس کا کیا ہے پس اگر یہ کہا جائے کہ فقط اُمت کا جمع ہو جانا اور سب لوگوں کا ایک بات پر اتفاق کر لینا ہی حجت شرعی مثل قرآن و حدیث کے ہے تو عقل اس کو قبول نہ کریگی کہ اُن لوگوں کی رائے جو کہ غیر معصوم ہیں صرف اتفاق کے سبب سے ایک معصوم کے قول یا خدا کے کلام کی نہ صرف برابر ہوئے بلکہ اُس کو منسوخ کرئے جیسا کہ صاحب دراسات اللبیب فی الاسوة الحسنة بالحبیب اپنی کتاب کی دراست ثامنہ میں لکھتے ہیں ان نفس الاجماع عبارة عن اٰراء مجتمعة من علماء عصر واحد ورأء الرجال لیست من نسخ کلام المعصوم فی شیٔ ولیس فی نفس اجماع الامة بمجردہ عندی ما یوجب القطع یعنی اجماع عبارت ہے کسی زمانہ کے علما کی رایوں کے جمع ہونے سے اور آدمیوں کی رایوں کو ایسی قوت نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی بات کو معصوم کی منسوخ کرئے پس میرے نزدیک فقط اُمت کا اجماع دلائل ناطقہ میں سے نہیں ہے پس جب اس قسم کا اجماع یعنی فقط اتفاق کر لینا ہی لوگوں کا قابل حجت نہ ٹھہرا تو ضرور ہوا کہ اُس اجماع کی کوئی سند کتاب و سنت سے ہووے یعنی کسی آیت یا حدیث کے سبب سے اُس اجماع کا ہونا پایا جائے ۔ پس ایسے حال میں درحقیقت کتاب و سنت حجت شرعی ٹھہرے نہ نفس اجماع بلکہ اجماع صرف اُس کے مطلب اور مراد کا ظاہر کرنے والا ٹھہرا اور چونکہ ثبوت اجماع کے لئے ضرور ہے کہ تمام حافظانِ حدیث و مشائخ اور مجتہدین زمانہ کے اس میں داخل ہوں اور ان سب کا اتفاق ہو تو ایسی حالت میں اُمت محمدی کے ضلالت پر اجماع کرنا محال ہے اس لئے کہ قطع نظر نقل کے عقل سلیم بھی قبول نہیں کرتی کہ سارے علما اور فقہا اور محدث ایسی بات پر اجماع کریں جو کہ کتاب و سنت کے مخالف ہو لیکن ایسا اجماع جس کا مستند کتاب و سنت ہو اور جس میں تمام محدثین اور فقہا داخل ہوں نسبت تقلید کے نہیں ہے کہ اُس کو ہم ثابت کرتے ہیں چند دلیلوں سے ۔

اولاً - خدا کی کتاب سے پہلی آیت ۔ اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء

دوسری آیت - فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئك الذین هداهم الله واولئك هم اولوا الالباب ۔

تیسری آیت - فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی الله والرسول ان کنتم تؤمنون

لہ اجماع کے معنی اتفاقیہ جمع ہو جانا لوگوں کا کسی بات پر نہیں ہے یعنی اگر کوئی بات ایسی ہو کہ سب لوگ بغیر غور و فکر کے کہتے یا کرتے چلے آئے ہوں تو اُس پر اطلاق اجماع کا نہیں ہو سکتا بلکہ اجماع کیلئے ضرور ہے کہ اُس پر بحث و تکرار ہوئی ہو اور دلائل موافق و مخالف بحث آئے ہوں اور بعد تمام مباحثہ کے کسی امر پر اجماع ہو گیا ہو پس اگر بعد اُس اجماع کے کوئی ایسی دلیل مخالف برآمد ہو جو اُس اجماع میں مباحثہ میں نہیں آئی تھی تو وہ اجماع حجت نہیں رہتا ۔

باللہ والیوم الآخر ۔

ابن حزم جس کے کلام کو شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ البالغہ میں نقل کیا ہے ۔ یہی آیتیں حرمت تقلید کے ثبوت میں بیان کرتا ہے حیث قال التقلید حرام ولا یحل لاحد ان یاخذ قول احد غیر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلا برھان کہ تقلید حرام ہے اور کسی کو جائز نہیں ہے کہ کسی کے قول کو سوائے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے بغیر دلیل کے قبول کرے ۔

اور ابن حزم ان روایتوں کو نقل کر کے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ فلم یبح اللہ تعالیٰ الرد عند التنازع الی احد غیر القرآن والسنۃ یعنی نہیں مباح کیا ہے اللہ تعالیٰ نے رجوع کرنا وقت تنازع کے کسی کی طرف سوائے قرآن اور حدیث کے اور حرام کر دیا ہے اس سے رجوع کرنا کسی کہنے والے کی بات پر اس لئے کہ قرآن وسنت نہیں ہے ۔

ثانیاً احادیث نبوی ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ احادیث صحاح کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثناء نے ہمیشہ تاکید اپنی اور اپنے اصحاب کی پیروی کی کی اور نئی باتوں سے بچنے اور اپنی احادیث پر تمسک کرنے کی کی ہے اور تقلید سے سوائے اپنے اپنے امام کے اقوال کی تبعیت کے کوئی نہ حدیث پر عمل کرنے کا مجاز رہے نہ اقوال و اعمال صحابہ پر تمسک کر سکتا ہے ۔

ثالثاً ۔ اقوال صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعین عن ابن عباس ما تخافون ان تعذبوا ویخسف بکم ان تقولوا قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وقال فلان کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ کیا تم عذاب نازل ہونے سے نہیں ڈرتے ہو جو یہ کہتے ہو کہ پیغمبر خدا نے فرمایا اور فلاں شخص نے یوں کہا ہے یعنی پیغمبر صاحب کے قول کے بعد دوسرے کے قول کو دیکھتے ہو قال ابن عمر لجابر ابن زید انک من فقہاء البصرۃ فلا تفت الا بقرآن ناطق او سنۃ ماضیۃ فانک ان فعلت غیر ذلک ھلکت واھلکت کہ حضرت ابن عمر نے جابر ابن زید سے کہا کہ تم بصرہ کے فقیہوں میں سے ہو اس لئے تم فتوے نہ دینا بجز قرآن ناطق اور حدیث صریح کے ورنہ خود ہلاک ہو گئے اور اوروں کو ہلاک کرو گے ۔

اخرج الترمذی عن ابی السائب قال کنا عند وکیع فقال الرجل ممن ینظر فی الرائے اشعر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ویقول ابو حنیفہ ھو مثلۃ فقال الرجل فانہ قد روی عن ابراھیم النخعی انہ قال الاشعار مثلۃ قال فرأیت وکیعا غضب غضبا شدیدا وقال اقول لک قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وتقول قال ابراھیم ما احقک بان تحبس ثم لا تخرج حتی تنزع عن قولک ھذا ۔ ترمذی نے ابی السائب سے روایت کی ہے کہ

میں وکیع کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے ایک آدمی سے جو کہ صاحب الرائے تھا کہا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار کیا ہے اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ وہ مثلہ ہے تو اس آدمی نے کہا ابراہیم نخعی سے ایسی ہی روایت پہنچی ہے یہ سنکر وکیع کو نہایت غصہ ہوا اور کہنے لگا کہ میں تو کہتا ہوں کہ فرمایا ہے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اور تو کہتا ہے کہ کہا ہے ابراہیم نخعی نے پس تیری یہی سزا ہے کہ تو قید کیا جاوے اور جب تک اپنے اس قول سے نہ پھرے تب تک جیلخانہ میں رہے ؂

حدیث عبادة بن الصامت الانصاری النقیب صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ غزا مع معاویة ارض الروم الی قولہ فقال عبادة احدثک عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وتحدثنی عن رائک ان اخرجنی اللہ سجانک لا اساکنک بارض لک فیھا امرة دراسات عبادت بن الصامت نے امیر معاویہ سے کہا کہ یہ لوگ چاندی کے ٹکڑوں کو درہم سے اور سونے کے ٹکڑوں کو دینار سے فروخت کرتے ہیں یہ سود ہے اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لاتبیعوا الذھب بالذھب الا مثلا بمثل امیر معاویہ نے کہا کہ میں اس کو ربا نہیں جانتا تو وہ غصہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میں تو پیغمبر خدا علیہ التحیة والثنا کا قول بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے بیان کرتے ہو اگر خدا نے مجھے اس جگہ سے نکالا تو کبھی میں وہاں نہ رہونگا جہاں تم امیر ہو ؂

قال الھروی وروینا عن محمد الکوفی وکان من اسلام بمکان قال رایت الشافعی رحمة اللہ تعالی بمسئلة بنی الناس الی قولہ فقال الشافعی رحمة اللہ علیہ ما احوجنی یا اسحاق ان یکون غیرک فی موضعک فکنت امرہ لغیرک اذینہ اقول قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وانت تقول عطا وطاوس وابراھیم والحسن وھل لاحد مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حجة کہ ایک جگہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہ جمع تھے ایک مسئلہ پر امام شافعیؒ نے حدیث نقل کی۔ اسحاق بن راہویہ نے بمقابل اس کے حسن اور ابراہیم اور عطا اور طاؤس کی رائے اور قول کو مخالف اس کے نقل کیا کہ امام شافعیؒ غصہ ہوئے اور کہا کہ اے اسحاق افسوس ہے بجائے تیرے دوسرا آدمی نہ ہو ورنہ میں اس کی گوشمالی کرتا کہ میں تو پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کرتا ہوں اور تم عطا اور طاؤس اور ابراہیم اور حسن کے قول کو نقل کرتے ہو کسی کو پیغمبر خدا کے ساتھ حجت نہیں ہے ؂

قال المحیی السنة وجاء رجل الی مالک فسئلہ عن مسئلة فقال لہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا وکذا فقال الرجل ما رایک فقال مالک فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنة او یصیبھم عذاب الیم

الا قولہ ان لتعض یوالواس دعلیہ مثل اسحاق رحمۃ اللہ علیہ مع جلالتہ فی روعن الشافعی رحمۃ اللہ علیہ لم یکن فی انہ بید من التعذیر بقول الفقیہ فی مقابلۃ الحدیث کہ ایک شخص نے امام مالکؒ سے آکر ایک مسئلہ پوچھا اُنہوں نے جواب دیا کہ ایسا ایسا فرمایا ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اُس شخص نے کہا پھر تم کیا کہتے ہو۔ امام مالکؒ خفا ہوئے اور کہا کہ تو نے قدر پیغمبر خدا کی نہ جانی اب تو سوچ کہ اسحاق بن راہویہ سے جلیل القدر امام شافعی نے صرف اسی سبب سے قابل تعزیر جانا کہ انہوں نے مقابلہ میں حدیث کے فقہ کے قول کو نقل کیا تھا پس اس قول سے امام مالکؒ نے اس شخص کو ڈرایا جو کہ بمقابلہ حدیث کے دوسری رائے دریافت کرے ✤

قیل الشعبی الا تحضر المسجد فقال لقد ابغض الی ھؤلاء ھذا المسجد حتی صار ابغض الی من کناسۃ داری قیل لہ من ھؤلاء یا ابا عمرو فقال اصحاب الرای۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے کہا کہ آپ مسجد میں نہیں آیا کرتے اُنہوں نے جواب دیا کہ لوگوں نے مجھے مسجد کا ایسا دشمن کر دیا ہے کہ میں اُس کو اپنے گھر کی بُری سے بُری جگہ سے بھی زیادہ بُرا جانتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ کون سے لوگ ہیں تب اُنہوں نے کہا کہ اصحاب الرائے ✤

قالو الاحمد مرۃ لم لا تصنع للناس فی الفقہ شیئاً فقال او لاحد کلام مع اللہ تعالٰی ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ امام احمد حنبلؒ سے کسی نے کہا کہ آپ فقہ میں کوئی کتاب کیوں نہیں لکھتے۔ جواب دیا کہ خدا اور رسول کے ہوتے ہوئے کسی کو مجال کلام کی نہیں ہے ✤

غرض کہ مثل اس کے صدہا اقوال صحابہؓ و تابعین کے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تقلید کسی کی سوائے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ چاہیئے لیکن ہم قطع نظر ان اقوال کے خاص چاروں امام کے اقوال کو نقل کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی تقلید کامل کو جائز ہی نہیں رکھا ✤

یواقیت وجواہر میں لکھا ہے کہ روی عن ابی حنیفۃؒ انہ کان یقول لا ینبغی لمن لا یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی[1] وکان رضی اللہ عنہ اذا افتے یقول ھذا رای النعمان ابن ثابت کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ جو شخص میری دلیلوں کو نہ جانے اسے سزاوار نہیں ہے کہ میرے کلام پر فتوے دے اور خود اُن کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کچھ فتوے دیتے تو صاف یہ کہہ دیتے کہ یہ رائے نعمان ابن ثابت کی یعنی میری ہے ✤

روی الحاکم والبیہقی عن الشافعی رضی اللہ عنہ انہ کان یقول اذا صح الحدیث فھو

---

[1] برخلاف اسکے مقلدین فرماتے ہیں کہ بہ تحقیق علما فرمودہ اند واجب ست افتا بقول امام اعظمؒ ہر چند ندانند از کجا گفتہ است نگر در فتاوی خیریہ غیرہ گفتہ۔ لوامع الالہام لدفع الاوہام ✤

مذہبی وفی روایۃ اذا رایتم کلامی یخالف الحدیث فاعملوا بالحدیث واضربوا بکلامی الحائط کہ حاکم اور بیہقی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر حدیث کی صحت ہو جاوے تو وہی مذہب میرا ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی کلام میرا حدیث کے مخالف ہو تو حدیث پر عمل کرو اور میری بات کو دیوار سے پٹکو۔

وقال یوما للمزنی یا ابراہیم لا تقلدنی فی کل ما اقول وانظر فی ذلک لنفسک فانہ دین کہ امام شافعیؒ اپنے شاگرد مزنی سے کہا کرتے تھے کہ اے ابراہیم میری تقلید نہ کرنا ہر ایک بات میں جو کہتا ہوں بلکہ تو اپنی ذات سے بھی اس پر نظر کرنا اس لئے کہ یہ دین ہے اس میں اعتماد اور کسی کے قول پر نہیں چاہئے۔

وکان رضی اللہ عنہ یقول لا حجۃ فی قول احد دون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وان کثروا ولا فی قیاس ولا فی شیٔ کہ امام شافعی کہا کرتے تھے کہ کسی کا قول کسی کا قیاس اور کوئی چیز کسی امر میں کچھ حجت نہیں ہے سوائے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اگرچہ اس قول اور قیاس پر بہت سے شخص متفق ہوں۔

وکان الامام احمد رضی اللہ عنہ یقول لیس لاحد مع اللہ ورسولہ کلام کہ امام محمد حنبل فرماتے تھے کہ خدا اور رسولؐ کے ساتھ کسی کو کلام نہیں ہے۔

وقال ایضا لرجل لا تقلدنی ولا تقلدن مالکا ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرھم وخذ الاحکام من حیث اخذوا من الکتاب والسنۃ کہ امام محمد حنبلؒ نے ایک شخص سے کہا کہ تو نہ میری تقلید کر اور نہ امام مالکؒ کی نہ اوزاعی کی۔ نہ نخعی کی اور نہ کسی اور کی بلکہ جہاں سے انہوں نے احکام نکالے ہیں یعنی کتاب و سنت سے وہیں سے تو بھی نکال۔

عن ابی یوسف وزفر رحمۃ اللہ علیہما انہم قالوا لا یحل لاحد ان یفتی بقولنا ما لم یعلم من این قلنا کہ امام ابو یوسف اور زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حلال نہیں ہے کسی کو یہ کہ فتوے دے ہمارے قول پر جب تک کہ وہ یہ نہ جانے کہ کہاں سے ہم نے کہا ہے۔

پس باوجود ایسی تصریحات کے جو ان ائمہ اربعہ اور انکے خاص شاگردوں نے عدم تقلید پر کی ہیں اگر کوئی تقلید کو واجب اور عمل بالحدیث کو ناجائز کہے وہ حقیقت میں ان اماموں کا مقلد نہیں ہے بلکہ اپنی ہوا و ہوس اور رسم و رواج کی پابندی کا۔

غرضکہ ان چند قولوں کے نقل کرنے سے ثابت ہوا کہ نہ صحابہؓ کے زمانہ میں نہ تابعین کے زمانہ

۱؎ صحابہ کے زمانہ میں تقلید جاری نہ ہونے سے یہ غرض ہے کہ کوئی ایک شخص ان میں ایسا نہیں تھا کہ جسکے سامنے اقوال اوروں نے مانے ہوں یا جسکی سب باتوں کو اوروں نے واجب التعمیل جانا ہو۔

میں نہ تبع تابعین کے زمانہ میں تقلید جاری ہوئی۔ نہ کسی نے ان قرون ثلاثہ میں اس کو واجب جانا بلکہ جس طرح پر آجکل لوگ عمل کرتے ہیں ایسا ہی عمل کسی کے قول پر بھی نہیں کیا تو باوجود اس کے پھر یہ دعوے کرنا کہ تقلید واجب ہے، اور تارک اس کا گنہگار اور واجب التعزیر حقیقت میں دوسری شریعت قائم کرنا اور نیا دین کھڑا کرنا ہے۔ نعوذ باللہ منہ ؁

اگر ہم ان زمانوں پر بھی خیال نہ کریں اور آئندہ آنے والے زمانوں پر نظر کریں کہ پیچھے نقلید پر اجماع ہوگیا ہو تو وہ بھی ہم نہیں پاتے اس لئے کہ بعد اس کے جتنے لوگ ہوئے وہ یا محدث تھے یا اہل تصوف یا فقہا یا عوام پس اصلی محدث تو ہزاروں میں ایک ہی دو ایسے ہونگے جنہوں نے تقلید کی ہو ورنہ جو لوگ اصل حدیث کے جمع کرنے والے اور اس کے جاری کرنے والے ہیں وہ تقلید کے نام سے بھاگتے تھے اور اس کو بدعت جانتے تھے اور جو اہل تصوف تھے اُن کا بھی یہی حال ہے کہ ہمیشہ تقلید سے نفرت کیا کئے اور اُس کی برائی بیان کرتے رہے۔ رہ گئے فقہا اور علما۔ اُن میں سے بھی جو محقق تھے وہ غیر مقلد رہے اور جو تحقیق اور اجتہاد کے اعلےٰ درجہ پر نہ تھے انہوں نے تقلید پر قناعت کی اور عوام تو کالانعام ہیں اُن کا کچھ ذکر نہیں۔ پس حقیقت میں اجماع جس کا نام ہے وہ کسی زمانہ میں نسبت وجوب تقلید کے نہیں ہوا۔ ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ چوتھی صدی سے اب تک اکثر لوگ تقلید کے پابند ہوگئے اور روز روز اس کی پابندی بڑھ گئی مگر مقابلہ محدثین اور محققین کے اور لوگوں کی کثرت کچھ بھی لائق لحاظ کے نہیں ہے ورنہ صرف کثرت پر اگر لحاظ کیا جائے تو ساری بدعتیں اور تعزیہ پرستی اور قبر پرستی وغیرہ سب اسی اجماع کی دلیل سے عبادت میں داخل ہو جائیں۔ اور ان کا ترک کرنا فرق اجماع کہلاوے ولم یقل بہ احد اور اجماع کی نسبت اہل اصول نے بھی یہی کہا ہے کہ اجماع مجتہدین صالحین کا اجماع ہے نہ اجماع مقلدین کا اور مطابق قول مقلدین کے مجتہد بعد ائمہ اربعہ کے کم ہوئے ہیں اور مجتہدین ہوا ہے وہ مقلدین ہوا پس جس میں قدر اور علما اور فقہا تقلید کے معتقد ہیں اُن کا اجماع حقیقت میں مطابق اصول کے اجماع نہیں ہے"؁

مقلد:۔ آپ کے روبرو جب ہم نے علما فقہا کے اقوال کو تقلید کے وجوب پر پیش کیا تب آپ نے اُن کو تسلیم نہ کیا اور پھر آپ انہیں کے اقوال کو اپنے دعوے عدم وجوب تقلید پر پیش کرتے ہیں"؁

غیر مقلد:۔ درحقیقت ہم تو صرف کتاب سنت ہی کو دلیل عدم وجوب تقلید کی جانتے ہیں۔ مگر چونکہ آپ اور اُس زمانہ کے اکثر لوگ عادی اس کے ہوگئے ہیں کہ بغیر حوالہ کتاب اور سند علما کے اقوال کے وہ کسی بات کو نہیں مانتے اِس لئے ہم نے آپ کے اور اس زمانہ کے

لوگوں کے سمجھانے کے لئے اُن کے قولوں کو نقل کیا اور نقل کرنے پر آمادہ ہیں ورنہ ہم اپنی ذات کے لئے اُس کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتے ہم کو تو خدا اور رسولؐ کے کلام پر تمسک ہے اور اس پر ایسا یقین ہے کہ بالفرض اگر ایک مولوی اور ایک عالم کا قول بھی ہمارے موافق نہ ہوتا تب بھی ہمارے عقیدہ میں کچھ خلل نہ آتا اور خدا کی کتاب اور رسولؐ کے اقوال کو چھوڑ کر ہم کسی بات پر کان بھی نہ لگاتے علاوہ اس کے ان قولوں کے نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ جو بار بار آپ کی زبان سے لفظ اجماع کا نکلتا ہے اُس کا بطلان ظاہر ہو جاوے اور ان بڑے بڑے محققین علما اور ائمہ دین کے اقوال سے آپ کے دعوے وجوب تقلید کا غلط ہونا سب پر کھل جاوے ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور محدثین اور مجتہدین اور محققین کا تقلید نہ کرنا اور اُس کا بُرا جاننا تو عدم وجوب تقلید کی دلیل نہ ٹھہرے اور ان کا ایک بات پر اتفاق کرنا اجماع نہ کہلاوے اور بعد قرون ثلثہ کے جو لوگ آویں اور جن کے مراتب ورع و تقویٰ اور مدارج علم و تحقیق ان متقدمین کے برابر نہ ہوں اور پھر وہ بھی سب کے سب ایک بات پر متفق نہ ہوں اُن کا تقلید کو جائز کہدینا وجوب تقلید پر ایسی دلیل ہو جاوے کہ اُس کا منکر بدعتی اور فاسق اور واجب التعزیر ٹھہرے۔ فاعتبروا یا اولی الالباب ان ھذا الشیئ عجاب ۔

مقلد ۔ جو لوگ کہ تقلید کا انکار کرتے ہیں وہ تھوڑے ہیں ان کا قول مرجوح ہے اور جو لوگ اُسکو واجب اور جائز جانتے ہیں وہ بہت ہیں اور سواد اعظم وہی ہے جس جانب بہت لوگ ہوں اس لئے آپ کا استناد چند ہی علما کے اقوال پر ہے اور ہمارا استناد ہزاروں کے قول پر ۔

غیر مقلد ۔ یہ دونوں دعوے غلط ہیں اول یہ کہنا کہ واجب العمل وہ قول ہے جس پر بہت لوگ متفق ہوں اور اُس کو سواد اعظم جاننا۔ دوسرے یہ سمجھنا کہ وجوب تقلید کی طرف اکثر لوگ ہیں اور جس طرف بہت لوگ ہوں اُس کی مخالفت اجماع کی مخالفت ہے اول دعوے کی غلطی پر چند قول میں نقل کرتا ہوں کہ بعض مفسرین نے آیت - ان تطع اکثر من فی الارض یضلوک کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فی ھذہ دلالۃ علی انہ لا عبرۃ فی دین اللہ و معرفۃ الحق بالقلۃ والکثرۃ یجوز ان یکون الحق مع الاقل کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے اس پر کہ کچھ اعتبار نہیں ہے خدا کے دین میں اور حق کے پہچاننے میں قلت اور اکثر پر اس لئے کہ جائز ہے کہ حق وہی ہو جس طرف تھوڑے لوگ ہیں ۔

ابن جوزی نے تلبیس ابلیس میں لکھا ہے کہ سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے یوسف ابن اسباط سے کہا کہ اذا بلغک عن احد بالمشرق انہ صاحب سنۃ فابعث الیہ بالسلام و اذا بلغک عن آخر بالمغرب انہ صاحب سنۃ فابعث الیہ بالسلام فقد قل اھل

سنت کہ اگر مشرق میں ایک اور مغرب میں دوسرا پابند سنت کا ہو تو اُسکو سلام بھیجو اس لیے کہ سنت پر چلنے والے بہت ہی کم ہیں *

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ سواد اعظم وہی ہے جو تابع کتاب یعنی قرآن اور سنت کا ہو وان ما سواھا لا یلتفت الیھم وان املا ما العالم منھم کہ جو کتاب و سنت کے سوا ہو اُس کی التفات نہ کرنا چاہیئے اگرچہ اُن سے جہاں بھرا ہو اور جماعت کے معنی میں ایک بزرگ نے کہا ہے کہ الجماعۃ والتبجا متہ اھل الحق وان قلوا کہ جماعت نام ہے اہل حق کے جمع ہونے کا ایک حق بات پر اگرچہ وہ بہت ہی کم ہوں *

سواد اعظم کے معنی میں ملا علی قاری شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں کہ ان فیھم من الصفات الموجبۃ المھنول ما تقوم مقام العدد الکثیر من غیرھم ولذا سمیت مثل ھذا الامام امۃ قال اللہ تعالیٰ ان ابراھیم کان امۃ لانہ یجتمع فیہ من الصفات ما لا یوجد متفرقۃ الا فی جماعۃ ولذا قال الشاعر لیس من اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی احد وقد قیل فی حدیث المشھور علیکم بالسواد الاعظم ای الاورع الاسلام پس جبکہ ایک شخص پر اطلاق امت کا خدا کے کلام سے ثابت ہوا اس لئے کہ وہ ایک ان باتوں کا جامع تھا جو کہ متفرق متفرق گروہوں میں علیحدہ پائی جائیں اور خدا کا ایک شخص کو بمنزلہ ایک جہاں کے بنا دینا عجب نہیں اور سواد اعظم سے مراد زیادہ پرہیزگار سے لی گئی ہو تو پھر کثرت عوام کو کسی مسئلہ کی صحت پر دلیل لانا بچوں کو بہلانا اور عوام کو خوش کرنا ہے دگر ہیچ *

فاضل روزبہان کتاب ابطال الباطل میں جہاں حدیث لا یزال طائفۃ من امتی منصورین لا یضرھم من خذلھم حتی تقوم الساعۃ کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں فحاصل الحدیث لا یزال طائفۃ قلیلۃ من امتی منصورین بالحجۃ والبرھان *

پس معلوم ہوا کہ وہ گروہ جو ہمیشہ غالب رہیگا وہ وہی قلیل آدمیوں کا گروہ ہے جو کہ اپنی حجت شرعی سے اوروں پر غالب ہوگا اور کوئی اُس کو مغلوب کر سکیگا اور یہ گروہ وہی ہے جو کہ تابع کتاب و سنت ہے کہ نہ اُس کے سامنے رسم و رواج کی کچھ پیش جاتی ہے نہ بدعتیوں کی پوچ اور بے ہودہ دلیلیں چل سکتی ہیں نہ علما دنیا طلب کی چکنی چپڑی باتوں کی رہینت اثر کرتی ہے نہ قوموں کی کثرت اور عوام کی جمعیت اور تعبیت اُس کو رد کر سکتی ہے خدا کی کتاب اور رسول کی حدیث کے سامنے سب کو مغلوبیت ہو جاتی ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ اُس کا مصداق کون ہے۔ وہ فرقہ جو تقلید کرتا ہے یا وہ فرقہ جو تقلید کا تارک ہے دونوں کی دلیلوں کو دیکھو اور پھر خدا کی کتاب و رسول کی حدیث سے ملاؤ اور تعصب کی آنکھ تھوڑی دیر بند کر کے انصاف کرو *

صحیح بخاری کی کتاب الاعتصام بالسنۃ میں لکھا ہے کہ لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق اور ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ھم اصحاب الحدیث کہ وہ لوگ اصحاب حدیث ہیں ✽

تفسیر نیشاپوری میں لکھا ہے کہ اگر مراد اس طائفہ سے اہل حدیث نہ ہوں تو میں نہیں جانتا کہ پھر کون لوگ اُس سے مراد ہونگے ✽

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں احیاء العلوم میں ومنھا ان یکون شدید التوقی من محدثات الامور وان اتفق علیہ الجمھور فلا یغرنہ اطباق الخلق علی ما احدث بعد الصحابۃ ✽

غرضکہ کثرت اقوال پر مغرور ہونا یا کثرت اشخاص پر فریفتہ ہونا نہایت ہی نادانی اور خلاف حکم شریعت ہے ہم مسلمانوں کو بجہت اسلام کے امور دین میں صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ کتاب و سنت سے کیا ثابت ہوتا ہے نہ اور کچھ اور اُس کو چھوڑ کر لوگوں کے اقوال پر نظر کرنا اور خدا کے کلام و رسول کے قول کو اور بندوں کی باتوں سے جانچنا اور اصل کو فرع پر عرض کرنا شان اسلام سے بعید ہے ✽

اگر کوئی مشرک یا اہل کتاب یہ پاوے کہ مسلمانوں نے اپنے دین میں سوائے کتاب و سنت کے اور لوگوں کی باتوں پر چلنا جائز رکھا ہے تو وہ اسلام کی بربادی کی نہایت عمدہ فال سمجھے اور اگر یہ خبر پاوے کہ اُنہوں نے اس امر کو واجب سمجھ لیا ہے اور اس کے خلاف سمجھنے والے کو بدعتی یا فاسق یا دشمن اسلام کہتے ہیں تب تو مارے [illegible] کے مرہی جاوے اور اسلام کے خاتمہ پر شادیانے خوشی کے بجاوے اس لئے کہ اگر خوبی اسلام کی اُس کی نظروں میں ہوتی تو اسی سے ہوتی کہ اسلام کے بانی نے کامل توحید کو جاری کیا اور ساری قسم کے شرک کو خفی ہو یا جلی باطل کر دیا اور تمام رسموں اور بنائی ہوئی باتوں کو جاری کیا اور ادیان سابقہ کی تحریف کرنے والوں کی تحریفات کو واجب الترک و الانکار بتلایا پس جبکہ اُسی مذہب کے لوگ توحید سے پھر گئے اور شرک فی صفۃ النبوت ہو گئے اور رسموں کی پابندی اور اپنے بھائی بندوں کی باتوں پر قانع بلکہ متمسک ہو گئے اور اپنے خدا کے کلام پر عمل کرنے کے لئے لوگوں کے فتووں پر نظر کرنے لگے اور اپنے رسول کے قول پر چلنے کے لئے عالموں کے حکم کے پابند ہو گئے کہ جب تک اُن کے مولوی نہ کہدیں وہ خدا کی کتاب پر عمل کرسکتے ہیں نہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر تو پھر ایسی خرابی پر اسلام کی جو کچھ وہ خوشی کریں وہ حق بجانب ہے اور جب وہ اس بات سے واقف ہوں کہ یہ قول اور عمل صرف عوام ہی کا نہیں ہے کہ وہ مجبوری اُس کے

قائل اور اس پر عامل ہوئے ہوں بلکہ اچھے اچھے پڑھے لکھوں کا جن کا علما اور حضرت اور قبلہ او رکعبہ کے سوا کوئی نام نہیں لیتا یہی عقیدہ ہوگیا ہے اور گروہ کا گروہ اس پر قائل ہورہا ہے اور دین اسلام کا مدار رہی اس پر۔ آگیا ہے تو معلوم نہیں کہ اس شکرانہ میں مشرک اپنے بتوں پر کیا کچھ ۔ ۔ ۔ اور نصاریٰ نے اپنے حضرت مسیح کی کیا کچھ اپنے حال پر عنایت سمجھیں۔

مقلد۔ خیر یہ زبان درازی ہو رہے اور دوسرے دعوے کو اپنے ثابت کیجئے۔ جو آپ نے کہا ہے کہ جس طرف بہت لوگ ہوں اس سے مخالفت کرنا اجماع کی مخالفت نہیں ہے۔

غیر مقلد۔ سنئے ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب اندلسی اپنی کتاب محلی کی کتاب الاشربہ میں بہ نسبت دعوئے اجماع کے لکھتا ہے۔ هذا ای دعوی الاجماع قول فی غایة الفساد لانه یبطل علیهم جمهور اقوالهم ویلزمهم ان لا یلزموا زکوٰة الا حیث اوجبها الاجماع ولا فرضیة حج او صلوٰة الا حیث صح الاجماع علی وجوبها ولا سوء الزنا الا حیث جمعت امته انه زنا. ومن الزم هذا المذهب خرج عن دین الاسلام بلاشك بوجهین احدهما انه مذهب مفتری لم یامر الله تعالیٰ قط بان لا نتبع الا الاجماع ولا قال تعالیٰ به قط ولا رسوله وانما امر الله عزوجل باتباع القرآن وسنة النبی واولی الامر باتباع الاجماع ولم یامر الله تعالیٰ قط بان لا یتبع الا الاجماع ولا قال تعالیٰ قط ولا رسوله لا تاخذوا فیما تختلف فیه الا ما اجمع علیه ومن ادعی بهذا فقد افتری علی الله الکذب واتی بدین محدث مبتدع بالضلال المبین۔ انما قال تعالیٰ اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم وقال تعالیٰ وما آتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم عنه فانتهوا وقال تعالیٰ فان تنازعتم فی شیء فردوه الی الاجماع فمن ترد ما تنوزع فیه الی الاجماع لا الی نص القرآن والسنة فقد عصی الله تعالیٰ ورسوله وتنزع من الذین ما لم یاذن به الله تعالیٰ واما نحن فنتبع الاجماع فیما نصح انهم اجمعوا علیه ولا نخالفه ونرد ما تنوزع فیه الی القرآن والسنة فناخذ ما فیهما وان لم یجمع علی الاخذ به وبهذا امر الله تعالیٰ ورسوله وعلیه اجمع اهل اسلام وما نعلم احدا قط قال لا الزام فی شیء من الدین الا ما اجمع الناس علیه فقد صاروا بهذا الاصل مخالفین للاجماع بلاشك الوجه الثانی انه مذهب یقتضی ان لا یلتفت الی القرآن والسنن اذا وجد الاختلاف فی شیء من احکامهما ولیس من هذا من دین الاسلام

فی شی مع انہ فی اکثر الامر کذب علی انہ قول بلا علم۔ وایضا فانھم لا یلزمون
ھذا الاصل الفاسد الا فی مسائل قلیلۃ جدا وھو ببطال سائر من اھبھم
بعاد علیھم وباللہ التوفیق، کہ اجماع کا دعوے کرنا ایک ایسا قول ہے جس کا فساد
ظاہر ہے اس لئے کہ اُس سے سارے اقوال باطل ہوتے ہیں اور ایسے دعوے کرنے
والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ نہ زکوٰۃ کو واجب جانیں نہ حج و تمامی فرضیت کے قائل ہوں
اور نہ زنا کی برائی پر اعتقاد رکھیں مگر اسی وجہ سے کہ اُس پر اجماع ہے اور جو ایسا کرے وہ
دین اسلام سے خارج ہے دو وجہ سے۔ اول یہ کہ یہ بنایا ہوا مذہب ہے نہ خدا نے یہ
حکم دیا ہے کہ سوائے اجماع کے اور کسی کا اتباع نہ کرنا اور نہ رسولؐ نے فرمایا ہے بلکہ خدا
نے تو قرآن وسنت اور اولو الامر کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ یہ بھی خدا نے نہیں کہا کہ جب کسی
امر میں اختلاف ہو تو وہی بات ماننا جس پر اجماع ہو۔ جو ایسا دعوے کرے وہ خدا پر تہمت کرتا ہے
اور نیا دین بنانا چاہتا ہے اس لئے کہ خدا نے صاف صاف کہ دیا ہے کہ جو تمہارے رب
نے بھیجا اُس کی اتباع کرو۔ اور پھر فرما دیا ہے کہ جو رسولؐ کہے اُسے لو اور جس سے منع کرے
چھوڑ دو اور نیز ارشاد فرماتا ہے کہ اگر کسی بات میں جھگڑا ہو تو خدا اور رسولؐ سے رجوع کرو اس لئے
ہم اُس امر میں اجماع کا اتباع کرتے ہیں جس میں ہم کو ثابت ہو کہ سب اُس پر متفق ہیں۔ اور
اُن کا اجماع کتاب و سنت کے مخالف نہیں ہے اور اگر آپس میں اختلاف ہو تو قرآن وحدیث پر
رجوع کرتے ہیں جس کو اُس کے مطابق پاتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں گو اُس پر اجماع نہ ہو۔ اور بس
یہی وہ طریقہ ہے جس کا حکم خدا اور رسولؐ نے دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اجماع کے دعوے سے ثابت ہوتا
ہے کہ حالت اختلاف میں ہم کو قرآن وحدیث پر رجوع کرنا نہ چاہئے بلکہ اجماع پر کہ بہتوں کی رائے
کیا ہے تو حقیقت میں یہ بات دین اسلام کی نہیں ہے"۔

مقلد:۔ سبحان اللہ آپ بڑے محقق کا کلام اپنے دعوے کی دلیل میں لائے ابن حزم تو بدعتی تھا
اور اُس کو فقہا نے نکال دیا تھا کہ وہ جنگل میں مر گیا"۔

غیر مقلد:۔ یہ سچ ہے کہ فقہا نے بدعتی کہہ کر نکال دیا تھا مگر اسی قصور میں کہ اُس نے فقہا کے
اقوال کو بالائے طاق رکھ کر خدا کی کتاب اور رسولؐ کی احادیث پر رجوع کی تھی لیکن شک ہے کہ اس
کے کلام کی تصدیق اور علما نے بھی کی ہے چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اجماع
کی نسبت ایسا ہی کچھ کہا ہے اور ابن حزم کے قول حرمت تقلید کو باطل نہیں گردانا بلکہ اُس کو اور پورا
کر دیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ قول ابن حزم کا کہ تقلید حرام ہے اور کسی کو حلال نہیں ہے کہ سوائے
رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے بغیر دلیل کے اور کسی کے قول کو لے اس لئے کہ چند آیتوں میں

اللہ جل شانہ نے اپنی ہی اور اپنے رسولؐ ہی کی تبعیت کا حکم کیا ہے اور تمام صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کا اول سے آخر تک اسی امر پر اجماع ہے کہ ایک انسان کو اپنے جیسے دوسرے انسان کے سب اقوال کا لینا منع ہے پس جو شخص سب اقوال کو امام ابوحنیفہؒ یا شافعیؒ وغیرہ کے لیتا ہے وہ خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت پر اعتماد نہیں کرتا وہ مخالف تینوں نیک زمانہ کے اجماع کا ہے اور جو ایسا ہو وہ اُس راہ پر چلتا ہے جو مسلمانوں کی نہیں ہے پس یہ قول ابن حزم کا بھی پورا نہیں بلکہ ناقص ہے مگر اُس شخص کے حق میں جو کہ طاقت اجتہاد کی رکھتا ہو اگرچہ ایک ہی مسئلہ میں ہو اور یا اُس کو ثابت ہو جاوے کہ پیغمبر صاحب نے ایسا فرمایا ہے یا اُس سے منع کیا ہے اور یہ بھی اُس کو معلوم ہو کہ یہ منسوخ نہیں ہے ایسی حالت میں حدیث سے مخالفت کرنے کا کوئی سبب بجز نفاق خفی یا حماقت جلی کے نہیں ہے "

مقلد :۔ یہ قول بھی اُس شخص کا ہے جس کو ہم غیر مقلد جانتے ہیں اور جس کے اقوال کو ہم نہیں مانتے وہ بھی تمہاری ہی طرح سے خلاف طریقہ اور علما کے تقلید کا تارک تھا :

غیر مقلد ۔ قطع نظر اُن کے صدہا اقوال عدم وجوب تقلید پر ہم کو معلوم ہیں کہ بطور نمونہ کے چند اقوال ہم آپ کو سناتے ہیں :

اوّل ۔ قال الشیخ عزالدین عبد السلام ومن العجب العجیب (اصل قول ازالۃ الخفا میں منقول ہے) یعنی سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ فقہا مقلدین اپنے امام کے قول کے ماخذ کے ضعیف ہونے سے واقف ہو جاتے ہیں اور کچھ جواب اُس کے ضعف کا نہیں رکھتے اور باایں ہمہ اپنے امام کے قول تقلید نہیں چھوڑتے بلکہ بسبب تقلید کے صریح حکم کتاب و سنت کو چھوڑ دیتے ہیں اور ظاہر کتاب و سنت کے ترک کرنے کے حیلے ڈھونڈتے ہیں اور تاویلات بعید اور باطل قرآن و حدیث میں کرتے ہیں حالانکہ اگلے لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ بغیر پابندی کسی مذہب کے جس عالم سے چاہتے مسئلہ پوچھ لیتے مگر جب کہ یہ مذہب ظاہر ہوئے اور مقلدین میں تعصب آیا تب سے یہ حال ہو گیا ہے کہ اپنے ہی امام کی تقلید کرتے ہیں اور کچھ دلیل و برہان کو نہیں دیکھتے اور اُس کو مثل نبی مرسل کے جانتے ہیں اور جو ایسا کرے وہ حق سے دُور ہے :

دوسرے ۔ قال الامام ابوشامہ ینبغی لمن اشتغل بالفقہ ان لا یقتصر علیٰ مذہب امام ویعتقد فی کل مسئلۃ صحۃ ما کان اقرب الیٰ دلالۃ الکتاب والسنۃ المحکمۃ یعنی امام ابوشامہ نے کہا ہے کہ اُس شخص کو جو فقہ میں مشغول ہو چاہیے کہ کسی ایک امام کے مذہب پر حصر نہ کرے بلکہ ہر مسئلہ میں اُس چیز کی صحت کا معتقد ہو جو قریب تر ہو کتاب و سنت سے :

تیسرے عبدالوہاب شعراوی میزان میں لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے حرام علی من لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی کہ حرام ہے اُس شخص پر جو میری دلیل کو نہ پہچانے یہ کہ فتوے دیوے میرے کلام پر اور شیخ تقی الدین نے ابن حزیمہ سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ لیس لاحد مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم قول اذا صح الخبر عنہ کہ کسی کے قول کا کچھ اعتبار نہیں ہے بمقابل رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کے جبکہ صحت حدیث کی ثابت ہو جاوے ۔

چوتھے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اذا صح الحدیث فھو مذھبی جو حدیث ثابت ہو جاوے وہی میرا مذہب ہے ۔

پانچویں ۔ زرقانی نے مواہب میں لکھا ہے وقد صح عنہ ایضا انہ قال اترکوا قولی بقول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لانہ لم یدع ھو ولا احد غیرہ من المجتھدین الاحاطۃ بکل قول صح من الرسول صلے اللہ علیہ وسلم فی زمانہ فضلا عما بعد زمانہ یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میرے قول کو چھوڑ دو جبکہ قول رسول صلعم کا پاؤ اس لئے کہ امام موصوف یا اور کسی مجتہد نے یہ دعوے نہیں کیا کہ ساری حدیثیں اُن تک پہنچ گئیں اُن کے زمانہ میں چہ جائیکہ وہ حدیثیں جو بعد اُنکے زمانہ کے معلوم ہوئیں ۔

چھٹے امام شعراوی نے منہج میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کل شیٔ خالف امر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سقط ولا یقوم معہ حجۃ ولا قیاس فان اللہ تعالی قد قطع العذر بقولہ صلے اللہ علیہ وسلم فلیس لاحد معہ حجۃ وقال ایضا اذا ثبت الخبر عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم لم یحل ترکہ لشئ ابدا یعنی بمقابل قول رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی کا قول حجت نہیں ہے اور بعد ثبوت حدیث کے ترک کرنا حدیث کا جائز نہیں ہے ۔

ساتویں امام شعراویؒ منہج میں امام شافعیؒ کے اقوال میں لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں احظوا امر دینکم فان التقلید المحض مذموم وفیہ للبصیرۃ ونسیان لتنویرھا یذم التقلید ویقول قبیح علی من اعطی شمعۃ لیستضئ بھا ان یطفئھا ویمشی فی الظلام ۔ کہ اپنے دین میں ہوشیار رہو تقلید محض پر قانع نہ ہو اس لئے کہ وہ بصیرت کو اندھا کر دیتی ہے اور نہایت بُری ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اکثر تقلید کی بُرائی کرتے اور کہتے کہ نہایت قبیح ہے حال اُس شخص کا کہ جس کو خدا شمع روشن عطا کرے تاکہ اُس کی روشنی پاوے اور وہ اُسے بجھا دے اور تاریکی میں چلے ۔

آٹھویں ۔ کتاب لوائح الانوار القدسیہ میں لکھا ہے کہ ومن شان العقید المحقق ترک

التعصب لامامہ اذا علم ضعف دلیلہ وعلم صحۃ دلیل مذہب الغیر لان امامہ لم یقل لہ قلدنی فی کل ما قلتہ لعلمہ بعدم العصمۃ من الخطاء کہ شان فقیہ محقق کی یہ ہے کہ وہ تعصب اپنے امام کا چھوڑ دے جبکہ اُس کی دلیل کا ضعف معلوم ہو جائے اس لئے کہ اُس کے امام نے یہ نہیں کہا ہے کہ ہر بات میں جو میں کہتا ہوں میری تقلید کرنا اس لئے کہ وہ خود جانتے تھے کہ ہم خطا سے محفوظ نہیں ہیں ؀

نویں شیخ محی الدین عربی فتوحات مکیہ کے باب ۳۲۸ معرفت نسخ شریعت میں لکھتے ہیں ان الشیطان قد مکنہ اللہ تعالیٰ علی حضرۃ الخیال وجعل لہ سلطانا فیھا فاذا رای الفقیہ یمیل الی ھوی الخ یعنی شیطان کو خدا نے خیال پر تسلط دیا ہے پس جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی فقیہ خواہش کی طرف مائل ہے تو اُس کو بہکاتا ہے اور یہ وسوسہ دیتا ہے کہ یہ روایت خدا کی طرف سے ہے اور یوں سمجھاتا ہے کہ پچھلے نیک لوگ بھی بسبب بڑائی کے خدا تک پہنچے ہیں اور احکام میں قیاس سے کام لیا ہے اور ایسی ایسی باتیں اس فقیہ کے دل میں ڈال کر اُس کی خواہشات پوری کرنے کے لئے اُسے ایک حیلہ شرعی بتلا دیتا ہے پس وہ فقیہ احادیث نبویہ کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور اُس کے عدم قبول پر یہ عذر کرتا ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی یا اگر صحیح ہے تو کوئی دوسری حدیث معارض اور ناسخ اُس کی نہ ہوتی تو ضرور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اُس پر عمل کرتے یا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اُس پر عامل ہوتے غرضکہ جو فقیہ جس امام کا مقلد ہے وہ ترک حدیث پر ایسے ہی عذر اور حیلے کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والے کو گمراہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن کے اماموں نے کہدیا اُس کی تقلید کو واجب جانتا ہے اگرچہ اُن کے اقوال احادیث کے معارض ہوں لیکن وہ کتاب و سنت کو چھوڑ کر اپنے ہی اماموں کی طرف رجوع کرتا ہے پس اگر ہم اُس سے کہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ صاف کہہ گئے ہیں کہ اگر کوئی حدیث تم کو مخالف میرے قول کے ملے تو میرے قول کو دیوار سے ٹپکو اور حدیث پر عمل کرو اس لئے کہ میرا مذہب ہی ہے جو حدیث سے ثابت ہوا اور مثل اسی کے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اور یہ قول اُنہیں کے مقلدین سے ثابت ہے پس ایسی باتوں کو سنکر مقلد چپ ہو جاتے ہیں اور کچھ جواب معقول نہیں دے سکتے۔ اور ایسے مباحثہ کا مجھے اکثر اتفاق ہوا۔ غرضکہ خواہشات نفسانی کے سبب سے شریعت محمدی کو فقہا نے منسوخ کر دیا کہ باوجودیکہ احادیث صحیح کتب صحاح میں موجود ہیں اور ان کے راویوں کے نام بھی مذکور ہیں اور ان کا جرح و تعدیل بھی منقول ہے اور ان کی سندیں بلا تبدیل و تغیر کے بھی محفوظ ہیں لیکن باوجود ان سب باتوں کے مقلدین میں سے کوئی ان پر عمل نہیں کرتا اور اپنے اگلوں کے فتووں ہی پر رجوع کرتے ہیں اور باوجود مخالفت ان صحاح حدیث کے اپنے فقیہوں

کے قول کو ترک نہیں کرتے تو کیا فرق ہے اُن احادیث کے ہونے اور نہ ہونے میں اس لئے کہ جب اُن کا حکم ہی نہ رہا اور مقلدین کے نزدیک اُن پر رجوع کرنا جائز ہی نہ تھا تو اُن کے نزدیک اُن احادیث کا وجود و عدم برابر ہے پس اس سے زیادہ نسخ شریعت کا اور کیا ہوگا۔ انتہی ✤

دسویں۔ نقل عن المنصمات ان الخبر فی کونہ حجۃ فوق الاجتہاد فان خالف الروایۃ الحدیث الصحیح ترکت فالعمل بالحدیث اولیٰ من الرأی ابدا یعنی جو حدیث مخالف حدیث کے ہو وہ چھوڑ دی جاویگی ✤

گیارھویں۔ امام شعرانی نے میزان میں لکھا ہے کہ فان قلت ما اصنع بالاحادیث التی صحت بعد موت امامی ولم یاخذ بہا فالجواب ینبغی لک ان تعمل بہا فان امامک لو ظفر بہا وصحت عندہ وبما کان امر بہا فان الائمۃ اسری کلہم فی ید الشریعۃ ومن فعل ذالک فقد حاز الخیر بکلتی یدیہ یعنی اگر تو پوچھے کہ پھر میں کیا کروں بہ نسبت ان حدیثوں کے جن کی صحت بعد موت میرے امام کے ثابت ہوئی اور میرے امام نے انکو نہیں پایا اس کا جواب یہ ہے کہ تجھے چاہیئے کہ تو اُس حدیث پر عمل کرے اسلیئے کہ اگر تیرے امام کو یہ حدیث مل جاتی تو ضرور وہ اُس پر عمل کرتے اس لئے کہ سارے امام شریعت کے ہاتھ میں ہیں اور جو ایسا کرے وہ دونوں ہاتھ سے نیکی جمع کریگا ✤

بارھویں۔ شاہ ولی اللہ صاحب اپنی وصایا میں لکھتے ہیں۔ در فروع پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میاں فقہ و حدیث کردن و دائما تعریفات فقہ بر کتاب و سنت عرض نمودن آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن والا کالائے بد بریش خاوند دادن اُست را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغنا حاصل نیست و سخن متقشفہ فقہا را کہ قول عالمے را دست آویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نہ شنیدن و بآں التفات نکردن و قرب خدا جستن بدورے ایناں ✤

تیرھویں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں تفسیر میں حدیث من لم یعرف امام زمانہ کے کہ فالمراد من لم یعرف امام زمانہ من الکتب لم یعرف نسخ الکتاب السابقۃ ولم یعرف ان کتب ائمۃ المذاہب لیست واجبۃ الاتباع کما یظنہ جملۃ المقلدین من کل مذہب مات میتۃ جاہلیۃ یعنی جو شخص نہ جانے کہ امام زمانہ کا قرآن مجید ہے اور نہ جانے اس امر کو کہ کتب سابقہ منسوخ ہوگئی ہیں اور نہ جانے اس بات کو کہ کتابیں مذہب کے اماموں کی واجب الاتباع نہیں ہیں جیسا کہ سب مقلدین اپنے اپنے مذہب کے اماموں کی نسبت گمان کرتے

ہیں تو اس شے جاننے والے کی موت جاہلیت کی موت ہے ٭

چودھویں ۔ صاحب لوامع الالہام نے مولوی شاہ عبد العزیز صاحب کے ایک اور قول کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے ۔ بانکہ امام ابوحنیفہ رح گفتہ است کہ حلال نبود کسے را کہ بقول ما تمسک کند تا آنکہ نہ داند ما خذ آں را از کتاب و سنت و اجماع امت و قیاس جلی مجتہد گاہ خطا کند و گاہ بحق رسد چوں خطائے او ظاہر گردد تقلید او درخطا حرام بود ٭

پندرھویں ابن امیر الحاج نے تیسیر شرح تحریر میں لکھا ہے کہ اذا رای بقول المخالف المذهب امامه دليلا صحيحا من الحديث ولم يجد في مذهب امامه جوابا قويا عنه ولا معارضا راجحا عليه اذا المكلف مامور باتباع النبي صلى الله عليه في ما شرعه فلا وجه للمنع من تقليده من قال بذلك من المجتهدين محافظة على مذهب الملتزم تقليده ٭

سولھویں ۔ صاحب دراسات اللبیب نے لکھا ہے کہ حنفی لو ترك مذهب امامه بقول من سهل بتتبع الرخص لم يكن ملاما ۔ کہ اگر کوئی شخص اپنے امام کے مذہب ترک کرے اس کے کہنے پر جو ایسے مباح ہونے کے کسی امر میں آسانی پائے از روے شریعت کے تو اُس پر کچھ ملامت نہیں ہو سکتی ٭

پس اس سے باطل ہوا وہ قول مقلدین کا کہ تقلید کے چھوڑنے سے آدمی آزاد ہو جاتا ہے اور بہت حرام چیزوں کو مباح سمجھتا ہے ایسے کہنے والوں نے درحقیقت شریعت محمدی کو مشکل کر رکھا ہے اور جو آسانی خدا نے اُس میں رکھی ہے اُس پر عمل کرنے کو الحاد تصور کیا ہے حالانکہ حضرت ابن عباس سے سنن ابو داؤد میں ایک حدیث منقول ہے کہ عن ابن عباس قال كان اهل الجاهلية يا كلون اشياء ويتركون اشياء تقذرا فبعث الله تعالى نبيه صلى الله عليه وسلم وانزل كتابه واحل حلاله وحرم حرامه فما احل فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سكت عنه فهو عفو ٭

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اہل جاہلیت بہت سی چیزیں کھاتے اور بہتوں کو ناپاک سمجھ کر چھوڑ دیتے کہ خدا نے اپنا نبی بھیجا اور اپنی کتاب نازل کی اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام بتلایا پس جس کو اس نے حلال کر دیا وہ حلال ہے اور جس کو اُس نے حرام کر دیا وہ حرام ہے اور جس سے سکوت فرمایا وہ مباح ہے اور معاف ٭

سترھویں ابن امیر الحاج شرح تحریر میں لکھتے ہیں کہ فلو التزم مذهبا معينا كابي حنيفة والشافعي فقيل يلزم وقيل لا يلزم قال الشارح وهو الاصح لان التزمه غير ملتزم اذ لا واجب الا ما اوجبه الله تعالى ورسوله ولم يوجب الله تعالى ورسوله صلى الله

علیہ وسلم علی احد من الناس ان یتمذھب بمذھب رجل رجل من الامۃ فیقلدہ دینہ فی کل ما یاتی وھذا وغیرہ کہ ایک مذہب معین کا التزام کرنا واجب نہیں ہے اس لئے کہ واجب وہ ہے جسکو خدا اور رسول نے واجب کیا ہو پس نہ خدا نے نہ رسولؐ نے بندوں پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ مذہب کسی آدمی کا اُس کی امت میں سے اختیار کریں اور خدا کے دین میں کسی کی ایسی تقلید کریں کہ اُسی کی باتوں کو مانے اور دوسروں کو چھوڑے ❊

اٹھارھویں ابن عزمے حاشیہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ من یتعصب لواحد معین غیر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ویری ان قولہ ھو الصواب الذی یجب اتباعہ دون الائمۃ الاخرین فھو ضال جاھل کہ جو شخص تعصب کرے کہ ایک ہی معین شخص کی تقلید لازم ہے وہ گمراہ جاہل ہے ❊

اُنیسویں ۔ صاحب دراساۃ نے لکھا ہے کہ العمل بالدلیل المخالف للحدیث الصحیح حرام علی المقلد کالمجتہد کہ عمل کرنا ایسی دلیل پر جو کہ مخالف ہو حدیث صحیح کے حرام ہے مقلد پر بھی مثل مجتہد کے ❊

بیسویں ۔ روی الخطیب باسنادہ ان الدرازکی من الشافعیۃ کان یفتی وربما یفتی بغیر مذھب الشافعی وابی حنیفۃ فقیل لہ ھذا مخالف لقولیھما فیقول ویلکم حدث فلان عن فلان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھکذا والاخذ بالحدیث اولی من الاخذ بقولھما اذا خالفاہ کہ درازکی فقہائے شافعی سے بھی فتوے مخالف مذہب امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے دیتے تو جب کوئی پوچھتا کہ یہ قول آپ کا مخالف اُن دونوں اماموں کے ہے تو وہ فرماتے کہ جب معلوم ہو گیا کہ یہ قول پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے تو اس کا لینا چاہئے نہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے قولوں کا جبکہ اُس سے مخالف ہوں ❊

اکیسویں ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اذا کان العامی یسوغ لہ کیف لا یسوغ لہ الاخذ بالحدیث فلو کانت سنۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا یجوز العمل بھا وھذہ من ابطل الباطل و اقام اللہ تعالی الحجۃ برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دون احاد الامۃ ولا یفرض احتمال خطاء لمن عمل بالحدیث وافتی بہ بعد فھمہ الا اضعاف اضعاف ما حصل لمن افتی بتقلیدہ یعنی جب کہ عامی کو مفتی کے قول پر عمل کرنا جائز بلکہ واجب ٹھہرا باوجود احتمال مفتی کی خطا کے تو کیونکر اسکو جائز نہ ہوگا عمل کرنا حدیث پر پس اگر پیغمبر خدا ہی کی حدیث پر عمل کرنا جائز نہ ہو تو پھر کس پر عمل کرنا جائز ہوگا حالانکہ خدا نے حجت صرف رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے نہ اور کسی آدمی کو اور یہ سمجھنا کہ عمل بالحدیث میں غلطی کا احتمال ہے ۔ باوجود

اقرار اس امر کے کہ اُس سے دو چند چہار چند زیادہ غلطیاں مفتی کے قول میں ہوتی ہیں جنکی تقلید واجب سمجھی جاتی ہے بڑی نادانی ہے ؎

بائیسویں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قراءت خلف امام کے استفتا کے جواب میں فرماتے ہیں کہ خواندن سورہ فاتحہ باقتدائے امام مقتدی را نزد ابوحنیفہ رح ممنوع و نزد محمد ہرگاہ کہ امام جہر نخواند جائز بلکہ اولےٰ و نزد شافعی رح بدون خواندن فاتحہ عدم جواز صلوٰۃ و نزد فقیر ہم قول شافعی ارجح و اولےٰ چرا کہ بلاحظہ حدیث صحیح لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب بطلان نماز ثابت می شود و قول ابو حنیفہ رح نیز جا بجا وارد است کہ جائیکہ مذہب صحیح وارد شود و قول من خلافش افتد قول مرا ترک باید نمود و بر حدیث عمل باید کرد الی قولہ ـ لہذا لازم است کہ متم فاتحہ مقتدی بتبعیت امام نیز کردہ باشد تا داخل عاملان مفسرین و محدثین خواہد شد و درین معنی از ترک فاتحہ خلاف حدیث صحیح واقع خواہد شد وجہ عجیب کہ صحت این حدیث بامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رسیدہ باشد ہرگاہ کہ الحال از صدہا و ہزارہا مردم علمائے محققین مثل امام بخاری و صاحب مسلم وغیرہم رحمہم اللہ صحت این ثابت شد از ترکش ملام و مطعون خواہد شد ؎

تئیسویں ـ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی حالت رویا میں لکھتے ہیں کہ ناگاہ جناب حضرت امیر از جانب قبلہ نمایاں شدند الی قولہ با فقیر ہمکلام شدید فقیر آن وقت را غنیمت دانستہ در چند چیز کہ در آں وقت در ذہن حاضر شد عرض نمود جواب باصواب یافتہ الی قولہ باز عرض نمود کہ از فقہا کدام یک مختار و پسند جناب است ـ فرمودند کہ ہیچ پسند ما نیست یا بطور ما نیست افراط و تفریط بعمل آوردہ اند ـ یہ اقوال صرف بطور نمونہ کے ہم نے نقل کئے اور مثل اس کے صدہا ہزارہا اقوال ہیں جن سے حدیث پر عمل کرنا واجب نکلتا ہے" ؎

نقل ـ "آپ کی اس تقریر سے ثابت ہوا کہ حدیث کا ترک کرنا جائز نہیں ہے اور مقابل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے کا قول لائق سند نہیں پس یہی ہم بھی کہتے ہیں اور ایسا ہی ہمارا عقیدہ ہے ہم بھی امام کو نبی نہیں جانتے ان کو معصوم نہیں کہتے بلکہ ہمارا اول عقیدہ مجتہدین کی نسبت یہی ہے کہ المجتہد قد یخطی و قد یصیب کہ مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی لیکن ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے مجتہدین اور فقہا نے ہر ایک قول کو حدیث سے ثابت کیا ہے اور کسی میں مخالفت حدیث کی نہیں کی اور جو قول ظاہر میں مخالف حدیث کے معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت مخالف نہیں ہیں بلکہ اور احادیث صحیحہ سے اُن کا ثبوت ہوتا ہے اور امام ابوحنیفہ رح کے پاس صندوق کے صندوق حدیثوں کے تھے ـ

پس ہم اسی واسطے اُن کی تقلید کرتے ہیں اور اُن کے اقوال کتاب و سنت سے ثابت ہیں اور مخالف حدیث کے نہیں ہیں ۔

غیر مقلد ۔ بیشک آپ اپنی زبان سے امام کو نبی نہیں کہتے اور اُن کی معصومیت کا اقرار نہیں کرتے مگر جو برتاؤ تمہارا اُن کے ساتھ ہے اُس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ تم اُن کو معصوم جانتے ہو ورنہ خیال کرو کہ یہ تمہارا کہنا کہ اُن کا کوئی قول حدیث کے مخالف نہیں اور بعد اُن کے بھی کوئی حدیث صحیح نہیں ملتی اس سے کسی مسئلہ میں اُن کا اجتہاد قابل ترک کے ہو یہ کیسا قول ہے کہ جس کی غلطی ثابت کرنے کے لیئے کسی دلیل کی حاجت ہو اگر چاروں امام کے سب قول موافق حدیث کے ہوتے تو کیوں آپس میں اختلاف ہوتا پس یہ اختلاف ہی عمدہ دلیل تمہارے قول کی غلطی کی ہے ۔ ۱؎

مقلد ۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک اماموں نے اپنی رائے سے کام لیا اور خلاف حدیث کے مسئلے اپنے ذہن سے تراش کر بنائے اور جو ایسا کرے وہ دشمن اسلام کا ہے تو یہ چاروں امام آپ کے عقیدہ کے موافق دشمن اسلام کے ٹھہرے ۔ نعوذ باللہ منہ ۔

غیر مقلد ۔ ہمارا یہ قول اور عقیدہ اُن پاک اماموں کی نسبت نہیں ہے بلکہ ہم تو اُن کو اُس درجے سے بھی بڑھا ہوا جانتے ہیں جس درجہ کا تم اُن کو سمجھتے ہو اور ہم اُن کی پاکی اور نیکی کے معتقد ہیں۔ اور اُن کا ایک بڑا احسان اپنے اوپر جانتے ہیں کہ اُن کی مساعی جمیلہ سے راہ شریعت کی کشادہ ہوئی خدائے تعالےٰ اُن کے نیک کاموں کا نیک بدلہ دے مگر یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک اُن کو احادیث پہنچیں اُس پر اُنہوں نے عمل کیا اور جن مسائل میں اُن کو حدیث نہ ملی وہاں اجتہاد کیا اور جہاں تک اُن سے بہ نیک نیتی ہو سکا اپنے آپ کو غلطی سے بچایا مگر وہ معصوم نہ تھے کہ اُن سے غلطی نہ ہوتی۔ علاوہ بریں پیچھے کر کے حدیث مل گئی سو اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور اُس مسئلہ میں اپنے اجتہاد کو ترک کر دیتے اور اسی لیئے ہمیشہ وہ کہتے رہے کہ حدیث کے ملنے کے بعد ہمارے قول کو نہ ماننا اگر وہ امام اپنی رائے کو دخل دیتے اور تم لوگوں کی طرح حدیث پا کر اور اُس کی صحت پر مطلع ہو کر چھوڑ دیتے تو بیشک اُن کی پاکی پر اعتراض ہوتا حقیقت میں تم اُن کے مقلد نہیں ہو۔ ہم اُن کے مقلد ہیں کہ اُن کے قول پر چلتے ہیں کہ وہ صاف فرما گئے ہیں کہ حدیث پر عمل کرو اور کسی کے قول کو نہ دیکھو۔ لیکن بعد اُن کے جو اور لوگ ہوئے اور جنہوں نے تقلید میں تعصب کو دخل دیا اُن کو بے شک ہم اچھا نہیں جانتے اور اُن کی باتوں پر نہیں چلتے گو تمہارے نزدیک وہ محقق ہوں یا علامہ

۱؎ یہاں اس جواب کو ہم نے مختصر کر دیا اس لئے کہ اس مضمون کے تمہید میں ہم نے نہایت تفصیل کے ساتھ جواب اس کا دیا ہے اور بہت سی روایات فقیہہ کی مخالفت حدیث سے ثابت کی ہے ۔

علاوہ اس کے آپ تقلید صرف ائمہ اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہی کی نہیں کرتے بلکہ ان کے مقلدین کی تقلید کرتے ہو اس لئے کہ جتنے مسئلے اور احکام فقہ کی کتابوں اور فتاووں میں لکھے ہوئے ہیں یہ بھی تو سب انہیں اماموں کے نکالے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کے بعد اور عالموں اور فقیہوں نے ان کے اصول پر نکالے ہیں۔ اور تم سب کو ان مسائل نکالے ہوئے اماموں کے مانتے ہو اس وجہ سے کہ وہ ان کے اصول کے پابند ہیں پس اگر تم صرف انہیں اماموں کے نکالے ہوئے مسئلوں کی تقلید کرتے تب بھی جب بلحاظ انکی بزرگی اور پاکی کے تم کو مناسب ہوتا مگر جبکہ سارے مسئلے ان کے نکالے ہوئے نہیں ہیں تو تعجب ہے کہ ان کے اصول کی پابندی سے جو مسئلے پچھلے عالموں نے نکالے ہوں اور جس میں انہوں نے غلطیاں بھی کی ہوں بلکہ خود اپنے اماموں کے اقوال سے بعضے حالات میں بوجہ نافہمی وغیرہ کے مخالفت کی ہو اور ان کے بعضے فتوے اور مسئلے اماموں کے اصول کے مطابق بھی نہ ہوں مگر باایں ہمہ ان کو تم مانو اور جو کتاب و سنت کو اصول سمجھ کر اس کی پابندی سے مسئلے نکالے اور واسطہ در واسطہ کو چھوڑ کر اصل ماخذ سے شرع کے احکام لے اس کو تم برا جانو تو حقیقت میں یہ ایک نہایت تعجب کی بات ہے"۔

مقلد: "کیا ہمارے پچھلے علما نے بارہ دانستہ حدیث کی مخالفت کی ہے"

غیر مقلد: "میں کیونکر اپنی زبان سے کہوں مگر میں تمہارے ہی فقہا کے اقوال کو مثیلاً نقل کرتا ہوں ذرا کان لگا کر سنو اور تقلید کے تعصب کو چھوڑ کر بانصاف غور کرو۔ ملا علی قاری اپنے رسالہ میں جو اشارہ کی نسبت لکھا ہے فرماتے ہیں فالی اعمل بالاخبار النبویۃ والآثار المصطفویۃ [1] کہ جو شخص اخبار نبوی و آثار مصطفوی کو نہیں جانتا جب اس نے دیکھا کہ بعض تو بسبب مسنون ہونے کے اشارہ تشہد میں کرتے ہیں اور بعض یا جہل یا کسل کے سبب سے نہیں کرتے تو یہ کہنے لگا کہ اس کا ترک کرنا اولیٰ ہے بعد اس کے دوسرا شخص ہوا اور اس نے یہ زیادہ کیا کہ اشارہ کرنا مکروہ ہے مگر کراہت سے مراد اس کی کراہت تنزیہی ہے۔ پھر تیسرا شخص ہوا اس نے کہا کہ جو اگلے لوگ کہہ گئے ہیں کہ مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے اس لئے اس نے فتویٰ دیا کہ اشارہ کرنا حرام ہے پس خیال کرو کہ بسبب جہالت اور غفلت کے سنت مشہورہ امور منہیہ میں داخل ہو گئی۔

---

[1] اس رسالہ کے حاشیہ پر یہ اصل عبارت لکھی ہوئی ہے جو چاہے دیکھ لے۔ ہم نے بسبب طول کے چھوڑ دی ہے اور فقط ترجمہ پر قناعت کی۔

[2] مولانا شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی نے بھی اشارہ کے جائز ہونے بلکہ مسنون ہونے کی نسبت بہت کچھ فرمایا ہے چنانچہ لوامع الالہام فی ان کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے کہ چوں نزد بعضے از سنت بودن قول ائمہ منع کردند آں را القیاس بکتاب و سنت و قیاس و اجماع مخالف نص جلی است پس خطا کردہ و تعمید او ورفتہ حرام بود نی قول فضل اشارت بسیار است دریں مختصر نگنجد۔ و لے برکسے کہ ازیں فضل محروم باشد۔

اور فعل پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثنا کا حرام ٹھہر گیا اور حرام کی تعریف یہی ہے کہ جس کی حرمت بدلیل قطعی کتاب و حدیث سے ثابت ہو اور یہ قواعد مقررہ سے ثابت ہے کہ مباح کا حرام کرنا حرام ہے نہ کہ ایسی سنت کا جو حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو پس جو علامہ کیدانی نے اُس کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے اُس کی بُرائی پر یہی دلیل کافی ہے کہ اُس نے سارے اہل حدیث کی اہانت کی اور بعد اس قول کے ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں ولولا حسن الظن بالکیدانی وتأویل کلامه بنسبته لکان کفره صریحاً وارتداده صحیحاً فهل یحل لمؤمن بالله تعالی ان یحرم ما ثبت فعله صلی الله علیه وسلم ما کاد نقله ان یکون متواترا یعنی اگر علامہ کیدانی کے ساتھ حسن ظن نہ ہوتا اور اُس کے کلام کی تاویل نہ ہوتی تو اُس کے کفر و ارتداد میں کچھ شک نہ تھا کیا جائز ہے خدا پر ایمان لانے والے کو کہ وہ حرام کرے اُس چیز کو جس کا کرنا ثابت ہوا ہو پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے اور جس کی نقل قریب متواتر کے ہو[1]

پس جب تقلید سے یہ نوبت پہنچ گئی ہو اور سنت نبوی سے ایسے ایسے بڑے فقہا کی بیخبری کا یہ حال ہو تو اُسی پر واجب جاننا اور عمل بالحدیث کو بدعت کہنا وہ دین و مذہب ہے جس کو کچھ بھی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔

مقلد:۔ ایک دو شخص نے اگر ایسی غلطی کی تو اُس سے الزام سب پر عاید نہیں ہوتا تقلید کے فائدوں کو دیکھو اور جو آسانی مسائل کے معلوم کرنے کی فقہا نے پیدا کی ہے اُس پر انصاف کرو۔

غیر مقلد:۔ آپ کو شاید اپنے مذہب کے علما کے قولوں پر بھی اطلاع نہیں ہے حضرت یہی مسئلہ اشارہ کا ایسا ہے کہ جس پر صدہا عالموں نے مخالفت حدیث کی ہے اور صرف تقلید کے سبب اُس کو مکروہ و حرام کہا ہے اور اس بیچارہ ملا علی قاری نے اس مسئلہ کا جواب لکھا ہے چنانچہ صاحب لوامع الہدایہ نے رسالہ اُس کے رد میں لکھا ہے وہ ملا علی قاری کے اس قول کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آنچہ علی قاری در جواز این فعل مسنون اصرار نموده سخنہا گفته که کسے کم گفته باشد و اراده ابطال مسئله اجتہاد و تقلید کرده و ہر آئینه این خبر از فساد اعتقاد وے است" پس معلوم ہوا کہ جو شخص ذرا بھی تقلید کو چھوڑے اور حدیث پر عمل کرے وہ فاسد الاعتقاد ہے سبحان اللہ یہ عجیب دین و مذہب ہے کہ جس پر آدمی ایمان لایا ہے اُس کے قول کو ماننا اور اس پر عمل کرنا دلیل فساد اعتقاد کی ہو وے۔

چوبیس تقلید کے فائدوں اور خوبیوں کو ہمارے علما کی کتابوں میں ملاحظہ کرو۔ اور جو کچھ

[1] بعضے علمائے حنفیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اشارہ کرنا نماز خلاف وقار و سکینت کے ہے مولانا شاہ عبد العزیز صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہر اگر گوید فعل اکابر خلاف وقار و سکینہ است خصوصاً در نماز باتفاق جمیع مومنین کافر گردد۔

آپ اعتراض کرنے میں اُن سب کا جواب دیکھو خصوصاً شرح سفر السعادت اور تفسیر احمدی وغیرہ کو مطالعہ کرو تب آپ کے سب شبہات دُور ہو جاویں ؀

خیر منقلد ہم نے سب کو دیکھا اور خوب غور کیا پس بعضوں کی تحریر میں اُن کی سادگی طبیعت کا اثر پایا اور بعضوں میں [illegible] مولانا صاحب [illegible] کا یاد آنا اور اکثروں کی باتوں کو تو صرف تعصب سے بھرا ہوا پایا مگر یہ ہم نہیں کہتے کہ علما اور فقہا نے دیدہ و دانستہ حدیث کی مخالفت کی ہے یا معاذ اللہ وہ سب کے سب پابند ہوا و ہوس کے تھے بلکہ ہم اکثر علما کو نیک اور پاک جانتے ہیں اور اُن کی نہایت دل سے تعظیم اور بزرگی کرتے ہیں لیکن ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جنہوں نے اپنی نیکی اور پاکی کے ساتھ تحقیق کو بھی دخل دیا اور کتاب و سنت پر تمسک کر کے فقہا سے اختلاف کیا اور اجتہاد کو تقلید سے بہتر جانا۔ اور دوسرے وہ علما ہیں جنہوں نے باوجود نیکی اور پاکی کے صرف تقلید ہی کو اچھا جانا اور کتاب و سنت کو نہ یہ سمجھ کر کہ واجب الاتباع نہیں ہیں بلکہ یہ خیال کر کے کہ جو کچھ اگلے لوگ لکھ گئے ہیں اور استخراج کر گئے ہیں وہ کافی ہے اور مطابق کتاب و سنت کے ہے اپنا متمسک بنایا اور نہ تعصب سے بلکہ نیکی اور محبت اور مصلحت سے تقلید ہی کو اچھا جانا پس ان دونوں علما کی نسبت ہم نہ اپنے دل میں کچھ بُرا خیال کرتے ہیں نہ اُن کی شان میں ہم کچھ کہتے ہیں بلکہ ہم اُن کو تم سے بھی بڑھ کر نیک اور پاک جانتے ہیں مگر ایسے علما کو چھوڑ کر بہت سے علما ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے تعصب ہی کو دخل دیا اور اپنے علم و فضل کے کھلانے اور اپنی بات کی پیروی کرنے میں دیدہ و دانستہ حق کو چھوڑا۔ اور نہ صرف نیکی سے اور نہ فقط محبت سے اور نہ محض مصلحت کے خیال سے بلکہ اپنی نفسانیت سے کھلی ہوئی حدیثوں کو پس پشت ڈالا اور تاویلات بعیدہ سے اُن پر خط نسخ کھینچا اور پوچ دلیلوں سے اپنے اقوال کو ثابت کیا ایسے علما کے اگر حالات اور مثالیں اور نام لکھے جاویں تو ایک دفتر کا دفتر ہو جاوے[1]۔ لیکن یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ جو آدمی نیک اور اچھا ہو اُس کی سب باتیں واجب التسلیم ہوں۔ اس لئے ہم نے مانا کہ بعضے عالم نیک اور بزرگ تقلید کو اچھا جانتے تھے یا فرض کیا کہ وہ اُسے واجب سمجھتے تھے مگر ہمارا اس قول کو اُن کے غلط جاننا اور اُن کی اس رائے کو نادرست سمجھنا اُن کی بزرگی پر الزام لگانا نہیں ہے یہی غلطی آپ کی سمجھ کی ہے اور اسی سے سب کو مغالطہ ہوتا ہے کہ جو آدمی نیک اور بزرگ ہے اُس کی سب باتیں ماننے کے لائق ہیں حالانکہ یہ حق کسی کا نہیں ہے سوائے اُس کے جو معصوم ہو اور جس کی نسبت اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے کہ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی ؀

---

[1] دیکھو احیاء العلوم کی کتاب علم اور کتاب غرور کہ ایسے علما کی نسبت کیا لکھا ہے۔

مقلد: "نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ علما اور فقہا کے اقوال ماننے کو بُرا سمجھتے ہیں اور اُن کی باتوں کو خلاف حدیث کے جانتے ہیں آخر علما کی باتوں کو تو ہم اسی لئے مانتے ہیں کہ وہ خدا اور رسول کی باتوں کو سمجھتے ہیں اور اُس سے واقف ہیں نہ اس وجہ سے ہم اُن کی باتوں کو مانتے ہیں کہ وہ بذات خود خدا و رسول ؐ کے مخالف باتیں کہتے ہیں اور خدا کی اور اُس کے رسول کی باتوں کو سوائے علما کے کون سمجھتا ہے پس جس پر بہت سے علما فقہا جمع ہوں اُسی کو ہم خدا اور رسول ؐ کے حکم کے موافق سمجھتے ہیں اس لئے کہ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لا تجتمع اُمتی علی الضلالۃ کہ میری اُمت ضلالت پر جمع نہ ہوگی اور چونکہ آپ علما و فقہا کے دشمن ہیں اس لئے ہم آپ کی باتوں کو خلاف خدا اور رسول ؐ کے سمجھتے ہیں اور علما کی دشمنی کو ہم نشانی ضلالت کی سمجھتے ہیں"۔

غیر مقلد: ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہم تمام ان لوگوں کو جو کہ علما اور فقہا کہلائے جاتے ہیں اور جن کے علم اور مولویت کے آپ معتقد ہیں اپنا پیرومرشد نہیں جانتے اور اُن کی سب باتوں کو نہیں مانتے مگر یہ غلط ہے کہ ہم فقہا سے عداوت رکھتے ہیں اور ان میں کچھ تمیز نہیں کرتے۔ اور سب کو بُرا سمجھتے ہیں یا اُن کے سارے قولوں کو غلط جانتے ہیں اس لئے ہم چند باتیں آپ سے بیان کرتے ہیں جس سے آپ کے یہ سارے شبہات دُور ہو جاویں سب سے پہلے اس امر کو سوچنا چاہیے کہ علما سے محبت اور عداوت کی کیا وجہ ہے اور ان کے قولوں کا ماننا نہ ماننا کس اصول پر مبنی ہے۔ پس ان کے ساتھ محبت اور عداوت کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم جس معصوم پر ایمان لائے اور جس صاحب شریعت کے دین میں داخل ہوئے اُس سے ہم کو دینی محبت رکھنا فرض اور ایک امر ضروری ہے پس جو شخص ہم کو ہمارے اُس محبوب تک پہنچاوے اور اُس کی باتیں ہم کو سکھلاوے اُس سے لامحالہ ہم کو محبت ہوگی اور رسول کا رسول سمجھ کر ہم اُس کے ساتھ خواہ مخواہ محبت رکھیں گے پس جن عالموں کو ہم جانتے ہیں وہ نیک اور پاک تھے یا ہیں اور سچی راہ ہمارے رسول ؐ کی ہم کو اور ساری اُمت کو بتلاتے تھے اور بتلاتے ہیں اور جن کی ذات سے دین کو بہت سا فائدہ ہوا اُن سے ہم محبت رکھتے ہیں اور اپنی ساری جان اور دل سے اُن کی تعظیم کرتے ہیں اس لئے کہ علت محبت کی ان میں موجود ہے اسی طرح پر جن مولویوں کو ہم جانتے ہیں کہ وہ متعصب اور جاہل تھے اور جن کے تعصب اور جہالت سے دین کو نقصان پہنچا اور جنہوں نے اپنی نفسانیت اور دُنیا طلبی یا حماقت اور نادانی سے وہ طریقہ جاری کیا جس سے ہم اپنے محبوب تک نہ پہنچ سکیں اور بیچ ہی ہی میں بھٹکتے رہ جاویں تو ضرور ہم ان سے عداوت رکھتے ہیں اس لئے کہ وجہ محبت کی ان کی ذات سے مفقود اور علت عداوت کی موجود ہے پس فقط عالم ہونا یا فقیہ ہو جانا کافی نہیں ہے

بلکہ اس کے ساتھ نیک اور پاک اور متقی اور مصداق لا یخافون لومۃ لائم ہونا بھی ضرور ہے۔
پس اگر ہم اُن لوگوں کے ساتھ محبت رکھیں جو کہ رسم و رواج کے پابند تھے یا جن کے دل کو تعصب نے سیاہ کر دیا تھا یا جن کی آنکھوں پر پردہ جہالت کا پڑ گیا تھا اور جنہوں نے دیدہ و دانستہ اُمت کو اُس کے پیغمبر سے چھڑانا چاہا اور اپنی پوچ و لچر باتوں سے لوگوں کو بہکایا تو حقیقت میں یہ دوستی رکھنا اسلام کے ساتھ دشمنی کرنا ہے اگر ہم علما اور فقہا کے دشمن ہوتے تو ضرور چاروں امام اور اُن کے خاص تلامذہ کے دشمن ہوتے حالانکہ ہم اُن کو وارث انبیا سمجھتے ہیں۔ اور علماے ربانی جانتے ہیں اور اپنے سارے دل و جان سے اُن کی تعظیم کرتے ہیں اور اُن کا شکر ادا کرتے ہیں جیسا کہ اُن کے اُن تقلید کرنے والوں کو جنہوں نے حدیث پر عمل کرنے کو ناجائز کر دیا اور تقلید کو واجب اور فرض ٹھہرا دیا برا اور متعصب جانتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ اگر جن علما کو ہم بھی نیک اور پاک جانتے ہیں اُن کی سب باتوں کو کیوں نہیں مانتے اس کا یہ سبب ہے اگر ہم اُن کو معصوم جانتے اور اُن کو صاحب الہام سمجھتے اور ہمارا یہ عقیدہ ہوتا کہ جبرئیل اُن پر نازل ہوتے تھے اور وہ فقہ اور احکام مسائل اُن کو بتلا جاتے تھے تو ضرور ہم اُن کے قول اور فعل ہی کو واجب العمل جانتے مگر جبکہ ہم کسی بڑے سے بڑے مجتہد اور نیک سے نیک عالم اور فقیہ اور امام کے اجتہاد اور امامت پر اعتقاد رکھینگے تو پہلا کلمہ طیبہ ہماری زبان سے یہ نکلیگا کہ المجتہد قد یخطی وقد یصیب تو پھر کیونکر ہم اُس کے برخلاف اُن کو معصوم جانینگے اور عصمت پر اعتقاد رکھنے یا نہ رکھنے کا ثبوت نہ صرف زبان کے اقرار و انکار سے ہوتا ہے بلکہ اُن کاموں سے جو ہم اُن کی باتوں کی نسبت کرتے ہیں پس جس نے اُنکی سب باتوں کو مانا اور باوجود غلطی کے یہ سمجھ کر کہ ضرور کچھ نہ کچھ سبب اس کا ہوگا اُسی پر عمل کیا بلاشک اُس نے اُنکو معصوم جانا گو ہزار زبان سے انکار کرے اور جس نے اُن کی باتوں میں اُن باتوں کو نہ مانا جو کہ مخالف حدیث کے ہوئیں۔ اُس نے اپنے دعوے کو پایہ ثبوت پر پہنچا ۔

میں نہایت حیران کہ باوجودیکہ مقلدین کا دعوے تو یہ ہے المجتہد قد یخطی وقد یصیب اور پھر عمل یہ ہے کہ امام کے اجتہاد کے برخلاف کرنا کسی کو جائز ہی نہیں ہے اور اسی کی تقلید واجب ہے ۔

اب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ آئمہ اربعہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سچے پیرو ہم ہیں یا کہ اُن کے مقلدین۔ تو ہم بخوبی اپنے سچے دل سے یقین کرتے ہیں کہ سچے پیرو اُن کے ہم ہیں نہ وہ لوگ جو کہ تقلید کا دعوے کرتے ہیں اس لئے کہ پیروی اُن کی وہ جھوٹی محبت نہیں ہے جس سے وہ اُس درجہ پر پہنچے ہوئے سمجھے جاویں کہ وہ مستحق نہیں ہیں بلکہ اصل پیروی اُن کی وہ ہے

کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہو اس پر عمل کیا جاوے پس اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر براہ محبت یہ عقیدہ رکھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خدا تھے نعوذ باللہ من ذالک تو اس نے آنحضرتؐ کو اس درجہ سے بڑھا دیا جو کہ خدا نے حضرت کو عنایت فرمایا اس لئے کہ حضرت بندہ تھے نہ خدا اسی واسطے آپ نے کلمہ شہادت میں اپنی عبودیت کو داخل کر دیا اور صاف صاف فرما دیا کہ یوں سمجھو اور یوں کہو کہ محمد اً عبدہ ورسولہ جس نے اس کے برخلاف کیا وہ دشمن آنحضرتؐ کا ہے نہ پیرو اسی طرح اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ آئمہ اربعہ معصوم تھے تو اس نے ان کو ان کے درجہ سے بڑھا دیا اس لئے وہ مجتہد تھے نہ معصوم اسی واسطے ان اماموں نے صاف فرما دیا کہ ہم مجتہد ہیں نہ معصوم والمجتہد قد یخطی وقد یصیب پس باوجود ان کے اس کہنے کے جس نے انکے برخلاف ان کے سب قولوں کو سہو اور غلطی سے محفوظ جانا وہ ان کا دشمن ہے نہ پیرو

کوئی خوف آنحضرتؐ کو اس سے زیادہ نہ رہتا تھا کہ لوگ خدا نہ سمجھنے لگیں اسی واسطے بار بار فرماتے تھے کہ انا عبدہ ورسولہ وانما انا بشر مثلکم اور جب کوئی ایسی بات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کہتا جس سے شرکت ساتھ خدا کے نکلتی اس وقت رنگ چہرہ کا متغیر ہو جاتا اور خفا ہو جاتے اور فرماتے کہ اجعلتنی للہ ندا کیا تو نے مجھ کو اللہ کا نِد (یعنی) خدا کا مجھے شریک بناتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ خدا خفا ہو جاوے کہ تم میری خدائی اور توحید کو پھیلانے گئے تھے یا کہ اپنے آپ کو میرا شریک بنانے کو پس بعینہ ان چاروں اماموں کو بھی کوئی خوف اس سے زیادہ اپنے اجتہاد میں نہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ ان کو معصوم جاننے لگیں اور انکے قولوں کو بمقابل احادیث کے واجب العمل جان کر حدیث کو چھوڑ دیں اسی واسطے بار بار ان کی پاک زبانوں سے یہی نکلتا رہا کہ المجتہد قد یخطی وقد یصیب چنانچہ امام ابو حنیفہؒ برابر یہی کہتے رہے کہ لا ینبغی لمن لا یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا تا دم مرگ یہی قول رہا کہ اذا صح الحدیث فہو مذہبی امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ چلا چلا کر یہ کہتے تھے کہ لا تقلدنی ولا تقلدن مالکا اور یہ خوف ان اماموں کا اسی سبب سے تھا کہ ایسا نہ ہو کہ پیغمبر صاحب ہم سے خفا ہو جاویں کہ تم مجتہد اور امام میری شریعت کے مسائل بتلانے کے لئے ہوئے تھے یا کہ اس کے باطل کرنے اور اپنے مذہب کے جاری کرنے کے لئے تم عالم اور فقیہ میری احادیث کے اور پر عمل کرانے کے لئے ہوئے تھے یا اس پر عمل کو حرام کرنے کے لئے پس اسی واسطے یہ بزرگ ڈراتے اور لوگوں کو سمجھاتے رہے مگر جس طرح پر کہ بعض لوگوں نے پیغمبروں کو باوجود ان کی ممانعت کے خدا کا شریک کر دیا اسی طرح ان مقلدین متعصبین نے اماموں کو باوجود ان کی تاکید اور ممانعت کے معصوم بنا دیا پس اگر وہ فرقہ اپنے پیغمبر کی ایسی جھوٹی محبت سے قابل تعریف کے ہے تو ضرور

مقلدین بھی لائق مدح و صفت کے ہیں ورنہ دشمنی کا نام دوستی اور مخالفت کا نام اطاعت رکھا ہے ؛

پس جبکہ خاص چاروں اماموں رضوان اللہ تعالٰی علیہم اجمعین کے سب اقوال کو ۔ ماننا اور اس کی جانچ خدا اور رسولؐ کے کلام سے کرنا دلیل ایمان اور توحید فی صفۃ النبوۃ کی ہو تو پھر اور علما کا کیا ذکر ہے اس لئے مسلمان کا کام ہے کہ وہ خدا و رسولؐ کے کلام کو مقدم رکھے جس کے کلام کو اُس کے مطابق پاوے اُسے صحیح جانے ورنہ کالائے بد بریش خاوند اُس کو قبول نہ کرے یہ کام مسلمان کا نہیں ہے کہ اندھا بن جاوے اور اپنی آنکھوں کو قرآن و حدیث سے بند کر لے اور اپنے کانوں تک اُن کی آوازیں نہ آنے دے بلکہ اور لوگوں کے قولوں کو ڈھونڈتا پھرے کہ زید نے کیا کہا ہے عمرو نے کیا فرمایا ہے اور بغیر ملانے قرآن و حدیث کے بغیر جانچے اُس کی کہی باتوں کو مان لے اور نہ صرف ماننا بلکہ انکی سب باتوں پر ایسا یقین کر لے کہ اس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں ہے اور باوجودیکہ خود بھی صریح حدیث سے مخالفت اُنکے قول کی سمجھ لے مگر حدیث میں شبہ کرے لیکن اُن کے قول میں شبہ نہ کرے حدیث کو تو چھوڑ دے مگر اُن کی بات کو نہ چھوڑے پس اگر یہ شرک فی صفۃ النبوت نہیں ہے تو کیا ہے بلکہ میرے نزدیک تو شرک فی صفۃ النبوت سے بھی بڑھ کر ہے ۔ اس لئے کہ اگر نبی کو شریک اپنے امام کا رکھتے تو کبھی حدیث پر بھی عمل کرنا جائز سمجھتے حالانکہ منجملہ لاکھ مسئلوں کے ایک مسئلہ کے بھی مخالفت امام کی اور عمل حدیث پر جائز نہیں ہے اور باوجود اس عقیدہ اور ایسے برتاؤ کے کیا بھلا معلوم ہوتا ہے جب مقلدین کی زبان سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہم کیا اپنے امام کو معصوم جانتے ہیں معلوم نہیں کہ معصوم کے لفظ سے کیا معنی ہیں ؛

حقیقت یہ ہے کہ مقلدین کا یہ کہنا کہ جو لوگ حدیث پر عمل کرتے ہیں وہ دشمن علما اور فقہا کے ہیں صرف ایک دھوکا اور مغالطہ ہے تاکہ عوام کو نفرت پیدا ہو اس لئے کہ یہ تو وہ جانتے ہیں کہ علما انبیا کے وارث ہوتے ہیں اور انہیں سے لوگ ہدایت پاتے ہیں کہ جو لوگ اُن کے دشمن ہونگے وہ ضرور دشمن اسلام کے ہونگے حالانکہ ہم تو ان علماء کے خاک پا ہیں جو کہ ورثۃ الانبیا ہیں اور اُن کی زیارت کو بھی عبادت جانتے ہیں مگر ان لوگوں کو جو کہ نام کے مولوی اور عالم ہیں اور حقیقت میں دین کے خراب کرنے والے ان کے ہم دشمن ہیں اور ہم کیا ہمارے آخری امام مہدی بھی ان کے دشمن ہونگے جیسا کہ عارف باللہ شیخ محی الدین ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ اذا خرج الامام المهدی علیه السلام فلیس له عدو مبین الا الفقهاء خاصة فانهم لا یبقی لهم ریاسة ولا تمییز عن العامة ولا یبقی لهم علم بحکم الا قلیلا ویرتفع الخلاف من العالم بوجود هذا الامام ولولا ان السیف

بیدہ لا فتی الفقہاء بقتلہ ویعتقدون فیہ اذا حکم بغیر مذہبہم انہ علی الضلالۃ فی ذالک الحکم لانہم یعتقدون ان اہل الاجتہاد وزمانہم قد انقطع وما بقی مجتہد فی العالم وان اللہ سبحانہ لا یوجد بعد ائمتہم احدا لہ درجۃ جس وقت امام مہدی علیہ السلام خروج کرینگے کوئی اُن کا ایسا کھلا ہوا دشمن نہ ہوگا جیسا کہ فقیہ اور مولوی ہونگے اس لئے کہ ان کی ریاست جاتی رہیگی اور ان میں اور عوام میں کچھ فرق وتمیز نہ رہیگی اور ان کا حکم باقی نہ رہیگا اور اگر اس امام کے پاس تلوار نہ ہوتے تو ضرور اس کے قتل کا فتوے فقہا دیدیں۔ اور مروا ڈالیں اور جب کبھی امام مہدی موافق ان چاروں اماموں کے مذہب کے فتوے نہ دینگے تو وہ فقہا سمجھینگے کہ یہ گمراہ ہے اس لئے کہ اُن کے نزدیک اہل اجتہاد باقی ہی نہیں اور اُس کا زمانہ منقطع ہوگیا اور دنیا میں کوئی مجتہد پایا نہیں جاتا گو اُن کے نزدیک خدا نے بعد ان کے اماموں کے ایسے آدمی کا پیدا کرنا بند کر دیا جس کو اجتہاد کا درجہ ہو۔

حقیقت میں مقلدین جس طرح پر ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیا سمجھتے ہیں اپنے اپنے اماموں کو خاتم الائمہ جانتے ہیں اور جب امام مہدی سے امام کو ترک تقلید سے کافر اور گمراہ جانینگے اور واجب القتل سمجھینگے تو پھر ہم اپنے فرقہ سے کیا شکایت کریں اور اپنی نسبت گمراہی اور ضلالت کے فتوے کو سنکر کیوں رنجیدہ ہوں حضرات کو اختیار ہے جو چاہیں سو کریں۔ دین کو خود برباد کریں اور ہم کو کافر اور مستحق قتل ہم کو بتادیں کیا انصاف ہے۔ تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر۔

اب میں اُن شبہات کو جو علما کی مخالفت کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں صرف ایک محقق کے قول کو نقل کرکے دُور کرتا ہوں یعنی ابن قیم جس نے نہایت خوبی سے اس شبہ کو رفع کیا اور سارے خطرات کو دُور کر دیا قال ابن قیم اذا جردت ھذا الی آخرہ یعنی جب کہ کسی مسلمان کے نفس مطمئنہ کو اس طرف رجحان ہوتا ہے کہ وہ خاص پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثنا کی خالص متابعت کرے تو نفس امارہ کی مزاحمت لوگوں کے قولوں اور رایوں سے اُس کے ارادہ کے ظہور کے لئے ہوتی ہے پس نفس امارہ ایسے شبہات ڈالتا ہے جن سے کمال متابعت پیغمبر خدا کی آدمی نہ کرسکے وہ خدا کی قسم دلاتا ہے کہ میری غرض سوائے نیکی اور احسان اور توفیق خیر کے اور کچھ نہیں ہے حالانکہ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے اور اصلی غرض اُس کی یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرے اور متابعت کے حیلخانہ سے نہ نکلنے دے اور نفس امارہ ایسے شخص کو دھوکا دیتا ہے کہ خالص پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی تبعیت کا قصد کرنا اور آنحضرت کے قول کو سب علماء کی

۵ ہم نے بسبب طول ہونے کے اصل عبارت کو نقل نہیں کیا صرف ترجمہ پر قناعت کی ہے اور اصل عبارت رسالہ کے صفحہ ۱۴۲ میں منقول ہے

اُن پر مقدم سمجھنا گویا سارے عالموں اور تمام فقیہوں کی شان میں نقص لگانا ہے اور ان کے ساتھ بے ادبی کرنا ہے کہ اُن میں سے کسی نے پیغمبر صاحب کے قول پر عمل نہ کیا اور سبھوں نے خود رائی کی اور کیسی بدظنی ہے کہ سارے مولوی اور فاضل اور بڑے بڑے جو ہوئے وہ تو گنہگار رہے اور غلطی پر اور ہم ثواب ڈھونڈتے ہیں حالانکہ یہ قوت اور طاقت ہم کو کہاں ہے کہ ہم ان بزرگوں کے قولوں کو رد کریں اور اُن کی غلطی اور خطا نکالیں پس ان باتوں کے خطرات دل میں ڈال کر نفس امارہ قسم کھاتا ہے اور خدا شاہد ہے کہ میری اور کچھ غرض سوائے احسان اور توفیق کے نہیں ہے کہ اسی دھوکہ میں بہت سے لوگ آجاتے ہیں پس ایسی باتوں کو نہ ماننا اور ایسے دھوکے میں نہ آنا چاہیئے اولئک الذین یعلم اللہ ما فی قلوبہم فاعرض عنہم وعظہم وقل لہم فی انفسہم قولا بلیغا۔ اور خالص متابعت کرنا پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ جو کچھ آنحضرت لائے ہیں اُس کے سامنے کسی قول کو دیکھے نہ کسی کی رائے پر لحاظ کرے کوئی کیوں نہ ہو بلکہ اول صرف حدیث کی صحت کی تحقیق کرے پھر اگر اُسے صحت ہو جاوے تو اُس کے معنی سمجھے جب معنی سمجھ لئے تو ہرگز اُس سے عدول نہ کرے گو تمام مشرق سے لیکر مغرب تک اُس سے مخالف ہوں اگرچہ ایسا کبھی ممکن نہیں ہے کہ نعوذ باللہ کوئی حدیث ایسی ہو کہ امت محمدی میں کوئی اُس کا قائل اور عامل نہ ہو ہاں یہ ممکن ہے کہ ہر کسی کو معلوم نہ ہو کہ کون شخص اُس حدیث کا عامل ہوا ہے یا ہے پس نہ جاننا ایسے آدمی کا جو کہ اُس حدیث کا قائل اور اُس پر عامل ہو خدا کے نزدیک اُس شخص کیلئے حجت نہیں ہو سکتی جو کہ حدیث کی صحت پر اطمینان کرکے اور اُس کے معنی سمجھ کر حدیث کو چھوڑ دے اور اس پر عامل نہ ہو پس جب تو کسی نص کو پالے تو تجھے چاہیئے کہ اُس پر عمل کر اور یہ سمجھ لے کہ ضرور کوئی نہ کوئی اور بھی اُس کا قائل اور اس پر عامل ہوگا تجھ کو اُس کی خبر نہیں ہوئی اور اور اُس سے تو اور علما کی محبت اور حفظ مراتب میں شبہ نہ کر اسلئے کہ مجتہدین اور علما سے خطا بھی ہو جاتی ہے اور اس میں بھی اگر وہ بدنیتی بھی نہ کریں مستحق ایک اجر کے ہوتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں ہے کہ ان کے غلط قول کی تبعیت کی جاوے اور صاحب شریعت کے کھلے احکام چھوڑ دیئے جاویں صرف یہ خیال کرکے کہ جن علما اور فقہا نے اس قول پر عمل نہیں کیا وہ ہم سے زیادہ عالم اور بزرگ تھے اور ہم کو ان کا سا مرتبہ حاصل نہیں اس لئے کہ جن لوگوں نے اُس نص پر عمل کیا ہے وہ بھی تجھ سے زیادہ عالم تھے تو تو نص پر عمل کرنے میں کیوں اُن سے موافقت نہیں کرتا اور یہ تو ممکن بھی نہیں ہے کہ کوئی نص موجود ہو اور کسی نے اُس پر عمل نہ کیا ہو بہر حال نص پر عمل کرنے والا بھی تنہا نہ ہوگا اور ضرور اُس کے ساتھ اور لوگ ہونگے پس جو آدمی علما اور فقہا کے قولوں کو قرآن و حدیث سے ملاوے اور اس سے مطابق کرے اور جن کو مخالف نصوص کے پاوے اُس سے مخالفت کرے تو ایسی مخالفت کرنے والے کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ

وہ اُن کا دشمن ہے بلکہ ان کے حفظ مراتب پر خیال نہیں کرتا اُن کو بُرا جانتا ہے بڑی غلطی ہے اس لئے کہ حقیقت میں ان کے کلام کو خدا و رسول کے کلام پر عرض کرنا اور جو مخالف اُس کے ہوئے نہ ماننا اصل پیروی اور اقتدا اُن عالموں کی ہے کیونکہ اُنہوں نے خود یہی کیا ہے اور ایسا ہی کرنے کو اوروں کو نصیحت کی ہے نہ کسی نے معصومیت کا دعوے کیا نہ اپنے قول کو نصوص پر مقدم سمجھا پس اس سے ثابت ہوا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے ایک ایسی تقلید کرنا کسی کی کہ اُس کی سب باتیں ماننا اور اُس کے قول کو نہ خدا کے کلام کو جانچنا نہ رسول کی حدیث سے ملانا بلکہ ایک معصوم کے قول کے موافق اُسی کو قبول کر لینا دوسرے اُس کے علم اور فہم اور تفقہ سے استعانت کرنا اور جو چراغ علم کا اُس نے روشن کیا اُس سے نور لینا پس جو مقلد ہے اور اول قسم میں داخل وہ اُس عالم کے قول کو بلا تامل قبول کرتا ہے نہ اُس میں غور کرتا ہے نہ کتاب سنت کی نسبت اُس کی صحت کی تحقیق کرتا ہے اور جو محقق ہے اور دوسری قسم میں داخل ہے وہ اُس عالم کے قول کو بمنزلہ دلیل کے سمجھتا ہے پس اگر پہلی دلیل اُسے مل گئی تو دوسرے استدلال کی کچھ حاجت نہیں جس طرح پر کہ ستارہ قبلہ پر دلیل ہے۔ مگر جب کہ آدمی خود قبلہ کو دیکھ لے تو پھر ستارہ کی حاجت نہیں رہتی اسی طرح پر جب ہم نے کسی فقیہ یا مجتہد کے قول کو سُنا تو ہم کو اُس پر عمل کرنے کی ابتدائی حجت کافی ہے مگر جب ہم کو کوئی حدیث صحیح اُسکے موافق ملجاوے تو اُس فقیہ کے قول پر ہم کو کامل اطمینان ہوگا اور سُننے سے مرتبہ دیکھنے کا ہم کو حاصل ہوگا اور اگر اُس کا قول مطابق حدیث کے نہ ہوا یا اس سبب سے کہ وہ حدیث اُسے نہ ملی یا اس وجہ سے کہ اُس نے اجتہاد میں غلطی کی تو ہم کو اُس سے چھوڑ دینے میں کچھ تامل نہ ہوگا پس یہ بات اُن جو مقلدین کیا کرتے ہیں کہ جو تقلید کو واجب نہیں جانتے آخر وہ بھی فقہا اور علما ہی کے قولوں پر عمل کرتے ہیں باطل ہوا اس لئے کہ واجب اور جائز میں بڑا فرق ہے پس ہمارا یہ قول نہیں ہے کہ علما فقہا کی باتوں کا ماننا یا ان کے نکالے ہوئے مسئلوں پر عمل کرنا جائز نہیں۔ ہاں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ واجب نہیں بلکہ جس کو معلوم ہو جاوے کہ خدا کا فلاں امر میں یہ حکم ہے یا اُس کے رسول نے فلاں معاملہ کی نسبت ایسا فرمایا ہے تو بمقابل اُس کے دوسرے کا اتباع جائز نہیں اس خدا اور رسول کے حکم کے سامنے دوسرے کا کچھ حکم نہیں۔ علاوہ بریں اُن مجتہدین اور آئمہ نے جن کے قول کے اتباع کی نسبت ساری بحث ہے خود کبھی تو یہ دعوے نہیں کیا کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی حکم خدا اور رسول کا ہے بلکہ وہ صاف کہتے رہتے ہیں کہ ہم اجتہاد کرتے ہیں ہمارے اجتہاد اور رائے کو جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے بلکہ امام ابو حنیفہؒ کا خود یہ قول ہے کہ جو شخص میری رائے سے بہتر رائے دے میں خود اُس کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں اور نیز اگر اُن ائمہ و مجتہدین کا قول وہی ہوتا جو کہ خدا و رسول کا قول ہے تو ان کے خاص شاگردوں کو اُن کی مخالفت کرنا جائز نہ ہوتا جس طرح پر کہ اصحاب کو

پیغمبرؐ کے قول سے مخالفت جائز نہیں ہے فقط انتہی ؛

یہ قول ابن قیم کا جو ہم نے نقل کیا مقلدین کے سارے اعتراضات کا جواب ہے، اور اس سے ان کے کل شبہات رفع ہوتے ہیں پس باوجود اس کے بھی اگر کوئی تقلید کو واجب کہے اور اُس کے ناواجب کہنے والے کو دشمن اسلام کا اور بدعتی جانے اُس کے حق میں بجز اس کے کہ دعائے خیر کی جاوے کیا کہا جاوے ؛

پس بفرض محال اگر عدم وجوب تقلید پر کوئی عالم بھی ہمارے ساتھ متفق نہ ہوتا اور سب اُس کے وجوب ہی کے معتقد ہوتے تب بھی ہمارا اُس سے انکار کرنا خرق اجماع نہ تھا کہ اُس کے عدم وجوب پر ہمارا علما کا اتفاق ہے بلکہ سارے صحابہ کل تابعین تمام تبع تابعین کا یہی عقیدہ تھا پس جو مقلدین یہ شبہ کرتے ہیں کہ اگر تقلید کے وجوب سے انکار کیا جاوے تو بہت سے علما فضلا کے اوپر نقص عاید ہوتا ہے اور اُن کی شان میں غلطی کی نسبت ہوتی ہے اُن کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر تقلید کا وجوب تسلیم کیا جاوے اور اُس کا منکر بدعتی اور فاسق اور گنہگار قرار دیا جاوے تو کل محدثین اکثر اہل تصوف اور اولیا اللہ اور اکثر مجتہدین اور محققین کا بدعتی اور فاسق ہونا لازم آتا ہے اس لئے کہ وہ تقلید کے تارک تھے پس تعجب ہے کہ وجوب تقلید کے نہ ماننے پر تو یہ شبہ کیا جاوے کہ اکثر علما کی خطا ثابت ہوتی ہے اور اُس ماننے پر یہ خیال نہ ہووے کہ اکثر محدثین اور اولیائے کرام اور محققین کا گنہگار ہونا لازم آتا ہے پس بالفرض اگر ایک فرقہ کا چھوڑنا ہی لازم ہوا تو اب اختیار ہے جو چاہے تقلید میں اہل ہوا اور محدثین اور اولیا اور اہل تصوف کو چھوڑے اور جسے منظور ہو وہ حدیث پر عمل کرے اور اُس زمانہ کے لوگوں کو چھوڑے جو کہ عہد نبوت سے دُور ہوتا گیا اور جس میں بدعت کا رواج بڑھتا گیا ؛

مقلد :۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ اجتہاد انہیں اماموں پر ختم ہو گیا مگر آجکل کس کو ایسا علم ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رح کے قول پر جرح کر سکے اور کس کو اُن کا سا تقویٰ اور بزرگی اور احتیاط ہے کہ ان کے کلام کو نہ مانے ہاں جو کوئی اُن کا سا علم اور ویسا تقویٰ رکھتا ہو وہ اجتہاد کرے مگر تب بھی قرب زمانہ نبوت کی فضیلت کہاں سے اب کوئی پاویگا ؛

غیر مقلد :۔ اس دلیل سے تو آپ ہی کی تقلید باطل ہوتی ہے اسلئے کہ دوسرا فریق بھی کہہ سکتا ہے کہ ائمہ اربعہ بھی پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثنا کے اصحاب کرام کے ہم رتبہ نہ تھے اور مہاجرین و انصار میں اہل نہ تھے پس چاہیئے تھا کہ وہ بھی اصحاب کرام کے اقوال میں جرح و تعدیل نہ کرتے اور کسی ایک صحابی کے سارے قولوں کو تسلیم کر لیتے پس جبکہ مجتہدین نے اصحاب نبویؐ کے قولوں میں جرح و تعدیل جائز رکھی اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے باوقار اور حضرت عمر فاروق رضؓ سے فقیہہ اور حضرت علی رضؓ

سے عالم جنکی فضیلت میں آیتیں بھی نازل ہوئیں اور جنکی شان میں پیغمبر خدا نے حدیثیں بھی فرمائی ہیں اور جن کی ہجرت اور نصرت کی خدا نے تعریف بھی کی باوجود اس کے تیسرے طبقہ کے لوگ اس امر کے مجاز ہوں کہ وہ ایسے اصحاب جلیل القدر کے قولوں میں سے جسکو مطابق کتاب و سنت کے پاویں اُسے لیں اور جسکو مخالف پاویں اُسے چھوڑ دیں اور ترک کریں اور اس سے انکی نسبت یہ شبہہ ہو کہ وہ اصحاب کی بزرگی کے معتقد تھے جو اُن کے قولوں سے انکار کرتے تھے اور بعد ائمہ اربعہ کے جو زمانہ آئے اُس میں کوئی ان ائمہ کے اقوال میں جرح و تعدیل کرنے کا مجاز نہ ہو اور سب کو کسی بالامام کے منجملہ چار اماموں کی تقلید واجب ہوئے اور جو واجب جانے اُس پر یہ الزام لگایا جاتے کہ وہ اُس امام کی بزرگی کا منکر ہے یہ ایک نہایت حیرت کی بات ہے"۔

مقلد:۔ اگر حدیث پر عمل کیا جاوے تو آجکل کس کو طاقت ہے کہ وہ تمام احادیث کو جمع کر کے ناسخ و منسوخ میں تمیز دے اور قوی اور ضعیف کو جدا کرے اور اس سے مسائل کو استخراج کرے"۔

غیر مقلد:۔ کیا آپکے نزدیک احادیث کی کتابیں فقہ کی کتابوں سے بھی زیادہ مشکل ہیں اور کیا اصول حدیث کے اصول فقہ سے بھی زیادہ دقیق ہیں اور کیا احادیث کو اگلے لوگ جمع نہیں کر گئے اور کیا انکے اقسام ضعیف و حسن وغیرہ کو جدا جدا نہیں کر دیا اور کیا موضوعات کو صحاح سے علیحدہ نہیں کر دیا اور کیا جو اختلاف احادیث میں ہے اُسکی تطبیق محدثین نے ابتک نہیں کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر تحقیقات احادیث کی محدثین نے کی ہے اور جسقدر مادہ احادیث پر عمل کرنے کا اس وقت موجود ہے اور جیسی آسانی اُس میں ہے اُس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی شخص فقیہ بننا چاہے تو جس قدر محنت اور وقت اُسکو ہوگی اتنی محنت اور دقت علم حدیث کے سیکھنے پر نہ ہوگی پس تعجب ہے کہ ہدایہ اور مبسوط وغیرہ جن کا سمجھنا بغیر اصول منطق اور قواعد فلسفہ کے دشوار ہو آپ سمجھ سکیں اور روایات مختلفہ کو جمع کر کے مسائل فقہی کو نکال لیں اور پھر باہم اختلاف مسائل فقیہہ کا رفع نہ ہو بلکہ قطع نظر اُس اختلاف کے جو چار مذاہب میں ہے ہر مذہب میں صدہا مسائل اختلافی موجود ہوں اور صاف اور کھلی ہوئی حدیثوں کا سمجھنا آپ کے نزدیک مشکل ہو اور ان کا اختلاف رفع کرنا اور اُس پر عمل کرنا آپکے نزدیک محالات اور ممتنعات سے ہو اور ساری حدیث کی کتابیں اور ان کی شرحیں اور محدثین کی تحقیقاتیں عبث ہوں۔ اس لیے کہ اُنکو نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ اُس میں عمل کر سکتا ہے پس حدیث کی کتابیں سوائے اس کے کہ واسطے تبرک اور برکت کے دوہرے کپڑے میں غلاف کے اندر رہیں اور کبھی کسی مسئلہ میں اُن پر رجوع نہ کی جاوے آپ کے کسی کام میں نہیں آسکتیں اور استخراج مسائل کے لیے آپ اُن سے کچھ کام نہیں لیتے اگر لیتے ہو تو ذرا مہربانی کر کے بتلاؤ کہ کسی فتوے میں خلاف

اقوال فقہا کے کوئی مقلد حدیث کی بھی سند لایا ہے اگر لایا ہو تو پیش کرو ہاتو برھانکم ان کنتم صادقین۔ اگر آپ غور کریں اور اپنے علما کے اقوال پر نظر کریں تب آپ کو معلوم ہو کہ فقہا نے احادیث کی کیسی قدر دانی کی ہے۔ میں اپنے اس قول کی تائید میں صرف ایک فقیہ کے کلام کو نقل کرتا ہوں۔ وہ فرماتا ہے کہ اعلم ان اصول الفقہ فرع لعلم اصول الدین واکثر التصانیف فی اصول الفقہ لاہل الاعتزال المخالفین لنا فی الاصول و لاہل الحدیث المخالفین لنا فی الفروع ولا اعتماد علی تصانیفھم یعنی اکثر تصانیف اصول فقہ کی معتزلہ کی ہیں جو اصول میں ہمارے مخالف ہیں یا اہل حدیث کی ہیں جو فروع میں ہمارے مخالف ہیں اور اُنکی تصانیف پر کچھ اعتبار نہیں ہے پس مقلدین نے گویا اہل حدیث کا ایک فرقہ علیحدہ تصور کیا اور اُنکی تصانیف کو اعتبار کے لائق نہ جانا پس نہایت افسوس کا مقام ہے کہ تقلید کی وجہ سے اہل حدیث دائرہ سنت سے خارج کر دیئے جاویں اور ان کی تصنیفات پر صرف اسی قصور میں کہ وہ فقط حدیث پر یعنی پیغمبر صاحب کے قول کو مانتے ہیں اعتبار نہ کیا جائے میں حیران ہوں کہ اگر اہلحدیث ہی دائرہ سنت سے خارج ہوں تو پھر دوسرا کون ہے جو سنی ہو سکے سچ کہا ہے مولوی شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک رسالہ میں جو جواز میں اشارہ کے لکھا ہے کہ "با محمد بدلیل باطل رسیدہ مخالفت پیغمبر خدا کردن و خلاف امام مذہب رفتن و باوجود راستی ہٹ آمدن جز جہل و نادانی و یا تعصب نفسانی چیزے دیگر نباشد سنی آنکہ کار سنت کند و رافضی آنکہ ترک سنت کند"

مقلد۔ پس تم باغی اور فاسق ہو بلکہ کافر جو تقلید کو واجب نہیں جانتے ہو تمہارے کفر کا فتوے لکھا جاوے گا اور تمہارا کھانا پینا بند ہوگا تاکہ آئندہ پھر کوئی دین کو برباد نہ کرے اور مذہب میں فتنہ و فساد نہ کھڑا کرے ؎

غیر مقلد ؎

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

سُنو۔ ہم تو اُسی روز سے آپکے کفر کے فتوے کے منتظر ہیں جب سے ہم نے قرآن و حدیث کو اپنا متمسک بنایا اور زید و عمرو کو چھوڑا اور پابندی رسم کی ترک کی حضرت خدا کے نزدیک کافر نہ ہونا چاہیے۔ وہ اگر ہمارے کفر کا فتویٰ دے تو البتہ ہم کو نقصان ہے ورنہ اگر دنیا کے سارے بندے ہم کو کافر کہیں اور خدا کے ساتھ ہمارا معاملہ راست ہو اور اُس کے نبی اور اُس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے نیچے ہم کافر بنائے جاویں تو اس کفر پر ہمارے

ہزار ایمان قربان اور ہزار اسلام صدقے اور بڑے بڑے امام اور اچھے اچھے ولی اور نامی نامی محقق ہمارے اس کفر کے شریک ہیں اور یہ آپ کا فرمانا کہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو دین برباد ہو جاوے موجب صد ہزار حیرت ہے کہ حدیث پر عمل کرنے میں دین کی بربادی کیا ہوگی اگر آپ کے نزدیک حدیث پر عمل کرنے سے دین برباد ہوگا تو وہ دین جس کا مدار سوائے قرآن و حدیث کے اور کسی پر ہو برباد ہی ہونا بہتر ✽

قول فیصل نسبت تقلید و عمل بالحدیث کے

بعضوں کو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اگر تقلید چھوڑ دیجاوے تو حدیث پر کیونکر عمل کیا جاوے اور جو اختلاف احادیث میں ہے وہ کیونکر رفع کیا جاوے آخر تقلید چھوڑنے پر بھی ہم کو اجتہاد کرنا پڑیگا اور سارے جزئیات مسائل کا حدیث سے نکالنا ممکن نہ ہوگا تو جب چار عمدہ اور اچھے اماموں کے مذہب کو چھوڑنا اور ایک نیا مذہب کھڑا کرنا نادانی ہے اس لئے یہ قول فیصل جو محققین علما نے لکھا گئے ہیں ہم بھی لکھتے ہیں ✽

یہ امر خیال کرنا کہ منجملہ مذاہب اربعہ کے کسی مذہب کے مسائل پر عمل کرنا جائز نہیں ہے غلطی ہے بلکہ ہمارا قول صرف یہ ہے کہ تقلید کو واجب جاننا اور اس کی اس طرح پابندی کرنا کہ ایک امام کے مقلد کو دوسرے امام کے کسی مسئلہ پر عمل کرنا یا اپنے امام کے کسی قول کو صریح مخالف حدیث کے پاکر اُس کا ترک کرنا یا کسی مسئلہ میں اجتہاد کی طاقت رکھکر اجتہاد نہ کر سکنا غلطی ہے اور یہ اگلے لوگوں کے طریق کے خلاف ہے بلکہ چاروں اماموں میں سے کسی کے قول کو یا ان کے استخراج کئے ہوئے مسائل پر عمل کرنا نہایت ہی بہتر ہے اور آجکل تو نہایت ہی مناسب اور ضرور ہے اور عامیوں کو تو سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں لیکن چند شرائط سے ✽

اول - جائز ہونا اجتہاد کا اور ترک تقلید کا اگر کوئی شخص ایک مسئلہ میں بھی اجتہاد کر سکے ✽

دوسرے - چھوڑ دینا کسی قول کا جبکہ کسی حدیث صحیح صریح سے مخالفت اُس کی ثابت ہو جاوے اور اُس حدیث کا منسوخ ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچے ✽

تیسرے - نہ اعتقاد رکھنا اس امر کا کہ ایک امام کے مقلد کو دوسرے امام کے قول پر عمل کرنا ناجائز ہے ✽

چوتھے مقدم رکھنا احادیث اور اصول احادیث کو قیاس اور قواعد مقررہ اصولی پر ✽

پس ان چار شرطوں کے ساتھ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس امام کے مذہب پر چاہے چلے اور جس کے قول کو معتبر اور اچھا جانے اُس کو اختیار کرے اور یہی مطلب ہمارا ہے اور یہ غرض

جاری نہیں ہے کہ کسی امام اور کسی فقیہ اور کسی مولوی کے کسی قول کو نہ مانے اور ہر شخص عامی ہو یا خاص عالم ہو یا جاہل ہو وہ ہر مسئلہ میں اپنا ہی اجتہاد کرے اور سارے جزئیات خود ہی کتاب و سنت سے نکالے *

بس افسوس ہے اُن لوگوں پر کہ جو باوجود علم و فضل کے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ چاروں مذہب میں سے کسی مذہب کی پابندی ترک کرنی اور دوسرے امام کے مذہب پر عمل کرنا چاروں مذہب کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنا یا اجتہاد کرنا جائز ہی نہیں ہے اس لئے کہ حقیقت میں یہ قول ایک نیا حکم شریعت کا ہے اور جس کا قائل اپنے آپ کو صاحب شریعت ہونے کا درپردہ دعوے کرتا ہے طحطاوی میں ایک بڑے فقیہ صاحب کمائل کا قول لکھا ہے کہ المنتقل من مذہب الی مذہب باجتہاد و برہان اثم یستوجب التعزیر فبلا اجتہاد و برہان اولی اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود اجتہاد و برہان کے ایک مذہب کا چھوڑنا اور دوسرے مذہب کا اختیار کرنا جائز نہیں ہے بلکہ گنہگار ہے اور ایسا کرنے والا واجب التعزیر مگر افسوس ہے کہ اس قول کے کہنے والے نے یہ خیال نہ کیا کہ وہ خدا تعالےٰ کو قیامت کے دن کیا جواب دیگا اور اپنی طرف سے فہرست میں گناہوں کی ایک گناہ بڑھا دینے پر کیا دلیل پیش کریگا۔ سچ یہ ہے کہ اگر ایسی ایسی باتیں یہ لوگ نہ لکھ جاتے اور ان و حکایوں سے جاہلوں کو نہ ڈراتے تو تقلید کا ایسا زور شور کیونکر ہوتا اور حدیث پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثنا پر عمل کرنا کیونکر چھوٹتا۔ ما سعادۃ الدارین الا بالاعتصام بہدیہ

ان لم یکن فی معادی اخذا بیدی

فضلا والا فقل یا زلۃ القدم

میں اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اسی بحث کے متعلق اور کچھ لکھونگا اور ان اقوال کو جو مقلدین تقلید کی نسبت بیان کرتے ہیں مفصل لکھ کر اُس کا جواب دونگا اور جو کچھ شرح سفر السعادت اور تفسیر احمدی وغیرہ میں لکھا ہے اُس کو بجنسہ نقل کر کے اُس جواب سے سب کو آگاہ کرونگا جو محدثین اور مجتہدین نے یہ نسبت اُس کے دیا ہے اور علاوہ اُس کے سارے شبہات اور اعتراضات کو مقلدین کے نہایت خوبی سے بیان کر کے اُس کی برائی بھلائی کو ظاہر کرونگا افسوس ہے کہ مضمون بڑا اور پرچہ چھوٹا کیونکہ جو کچھ دل میں ہے اُسے لکھوں مگر خیر اب تو اس پر ختم کرتا ہوں اور جو رہ گیا ہے دوسرے پرچہ میں لکھونگا *

مجھے اپنے بھائیوں سے امید ہے کہ دیکھتے ہی خفا نہ ہو جاویں اور ہر فقرہ پر گالی دینا اور برا کہنا شروع نہ کریں بلکہ اول ذرا دل کو ٹھنڈا کریں اور غور سے دیکھیں اور پھر انصاف کریں اس لئے کہ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف مجتہدین و محققین کے اقوال کی نقل ہے نہ فقط کاتب کی رائے اور *

اقوال بھی محدود نہیں اور جو کچھ لکھے گئے اُسی پر ختم نہیں بلکہ صرف نمونہ کے ہیں اور مثل اُن کے صدہا قول بڑے بڑے محققوں کے اُس کی تائید میں ہیں اگر صرف ہماری ہی رائے ہوتی تو ہم مستحق عتاب اور قابل ملامت کے تھے جب کہ ہم نقل کرنے والے اور جمع کرنے والے اُن کے قولوں کے ہیں تو حضرت جو کچھ ارشاد فرماویں گے اول بزرگوں کی ارواح پر اُس کا اثر ہوگا پیچھے ہمارے اوپر اور ہم تو اپنی عزت اسی میں سمجھتے ہیں کہ خدا اور اُس کے رسول کے پیچھے لوگ ہم سے دشمنی رکھیں اور ہم کو عمل بالحدیث کے سبب کافر کہیں اور ہم بھی اپنے سچے خدا اور سچے رسول سے مضمون اس مصرع کا "عالم تمام دشمن جاں شد برائے تو" عرض کریں۔ اے بھائیو! ان سب باتوں کو غور سے دیکھو اور انصاف کرو تلک آیات اللہ نتلوھا علیک بالحق فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون ۔

تفسیر بالرّائے

مسلمان یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ اپنی عقل سے قرآن مجید کی تفسیر کرنی اور معنی بیان کرنے منع ہیں اور اپنے اس اعتقاد کے ثبوت پر اس حدیث کو کہ من فسر القرآن برایہ فلیتبوأ مقعدہ من النار پیش کرتے ہیں یعنی جس شخص نے قرآن کی تفسیر اپنی عقل سے کی تو وہ اپنی جگہ دوزخ کی آگ میں ٹھہرالے ۔

مگر جو معنی کہ انہوں نے تفسیر بالرائے کے سمجھے ہیں وہ غلط محض ہیں وہ یہ سمجھے ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر میں جو کچھ اگلے مفسروں نے کہا ہے اور جو کچھ اگلی تفسیروں میں لکھا ہے اُس کے سوا اور کچھ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے نکالنا منع ہے پس اُس کے سوا جو کوئی شخص قرآن مجید کے کسی لفظ کے اور معنی کہتا ہے یا کسی آیت کی تفسیر دوسری طرح پر کرتا ہے وہ تفسیر بالرائے کرتا ہے اور دوزخ کی آگ کا مستحق ہوتا ہے ۔

یہ سمجھ اُن کی بالکل غلط ہے اور علمائے متقدمین کے اقوال اور طریقہ اور مذہب کے بھی برخلاف ہے امام حجۃ الاسلام غزالیؒ فرماتے ہیں[۱] کہ تفسیر قرآن برایہ کے یہ معنی ہیں کہ اس کی غرض اور سمجھ میں ایک مطلب کا بیان کرنا ہو اور وہ اُس پر قرآن کی گواہی لاوے اور قرآن مجید کو ایسے مطلب پر لے جاوے کہ اُس مطلب میں آیت کے نازل ہونے پر نہ لفظوں کے لغوی معنی دلالت کریں اور نہ کوئی نقلی روایت

[۱] من فسر القرآن برایہ ان یکون غرضہ روایۃ تقریر امر وتحقیقۃ فیستجیر شہادۃ القرآن الیہ ویحملہ علیہ من غیر ان یشہد لتنزیلہ علیہ دلالۃ لغویۃ او نقلیۃ ۔

موجود ہو۔ پس بلا شبہ اس طرح پر قرآن کی تفسیر منع ہے ۔

بعد اس کے امام غزالی صاحب لکھتے ہیں[1] کہ "اس بات سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ قرآن کی تفسیر استنباط سے اور غور و فکر سے بھی کرنی منع ہے کیونکہ بہت سی آیتیں ایسی ہیں کہ اُن کے پانچ پانچ چھ چھ سات سات معنی صحابہ اور مفسرین سے نقل ہوئے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی رسول خدا صلعم سے نہیں سُنا اور وہ معنی آپس میں ایک دوسرے کے برعکس بھی ہوتے ہیں اور سب کے سب صحیح نہیں ہو سکتے اور اس سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے غور اور اپنی اپنی سمجھ سے نکالے تھے۔ اسی لئے رسول خدا صلعم نے ابن عباسؓ کو دعا دی تھی کہ اللہ اُس کو دین میں سمجھ دار کرے اور اس کو قرآن کے معنی بیان کرنے سکھاوے ۔

اسی طرح ایک جگہ فرماتے ہیں کہ[2] "بہت سے دقیق معنی اور قرآن کے بھید ایسے ہیں کہ غور و فکر کرنے والوں کے دل میں آتے ہیں کہ اُن سے تفسیر کی کتابیں بالکل خالی ہیں اور بڑے بڑے مفسرین کو بھی اُن کی خبر نہیں ہوئی۔"

غرض اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ خدا کی کتاب پر غور کرنا اور اس کے الفاظ سے معانی اور مطلب کی تحقیق کرنا اور صرف اگلے مفسرین کی پیروی ہی نہ کرنا بلکہ جو علوم کہ اب حاصل ہوئے ہیں اُن کا قرآن مجید کے الفاظ سے جانچنا منع نہیں ہے اور نہ ایسا کرنا تفسیر بالرائے ہے اور نہ کیونکر تفسیر بالرائے ہو سکتی ہے اس لئے کہ تفسیر بالرائے ہونے میں یہ بات ضرور تھی کہ الفاظ کے لغوی معنے یا نقل اُس پر دلالت نہ کرتے ہوں ۔ اور اب جو ہم تفسیر قرآن کی کرتے ہیں وہ تو اُس سے بھی زیادہ سند یعنی حقایق محققہ پر کرتے ہیں اور اپنی عقل یا قیاس کو مطلق دخل نہیں دیتے پس وہ تفسیر بالرائے کیونکر ہو سکتی ہے بلکہ وہ تفسیر تو فی الحقیقت حقیقت قرآن ہے جس کی روشنی خدا سب کو نصیب کرے ۔ آمین

---

[1] ولا ینبغی ان یفہم منہ انہ یجب ان لا یفسر القرآن بالاستنباط والفکر فان من الآیات ما نقل فیہا عن الصحابۃ والمفسرین خمسۃ معان وستۃ وسبعۃ ونعلم ان جمیعہا غیر مسموعۃ من النبی صلعم فانہا قد تکون متنافیۃ لا تقبل الجمع فیکون ذلک مستنبطاً بحسن الفہم وطول الفکر ولہذا قال صلی اللہ علیہ وسلم لابن عباس رضی اللہ عنہ اللہم فقہہ فی الدین وعلمہ التاویل ۔

[2] فکم من معان دقیقۃ من اسرار القرآن تخطر علی قلب المتجردین للذکر والفکر تخلو عنہا کتب التفاسیر ولا یطلع علیہا افاضل المفسرین ۔

وجودِ آسمان

مسلمان جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کی رو سے ہر ایک مسلمان کو اس بات کا اعتقاد کرنا فرض ہے کہ آسمان ایک مجوف کروی جسم گنبد کی مانند ہے اور انڈے کے چھلکے کی طرح دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اور زمین مثل انڈے کی زردی کے اُس میں ہے اور تمام ستارے اُس میں جڑے ہوئے ہیں۔ یہ سمجھ اور یہ اعتقاد اُن کا غلط ہے۔

حکمائے یونان نے اپنی حکمت اور اپنے علم ہیئت میں آسمان کو جسم کروی محیط زمین کے اور ستاروں کا اُس میں جڑا ہوا ہونا بیان کیا تھا۔ یہودی بھی آسمانوں کو ایسا ہی سمجھتے تھے مسلمانوں نے بھی قرآن مجید کی آیات متشابہات پر جن میں آسمانوں اور ستاروں کا ذکر ہے کچھ بھی غور و فکر نہیں کیا اور جیسا کہ اُس زمانہ میں رواج تھا۔ اور جہاں تک اُس زمانہ میں ترقی علوم کی ہوئی تھی اُسی کے مطابق اُن کے معنی کر دیئے ورنہ قرآن مجید سے اس اعتقاد کا ثبوت مطلق نہیں ہے۔

قرآن مجید میں آیات متشابہات کا ہونا خصوصاً ان امور میں جو زمین و آسمان اور ستاروں اور فرشتوں اور بہشت و دوزخ سے علاقہ رکھتے ہیں نہایت حکمت اور ایک عجیب قدرت کی بات ہے اگر حقائق واقعی موجودات کی بذریعہ آیات محکم قرآن مجید میں بیان کی جاتی تو تمام دنیا اُس میں حیران و پریشان ہو جاتی اور تعلیم روحانی جو اصلی مقصود قرآن مجید تھی غیر مقصود جھگڑوں میں برباد ہو جاتی اس لئے ان حقائق کا بیان بذریعہ آیات متشابہات کے ہوا جن کے الفاظ مستعمل مخالف علم و ادراک اُس زمانہ کے لوگوں کے نہ تھے اور ان کے معانی محققہ حقیقت اشیائے کما ہی علیہ پر دلالت کرنے تھے۔ اور یہ طرز بیان ایسا عمدہ ہے کہ اعجاز قرآن میں شمار ہو سکتا ہے۔

پس اب ہم مسلمانوں کو یہ اعتقاد کرنا چاہیے کہ درحقیقت آسمان کوئی وجود مجسم مثل گول گنبد یا چوکس چھت کے نہیں ہے بلکہ تمام ستارے چاند اور سورج جن میں زمین بھی ایک ستارہ ہے فضائے بسیط میں معلق ہیں اور قدرتی ستونوں کے ذریعہ سے جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے اور جس کا نام لسان شرع میں عمد غیر مرئی اور زبان اہل علم میں جذب ہے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہے جو کہ ہمارے سر کے اوپر ہے اُس کا نام آسمان ہے جس طرح کہ ہم اپنے سر پر کی چیزوں کو جو حقیقت میں امریکہ کے رہنے والوں کے تحت قدم ہیں آسمان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اسی طرح امریکہ کے رہنے والے اپنے سر پر کی چیزوں کو جو درحقیقت ہمارے تحت قدم ہیں آسمان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ کچھ ہمارا ہی قول نہیں ہے بلکہ اگلے مسلمان عالم بھی اس بات کے قائل ہوئے ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں السماء عبارۃ عن کل ما ارتفع یعنی آسمان کا لفظ ہر اونچی چیز پر بولا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں بھی سماء کا لفظ انہی معنوں میں آیا ہے جہاں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وانزل من السماء یعنی برسایا خدا نے اوپر سے پانی پس اس جگہ سما یعنی آسمان کے لفظ سے اگلے لوگوں کے نزدیک بھی یونانی حکیموں والا آسمان مراد نہیں بلکہ صرف اوپر کی سمت مراد ہے۔

قرآن مجید سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آسمانوں کا ایک ایسا وجود جیسا کہ یونانی حکیموں نے بیان کیا ہے نہیں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے ستاروں کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ تیرتے پھرتے ہیں پھر اگر وہ آسمان میں جڑے ہوئے ہوتے تو وہ تیرتے کیونکر پھرتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمان کوئی وجود مجسم نہیں ہے اور نہ ستارے کسی میں جڑے ہوئے ہیں بلکہ معلق ہیں اور خود اپنی اپنی جگہ میں تیرتے پھرتے ہیں۔

فلک کے معنی بھی جو مسلمانوں نے مثل آسمان کے جسم مجوف کروی محیط ارض قرار دیئے ہیں یہ بھی غلط ہے بلکہ فلک کے معنی اس دائرہ کے ہیں جو کسی ستارہ کی گردش سے ذہن میں یا خیال میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ بنیٹی پھراتے ہیں تم نے دیکھا ہو گا کہ گول چکر بن جاتا ہے حقیقت میں وہ چکر نہیں ہے بلکہ صرف بنیٹی کے سروں کی گردش کرنے کا رستہ ہے جو خیال میں مثل فلک یعنی دائرہ کے دکھائی دیتا ہے یا جب کبھی لڑکے ڈور کے سرے میں پتھر یا گیند باندھ کر زور زور سے پھراتے ہیں تو ایک بھی حلقہ معلوم ہونے لگتا ہے حقیقت میں وہ حلقہ مجسم نہیں ہے بلکہ اس پتھر یا گیند کی گردش کی راہ ہے جو وہم میں مثل فلک یعنی دائرہ کے دکھائی دیتی ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت سے کہ "کل فی فلک یسبحون" یعنی ہر ستارہ ایک گھیرے میں تیرتا پھرتا ہے۔ بالکل ٹھیک ٹھیک فلک کے یہی معنی ثابت ہوتے ہیں جو ابھی ہم نے بیان کئے۔

شارح چغمینی نے بھی لکھا ہے کہ ان فلک یطلق علی غیر المجسم ایضاً کالدائرۃ ومحیطاتھا یعنی فلک کا لفظ غیر مجسم چیز پر بھی بولا جاتا ہے جیسے کہ دائرہ پر یا حلقہ پر۔

امام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں کہ "او دائرۃ یفعلھا الکواکب بحرکتہ" یعنی فلک ایک دائرہ بھی ہو سکتا ہے جو ستارہ اپنی چال سے بناتا ہے۔

اور اس بات کے ثبوت کے لئے کہ آسمان سے صرف ستاروں کا رستہ مراد ہے۔ بڑی دلیل یہ ہے کہ خود خدا تعالیٰ نے ایک جگہ قرآن مجید میں آسمانوں کے لفظ کے بدلے ستاروں کی راہ فرمایا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے "ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق" جیسا کہ خدا تعالیٰ نے

اسی طرح فرمایا ہے کہ ہم نے سات آسمان پیدا کئے ہیں اسی طرح اس آیت میں یہ فرمایا کہ ہم نے تمہارے اوپر سات راہیں پیدا کی ہیں۔ آسمانوں کی جگہ راہیں فرمائیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمان اور ستاروں کے چلنے کی راہ ایک چیز ہے اور راہ ستاروں کی ضرور نہیں کہ جسم مجسم ہو بلکہ کُرات متعلق کی فضائے بسیط میں جس طرف حرکت ہے وہی اُس کی راہ ہے ❊

اب ان لفظوں سے بحث باقی رہی جن میں صفات آسمانوں کی بیان ہوئی ہے اور جس سے آسمانوں کے مجسم ہونے کا شبہ پڑتا ہے مگر حقیقت میں ان سے بھی مجسم ہونا آسمانوں کا ثابت نہیں ہوتا ❊

اوّل یہ کہ ایک جگہ خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ خلق سبع سموات طباقا یعنی سات آسمان تہ بتہ پیدا کئے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک آسمان دوسرے آسمان سے ایسا ملا ہوا ہے جیسے کہ پیاز سے پرت اور یہی مذہب حکمائے یونان کا بھی تھا کہ ایک آسمان کا مقعر نیچے کے آسمان کے محدب سے ملا ہوا ملتے تھے ❊

مگر امام فخر الدین رازیؒ نے ان معنوں کو تو باطل کر دیا وہ کہتے ہیں کہ لعل المراد کونہا طباقا کونہا متوازیۃ لا انہا متماستہ یعنی تہ بہ تہ ہونے سے یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں شاید ان کا ایک دوسرے کے متوازی ہونا مراد ہو ❊

مگر حقیقت میں یہ معنی بھی جو امام فخر الدین رازی نے لئے ہیں صحیح نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ سمار یعنی آسمان کا لفظ عربی زبان کے محاورہ میں ہر اوپر کی چیز پر جو بلا تعلق زمین کے معلق دکھائی دیتی ہو بولا جاتا ہے مثلاً چاند۔ سورج۔ ستاروں پر بھی سمار کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور اُنکی حرکت سے جو دائرہ یا گھیرا متخیل ہوتا ہے اُس پر بھی سمار کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے بادلوں پر بھی سمار کا لفظ بولا جاتا ہے اور یہ نیلی چھت جو ہم کو دکھائی دیتی ہے اُس پر بھی سمار کا لفظ بولا جاتا ہے اوپر کی سمت پر بھی جو خلائے بسیط ہے سما کا لفظ اطلاق ہوتا ہے پس خلق سبع سموات طباقا کے یہ معنی ہیں کہ خلق اللہ تعالیٰ ھذہ السمت المرتفعۃ علی سبع ارتفاعات طباقا یعلمہا اھل ذالک الزمان بعدد سبع اجرام عظام یقال لہا الکواکب السبع یعنی اللہ تعالےٰ نے اس اونچائی کو سات اونچے طبقوں میں پیدا کیا ہے جس کو اُس زمانہ کے لوگ سات بڑے بڑے جسموں کے سبب جن کو سات ستارے کہتے تھے درجہ بدرجہ جُدا جُدا سمجھتے تھے جیسے کہ ہم ایک سطح پر نقاط مفروضہ مقرر کر کر اُس سطح واحد کو طبقات قرار دیں پس اس آیت سے یونانی حکیموں کے آسمان کا وجود ثابت نہیں ہوتا ❊

دوسرے یہ کہ ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے وبنینا فوقکم سبعا شدادا وجعلنا

سراجاً وهاجاً یعنی بنائیں ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط چیزوں اور کیا ہم نے ایک کو چراغ روشن اس آیت میں جن سات چیزوں کا ذکر ہے اُن سے یونانی حکیموں کے سات آسمان مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ ان سات مضبوط چیزوں سے وہی سات ستارے مراد ہیں جن کو اُس زمانہ کے لوگ بھی جانتے تھے اور جبکہ اُس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ کیا ہم نے ایک کو چراغ روشن جس سے علانیہ سورج مراد ہے جس کو لوگ اُن سات میں سے ایک سمجھتے تھے۔ تو اب کچھ شبہ نہیں رہا کہ ان سات چیزوں سے یونانی حکیموں والے سات آسمان مراد نہیں ہیں بلکہ وہ سات چیزیں مراد ہیں جنکو اُس زمانہ کے لوگ سبع سیارہ کہتے تھے۔

تیسرے یہ کہ ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ الله الذی رفع السموات بغیر عمد ترونها اس آیت سے بھی یونانی حکیموں والا آسمان ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ آیت بالکل اُس مطلب کو جو ہم نے بیان کیا ہے واضح کر دیتی ہے اس لئے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ وہ ہے جس نے اٹھا دیا اوپر والی چیزوں کو بغیر ستون کے جس کو تم دیکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں ہم کو اوپر دکھائی دیتی ہیں اُن کے لئے ستون تو ہے مگر وہ ایسا ستون ہے کہ ہم کو دکھائی نہیں دیتا اب سمجھو کہ وہ ستون کیا ہے وہی قوت جاذبہ ہے جو خدا تعالےٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ہر ایک کرہ معلق میں پیدا کی ہے جس کے سبب تمام اوپر کی چیزیں معلق بغیر ظاہری ستون یا سہارے کے کھڑی ہیں۔

امام فخرالدین رازیؒ نے جو کچھ اس مقام پر لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ بعض مفسرین کی یہی رائے تھی کہ خلاء و غیرہ محدود میں کرات معلق ہیں چنانچہ وہ اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں وعندی فیه وجه اخر احسن من الکل وهو ان العماد ما یعتمد علیه وقد دللنا علی ان هذه الاجسام انما بقیت واقفة فی الجو العالی بقدرة الله تعالیٰ وحینئذ یکون عمدها هو قدرة الله تعالیٰ فنتج ان یقال انه رفع السماء بغیر عمد ترونها ای لها عمد فی الحقیقة الا ان تلك العمد هی قدرة الله تعالیٰ وحفظه وتدبیره وابقاؤه ایاها فی الجو العالی وانهم لا یرون ذالك التدبیر ولا یعرفون کیفیة ذالك الامساك یعنی امام فخرالدین رازیؒ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اچھی ایک اور بات ہے اور وہ یہ ہے کہ ستون اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے سہارے سے کوئی چیز ٹھہری رہے اور ہم نے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام جسم صرف خدا کی قدرت سے اس قدر وسیع جو میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو اب ہی خدا کی قدرت اُن کے لئے ستون ہوگی پس نتیجہ یہ نکلا کہ خدا تعالےٰ نے آسمان یعنی اوپر کی چیزوں کو بغیر ایسے ستون کے جس کو تم دیکھو اٹھا رکھا ہے وہ خدا کی قدرت اور اُس کی نگہبانی اور تدبیر اور اُس کا

ٹھہرائے رکھنا ایسی چیزوں کا اتنے بڑے جو میں ہے اور بیشک بندے اُن تدبیروں کو نہیں دیکھتے اور ان باتوں کو نہیں جانتے ۔

اگر اس زمانہ میں امام فخر الدین رازیؒ ہوتے تو ان کو اتنی بڑی تقریر اور ٹیڑھی سیدھی باتیں نہ بنانی پڑتیں بلکہ وہ نہایت آسانی سے سمجھ لیتے کہ وہ ستون جس کو ہم نہیں دیکھتے جس سے تمام کرات معلقہ تھمے ہوئے ہیں وہ قوت جذب ہے جو خدا نے ہر ایک میں پیدا کی ہے ۔

چوتھے یہ کہ قرآن مجید میں آسمان کی نسبت تین لفظ اور آئے ہیں جن کی تفسیر میں کم غور کرنے والوں کو دقت پڑتی ہے اور وہ لفظ یہ ہیں ۔ سقفا ۔ محفوظا ۔ مالہا من فروج ۔ والسقف المرفوع ۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان تینوں لفظوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمان چھت کی مانند ہے اور جب چھت کی مانند ہوا تو ضرور جسم ہوگا ۔

اس خیال پر بعض مفسرین کی اور شامت آئی کہ وہ یہ سمجھے کہ جب چھت کی مانند ہوا تو ضرور چوڑیں ہی ہوگا اور دیواروں پر ہی رکھا ہوا ہوگا ۔ اس خیال باطل سے انہوں نے کہہ دیا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے کہ آسمان چوڑیں ہے اور بڑے اونچے اونچے پہاڑوں پر ٹکا ہوا ہے امام فخر الدین رازی نے ایک لغو طور پر جیسا کہ اس زمانہ کے فیلسوفوں کا دستور تھا اس بیان کو رد کیا ہے مگر اصل یہ ہے کہ یہ الفاظ کچھ بھی منافی یا مخالف حقیقت کے نہیں ہیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ آسمان ہر اوپر کی چیز پر بولا جاتا ہے پس یہ نیلی نیلی چیز جو ہم کو دکھائی دیتی ہے اور جو حقیقت میں مثل دخان یا ہوائے مجسد کے ایک جسم بھی رکھتی ہے اور ہماری دنیا کے چاروں طرف محیط ہے اور دنیا کے رہنے والوں کو مثل سقف گنبدی کے دکھائی دیتی ہے اُس پر بھی آسمان کا اطلاق ہوتا ہے ۔ گو یہ نیلی چیز حکیموں والا آسمان نہیں ہے پس اگر اس نیلی چیز پر سقف مرفوع اور سقف محفوظ کا اطلاق ہوا تو مشکل اور دقت کیا پیش آئی ۔

ایک اور مصیبت مفسرین پر پڑی ہے کہ قرآن مجید میں آسمان کی نسبت لفظ دخان بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف دھواں ہے اب تو مفسرین کے ہوش گئے اور سمجھے کہ اب تو یونانی حکیموں والا آسمان بھی نہ رہا اور شیخ چلی کی طرح سے فیض کا گھر خاک ہو گیا تو اس پر جناب شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ البالغہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھ میں دھوئیں کی مانند دکھائی دے مگر اصل میں ایسا نہ ہو اس پر ابن مسعود کا ایک قول بے سند نقل کیا ہے کہ بھوک کے مارے آنکھوں میں آسمان مثل دھوئیں کے دکھائی دیگا پھر فرماتے ہیں کہ میاں قرآن کی باتوں سے انکار کرنا منع ہے اگر سمجھ میں نہ آئے تو ظاہری اُس کے معنوں ہی پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اقل مرتبہ ایمان اُن کا مان لینا اور تصدیق کر لینا ہے مگر ہم دست بستہ

عرض کرتے ہیں کہ جناب ہم ادنیٰ درجات یہاں نہیں چاہتے ہم تو اعلیٰ درجات یہاں بہ پہنچے ہوئے ہیں ۔

یہ باتیں ہم نے کچھ گستاخی کی راہ سے نہیں لکھیں بلکہ جتنا کہ ہم امام رازیؒ اور مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا ادب کرتے ہیں اور اُن کو علمائے محققین ربانی سے سمجھتے ہیں اتنا کوئی نہ کرتا ہوگا نہ سمجھتا ہوگا مگر اس تحریر سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ لوگ یہ بات سمجھیں کہ حقیقت اشیا روز بروز زیادہ تر منکشف ہوتی جاتی ہے اور جس قدر کہ ہمارا علم ترقی پاتا ہے اُسی قدر کلام ربانی کی حقیقت زیادہ تر واضح ہوتی ہے پس اقوال مفسرین سابق ہی پر ہم کو منحصر رہنا نہیں چاہئے ۔

ہماری دنیا کو ایک مادہ رقیق سیال محیط ہے جس کا نام دخان کہو خواہ ہوائے محیط کرۂ ارض خواہ اور کچھ ۔ اور وہی مادہ اس بات کا سبب ہے کہ ہم کو یہ نیلی چھت جس کو آسمان بھی کہتے ہیں دکھائی دیتی ہے پس یہ بات کہنا کہ آسمان دخان ہے بالکل حقیقت کے مطابق ہے اور کچھ بھی تاویل اور تردد کی حاجت نہیں ہے ۔ یہ ساری خرابی اس لئے پڑتی ہے کہ ہم نے اپنی غلطی سے ہر جگہ لفظ آسمان کا مصداق یونانی حکیموں کے آسمان کو سمجھ رکھا ہے ۔

پانچویں یہ کہ قرآن مجید میں آسمان کی نسبت فتح ابواب بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ایک جسم مجسم ہے اور اس میں چوکھٹ اور کواڑ اور تیغے کنڈے سب لگے ہوئے ہیں جس کے سب دروازے کھلتے بند ہوتے ہیں اور ضرور سنتری بھی دروازے کھولنے بند کرنے کو کھڑے ہونگے پھر آسمان کے وجود مجسم و مستحکم سے کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے مگر اس پر ہم کو بحث کی ضرور نہیں کیونکہ خود اگلے مفسرین اس کو رد کر چکے ہیں ۔ قال الامام الغزالیؒ وھو علی طریق الاستعارۃ فان الظاھر ان الماء کان من السحاب علی ھذا فھو کما یقول القائل فی المطر الوابل جرت میازیب السماء وفتح ابواب القرب یعنی امام غزالی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شدت کے مینہ برسنے میں جو خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ آسمان کے دروازے کھل گئے تو ایسا کہنا بطور استعارہ کے ہے کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ مینہ یونانی حکیموں والے آسمان میں سے تو برستا نہیں بلکہ بادلوں میں سے برستا ہے پس آسمان کے دروازوں کا کھلنا ایسا ہے جیسے کوئی شدت کے مینہ برسنے میں یوں کہے کہ آسمان کے پرنالے بہ نکلے اور پکھالوں کے منہ کھل گئے ۔

چھٹے یہ کہ بعض جگہ قرآن مجید میں آسمانوں کے پیدا کرنے اور بنانے کا ذکر کیا اور چند جگہ اُن کا شق ہونا اور پھٹ جانا فرمایا ہے پھر اگر وہ مثل یونانی حکیموں کے آسمان کے مجسم نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ یہ باتیں آسمانوں کی نسبت کیونکر منسوب کرتا ۔

مگر سمجھنا چاہئے کہ خدا تعالےٰ نے بہت سی جگہ قرآن مجید میں غیر مجسم چیزوں پر خلق کے لفظ کا اطلاق فرمایا ہے بلکہ حالات مفروضہ اور اشیاء معدومہ کی نسبت بھی ایسے لفظوں کا اطلاق ہوا ہے مثلاً فرمایا ہے کہ جعل فی السماء بروجا یعنی بنائے آسمان میں برج۔ حالانکہ کسی کے نزدیک وہ کوئی جسمانی چیز نہیں ہے موت اور حیات سب کے نزدیک فرضی حالتیں ہیں اُن کی نسبت بھی خلق کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے کما قال تبارک وتعالیٰ خلق الموت والحیات ؕ عقل کی نسبت بھی پیدا کرنے کا لفظ آیا ہے معہذا جبکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اوپر کی تمام چیزوں پر آسمان کا لفظ بولا جاتا ہے تو ان میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ وجود اصلی بھی رکھتی ہیں پس یہ بات کہنی کہ اوپر کی چیزوں کو خدا نے بنایا ہے۔ خدا نے پیدا کیا ہے اوپر کی چیزیں پھٹ جاوینگی شق ہو جاوینگی۔ کچھ بھی حقیقت کے برخلاف نہیں ہے اور نہ کسی قسم کی تاویل کی حاجت ہے غلطی تو جب ہی پڑتی ہے جبکہ قرآن کو چھوڑ یونانی حکیموں کی پیروی کریں سماء کے لفظ سے یونانی حکیموں کا بنایا ہوا آسمان مراد لیا جائے ؕ

اب سبع سموات کی بحث باقی رہی یعنی اگر طبقات آسمان کے وہ معنی لئے جاویں جو سبع سموات طباقا میں بیان ہوئے تو وہ سات نہیں قرار پا سکتے بلکہ سات سے زیادہ ہیں اور روز بروز نکلتے چلے آتے ہیں۔ چند روز ہوئے کہ ایک سیارہ کا طبقہ نکلا تھا اور بھی بچیوں سیارہ کا ایک طبقہ نکلا ہے اور معلوم نہیں کہ اور کتنے نکلتے آوینگے پھر اُن کو سات میں منحصر کرنا کیونکر صحیح ہوگا ؕ

مگر یہ سمجھ کہ خدا نے ان طبقوں کو سات میں منحصر کر دیا ہے غلط ہے کوئی تعداد بیان کرنے سے عدد زائد کی نفی لازم نہیں آتی۔ امام رازیؒ صاحب فرماتے ہیں فان قال قائل ھل یدل التنصیص علے سبع سموات علے نفی العدد الزائد قلنا الحق ان تخصیص العدد بالذکر لا یدل علے نفی الزائد یعنی اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ کیا سات آسمانوں کی صریح تعداد بیان کرنی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اُس سے زیادہ آسمان نہیں ہیں تو ہم کہینگے کہ حق یہ ہے کہ کسی عدد کو بیان کرنے میں خاص کر لینا اُس سے زیادہ نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا پس صاف ظاہر ہو گیا کہ اگلے عالموں کے نزدیک بھی سات ہی ہیں آسمانوں کا انحصار نہیں پایا جاتا تھا ؕ

غرضکہ بیان مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ الفاظ اور آیات قرآن مجید سے وہ آسمان جس کو یونانی حکیموں نے بنایا تھا اور جس کی حقیقت ہیئت قدیمہ میں بیان کی گئی ہے ثابت نہیں ہوتی اور اُس کا منکر منکر نص قرآنی نہیں سمجھا جا سکتا اور مسئلہ ہیئت جدید جو اس امر کی نسبت ہے وہ مخالف

قرآن مجید نہیں پایا جاتا۔ فتدبر۔

تطبیق منقول با معقول

کوئی خیال اس سے زیادہ غلط نہیں ہے کہ دین کے اصول جو خدا نے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی معرفت بتلائے وہ مطابق ان اصول کے نہیں ہیں جو عقل سے ثابت ہوتے ہوں اور کوئی امر اس سے زیادہ تر مذہب پر الزام نہیں دیتا جیسا کہ یہ مسئلہ کہ نقل میں عقل کو دخل دینا شرعاً ناجائز ہے۔
اس غلط خیال کے پیدا ہونے کا کوئی سبب کیوں نہ ہوا اور اس مسئلہ کے جاری کرنے والوں نے کیسا ہی کچھ فائدہ کیوں نہ سوچا ہو مگر حقیقت میں دین کے غلط اور بنائے ہوئے پر اس سے زیادہ اور کسی دلیل و برہان کی حاجت نہیں ہے کہ کہا جاوے کہ اس کے اصول کو عقل سے جانچنا ناجائز ہے یا وہ عقل کے خلاف ہیں کیونکہ جو مذہب فی ذاتہ سچا اور صحیح ہے اور خاص خدا کا دیا ہوا ہے نہ انسان کا بنایا ہوا تو اس میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہ ہوگی جو عقل کے خلاف ہو اس لئے کہ جو شئے عقلاً محال ہو اس کا واقع ہونا بھی غیر ممکن ہے پس اگر کسی دین و مذہب میں کوئی بات ایسی ہو جو مخالف عقل کے ہو تو حقیقت میں وہ دین و مذہب ہی سچا اور صحیح اور خدا کا دیا ہوا نہ ہوگا۔ بلکہ انسان کا بنایا ہوا ہوگا پس جتنے دین دنیا میں جاری ہیں اُن کی صحت اور غلطی کے جانچنے کیلئے اگر خدا نے ہم کو کوئی آلہ دیا ہے تو وہ صرف عقل ہے پس اگر اسی کے استعمال کو کسی دین کے بانی نے ناجائز اور ممنوع اور حرام کر دیا ہو تو گویا اُس نے پہلے ہی سے اہل عقل پر ظاہر کر دیا کہ یہ دین خدا کا دیا ہوا نہیں ہے جس سے غلطی کا ہونا غیر ممکن ہے بلکہ ایک ایسے انسان کا بنایا ہوا ہے جس کی غلطیاں بہ نسبت صحت کے زیادہ ہوتی ہیں اور اسی غلطی کے چھپانے کے لئے اُس کے بانی نے عقل سے جانچ اور امتحان کرنے کو منع کر دیا۔ پس جو دین و مذہب ایسا ہو کہ جس کے بانی نے عقل کو بیکار کر دیا ہو اور اُس سے کام لینے سے ممانعت کر دی ہو تو اُس دین کو کوئی قبول نہ کریگا مگر احمق اور جاہل کیونکہ بنا اُس کی جہالت پر ہے۔
لیکن ہم اپنے دین اسلام کی نسبت کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ خدا کا دیا ہوا نہیں ہے اور اس کے اصول عقل کے مطابق نہیں ہیں بلکہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہمارا دین سچا دین ہے کیونکہ جو کچھ خدا نے ہم کو بتلایا ہے وہ نفس الامر کے مطابق اصول عقلی کے موافق ہے اور ہمارے اس یقین کی تکمیل خدا کے کلام اور ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ہوتی ہے اس

لئے کہ ہمارے خدا اور رسولؐ نے کبھی نہیں کہا کہ تم عقل سے کام نہ لو اور جاہلوں کی طرح کسی بات کو مانو۔ بلکہ دین کا معیار بالکل عقل پر رکھا اور سب کو عقل سے کام لینے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اُس کی تاکید فرمائی ہمارے خدا کا پاک کلام اسی دعوے سے بھرا ہوا ہے کہ جس کسی کو اس دین کی حقیقت میں شک ہو وہ سوچے اور عقل سے جانچ کرے تاکہ ہر بات کو مطابق نفس الامر کے اور موافق عقل کے پاکر اس کی حقیقت پر یقین کرے: کما قال اللہ تعالےٰ ما تری فی خلق الرحمٰن من تفاوت ۰ فارجع البصر ھل تری من قتور ۰ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئًا وھو حسیرٌ ۰

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ منقول اور معقول میں مخالفت ہے وہ حقیقت میں عقل اور دین کی حقیقت سے بے خبر ہیں اس لئے ہم دونوں کی ماہیت بیان کرتے ہیں جسکے جاننے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ منقول اور معقول میں مخالفت ہے ۰

جتنی چیزیں خدا نے اس دنیا میں پیدا کی ہیں اُن کی فی ذاتہٖ ایک حقیقت ہے اور انسان کو خدا نے اُن چیزوں کی حقیقتوں کے دریافت کرنے کی ایک قوت اور استعداد دی ہے اُسی قوے کا نام عقل اور اُس حقیقت کے دل میں یا دماغ میں آجانے کو علم کہتے ہیں پس علوم عقلی وہ ہیں جو بذریعہ عقل کے دریافت کئے جاویں خواہ وہ ضروری اور بدیہی ہوں کہ بغیر دلیل و برہان کے سمجھ میں آسکیں خواہ وہ نظری اور کسبی ہوں جو فکر و استدلال سے حاصل ہو سکتے ہوں اور علوم دینی وہ ہیں جو کہ خدا نے معرفت کسی سچے پیغمبر کے ظاہر کئے ہوں خواہ وہ متعلق عقائد کے ہوں جو اصلی اصول دین کے ہیں یا متعلق اعمال کے ہوں جو عقائد کی تائید اور ظاہری تکمیل کے لئے بتلائے گئے ہوں جو فروع اُن اصول کے ہوں پس جن چیزوں کو خدا نے پیدا کیا وہ حقیقت میں اُس کا فعل ہے اور جب اس کی حقیقت کو معرفت کسی پیغمبر کے بتلا دیا وہ اُس کا قول ہے پس کون احمق اور جاہل ہے جو یہ کہہ سکے کہ خدا کا قول مخالف اس کے فعل کے ہو سکتا ہے یا قانون قدرت اُس کا تبدل شرائع اور اختلاف ادیان سے تبدیل اور مختلف ہو سکتا ہے یا حقیقت کسی چیز کی کسی دین کے بدلنے سے بدل سکتی ہے جو کوئی ایسا خیال کرے وہ دین سے بے بہرہ ہے اور عقل سے بھی بے نصیب۔ اور جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ حقیقت اشیا کی بدل نہیں سکتی اور قانون قدرت میں کچھ ترمیم ہو نہیں سکتی پس جو علوم ایسے ہیں کہ جن سے اشیار کی حقیقت معلوم ہوا نہیں کو ہم علوم عقلی یا علوم عقلی اور علوم حکمی کہتے ہیں جیسا کہ ہمارے یہاں کے ایک محقق نے لکھا ہے کہ "ان العلم ینقسم الی حکمی و غیر حکمی و وجہ الضبط انہ اما ان لا یتغیر بتغیر الامکنۃ والازمان ولا یتبدل بتبدل الدول والادیان فالاول العلوم الحکمیۃ ویقال لہ العلوم الحقیقیۃ ایضًا ای الثابتۃ

عقلی من الدھور والاعوام۔ اور جو علوم ایسے ہیں کہ جن کو خاص خدا نے معرفت کسی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتلایا ہو اُن کو ہم علوم دینی کہتے ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اما العلوم الدینیۃ فھی ماخوذۃ بطریق التقلید من الانبیاء صلوات اللہ علیہم وسلامہ وذلک یحصل بالتعلیم بکتاب اللہ تعالیٰ وسنۃ رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم وفھم معانیھما بعد السماع۔

اب ہم کو یہ سوچنا چاہیے کہ آیا ہم علوم دینی کی حقیقت بغیر استعانت عقل کے دریافت کرسکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت ہمارے محققین کا اقرار ہے "لا یمکن فھمہ بعد سماعہ الا بالعقل فلا غناء بالعقل عن السماع ولا غناء بالسماع عن العقل فالداعی الی محض التقلید مع عزل العقل بالکلیۃ جاھل والمکتفی بمجرد العقل عن انوار القرآن والسنۃ مغرور فایاک ان تکون من احد الفریقین وکن جامعا بین الاصلین (احیاء جلد ۳ صفحہ ") اور جب بغیر استعانت عقل کے علوم دینی کی حقیقت کا سمجھنا ہی مشکل ہے تو کیونکر وہ علوم عقلی مخالف دینی علوم کے ہونگے مگر جو لوگ ظاہر میں دونوں کو مخالف بتاتے ہیں اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ جو علوم حقیقت میں عقلی نہیں ہیں۔ بلکہ وہمی اور خیالی ہیں اُن کو غلطی سے عقلی علوم سمجھنا۔ دوسرے جو علوم حقیقت میں دینی نہیں ہیں یعنی جن کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلایا ان کو دینی علوم تصور کرنا مثلاً مسئلہ حکمائے یونان کا کہ خدا عالم بالجزئیات نہیں ہے بے شک مخالف ہمارے اس دینی عقیدہ کے ہے کہ خدا سب چیز کو جانتا ہے یا یہ قول جاہل مسلمانوں کا کہ زمین گائے کے سینگ پر ہے بلاشبہ مخالف علوم عقلی کے ہے پس مخالفت اس قول کے کہ خدا عالم بالجزئیات نہیں ہے ہمارے دینی عقیدہ سے اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ قول عقل سے ثابت ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ حقیقت میں اُس کا ثبوت دلائل عقلی سے نہیں ہے بلکہ صرف وہمی اور خیالی دلیل سے اور یہ قول جہلا کا کہ زمین گائے کے سینگ پر ہے مخالف علوم عقلی کے نہ اس وجہ سے ہے کہ یہ قول بتلایا ہوا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے بلکہ اس سبب سے ہے کہ اس کی کچھ اصلیت دین میں نہیں ہے مگر جب دونوں باتیں اپنے اپنے اصول کے مطابق ہونگی یعنی علوم عقلی حقیقت میں علوم عقلی ہوں اور بلا آمیزش وہم و خیال کے عقل کے ثابت ہوں وہ مخالف اُن علوم دینی کے ہو ہی نہیں سکتے جو کہ خاص خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتلائے ہوئے ہوں اور جس میں کسی نے بیچ میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔ اور کسی نے اپنی غلطی سے اُن میں تحریف معنوی نہ کی ہو اس لئے جو شخص علوم عقلی اور علوم دینی کی مخالفت کا قائل ہے اُس کو یہی دھوکا اور یہی مغالطہ ہوا ہے ورنہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو یہ خیال بھی کرے کہ خدا کا قول اُس کے فعل کے مخالف ہوگا کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ خدا نے زمین کو گول بنایا ہو اور

معرفت پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اُس کا مسطح ہوتا بتلایا ہو نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو قول خدا کا ہے وہ ہرگز اس شئے کی اصلی حقیقت کے مخالف نہ ہوگا اس لئے جو شخص اپنے دین کی سچائی پر خود کامل یقین رکھنا اور اُس کی سچائی اوروں پر ثابت کرنا چاہے اُسے ضرور ہے کہ وہ اپنے دین کے اصول کی عقلی اصول سے مطابقت دکھلا دے نہ کہ بجائے اس کے اپنے دین کی حفاظت کے لئے یہ حکم جاری کردے کہ اصول دین کو عقل سے جانچنا اور منقول کو معقول سے ملانا ناجائز ہے اور دونوں میں فی ذاتہ تناقص ہے ہمارے مذہب کا ایک محقق لکھتا ہے [1] کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ علوم عقلی علوم شرعی کے مخالف ہیں اور دونوں میں موافقت غیر ممکن ہے یہ خیال چشم بصیرت اندھے پن سے پیدا ہوتا ہے خدا ایسے خیال سے بچائے ایسا خیال کرنے والا جبکہ بعض علوم شرعی کو بعض علوم عقلی سے مخالف پاتا ہے اور دونوں میں توافق نہیں کر سکتا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ اختلاف اصل دین میں ہے پس وہ دین سے ایسا نکل جاتا ہے جیسا کہ بال آٹے سے اور اس کا سبب یہی ہے کہ اُس کے عجز و قصور نے اُس کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ حقیقت دین ہی میں اختلاف ہے افسوس ایسے آدمی کے حال پر۔

تطبیق معقول و منقول میں اکثر چند شبہات لوگوں کے دلوں میں گذرتے ہیں اور علوم و فنون کی تحصیل واسطے تطبیق منقول کے اُن کے نزدیک بے سود و ناجائز یا ممنوع سمجھی جاتی ہے۔

---

[1] وظن من يظن ان العلوم العقلية مناقضة العلوم الشرعية وان الجمع بين هما غير ممكن هو ظن صادر عن عمى فى عين البصيرة نعوذ بالله منه بل هذا القائل ربما تناقض عنده بعض العلوم الشرعية لبعض فيعجز عن الجمع بين هما فيظن انه تناقض فى الدين فيتحير به فينسل من الدين انسلال الشعرة من العجين وانما ذلك لان عجزه فى نفسه خيل اليه نقصا فى الدين وهيهات وانما مثاله مثال الاعمى الذى دخل دار قوم فتعثر فيها باوانى الدار فقال لهم ما بال هذه الاوانى تركت على الطريق لم ترد الى مواضعها فقالوا له تلك الاوانى فى مواضعها وانما انت لست تهتدى الطريق لعماك فالعجب منك انك لا تحيل عثرتك على عماك وانما تحيلها على تقصير غيرك فهذه نسبة العلوم الدينية العلوم العقلية

(احیاء)

پہلا شبہہ تطبیق معقول و منقول میں یہ ہے

کہ انسان کی عقل کامل نہیں ہوتی اور وہم اور شک کی آمیزش سے کوئی عقلی مسئلہ پاک نہیں ہوتا خلاف منقول کے کہ جو کچھ خدا اور اُس کے رسول نے فرمایا اُس میں کبھی غلطی ہو ہی نہیں سکتی پس ایسی چیز کو جس میں حق و باطل کی تمیز نہ ہو ایسی چیز سے ملانا جس میں غلطی کا احتمال ہی نہ ہو سوائے پریشانیٔ طبیعت اور تحریک مادہ الحاد اور پیدا کرنے شکوک و شبہات کے عقائد دینی پر کچھ حاصل نہیں ایسے شبہے کرنے والے یہ نہایت عمدہ اور مضبوط دلیل بیان کرتے ہیں کہ اب تک اس دنیا میں ہزاروں حکیم اور فلسفی اور عاقل گذرے اور صدہا برس تک ہزاروں محقق چند عقلی مسائل کی صحت پر متفق رہے مگر پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ ان کے مسلمات عقلیہ کی غلطی کھل گئی اور جو کچھ وہ سوچے سمجھے تھے اُس کی کچھ اصلیت نہ پائی گئی پس اگر انسان کی عقل ادراک حقائق کے لئے کافی ہوتی اور اسکے دریافت پر دھوکا ہوتا تو کیوں ایسی غلطیاں ہوتیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقل حقیقت اشیاء کے ادراک میں قاصر ہے اور جو کچھ عقلا حکما نے سوچا سمجھا وہ اطمینان کے لائق نہیں ہے تو خدا اور رسولؐ کے کلام کو اس سے ملانا حق کو باطل سے تطبیق دینا ہے۔

یہ شبہہ بے شک غور کرنے کے لائق ہے مگر ایسا قوی و مدلل نہیں ہے کہ اس سے تطبیق منقول و معقول کی ضرورت اور جواز سے انکار کیا جاوے کیونکہ یہ بات تو یقینی معلوم ہے کہ ہر چیز کی فی نفسہ ایک حقیقت ہے اور خدا نے جو قوت مدرکہ ہم کو دی ہے وہ اُن اشیاء کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے دی ہے[1] اور اُن اشیاء کے حقائق دریافت کرنے کی ترغیب اور تحریص بھی

[1] امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ وہ صفت جس سے انسان انسان ہوا اور جس نے اُس کو حیوان سے جدا کر دیا ہے هو الذی استعد به لقبول العلوم النظریة و تدبیر الصناعات الخفیة الفکریة وہ ایک استعداد قبول کرنے علوم نظریہ کی اور پیدا کرنے تدبیر صنعتوں پوشیدہ کی ہے اور ایسی استعداد کا نام عقل ہے اور کوئی انسان نہیں ہے جسکو یہ استعداد نہ دی گئی ہو تمام علوم اور جمیع فنون اسی سے پیدا ہوتے ہیں گویا وہ سب اس میں پوشیدہ ہیں اور صرف ایک سبب کی حاجت ہے جو اُن علوم کو اس سے پیدا کرے کوئی علم اور فن نہیں ہے کہ جو اس سے خارج ہو اور اُس میں پوشیدہ نہ ہو عقل کے اور علوم کے اس میں پوشیدہ ہونے کی ایک مثال بعینہ پانی اور مٹی کی ہے کہ کوئی زمین نہیں ہے جس میں پانی نہ ہو مگر اس کا نکلنا محتاج کھودنے اور نکالنے اوپر کی مٹی کا ہے یا اُس کی تمثیل مثل روغن کے ہے کہ وہ ہر دودھ میں موجود ہے مگر اُس کا پیدا ہونا ایک تدبیر خاص پر موقوف ہے پس جو شخص اُس استعداد کو کام میں لاوے اور عقل کو بیکار کر دے وہ درحقیقت اس استعداد کو ضائع کرتا ہے جو خدا نے اس کو دی ہے اور وہ انسان ہو کر اپنے آپ کو حیوان بناتا ہے اس استعداد کا کمال اور ترقی تجربہ اور تحقیقات اور محنت پر موقوف ہے قدرت نے بدفطرت ہیں وہ قوت سب کو دی ہے جو اس کو کام میں لاتے ہیں وہ اُس کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور اسکے ثمرات اور نتائج کا لطف اُٹھاتے ہیں جو اسکو کام میں نہیں لاتے وہ اسکی حقیقت ہی کے منکر ہو جاتے ہیں اور اسکو استعمال میں لانے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔

اپنے کلام میں جابجا فرمائی ہے اور غور کرنے والوں اور سوچنے والوں کی بزرگی بھی بیان کی ہے پس اگر اس قوت مدرکہ سے کام لینے اور عقل سے سوچنے کی ہم کو اجازت نہ ہوتی تو نہ ہم کو عقل دی جاتی نہ غور و فکر کی ترغیب ہوتی پس ہم کو عقل کو دینا اور یتفکرون فی خلق السموات والارض کہہ کر ہم کو اس کے حقائق دریافت کرنے پر برانگیختہ کرنا ہی اس بات کی عمدہ دلیل ہے کہ ہم حقائق اشیاء کو دریافت کرسکتے ہیں اور چونکہ ہماری عقل وہم اور خیال کی آمیزش سے پاک نہیں ہے اس لئے جو کچھ ہم سوچیں اور سمجھیں اور تحقیق کریں اس میں غلطی کا احتمال بھی ہوسکتا ہے لیکن ہماری تحقیق دو قسم کی ہوسکتی ہے یا ایسی تحقیق کہ سوائے ذہنی دلیل کے کوئی ثبوت نہیں یا ایسا نہ ہو جس کو ہم مشاہدہ اور معاینہ اور تجربہ سے ایسا صحیح سمجھیں کہ غلطی کا احتمال ہی نہ ہو یا علاوہ اس ذہنی دلیل کے اُس کا ثبوت کامل مشاہدہ اور معاینہ اور تجربہ سے بھی ہو۔ پس پہلی قسم کی تحقیق پر بلاشک ہم احتمال غلطی کا کرسکتے ہیں اور دوسری کی تحقیق پر اُس کا خیال نہیں کرسکتے۔ اسی سے ثابت ہوا کہ جس طرح پر ہمارے سب معقولات برحق اور صحیح اور مطابق واقع نہیں ہوسکتے اسی طرح ہمارے سب منقول غلط اور پوچ اور باطل نہیں ہوسکتے ✦

اب ہم کو چاہیے کہ ہم معقولات کا امتحان کریں اور اس کی صحت اور غلطی کو جانچیں اگر ہم کو امتحان کے بعد اُس کی صحت پر یقین ہوجاوے تو ہم کو اگر سچے مسلمان اور پکے دیندار ہیں اور عقل اور سمجھ بھی رکھتے ہیں اور تعصب اور جہالت سے بھی پاک ہیں تو لازم ہے کہ انہیں باتوں کا اگر ان کا ذکر کچھ ہمارے دین میں ہو اُس معقولات سے متحد اور مطابق ہونا سب پر ظاہر کریں اور اگر بظاہر کچھ اختلاف ہو اُس کی وجوہ پر غور کریں اور ایک سچے باایمان آدمی کے موافق اس اختلاف کو حل کریں اگر ہم ایسا کرینگے تو ضرور ہم کامیاب ہونگے اور دونوں کو ایک کر دکھا دینگے ؛

خیال کرو کہ اگلے حکمائے یونان جو کچھ سوچے سمجھے تھے اور جو مسئلے عقلی وہ بیان کرتے تھے ان کی دلیلیں صرف ذہنی اور عقلی ہوتی تھیں اور احتمال غلطی کا بلکہ ظن غالب خطا کا ہونا تھا اس لئے ہم اُن کو غلط کہہ سکتے تھے مگر جو حکمت کی باتیں اب بیان کی جاتی ہیں اگر وہ ہیں جن کا ثبوت مشاہدہ اور تجربہ اور ایسی تحقیقات پر ہے کہ آنکھ دیکھی چیز سے کم نہیں تو اگر ہم ایسے اصول اور مسلمات کو غلط کہیں اور بلا امتحان اور بغیر جانچ کے غلط اور باطل کہہ دیں تو صرف مکابرہ اور اپنی نادانی کا ظاہر کرنا ہے ؛

فرض کرو کہ مسلمانوں کے مذہب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ زمین کا قطر پانچ برس کی راہ ہے اور اب تحقیقات سے ثابت ہوا کہ اُس کا قطر ۷۹۲۶ میل ہے اور زیادہ سے زیادہ دو برس میں یہ راہ طے ہوسکتی ہے تو اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ زمین کا قطر پانسو برس کی راہ کا مانیں اور ان تحقیقات

کو غلط اور پوچ کہدیں یا اُس کی تحقیقات کریں۔ اگر اہل اسلام اُس تحقیقات کو غلط کہدیں تو اس سے اسلام کو کیا فائدہ ہوگا۔ یہ ہوگا کہ لوگ اسلام کو مجموعۂ جہالت جانینگے اور مسلمانوں کو احمق اور جاہل سمجھینگے اور ذی علم اور تربیت یافتہ لوگوں کو اسلام کی حقیقت سے منکر ہونے کا ذریعہ پیدا کرینگے۔ اور اگر اہل اسلام اس تحقیقات کو ٹھنڈے دل سے سنیں اور اس کی وجوہ اور دلائل کو سوچیں اور اس پر غور کریں تو اس کو کیا حاصل ہوگا۔ دو باتوں میں سے ایک فائدہ ہوگا یا یہ کہ وہ اس تحقیقات کے اصول اور دلائل کی غلطی ثابت کر دینگے اور اپنے مذہبی قول کی صحت ظاہر کرینگے یا وہ اُس تحقیقات کی صحت کو قبول کرینگے اور ایسے بین اور ظاہری اختلافات کے غور کرنے پر متوجہ ہونگے اور اس امر کی تحقیق کرینگے کہ یہ قول جسکو ہم مذہبی قول سمجھتے ہیں خدا کا فرمایا ہوا ہے رسول کا بتلایا ہوا ہے اس کی اصل کیا ہے اس تحقیقات سے ان کو یہ فائدہ ہوگا کہ اُس قول کا کچھ پتہ نہ چلے گا اور خدا کے کلام اور رسول کی کتاب سے اسکی اصلیت ہی کچھ ثابت نہ ہوگی بلکہ ایک وضعی و غلط اور بے بنیاد بات معلوم ہوگی اور جو الزام دین اسلام پر عائد ہوتا تھا رفع ہو جائیگا اور اسلام کی حقیقت پر کسی معترض کا منہ نہ کھلے گا پس خیال کرو کہ یہ محقق دوست شریعت کا اور عاشق اسلام کا ہے یا وہ مقلد۔ نعوذ باللہ من کتمان الحق وقد کان الحق بالاتباع الحق ؛

یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ جو علوم آجکل جاری ہیں اور جن کی تحقیقات روز بروز ہوتی جاتی ہے اس کا کچھ اثر مذہب اسلام پر پہنچے گا یا نہیں اور اگر پہنچے گا تو اس کا علاج کیا ہے یہ تو کوئی زبان پر لا نہیں سکتا کہ اُس کا اثر مذہب اسلام پر نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اکثر علوم وہ ہیں جو ہماری مانی ہوئی مذہبی باتوں کے خلاف ہیں اور جب اُس کا بد اثر مذہب پر پہنچنا یقینی ہے تو اُس کے دفع کرنے کی فکر ضروریات سے ہے بلکہ خود از روئے اصول مذہب کے فرض کفایہ ہے پس اگر ہم اُس کی تدبیر صرف یہ خیال کریں کہ اُن علوم کی تعلیم حرام اور منع کہدیں تو وہ تدبیر کافی نہیں ہے دو وجہ سے اول یہ کہ اب معتضد باللہ خلیفۂ عباسی کا عہد خلافت نہیں ہے کہ کتب فلسفہ اور معقولات کا پڑھانا اور علوم عقلی کا تعلیم کرنا ہمارے علما کے فتوے سے بند ہو جاوے اور مولویوں کے کہدینے سے ان علوم کا پڑھنا پڑھانا موقوف ہو جاوے ؛ دوسرے اگر بعض مسلمان یا کل اہل اسلام پر اُن کا فتوے اثر کرے اور مسلمان ان علوم و فنون سے جاہل بھی رہیں تو معترض کے اعتراضات اور منکرین اسلام کے شبہات کلی دفع کرنے کا کیا علاج ہے اور جو قوت ان کے انکار کو بسبب حاصل نہ ہونے جواب شافی کے ہوگی اُس کا عذاب کس کی گردن پر ہے ؛

سچ تو یہ ہے کہ جو حالت اس زمانہ کی ہے اُس پر نظر کر کے یہ کہنا کہ معقولات کی تعلیم حرام ہے

سراسر نادانی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مقام کے رہنے والے کسی بلندی پر روشنی کے شعلے دیکھیں اور آگ لگنے کے خوف سے مضطر ہو کر اپنے رئیس سے صلاح پوچھیں اور وہ کہدے کہ سب اپنی آنکھیں بند لو اور اس آگ کو جو نمونہ جہنم کا ہے نہ دیکھو پس نتیجہ اُس کا قوم کے حق میں کیا ہوگا۔ اگر وہ روشنی حقیقت میں جلانے والی آگ ہے تو وہ آکر اُس قوم کے گھر بار کو جلا دیگی اور نام و نشان اُن کا نہ رکھیگی اور اگر وہ روشنی تاریکی کی دُور کرنے والی اور گھروں کی روشن کرنے والی ہے تو اس سے وہ قوم محروم رہے گی پس اُس قوم کے دوست کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ آنکھ بند کر لینے اور چپ بیٹھ رہنے کی صلاح دے بلکہ اُس قوم کے سچے اور عاقل دوست کا کام یہ ہے کہ سب کو برانگیختہ کرے اور اُس کی حقیقت دریافت کرنے کا شوق دلا دے تاکہ چھوٹے بڑے سب اُس کو غور سے دیکھیں اور چھت پر چڑھ چڑھ کر اُس کی تحقیق کریں اگر درحقیقت وہ جلانے والی آگ ہو تو قبل اُس کے کہ ان کے گھر تک پہنچے اُسے پانی سے بجھا دیں اور اگر وہ گھروں کی روشن کرنے والی قندیل ہو تو اس سے اپنے گھروں کو بھی روشن کریں ⁂

ہمارے مذہب کے وہ عالم بھی مقتدا تھے جنہوں نے علوم یونانیوں کی ترویج پر کہا تھا کہ "یا معشر التجار انی انستنا الی بوادی ھذہ الفنون اتیتم منہا بخبر او قبس تعلکم تصطلون" اور ہمارے ہی دین کے وہ بھی پیشوا تھے جنہوں نے ریاضی کے منکرین کی نسبت فرمایا تھا کہ "وتتخذ القوم ظھیریا ونبذوہ شیئاً فریا"۔ اور اب ہماری ہی قوم کے وہ لوگ ہیں کہ ان علوم و فنون سے ناواقف ہیں اور جاہلوں کی طرح اُس کی حقیقت سے منکر ہیں اور اپنی قوم کو اس کی تحصیل سے مانع ہیں اس سے ہماری قوم جہالت کے دریا میں غرق ہوتی جاتی ہے اور تعصبات کے تاریک جنگل میں بھٹکی پھرتی ہے اور اگر کوئی شاذ و نادر اُس سے نکلتا ہے تو اُس کا کوئی راہ بتانے والا اور منزل مقصود کو پہنچانے والا نہیں ہے فظل ھو کالحیاری فی الصحاری ولا یھتدون الی منازلھم سبیلا ولا یجدون الی جادۃ الرشد دلیلا :

دوسرا شبہ تطبیق معقول و منقول میں

بعض جہل کہتے ہیں کہ عقلی علوم کا مثل ہیئات و ریاضی اور ہندسہ اور طبعیات وغیرہ کے سیکھنا اور اُس سے مذہبی باتوں کو ملانا جائز نہ ہو تو بے سود اور عبث ہے خدا کے کلام کی تصدیق بندوں کی باتوں سے کرنا اور رسولؐ کے اقوال کو لوگوں کی تحقیقاتوں سے جانچنا اگر بد دینی اور الحاد بھی نہ ہو تو بے سود اور لاحاصل ضرور ہے مگر یہ غلطی ہے کیونکہ خدا نے صرف اصول اور

کھلی ہوئی باتیں بیان کی ہیں اور عجائب غرایب قدرت کی باریک باتیں ظاہر نہیں کی ہیں مگر سوچنے والوں اور غور کرنے والوں کو اس کی تحقیق کی اجازت دی ہے پس جس قدر کہ ہم اُس کی مخلوق کے حقایق سے واقف ہوں اور اس کے ملکوت سموات و ارض کی ماہیت کی تحقیق کریں تو وہ اس یقین کو جو اُس کی قدرت اور عظمت پر ہمارے دل میں ہے اور قوت بخشیگا اور ہمارے ایمان کو مضبوط کریگا جیسا کہ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ فمن دعا الی النظر و الاستدلال کان علے وفق القرآن ودین الانبیاء ومن دعا الی التقلید کان علی خلاف القرآن و علے وفاق دین الکفار ماورا اس کے جو دقائق حقائق قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کی تشریح اور تفصیل سے اس کے اعجاز اور کلام کی تصدیق زیادہ ہوگی۔ کما قال ابراھیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی ۔

امام فخر الدین رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ اعتراض جہلا کا سراسر پوچ اور غلط ہے کیونکہ اگر ہم کسی عالم کی کتاب پر ایمان لاویں صرف یہ سمجھ کر کہ وہ عالم درحقیقت عالم ہے تو کیا ہمارا ایمان اُس شخص کی برابر ہوگا جو کہ اس کتاب کو پڑھے اور اُس کے حقایق و دقایق سے زیادہ واقف ہوگا اُسی قدر اُس کا ایمان کامل اور مضبوط ہوگا اور اس مصنف کے جلال و عظمت پر اُس کو زیادہ یقین ہوگا ۔

تیسرا شبہ تطبیق معقول و منقول میں

بعض لوگوں کا یہ قول ہے کہ جو کچھ ہمارے خدا اور رسولؐ نے کہدیا ہے وہ سب سچ ہے پھر اُس کی تحقیق اور تصدیق کی کیا حاجت ہے مگر یہ غلطی سمجھ کی ہے اور دو وجہ سے تطبیق کی نہایت ضرورت ہے اول وہ باتیں جو اور لوگوں نے خدا اور رسولؐ کی طرف منسوب کر دی ہیں اور حقیقت میں خدا اور رسولؐ کی نہیں ہیں دین سے حرف غلط کی طرح نکل جاویں اور مذہب کی سیدھی اور عمدہ راہ میں جو کانٹے اور کنکر پتھر لوگوں نے ڈال دیئے ہیں جن کے سبب سے چلنے والے ٹھوکریں کھاتے ہیں اور مُنہ کے بل گرتے ہیں وہ صاف کر دیئے جاویں ۔ دوسرے جو لوگ مذہب کی حقیقت پر صرف مخالفت معقول کی وجہ سے طعنہ کرتے ہیں ان کی زبان بند ہو جاوے اور جو شبہات ناواقفیت و غلطی کے سبب سے اُن کو پیدا ہوتے ہیں وہ رفع ہو جاویں ۔

جو لوگ تطبیق معقول و منقول پر ایسے شبہات کرتے ہیں اور جن کے دماغ میں ایسے پوچ اور غلط خیالات سماتے ہیں وہ تطبیق معقول و منقول کی اصلی غرض سے واقف نہیں ہیں ۔ وہ یہی سوچتے ہیں کہ اب تک بڑے بڑے علماء نے کیوں اس طرف نہ توجہ کی اور اب لوگ کس خیال سے

اس کی آرزو کرتے ہیں شاید ان کو یہ خیال ہے کہ خدا اور رسول کے کلام کی تصدیق کے لئے ان کے کلام کا معقولات سے ملانا ضروری شرط سمجھا گیا ہے حالانکہ یہ غلطی ہے بلکہ جب علوم معقولات کے سبب سے دینیات میں شبہات پیدا ہو گئے اور مسائل حکمیہ کے جاری ہونے سے اقوال مذہب پر طعنے شروع ہوئے اور فلسفہ اور حکمت کے جاننے والوں نے مذہب پر زبان طعن دراز کی تو ضرور اور لازم ہوا کہ مذہبی مسائل کی اصلی حقیقت بیان کی جاوے اور جو خارجی بے اصل باتیں مذہب میں داخل ہوگئی ہیں نکال ڈالی جاویں اور منقول کا جسے اہل معقول غلط کہتے ہیں مطابق واقع کے ہونا ثابت کر دیا جاوے پس اس زمانہ میں حقیقت میں نہ یہ بے سود ہے اور نہ ناجائز ہے بلکہ ضرور اور لازم اور فرض کفایہ ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں ؎ واشتد التمسکات بالمعقول فی کثیر من المباحث الدینیۃ وظہرت تشکیکات فی الاصول الاعتقادیۃ الحمایۃ قال الاخر الی ان صار الاهتمام باقامۃ الدلائل العقلیۃ حسب النصوص النقلیۃ وتطبیق المنقول بالمعقول والمسموع بالمفہوم لاسی امور الدین وسعیا جملا فی جمع شمل المسلمین ومعدودا من اعظم القربات وراس الروس الطاعات ؎

چوتھا شبہہ تطبیق معقول و منقول میں

بعض فقہا یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ علوم عقلی کی تعلیم جائز کی جاوے اور اقوال مذہبی کی معقولات سے ملانے کی اجازت دی جاوے تو ظواہر آیات و احادیث کی رعایت نہ رہے گی اور تاویل اور استعارہ اور تشبیہ سے آیات و احادیث کے ظاہری معنی سے اعتقاد اٹھ جاویگا اس واسطے علماء ظاہری نے الفاظ و عبارت کی نہایت رعایت کی اور استعارات اور تشبیہات سے احتیاط رکھی ؎

یہ شبہہ زیادہ اس سبب سے پیدا ہوا کہ کسی زمانہ میں باطنیہ فرقہ نے تمام آیات کی تاویل کر دیا اور اس کے ظاہری معنوں سے انکار کیا مگر ہماری یہ غرض نہیں کیونکہ ایسا ہو تو بغیر مناسبت اور رعایت الفاظ کے فرضی معنی بنائے جاویں اور نعم سے مراد لا اور لیس سے مراد آرے لی جاوے تو تطبیق سے کیا حاصل ہوگا تطبیق تو اس حالت میں مفید ہوگی کہ بناوٹ اور تکلف نہ پایا جاوے اور عقل سلیم اس تاویل کو تسلیم کرلے لیکن جتنی پابندی ظاہری الفاظ کی بعض علماء نے کی ہے وہ بھی شارع کے مقصود کے برخلاف ہے کیونکہ جب خدا نے بندوں سے خطاب کیا اور ان کو ترغیب اور تہدید کی تو ان کی سمجھ اور فہم اور علم کے مناسب ان سے گفتگو کرنا اس حکیم کی مقتضائے حکمت تھا اور جن باتوں کو وہ خوشی اور رنج کی سمجھتے تھے اسی پیرایہ میں ان کا سمجھانا مناسب تھا پس

اگر خدا نے اپنی قدرت کے اظہار میں فرمایا کہ سب آسمان اور زمین میرے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں اور سب آسمانوں سے اوپر عرش پر میرا مقام ہے اور میرے تخت کو بڑے بڑے فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں اور میں آسمانوں کو کپڑے کی طرح جب چاہونگا تہ کر ڈالونگا تو خود عقل شہادت دیتی ہے کہ مراد اس سے اظہار قدرت ہے نہ بیان حقیقت پس اگر کوئی ظاہری لفظوں کی ایسی رعایت کرے کہ خدا کے ہاتھوں سے مراد ہمارے سے ہاتھ ہیں اور عرش سے مراد تخت طلاؤسی ساخت زرنگار ہے اور حاملان عرش سے سلطانی بانات کی وردی پہنے ہوئے کہار مراد ہیں تو یہ اُس کی نادانی ہے اور اس سے جو کچھ اعتراض شریعت پر وارد ہوئے اس کا الزام اس نادان پر ہے نہ شریعت پر ❊

پس ظاہری الفاظ کی حد سے زیادہ رعایت کرنے سے بڑا نقصان ہوا۔ لوگ حقیقت سے دین و مذہب کی بے خبر ہو گئے دلوں سے اصلی نور ایمان کا جاتا رہا۔ اسلام پر جو کہ روحانی لذتوں کا پہنچانے والا اور انسان کا اعلےٰ درجہ کی تہذیب و شائستگی بخشنے والا ہے ظاہری صفائی اور جسمانی لذتوں کی رہنمائی کا غلط الزام لوگوں نے لگایا۔ تناقض اور اختلاف دینیات میں بڑھ گیا۔ تاویلات رکیکہ کرنے کی ضرورت ہوئی جوابات باردہ دینے سے ضعف دین اسلام کا ظاہر ہوا کہ علمائے کاملین مذہب اسلام کو قائم نہ رکھتے تو ان ظاہری عالموں کی بدولت مذہب اسلام میں سوائے نام کے کچھ نہ رہتا۔ اور بجز پوست اور چھلکے کے کچھ باقی نہ رہتا مگر رحمت خدا کی ان علما پر جنہوں نے دین کو قائم رکھا اور اصول اور احکام شریعت کے حقائق کو ظاہر کیا۔ ولنعم ما قال الامام الغزالی رحمۃ اللہ علیہ ان من یاخذ العلوم من الالفاظ المنقولۃ والعمومات المحققۃ کان العناد علیہ اغلب ما الھم یھتدی بنور اللہ تعالیٰ الی ادراک العلوم علےٰ ما ھی علیہ ❊

ظاہری الفاظ کی پابندی پر ایک اور غلطی یہ ہوئی کہ علاوہ قرآن و حدیث کے لوگوں کے اقوال بھی قابل استناد ٹھہرائے گئے اور وہ الفاظ جو کسی نامی آدمی کی زبان سے نکلے اور وہ حرف جو کسی مشہور شخص کے قلم سے نکلے وہ بھی اسلام میں داخل کئے گئے اور ان لفظوں اور حرفوں کی بھی رعایت ضروری سمجھی گئی اس پر حکایات کاذبہ اور قصص باطلہ اور روایات ضعیفہ نے اسلام کی یہ کیفیت کر دی کہ مذہب اسلام اضحوکۂ طفلان ہو گیا اور دین کو لوگ کہانیوں اور قصوں کا مجموعہ سمجھنے لگے ❊

اگر چشم انصاف سے دیکھا جائے اور تعصب اور لجاج کو دخل نہ دیا جاوے تو کیا فرق ہے ہندوؤں کے اس قول میں کہ میرد پہاڑ دنیا کا مرکز ہے اور اس کے پہلو جواہرات کے ہیں۔ اور اس کی چوٹی پر زمین کی بیکنٹھ ہے اور سات سمندر دودھ اور شراب اور گنّے کے رس کے اسکے

گروہیں اور ہمارے اس قول میں کہ زمین چپٹی ہے اور گائے کے سینگ پر رکھی ہے اور سات آسمان سونے ۔ چاندی ۔ یاقوت ۔ موتی کے ہیں اور کوہ قاف زمرد کا پہاڑ ہے اُس پر ستون آسمان کے کھڑے ہوئے ہیں پس اگر ہم ہندوؤں کی کتابوں پر ہنسیں اور اپنے اس خرافات پر غور نہ کریں تو افسوس ہے ہماری سمجھ اور شرم پر اذالقیت جلباب الحیا وفعل ماشئت فان من لاحیاء لہم لاایمان لہ ❖

اگر ایمان اور عقل کو دخل دیا جاوے تو آج اس سے زیادہ کسی چیز کی صورت نہیں ہے کہ جو کچھ اگلے فلاسفہ اسلام نے کیا وہ ہم کریں وعلوم و فنون جدید صرف واسطے تقویت دین کے حاصل کریں اور امور اکتسابی کو لغو خیالات اور حکایات اور اباطیل کو دین کی کتاب سے چک کریں اور جو جھوٹے قصوں اور بے اصل باتوں نے خوبصورت اور روشن چہرہ کو اسلام کے داغدار کر دیا ہے ان داغوں کو مٹاویں اور ان سیاہ بادلوں کو جو اسلام کے روشن آفتاب کے گرد جمع ہو گئے ہیں ہوا میں اڑا دیں تاکہ سب اس کے نور سے ہدایت پاویں نہ کہ اس عارضی سیاہی کے سبب ٹھوکریں کھاویں اگر اہل ایمان کے نزدیک یہ کام اسلام کا نہیں تو معلوم نہیں کہ اسلام کا کام کیا ہے ❖

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جاہلوں بلکہ اکثر عالموں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جو بات دین سے منسوب ہو گئی ہو گو وہ واقع میں دین کی ہو یا نہ ہو مگر اس کی حمایت ہی کرنی چاہیے مگر یہ غلطی ہے خیال کرو کہ اگر چرک اور میل اور کثافت بدن پر جمع ہو جاوے اور امتداد مدت اور بے احتیاطی کے سبب سے وہ ایک تہ جسم کی ہو جاوے تو کیا اس کا دور کرنا جسم کے اصلی اجزا کا جدا کرنا اور اسکی ہیات اور شکل کا بدلنا ہے ہرگز نہیں بلکہ اُس جسم کی طہارت کو ظاہر کرنا اور اس کو اصلی ہیئت پر لانا اور اسکی کثافت اور میل کو چھڑانا ہے پس گو کوئی جاہل غلطی سے ایسی کثافت دور کرنے والے کو دشمن جانے مگر حقیقت میں وہ سچا دوست اور پکا خیر خواہ اس جسم کا ہے ❖

علم معقول و منقول

گو اگلے زمانہ میں ایسے لوگ گذرے ہوں جو منقول موجودہ اور معقول قدیم یونانیہ کے جامع ہوئے ہوں اور جامع معقول و منقول کہلائے ہوں مگر اس زمانہ میں منقول مروجہ اور معقول جدیدہ کا جامع ہونا غیر ممکن ہے اور اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ اب نئے معقولات پر لحاظ کر کے کسی آدمی کا جامع معقول و منقول ہونا غیر ممکن ہے ❖

ہماری اس بات پر یقینی لوگ تعجب کرینگے اور اس امر کو نہ مانینگے لیکن ہم ثابت کرتے ہیں کہ ہمارا قول نہایت صحیح اور درست ہے کیونکہ ہماری مذہبی تعلیم آجکل کے علوم و فنون کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اور دونوں میں تناقص کی نسبت ہے جو ہمارے مذہبی عقائد ہیں انہیں آجکل کے تربیت یافتہ اوہام اور خیالات گنتے ہیں اور جو مسائل علوم فنون جدیدہ کے ہیں انہیں ہمارے عالم ذریعہ الحاد جانتے ہیں پس جب دونوں میں باہم ایسی نقیض اور اختلاف ہے تو ایک دل میں دونوں قسم کے خیالات کا آنا حقیقت میں نقیض کا جمع ہو جانا ہے۔ فرض کرو کہ ایک طالب علم نے دونوں قسموں کی تعلیم شروع کی۔ جب وہ مدرسہ میں گیا اور اس نے جغرافیہ میں پڑھا کہ زمین چلتی ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ پھر جب وہ اپنے ملاجی کے پاس آیا انہوں نے پڑھایا کہ زمین گائے کے سینگ پر رکھی ہوئی ہے اور گائے مچھلی پر ہے اور سورج زمین کے گرد پھر رہا ہے اور یہی مولوی جی نے کہا ہے کہ یہ سچا عقیدہ دین کا ہے اس کا نہ ماننا کفر ہے پس سوچو کہ وہ طالب علم کیا کرے گا۔ ایسی تعلیم سے کچھ فائدہ پاوے گا۔ یقیناً وہ ایک مصیبت میں مبتلا ہو جاوے گا۔ اور اس کی عقل جاتی رہے گی اور ضرور دونوں تعلیموں سے ایک کو چھوڑ بیٹھے گا:

اگر کوئی خیال کرے کہ یہی امر پرانے معقولات کی تعلیم میں پیش آیا تھا پھر کیونکر ایک ہزار برس تک منقولات کے ساتھ اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا جواب ہم یہ دینگے کہ حال کے معقولات کا قیاس پچھلے معقولات پر کرنا حقیقت میں قیاس مع الفارق ہے اور بڑی غلطی اور دھوکے کی بات ہے۔ وہ سبب یہ اول یونانیوں کے معقولات کا مدار فرضی اور وہمی دلیلوں پر تھا اور خود پڑھنے والے کا دل اُس کی حقیقت پر کامل یقین نہ کرتا تھا اکثر دلیلیں ان کی مخدوش اور مجروح تھیں اور ان پر یہ مقولہ "بنائے فاسد علے الفاسد" کا صادق تھا اس لئے ان مسائل عقلی سے جن کی دلائل و براہین مخدوش و مجروح تھیں مسائل شرعی پر کوئی نقصان صریح نہیں پہنچتا تھا اور ان معقولی مسائل کے جاننے والوں کا دل اپنے مذہبی مسائل سے پھر نہیں سکتا تھا بخلاف ان تحقیقاتوں کے جو آجکل ہوئی ہیں اور ان مسائل حکمیہ کے جن کی تعلیم ان دنوں میں ہوتی ہے کہ اُس کے جاننے کے بعد اُن مسائل کی حقیقت سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو اپنی آنکھ سے دیکھی ہوئی کسی چیز سے انکار کرے۔ یونانیوں کی حکمت کے عمدہ مسائل مثل ابطال جزلا یتجزی اور اثبات ہیولے و صورت اور استحالہ خلا اور حرکت فلک علے الاستدارہ اور ابطال خرق والتیام و الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد اور کرویۃ اجسام بسیط کیا ایسے ہیں جن کے دلایل ایک فرضی وہمی دلیل سے کچھ زیادہ رتبہ رکھتے ہوں یا عناصر بسیط اور اسطقسات اربعہ اور کائنات الجو کی

تحقیقاً ہیں ان کی اس قابل ہیں کہ عقلی دلیل یا تجربہ اور مشاہدہ سے اُس کا کامل ثبوت ہوتا ہو حقیقت میں ایک دلیل بھی ان کی ایسی قوی اور مضبوط نہیں بخلاف اس زمانہ کی تحقیقاتوں کے کہ کوئی دلیل فرضی اور وہمی نہیں ہے سب چیزوں کا ثبوت مشاہدہ اور تجربہ پر ہے جس کے سمجھنے کے بعد کسی شخص کو اُس کی حقیقت میں شبہہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا پس پرانی معقولات کی تعلیم منقولات کے ساتھ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی اور پڑھنے والے کی طبیعت کو کامل پریشانی نہیں ہوتی بخلاف حال کی معقولات کے کہ اس کے سمجھنے کے بعد جو تعلیم اس کے مخالف ہوگی اُس کو کوئی قبول ہی نہ کریگا ؛

علاوہ اس کے پُرانی معقولات کی تعلیم کا منقولات کے ساتھ جاری رہنے کا ایک دوسرا سبب تھا کہ ہمارے قدیم عالموں نے خوب تحقیقات کر کے دونوں میں تطبیق دی اور جہانتک ہو سکا ایک کو دوسرے سے ملا دیا یا ایک کی غلطی کو ظاہر کر دیا اسی واسطے علم کلام کی کتابیں یونانی مسئلوں سے بھری ہوئی ہیں اور ان کی تطبیق یا تردید کی دلیلیں لکھی ہوئی ہیں بخلاف اس زمانہ کے کہ اب تک یہ کام کسی نے شروع ہی نہیں کیا اور حال کی معقولات کے کسی مسئلہ کو اپنے دینی کسی عقیدہ سے تطبیق دیا نہ اس کی تردید کی پس وہ پرانا معقولات جس کے مسائل کو ہزار برس تک مختلف عالم اپنے دینی مسئلوں سے مقابل کرتے آئے اور تطبیق یا تردید کرتے رہے کیونکر اس معقولات سے مقابل ہو سکتا ہے جس کے ایک مسئلہ کو بھی اب تک کسی نے اپنے دینی مسئلہ سے نہیں ملایا ۔ غرض کہ اب نئے علوم کی تعلیم کے ساتھ مذہب قائم رکھنے کے لئے ضرور ہے کہ مذہبی عقائد اور مذہبی اوہام میں تفریق کی جائے اور تخیلات و توہمات مذہب کے سچے صحیح عقیدوں سے جُدے کر دیئے جاویں اور لوگوں کی فرضی اور وہمی باتیں جو دین میں داخل ہو گئی ہیں ۔ اور اصلی خدا کی بتلائی ہوئی باتوں سے خلط ملط ہو گئی ہیں دین سے نکال دی جاویں ۔ تب جو اصلی اور سچی باتیں ہیں وہ حال کے علوم سے مطابق کی جاویں اور نئی نئی تالیفات علم کلام میں کی جاویں اور یہ بات گو بظاہر نہایت ہی مشکل معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں کچھ مشکل نہیں ہے اگر مسلمانوں کو مذہبی عقاید اور عقلی علوم دونوں کی تعلیم اپنی قوم میں جاری کرنی منظور ہے تو ان کو ایسا کرنا ضروریات سے ہے ۔ ورنہ دونوں میں سے ایک چھوڑنا پڑے گا ۔ ہم ان دقتوں اور مشکلات سے بے خبر نہیں ہیں جو اس کام میں پیش آویں گی اور نہ اس انقلاب عظیم سے غافل ہیں جو ہمارے فرضی سلسلہ تعلیم میں علوم جدیدہ کی تطبیق سے واقع ہوگا ۔ مگر ہم سوائے اس کے دوسرا علاج نہیں پاتے اور چار و ناچار ہم کو یہی کرنا چاہئے ؛

تحریف الفاظ علوم

اس زمانہ میں جو علوم شرعی علوم سمجھے جاتے ہیں اور جو باتیں بڑی دینداری اور ایمان کی خیال کی جاتی ہیں جب اس کی حقیقت پر غور کیا جاتا ہے اور خدا اور رسولؐ کے کلام سے اس کی تطبیق دی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ علوم حقیقت میں شرعی علوم ہیں اور نہ وہ باتیں فی نفسہ دینداری اور ایمانداری کی ہیں بلکہ دنیا طلبی اور نفس پروری اور غرور و حب جاہ کے سبب سے لوگوں نے تحریف کر کے شارع کے مقصود کے برخلاف ان علموں کی حقیقت کو چھپا کر اور اپنی بنائی ہوئی باتوں پر اطلاق دینداری اور ایمان کا کر کے لفظوں کے التباس سے لوگوں کو دھوکہ اور مغالطہ میں ڈال دیا تھا تاکہ اس ذریعہ سے وہ لوگ علمائے ربانی سمجھے جاویں اور نائب رسولؐ اور جانشین نبیؐ ٹھہریں۔

بلاشبہ وہ علوم اور وہ باتیں فی نفسہ سلف صالح اور قرن صحابہ میں شرعی علوم اور دین کی باتیں تھیں اور ان کے جاننے والے بڑے دیندار بلکہ نائب رسولؐ تھے مگر اب ان میں ایسی تحریف اور تبدیل و تغیر ہوگئی ہے کہ سوائے لفظوں کے ان کے معنی ہی باقی نہیں رہے اور جو مراد ان علموں سے اس وقت لی جاتی تھی وہ بالکل فوت ہوگئی پس اب اُن علوم کے جاننے والوں کا اپنے آپ کو محقق اور مدقق سمجھنا اور جو شخص ان کی اصطلاحات اور محاورات کے لفظوں کو زبان پر نہ لاتا ہو اور ان کی بنائی ہوئی بولیاں نہ جانتا ہو اُس کو جاہل اور دین کی باتوں سے بے خبر کہنا اور جو کوئی اُن علوم کی مذمت کرے یا اُن کو شرعی علوم نہ جانے اُسے مرتد اور بددین بتلانا حقیقت میں اُسی تحریف کا نتیجہ ہے۔ پس جب تک کہ ان لفظوں کی اصلی حقیقت بیان نہ کی جاوے اور جو معنی اُس کے سلف صالح اور صحابہ سمجھے تھے ظاہر نہ کئے جاویں اور جو تحریف اس میں کی گئی ہے وہ ثابت نہ کی جاوے تب تک یہ مغالطہ اور دھوکہ رفع ہو نہیں سکتا۔

منجملہ ان لفظوں کے چند لفظوں کا ہم بیان کرتے ہیں۔ اول لفظ علم دوسرے لفظ [illegible] تیسرے لفظ حکمت چوتھے لفظ وعظ و تذکیر۔

اول لفظ علم

لفظ علم کا اطلاق خدا اور اُس کے رسولؐ کے کلام میں ان چیزوں کے جاننے پر۔

متعلق ذات اور صفات اور آیات اور افعال خدائے عزّ وجل کے ہوں اور جس سے اُس کی قدرت اور عظمت اور جلال کی تاثیر دل پر ہوئے مگر اس لفظ کی تحریف اس طرح کی گئی ہے کہ لوگوں نے اُسے مخصوص اپنے مصطلحات اور محاورات پر کر دیا ہے اور جن باتوں کا کچھ ذکر بھی قرن اول میں نہ تھا اُن کو اصل علم قرار دیا ہے اسی واسطے جو شخص علم کلام خوب جانتا ہو اور مسائل فقہ میں خوب مناظرہ اور مباحثہ کرتا ہو اور لوگوں کے گھڑے ہوئے اصول سے بخوبی واقف ہو اور کتابی لفظوں کو اچھی طرح یاد رکھتا ہو وہی بڑا عالم اور علامہ سمجھا جاتا ہے اور جو فضائل علما کے شارع نے بیان کئے ہیں اُن کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ فضیلتیں اُن علما کی نسبت بیان کی گئی ہیں جو کہ اللہ جل شانہ کی ذات اور صفات اور قدرت اور جلال کے جاننے والے ہیں ٭

دوسرا لفظ فقہ[1]

اِس لفظ میں تحریف اس طرح کی گئی ہے کہ اُسے مخصوص کر دیا ہے فروعات کے جاننے اور احکام کی علتوں کے دقائق دریافت کرنے اور مشکل اور عجیب مسئلوں کے یاد رکھنے اور مصطلحات اور محاورات مخترعہ کے الفاظ کے حفظ ہونے پر۔ اسی واسطے جو شخص ان فروعات سے خوب واقف ہو اور جسے ان اصطلاحوں اور اقوال سے زیادہ آگاہی ہو اور جو دقیق اور باریک مسئلوں کو مثل معمہ اور پہیلی کے خوب حل کرتا ہو وہی بڑا فقیہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ زمانہ میں صحابہ کے اس لفظ کا اطلاق طریق آخرت کے جاننے والے اور آفات نفوس کی باریکیوں کے پہچاننے اور

[1] الفقہ فقد تصرفوا بالتخصیص کا بالنقل والتحویل اذ خصصوہ بمعرفۃ الفروع الغریبۃ فی الفتاوی والوقوف علی دقایق عللہا واستکثار الکلام فیہا وحفظ المقالات المتعلقۃ بہا فمن کان اشد تعمقا فیہا واکثر اشتغالا بہ یقال ہو الافقہ ونقد کان اسم الفقہ فی العصر الاول مطلقا علی علم طریق الاخرۃ ومعرفۃ دقایق آفات النفوس ومفسدات الاعمال وقوۃ الاحاطۃ بحقارۃ الدنیا وشدۃ التطلع الی نعیم الاخرۃ واستیلاء الخوف علی القلب ویدلک علیہ قولہ عز وجل "لیتفقہوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم" وما یحصل بہ الانذار والتخویف ہو ہذا الفقہ دون تفریعات الطلاق والعتاق واللعان والسلم والاجارۃ فذلک لا یحصل بہ انذار ولا تخویف بل التجرد لہ علی الدوام یقسی القلب وینزع الخشیۃ منہ کما نشاہد الان من المتجردین لہ وقال تعالی "لہم قلوب لا یفقہون بہا" واراد بہ معانی الایمان دون الفتوی (احیاء العلوم) ٭

دنیا کی بے ثباتی پر یقین کر کے نعیم جنت کی خواہش کرنے پر کیا جاتا تھا اور اسی واسطے جو شخص خدا سے خائف اور دنیا سے متنفر اور آخرت کا طالب ہوتا تھا اُس کو فقیہ کہتے تھے اور یہی مراد خدا کے کلام میں اس لفظ سے ہے حیث قال تبارک وتعالےٰ۔ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم تاکہ فقیہ ہوں دین میں اور ڈراویں اپنی قوم کو جب کہ لوٹیں اُن میں ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ڈرانا اور لوگوں کو خدا کا خوف دلانا اسی فقہ سے ہوسکتا ہے جو قرن صحابہ میں جاری تھی نہ اُس فقہ سے جو اب بنام فقہ کے مشہور ہے کیا کوئی شخص طلاق اور عتاق اور لعان اور سلم اور اجارہ کے مسائل سے کسی کو دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی نعمتوں کا یقین یا اُن فرعی مسائل سے خدا کا خوف دلاسکتا ہے بلکہ فقط اسی میں مستغرق رہنا اور انہی باتوں کو فقہ سمجھنا آدمی کو قسی القلب اور نڈر کر دیتا ہے اور خدا کا خوف ایسے فقیہ کے دل سے جاتا رہتا ہے جیسا کہ ہم اپنے زمانہ کے فقیہوں کا حال دیکھتے ہیں جن کے حق میں خدا کا یہ قول صادق ہے لھم قلوب لا یفقھون بھا اسی واسطے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص سے جبکہ اُس نے کوئی مسئلہ ان سے پوچھا اور انہوں نے جواب دیا اور پوچھنے والے نے کہا یہ فقہا کے مخالف ہے۔ فرمایا کہ ھل رایت فقیھا بعینک انما الفقیہ الزاھد فی الدنیا الراغب فی الاخرۃ البصیرۃ بدینہ المداوم علیٰ عبادۃ ربہ الورع الکاف نفسہ عن اعراض المسلمین العفیف عن اموالھم الناصح لجماعتھم کہ آیا تو نے کسی فقیہ کو آنکھ سے بھی دیکھا ہے فقیہ وہی ہے جو کہ دنیا کا تارک ہو آخرت پر راغب ہو اپنے دین کو جانتا ہو اپنے پروردگار کی عبادت پر مداومت کرتا ہو پرہیزگار ہو۔ اپنے نفس کو مسلمانوں کی آبرو اور ان کے مالوں سے بچاتا رہتا ہو اور اپنے بھائیوں کو نصیحت کرتا رہتا ہو ۔

یہ سب صفات فقیہ کی حضرت حسن بصریؒ نے بیان کیں مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ فرمایا جس سے معلوم ہوتا کہ فقیہ وہ ہے جو مسائل فرعیات کو خوب جانتا ہو ۔

تیسرا لفظ حکمت

حکمت کا لفظ اکثر قرآن مجید میں اور احادیث میں واقع ہوا ہے اور جس شخص کو خدا نے حکمت دی ہے اُس کی خود خدا نے بڑی صفت کی ہے جیسا کہ خود فرمایا ہے من یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ مگر جو مراد خدا کی اس حکمت سے ہے وہ صرف معرفت ذات و صفات ربانی تعالےٰ ہے۔ مگر اب یہ لفظ اس علم پر اطلاق کیا جاتا ہے جس سے انسان اور گمراہ ہوتا ہے اور وہمی اور خیالی باتوں میں پھنس جاتا ہے اور حکمائے یونان کے خیالی مسئلوں کا جاننے والا

یہی حکم سمجھا جاتا ہے پس جو شخص ان کے قولوں کو جانتا ہو اور ان کی بیان کی ہوئی باتوں سے واقفیت رکھتا ہو اور جو لوگوں نے ان باتوں کو مشکل لفظوں اور دقیق دقیق عبارتوں میں اپنی زبان میں کہا ہے اُسے بخوبی یاد رکھتا ہو۔ وہ اس صفت سے موصوف تصور کیا جاتا ہے جو خدا نے حکمت کی کی ہے حالانکہ یہ بڑا دھوکہ ہے ۔

چوتھا لفظ وعظ و تذکیر[1]

وعظ و تذکیر کی بڑی صفت اللہ جل شانہ نے کی ہے اور اس کی فضیلت میں خدا نے فرمایا ہے وذکر فان الذکریٰ تنفع المؤمنین اور حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے بھی مجالس ذکر کی بڑی بزرگی بیان فرمائی ہے لیکن اب اس زمانہ میں بات پر اطلاق وعظ و تذکیر کا ہوتا ہے وہ حقیقت میں تحریف ہے یعنی اس زمانہ کے واعظ اپنے وعظ میں قصے بکتے

---

[1] فنقل ذالک الیٰ ماتری اکثر الوعاظ فی ھذا الزمان یواظبون علیہ وھو القصص والاشعار والشطح والطامات ، اما القصص فھی البدعۃ وقد ورد نھی السلف عن الجلوس الی القصاص وقالوا لم یکن ذالک فی زمن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ولا فی زمن ابی بکر ولا عمر رضی اللہ عنہما حتیٰ ظھرت الفتنۃ وظھر القصاص وروی ان ابن عمر رضی اللہ عنہما خرج من المسجد فقال ما اخرجنی الا القصاص ولولاہ لما خرجت (احیاء)

ومن الناس من یستجیز وضع الحکایات المرغبۃ فی الطاعات ویزعم ان قصدہ فیہا دعوۃ الخلق الی الحق وھذا من نزغات الشیطان فان فی الصدق مندوحۃ عن الکذب وفیما ذکر اللہ تعالیٰ ورسولہ صلے اللہ علیہ وسلم غنیۃ عن الاختراع فی الوعظ کیف وقد کرہ تکلف السجع وعد ذالک من التصنع (احیاء)

واما الاشعار فتکثیرھا فی المواعظ مذموم قال اللہ تعالیٰ والشعراء یتبعھم الغاوون الم تر انھم فی کل واد یھیمون وقال تعالیٰ وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ واکثر ما اعتادہ الوعاظ من الاشعار ما یتعلق بالتواصف فی العشق وجمال المعشوق وروح الوصال والم الفراق والمجلس لا یحوی الا اجلاف العوام وبواطنھم مشحونۃ بالشھوات وقلوبھم غیر منفکۃ عن الالتفات الی الصور الملیحۃ فلا تحرک الاشعار من قلوبھم الا ما ھو مستکن فیھا فتشتعل فیھا ..... فیھا نیران الشھوات فیزعقون ویتواجدون واکثر ذالک او کلہ یرجع الی نوع فساد ۔

ہیں جھوٹی کہانیاں بیان کرتے ہیں شہوت انگیز شعر پڑھتے ہیں۔ جھوٹا مذہبی جوش دلانے والی حکایتیں جن کی کچھ بھی اصلیت نہیں نہایت خوش تقریری سے ایک عمدہ قصہ خواں کی طرح نقل کرتے ہیں اور انبیا اور بزرگان دین کی نسبت بے اصل باتیں منسوب کرکے اُسے بڑی دینداری بلکہ ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں میں اُن بے اصل باتوں کا ایسا یقین دلاتے ہیں۔ کہ سُننے والے اُسے خدا و رسول کے قول کے برابر جانتے ہیں حالانکہ قصص اور حکایات کا وعظ میں بیان کرنا بدعت ہے اور اس کا سُننا سلف صالح نے نہایت بُرا جانا ہے اور قصہ گویوں کے پاس بیٹھنے سے منع کیا ہے۔ یہانتک کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما مسجد سے نکل گئے اور کہنے لگے کہ ان قصہ گویوں نے مجھ سے مسجد چھڑائی اور حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہ نے سوائے حضرت حسن بصریؒ کے سب واعظوں کو مسجد سے نکال دیا۔

جو شخص اس زمانہ کے واعظوں کی باتیں سُنے وہ خود اس امر پر یقین کرسکتا ہے کہ ان کا وعظ قصوں کہانیوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور جھوٹی روایتوں اور بے اصل حکایتوں اور لغو اور خرافات باتوں سے مملو ہوتا ہے اور حضرات واعظین اُسے ہدایت کا ذریعہ سمجھتے ہیں بلکہ غیر صحیح روایتوں کا بیان کرنا وعظ و تذکیر کیلئے جائز جانتے ہیں اور اُس کو راہ حق پر پہنچنے اور دل میں سوز و گداز پیدا کرنے کا وسیلہ کہتے ہیں حالانکہ یہ وسوسہ شیطان کا ہے کیونکہ کبھی حق جھوٹ سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور بے راہ چلنے سے کوئی دین کی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تکلف اور سجع اور تصنع سے اپنی امت کو منع فرمایا ہے حالانکہ اب مدار وعظ کی خوبی کا اسی پر ہے۔ سب سے زیادہ خرابی اور بربادی دین کی ان واعظوں کے وعظ سے ہے جو شعر پڑھتے ہیں اور شہوت انگیز اشعار پڑھ پڑھ کر لوگوں کو وجد میں لاتے ہیں اور وصال و فراق کے مضمون بیان کرکے اس شہوت کو تیز کرتے ہیں اور اُسے عشق حقیقی کا ذریعہ کہتے ہیں۔

اور اُس سے بھی زیادہ بُرائی اُن لوگوں کے بیان سے پیدا ہوتی ہے جو کہ بڑے لنبے چوڑے دعوے خدا کے عشق و محبت کے کرتے ہیں اور وصال اور اتحاد کی حقیقت بیان کرکے اپنے نزدیک لوگوں کو خدا سے ملادینے کی راہ دکھاتے ہیں اور اس کی خوبی بعض لوگوں کے حالات اور حکایات کی نقل کرنے سے لوگوں کے دلوں میں کالنقش فی الحجر بٹھاتے ہیں۔ اسی واسطے اکثر جاہل احمق نادان آدمی ان باتوں سے گمراہ ہوجاتے ہیں اور منصور کی طرح انا الحق کہنے لگتے ہیں اور آخر کار دنیا اور دین دونوں سے بے نصیب ہوجاتے ہیں۔

علاوہ اس کے اکثر حضرات واعظین خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور جو مراد خدا کی اور اُس کے رسول کی ہے اُس کو چھوڑ کر اپنے علم و فضل ظاہر کرنے اور لوگوں کے دلوں کو خوش کرنے

کے لئے غلط معنی بیان کرتے ہیں اور اُس کو نکتہ اور باریکی کہتے ہیں اور الفاظ ظاہری کو اپنے ظاہر معنی سے پھیر کر اُس کی بیجا تاویلیں کرتے ہیں اور غلط تفسیریں کر کے اپنے تئیں فصیح و بلیغ اور علامہ مشہور کراتے ہیں جیسا کہ بعضوں نے بیان کیا ہے بلکہ تفسیروں میں بھی لکھ دیا ہے کہ والضحٰی سے مراد رخسارے اور واللیل سے مراد زلفیں ہیں یا آیہ اذھب الی فرعون انہ طغٰی میں مراد فرعون سے دل ہے یا صم بکم عمی فھم لا یرجعون سے اہل تصوف اور عاشقان خدا ہیں کہ ایسے معنی بیان کرنے والے اپنی بڑی قابلیت اور علمیت ان معنوں سے ظاہر کرتے ہیں اور سننے والے بھی اُسے سُنکر وجد میں آجاتے ہیں مگر حقیقت میں ایسا وعظ بالکل حرام ہے اور کہنے والا اس کا دشمن اسلام کا ہے بلکہ تہمت کرنے والا پیغمبر کا ہے صلے اللہ علیہ وسلم۔ فقد عرفت کیف صرف الشیطان دواعی الخلق من العلوم المحمودة الی المذمومة فکل ذالک من تلبیس علماء السوء بتبدیل الاسامی۔

علم تفسیر

چند روز ہوئے کہ ہم نے ایک مختصر تفسیر بالرائے کی تعریف میں لکھا تھا اس پر لوگوں نے بہت کچھ اعتراض کیا اور ہم کو منکر تفاسیر اور مخالف علما ٹھہرایا اس لئے اب ہم تفسیر کی حقیقت اور مفسرین کے طبقات اور تفاسیر کی کیفیت اور نئی تحقیقات کی ضرورت بیان کرتے ہیں تاکہ سمجھ دار لوگ انصاف کریں کہ ہمارا قول اگلے عالموں کے موافق ہے یا اُن کے مخالف اور جس ضرورت سے ہم تحقیق کی آرزو کرتے ہیں وہ ہے نہیں۔

ہمارے بھائیوں کا یہ حال ہے کہ جہاں ان کے کان تک آواز پہنچی جسے اُنہوں نے پہلے نہ سُنا ہو چونک اُٹھتے ہیں اور سمجھتا بھی نہیں انی اباءنا الاولین کہہ کر کہنے والے کو مرتد اور کافر بناتے ہیں نہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ کہنے والا اسی بات کو کہہ رہا ہے جسے ہزار برس پہلے ہمارے دین کے پیشوا اور امام کہتے تھے نہ اس پر غور کرتے ہیں کہ یہ باتیں وہی ہیں جس کو ہمارے مذہب کے محقق اور عالم لکھ گئے ہیں نہ اُس کی حقیقت اور اصلیت کو دیکھتے ہیں نہ اُس کے ماخذ اور مبداء پر نظر فرماتے ہیں بلکہ عالمیانہ طور سے کہنے والے کی طرف الحاد و ارتداد کی نسبت کرنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ کفر کفر کا شور آسمان تک پہنچاتے ہیں حالانکہ یہ بات بڑی نادانی کی ہے۔ عاقل کا کام ہے کہ وہ کہنے والے کی بات کو غور سے سُنے اور گو بوجہ اس کے کہ اُس نے پہلے اُسے نہ سنا ہو اس

پر متعجب ہوئے مگر تحقیق سے تساہل نہ کرے اس کی حقیقت کو سوچے اگر کہنے والے کا حق اور صحیح ہو
مانے ورنہ کالائے بد بریش خاوند اس کو کہنے والے کے سر پر مارے ۔

اب میں اصل مطلب کو لکھتا ہوں اور اس مضمون کو چند بحثوں پر تقسیم کرتا ہوں پہلی بحث علم تفسیر کی تعریف میں ۔ دوسری بحث مفسرین کے طبقات کے بیان میں تیسری بحث کتب تفاسیر کی حقیقت میں ۔

پہلی بحث علم تفسیر کی تعریف میں

ہمارے متقدمین علمائے علم تفسیر کی تعریف میں مختلف ہیں بعضے کہتے ہیں[1] کہ علم تفسیر وہ علم ہے جس میں بحث کی جاتی ہے نظم قرآن سے بقدر طاقت بشری کے موافق قواعد عربی کے واسطے استنباط کرنے احکام شرعی کے ۔ اور بعضے یہ[2] لکھتے ہیں کہ علم تفسیر وہ علم ہے جس میں بحث کی جاتی ہے اللہ جل شانہ کی مراد و مقصود سے جو قرآن مجید میں ہے ۔ اور بعضے یہ فرماتے ہیں[3] کہ وہ وہ علم ہے جس میں بحث کی جاتی ہے الفاظ کلام اللہ سے تاکہ دلالت کرے مراد پر اللہ جل شانہ کی ۔ ہمارے مذہب کے ایک بڑے محقق نے ان تعریفوں کو جامع مانع نہیں جانا اور یہ لکھا کہ اللہ جل شانہ کی مراد سے بحث کرنا علم تفسیر نہیں ہے کیونکہ تفسیر دو ہی طرح پر ہوتی ہے یا روایۃً یا درایۃً چونکہ اکثر روایتیں تفسیر کی احاد ہیں اس لئے وہ مفید یقین نہیں ہو سکتیں پس از روے روایت کے مراد خدا کی یقیناً معلوم نہیں ہو سکتی ۔ باقی رہا از روے درایت کے یعنی موافق اپنی سمجھ کے معنی سمجھنا یہ امر بھی ظنی ہے اسی واسطے تفسیروں میں ایک دوسری سے اختلاف ہے پس کیونکر اس پر یقین کیا جاوے کہ یہی مراد و مقصود خدا ہے پس اصل تعریف جامع مانع علم تفسیر کی یہ[4] ہے کہ

---

[1] وهو علم باحث عن معنى نظم القرآن بحسب الطاقة البشرية وبحسب ما تقتضيه القواعد العربية وفائدة حصول القدرة على استنباط الاحكام الشرعية على وجه الصحة هذا ما ذكره ابو الخير وابن صدر الدين ۔

[2] هو ما يبحث فيه عن مراد الله سبحانه وتعالى من القرآن المجيد ۔ مولانا قطب الدين الرازي في شرحه للكشاف ۔

[3] شارح تفتازانی ۔

[4] فالاولى ان يقال علم التفسير معرفة احوال كلام الله سبحانه وتعالى من حيث القرآنية ومن حيث دلالته على ما يعلم او يظن انه مراد الله سبحانه وتعالى بقدر الطاقة الانسانية ۔ (كشف الظنون)

تفسیر وہ علم ہے جس سے کیفیت خدا کے کلام کی من حیث القرانیۃ اس طرح پر دریافت کی جاوے کہ جس سے علم یا ظن اللہ جل شانہٗ کی مراد اور مقصود کا بقدر طاقت بشری کے حاصل ہو ❊

پس علم تفسیر کی تعریف میں جو باہم علماء کے اختلاف ہے اور جو تعریف جامع مانع اس علم کی بعض محققین نے بیان کی ہے یہ اختلاف اور یہ تعریف ہی اس بات پر اشارہ کرتی ہے کہ تفسیر جو کچھ اگلے لوگوں نے کی ہے وہ نہ سب واجب یقین ہے اور نہ وہ معانی جو بیان کئے گئے ہیں سب منقول مخبر صادق علیہ السلام سے ہیں بلکہ جو کچھ مفسرین نے معانی اور مطالب بیان کئے ہیں۔ ان سب کا منقول ہونا صحابہ یا تابعین سے بھی نہیں پایا جاتا۔ پس وہ معانی جو بہ اخبار مشہورہ یا بہ آیات صحیحہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہیں صرف ظنی ہیں اور اگر ان میں سے کسی کی غلطی ظاہر ہو جاوے تو اس کا ماننا کچھ لازم نہیں ہے ❊

البتہ تفسیر میں ایک قسم خاص ہے جس میں سوائے بطریق سمع اور نقل کے تفسیر کرنا ناجائز ہے یعنی بیان کرنا اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ کا جن کے نزدیک نسخ جائز ہے۔ اور قراآت اور لغات اور قصص اور اخبار کا مگر سوائے اس کے استنباط کرنا احکام اصلی اور فرعی کا آیات سے اور مطابقت دینا الفاظ کلام الٰہی کا حقائق موجودہ محققہ سے اور تفصیل کرنا ان نکات و اسرار کا جو ان لفظوں سے اجمالاً ظاہر ہوتے ہوں اور رفع کرنا ان شکوک و شبہات کا جو آیات متشابہات سے پیدا ہوتے ہوں اور جن سے ملحدین و منکرین کو اس کلام کی حقیقت پر طعن کرنے کا موقع ملتا ہو نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں ضروری اور واجب ہے ❊

دوسری بحث طبقات مفسرین کے بیان میں

پہلا طبقہ مفسرین کا طبقہ صحابہ ہے جس میں خلفائے اربعہ اور حضرت ابن مسعود اور ابن عباس اور ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری اور عبد اللہ بن زبیر اور انس بن مالک اور ابو ہریرہ اور جابر اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہم ہیں مگر منجملہ ان کے بڑے مفسر حضرت عبد اللہ بن عباس ہیں جن کو ترجمان قرآن کہتے ہیں ❊

حضرت عبد اللہ بن عباس سے جو تفسیر[1] منقول ہے اس کے بہت سے سلسلے ہیں جن سے بعض صحیح بعض مشتبہ اور بعض بالکل غلط اور جھوٹ ہیں صحیح سلسلہ ان کا وہ ہے

---

[1] یاد رکھنا چاہیے کہ عبد اللہ ابن عباس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے صرف چار حدیثیں سنی ہیں کیونکہ وہ بہت چھوٹے تھے جن میں مگر ان کی مرسل روایتوں کو قبول کرنے پر بھی اجماع ہے (شرح اصول بزدوی) ❊

جو علی بن ابی طلحہ ہاشمی سے (جنہوں نے سنہ ۱۴۳ ہجری میں وفات پائی) منقول ہے[1] اور جن پر بخاری نے اعتبار کیا ہے اور سلسلہ قیس بن مسلم کوفی کا (جس نے سنہ ۱۲۰ ہجری میں وفات پائی) عطا ابن سائب کی روایت سے بھی صحیح ہے لیکن ان ہی سلسلوں میں سے اُن کی تفسیر کا وہ سلسلہ ہے جو ابو نصر محمد بن سائب کلبی (جس نے سنہ ۱۴۶ ہجری میں وفات پائی) نے ابو صالح کی روایت سے بیان کیا ہے اور اگر اس میں روایت محمد بن مروان سدی صغیر کی (جس نے سنہ ۱۸۶ ہجری میں وفات پائی) ملی ہے وہ سلسلہ بالکل ہی غلط اور جھوٹا ہے اور اسی طرح پر مقاتل[2] بن سلمان بن بشیر ازدی کا (جس نے سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی) موضوع اور جھوٹا ہے اور سلسلہ ضحاک بن مزاحم کوفی کا (جس نے سنہ ۱۰۲ ہجری میں وفات پائی) منقطع ہے کیونکہ ضحاک حضرت عبداللہ بن عباس سے نہیں ملا اور اگر اس میں روایت بشیر بن عمارہ کی ملائی جاوے تو اور بھی زیادہ ضعیف ہے اور اگر روایت جبیر کی ضحاک سے ہے تو بہت ہی زیادہ غیر قابل اعتبار کے ہے ؂

دوسرا طبقہ مفسرین کا طبقہ تابعین ہے جس میں مجاہد[3] بن جبر مکی اور سعید بن جبیر اور عکرمہ اور طاؤس بن کیسان یمانی اور عطا بن ابی رباح مکی ہے جو اصحاب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہلائے جاتے ہیں اور علقمہ بن قیس اور اسود بن یزید اور ابراہیم نخعی اور شعبی ہیں جو کہ یاران ابن مسعود ہیں اور عبدالرحمٰن بن زید اور مالک بن انس اور حسن بصری اور عطا ابن ابی سلمہ اور محمد بن کعب اور ابو العالیہ اور ضحاک ابن مزاحم[4] اور عطیہ بن سعید اور

---

[1] قال قوم لم يسمع ابن ابي طلحة من ابن عباس التفسير وانما اخذه عن مجاهد او سعيد بن جبير۔ (اتقان) ؂

قال يعقوب بن سفيان ضعيف الحديث يعني علي ابن ابي طلحة (ميزان ذہبی)

[2] قال وكيع ابن مقاتل ابن سليمان كان كذابا وقال ابن حبان انه كان يكذب بالحديث (میزان ذہبی)

[3] قال ابو بكر بن العياش قلت الاعمش ما بال تفسير مجاهد قال اخذه من اهل الكتاب۔ (میزان الاعتدال ذہبی)

[4] قال يحيى بن سعيد الضحاك ضعيف عندنا وما رواياته عن ابن عباس وابي هريرة وجميع من روى عنه ففي ذلك كله نظر (میزان ذہبی)

الضحاك ضعيف ولم يسمع من ابن عباس۔ لآلی مصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ السیوطی۔

قتادہ بن دعامہ اور ربیع بن انس۔ مگر ان میں سے کسی نے کوئی کتاب تفسیر کی تالیف نہیں کی ❊

تیسرا طبقہ مفسرین کا وہ ہے جنہوں نے کتابیں تفسیر کی تالیف کیں اور اقوال صحابہ اور تابعین کو جمع کیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ سفیان بن عیینہ۔ وکیع بن جراح۔ شعبہ بن حجاج۔ یزید بن ہارون۔ عبدالرزاق۔ علی بن ابی طلحہ۔ ابن جریر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن ماجہ۔ حاکم۔ ابن مردویہ۔ ابن حبان۔ ابن منذر ❊

چوتھا طبقہ۔ اُن مفسرین کا ہے جنہوں نے تفسیریں تالیف کیں مگر سلسلۂ سند کو اُڑا دیا۔ مثل ابو اسحاق زجاج۔ اور ابو علی فارسی اور ابوبکر نقاش[2] اور ابو جعفر نحاس۔ اور مکی بن ابی طالب اور ابو العباس مہدوی ❊

پانچواں طبقہ[3] ان لوگوں کا ہے جنہوں نے بے سند قولوں کو نقل کیا اور ہر قسم کی روایات صحیح اور غلط اور ضعیف اور موضوع کو بیان کیا اور بلا تصحیح و تمیز کے ہر قسم کی روایتوں سے اپنی تفسیروں کو بھر دیا جن علموں سے وہ واقف ہوئے یا جن باتوں پر ان کا میلان طبع ہوا اُسی پر آیات قرآنی کو ماؤل کیا اور انہیں علموں اور باتوں سے ورق کے ورق تفسیروں کے سیاہ کئے مثل ثعلبی اور کلبی[4] اور واحدی اور امام رازی اور محمود بن حمزہ کرمانی وغیرہ کے ❊

---

[1] قال جرير بن عبد الحميد عن مغيرة عن شعبي قيل له هل رايت قتادة عن نعمر رايته كحاطب ليل وقال سفيان ابن عيينه قال الشعبي لقتادة حاطب ليل (مختصر تہذیب الکمال ذہبی) ❊

[2] كان يكذب في الحديث والغالب عليه القصص وسئل ابوبكر البرقاني عن النقاش فقال كل حديث منكر وقال البرقاني وذكر تفسير النقاش فقال ليس فيه حديث صحيح (انساب سمعانی) ❊

كان النقاش يكذب في الحديث والغالب عليه القصص۔ (میزان ذہبی) ❊

النقاش صاحب التفسير فانه كذاب اوهو احد من الدجاجين (لسان المیزان عسقلانی) ❊

في حديث مناكير باسانيد مشهورة ونكر النقاش عند طلحة بن محمد بن جعفر فقال كان يكذب في الحديث والغالب عليه القصص وقال البرقاني ليس في تفسيره حديث صحيح (وفیات الاعیان یافعی) ❊

[3] علامہ سیوطی اس طبقہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ ثم الف في التفسير طائفة من المتاخرين فاختصروا الاسانيد ونقلوا الاقوال تبرا فدخل من ثمها الدخيل والتبس الصحيح بالعليل ثم صار كل من سنح له قول يورده ومن خطر بباله شيء يعتمده ثم ينقل عن ذالك خلف عن سلف ظانا ان له اصلا غير ملتفت الى تحرير ما ورد عن السلف الصالح ❊

[4] حموی ذکر میں تفسیر طبری کے لکھتے ہیں کہ ولم يتعرض اى الطبرى لتفسير غير موثوق به فانه لم يدخل في كتابه شيئا عن كتاب محمد بن السائب الكلبي ولا مقاتل ابن سليمان ولا محمد ابن عمر الواقدی لانهم عنده اظنا۔

تیسری بحث کتب تفاسیر کی حقیقت میں

جتنی تفسیریں آجکل مشہور ہیں ان میں کوئی ایک بھی تفسیر کی کتاب ایسی نہیں ہے جس پر بجمیع الوجوہ صحت کا یقین کیا جاوے۔ اور جس کی ساری روائتیں اور سارے اقوال مانے جاویں اور جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو کیونکہ کوئی تفسیر نہیں ہے جو صرف احادیث صحیحہ اور اقوال مخبر صادق علیہ السلام ہی کی جامع ہو اور لوگوں کی رائیں اور ان کے قول نہ ملے ہوں۔ اور کوئی تفسیر ایسی بھی نہیں ہے جو صرف اقوال صحابہ کی جامع ہو ہاں ایک تفسیر ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ مگر ہم اوپر طبقات کی بحث میں لکھ آئے ہیں کہ وہ تفسیر جو منسوب بہ حضرت عبداللہ بن عباس ہے اس کے کئی سلسلے ہیں اور اکثر جھوٹے اور وضعی ہیں۔ سچا سلسلہ ان کی تفسیر کا جو ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے اور اُسے شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فوزالکبیر کے آخری حصہ میں لکھ دیا ہے جو چاہے وہ دیکھ لے اُس میں یا الفاظ غریب قرآن مجید کے معنی ہیں یا مختصر تفسیر بعض آیات کی ہے مگر وہ لمبے چوڑے قصتے اور کہانیاں جو اُن کی طرف منسوب کی گئی ہیں ان کا نام ونشان بھی نہیں ہے ✧

غرض کہ جب ان طولانی تفسیروں میں کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو صرف جامع احادیث نبویؐ اور اقوال صحابہ کیار ہو تو اب ہر تفسیر کے اوپر اعتبار کرلینا اور بغیر تحقیق کے جو کچھ کسی عالم کے قلم سے نکل گیا اُس کا مان لینا اور مثل آیات قرآن مجید کے اُس کے انکار کو کفر جاننا حقیقت میں اسلام کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ تقلید کا ثمرہ ✧

اگرچہ ہم اُن مفسرین کی نہایت تعظیم کرتے ہیں اور اکثر کو اُن میں سے اپنا پیشوا اور امام اور مقتدا جانتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے اپنی نیک نیتی اور صفائے طینت سے نیک کوششیں کیں اُس کا شکر کرتے ہیں اور اپنے اوپر ان کے علم اور تحقیقات اور تالیفات کا بڑا احسان سمجھتے ہیں۔ اور ان کی کتابوں اور تفاسیر سے بہت بڑی مدد پاتے ہیں اور ہم کو بہت سے عمدہ اور اعلےٰ مباحث

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) الکلبی فھو معروف بالتفسیر ولا لاحد تفسیر اطول منہ ولا اشبع وبعدہ مقاتل ابن سلیمان الا ان الکلبی یفضل لما فی مقاتل من المذاہب الردیئۃ۔ (اتقان)

قال احمد بن زہیر لاحمد بن حنبلؒ یحل النظر فی تفسیر الکلبی قال لا وقال الجورجانی وغیرہ انہ کذاب وقال الدارقطنی متروک وقال ابن حبان مذہبہ فی الدین ووضوح الکذب فیہ اظہر من ان یحتاج الی الاغراق فی وصفہ۔ (میزان ذہبی)

قد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اولہ الی اخرہ کذب لا یحل النظر فیہ ✧

میں اُن سے فائدہ پہنچتا ہے مگر بایں ہمہ اُن کو معصوم اور محفوظ نہیں جانتے اور ان کی رائے اور سمجھ اور بیان اور تالیف کو غلطی سے مبرا نہیں سمجھتے اور مثل اپنے پیغمبر صلعم کے ان کی ہر بات پر آمنا وصدقنا نہیں کہتے کیونکہ ہم یہ حق صرف اُسی ایک کا جانتے ہیں جس کی شان میں ہمارے خدا نے فرمایا ہے وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ پس اگر دوسرے کی نسبت بھی ہم ایسا ہی اعتقاد رکھیں تو حقیقت میں ہم مشرک فی صفۃ النبوۃ ہیں ٭

یہ عقیدہ یا یہ قول ہمارا ہی نہیں ہے۔ تمام متقدمین میں اور سارے اگلے محدثین اور مجتہدین کا یہی عقیدہ اور یہی قول تھا بلکہ وہ اصحاب نبوی کی نسبت یہی کہتے تھے کہ ان کی روایت معصوم ہے مگر اُن کی رائے معصوم نہیں ہے اور سوائے اُن کے اوروں کی نسبت تو صاف کہتے تھے کہ کانوا رجالاً ونحن رجال والائمۃ بیننا وبینھم سجال ٭

پس جب کسی کی رائے اور کسی کا قول ہر طرح پر تسلیم کرنا اور اس کو گو کیسی ہی کھلی غلطی پائی جاوے مان لینا ضروری نہ ہوا تو ہر شخص کو تحقیق کرنے اور اس کے مالہٗ وما علیہ کے سوچنے کی عقلاً ونقلاً اجازت ہوئی پس کسی مسلمان پر بحیثیت اسلام کے کسی تفسیر کی کتاب کا بجمیع الوجوہ ماننا ضروری ہے نہ جائز بلکہ ہر مسلمان پر خصوصاً اُس پر جو اپنی ہر بات اور اپنے ہر عقیدہ کا جواب دینا خدا کے روبرو یقینی جانتا ہو کہ وہ تحقیق کرے اور ان کتابوں کے اندر جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کی جانچ کرے جسے صحیح پاوے اُسے سر پر آنکھوں پر رکھے جسے غلط پاوے اُس پر خط نسخ کھینچ دے ٭

تفسیروں میں جہانتک غور کرنے سے پایا جاتا ہے سوائے ان باتوں کے جو نقل وسمع پر موقوف ہیں مثل اسباب نزول وغیرہ کے چند چیزیں ہیں یا احادیث رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی یا اقوال صحابہ کبار اور تابعین کے یا قصص اور اخبار یا واقعات زمانہ آیندہ کے یا استنباط مسائل اصول وفروع کا یا تشریح وتطبیق موجودات کی مطابق علوم نقلی کے ٭

ذکر حدیث نبوی کا جو تفسیروں میں ہیں

احادیث نبوی جو کتب تفاسیر میں منقول ہیں اکثر بلا سلسلہ رواۃ او ربغیر ذکر اسناد کے مذکور

---

[1] کتب التفسیر التی ینقل فیھا الصحیح والضعیف مثل تفسیر الثعلبی والواحدی والبغوی وابن جریر وابن ابی حاتم لم یکن مجرد روایۃ واحد من ھولاء دلیلاً علی صحتہ باتفاق اھل العلم فانہ اذا عرف ان تلک المنقولات فیھا صحیح وضعیف فلا بد من بیان ان ھذا المنقول من قسم الصحیح دون الضعیف (ابن تیمیہ)

[2] ومن تلبیس ابلیس علی علماء اھل الحدیث روایۃ الحدیث الموضوع من غیر (حاشیہ بر صفحہ ۱۴۰)

ہیں مگر بعض تفسیروں میں اُس کی رعایت ہے پس جو حدیث بے سند ہے یعنی جس میں نہ راویوں کے نام نہ بیان کرنے والوں کا ذکر مفسر نے کیا ہے اس کی تنقیح کرنا اور جو حدیث سلسلہ رواۃ مذکور ہے اس کے رواۃ کی تحقیق کرنا محقق کا کام ہے کیونکہ جب ہمارے پچھلے عالموں نے ان حدیثوں کی تحقیق کی جو تفسیروں میں بھری ہوئی ہیں تو انھوں نے اقرار کیا کہ تفسیر کی کتابیں نہ صرف ضعیف اور منکر حدیثوں سے بھری ہوئی ہیں بلکہ موضوع حدیثوں کا مجموعہ ہے جیسا کہ علامہ عبد الرؤف فتاوی فیض القدیر شرح جامع صغیر میں لکھتے ہیں کہ قال ابن الکمال کتب التفسیر مشحونۃ بالاحادیث الموضوعۃ۔

علاوہ موضوع حدیثوں کے ضعیف اور منکر حدیثوں کا ہونا تو تفاسیر میں بعض کے نزدیک موجب قدح نہیں ہے کیونکہ بڑے بڑے اماموں اور محدثین نے فرمایا ہے کہ سوائے اُن احادیث کے جن سے استخراج احکام ہوتا ہے اور حدیثوں کی تنقیح میں ہم نے خود تسامل کیا ہے[۵] اور بعض فرقوں نے تو حدیث کا وضع کر لینا ترغیب و ترہیب کے لئے جب تر تصور کیا ہے جیسا کہ خلاصۃ الخلاصہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) ان یبینوا انہ موضوع وھذا خیانۃ منھم علی الشرع ومقصودھم تنفیق احادیثھم وکثرت روایاتھم الی قولہ ومن ھذا الفن تدلیسھم فی الروایۃ فتارۃ یقول احدھم فلان عن فلان او قال فلان عن فلان یوھم انہ سمع منہ ولم یسمع وھذا قبیح لانہ یجعل المنقطع فی مرتبۃ المتصل (تلبیس ابلیس علامہ ابن جوزی)

وکان الاعمش والثوری وابن عیینۃ وابن اسحاق وغیرھم یفعلون ھذا النوع فی تدلیس الاسناد (شرح شرح نخبۃ الفکر ملا علی قاری)۔

وانما عجبت من ابی بکر بن ابی داؤد کیف قوقم بعض ھذا الحدیث علی کتابہ الذی صنفہ فی فضائل القرآن وھو یعلم انہ حدیث محال ولکن شرہ یاذ لک جمھور المحدثین فان من عادتھم تنفیق حدیثھم ولو بالبواطیل وھذا قبیح منھم (علامہ ابن جوزی)

[۵] الرابع انھم قد یروون عنھم احادیث فی الترغیب والترھیب و فضائل الاعمال والقصص واحادیث الزھد ومکارم الاخلاق ونحو ذالک مما لا یتعلق بالحلال والحرام وسائر الاحکام وھذا الضرب من الحدیث یجوز عند اھل الحدیث وغیرھم التساھل فیہ وروایۃ ما سوی الموضوع فیہ والعمل بہ لان اصول ذالک صحیحۃ مقررۃ فی الشرع معروفۃ عند اھلہ وعلی کل حال فان الائمۃ لا یروون عن الضعفاء شیئا یحتجون بہ علی الانفراد فی الاحکام ھذا شئ لا یفعلہ امام من ائمۃ المحدثین ولا محقق من غیرھم من العلماء واما فعل کثیر من الفقھاء واکثرھم ذالک واعتقادھم فلیس بصواب بل قبیح جدا (خلاصۃ الخلاصہ)۔

بھی انہوں نے غلطی سے قبول کرلیں اور حافظ زین الدین عراقی نے لکھا ہے کہ اگلے لوگوں کی عادت تھی کہ جو حدیثیں اپنی کتاب میں وہ نقل کرتے اُس سے سکوت کرجاتے یعنی اُس کے جرح کو بیان نہ کرتے اور اس کی صحت و ضعف کو ظاہر نہ کرتے یہاں تک کہ بڑے بڑے ائمہ حدیث نے ایسا ہی کیا ہے۔ یہاں تک کہ آخر نووی پیدا ہوئے اور انہوں نے لوگوں کو اس غفلت سے نکالنا چاہا۔

پس سوائے موضوع حدیثوں کے ضعیف حدیثوں کا بجز احکام کے اور باتوں میں قبول کرلینا تو مسلمات سے ٹھہر چکا اب موضوع حدیثوں پر غور کرنا چاہئے کہ ان کتابوں میں اُن کو کس طرح عالموں نے لکھ دیا اس کی تحقیق ہمارے اگلے محققین نے کی ہے اور اس کے اسباب بیان کئے ہیں۔ چنانچہ مُلّا علی قاری شرح شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں کہ "حدیثوں کے وضع کرنے کا سبب یا بد دینی ہے مثل زندیقوں کے یا غلبۂ جہل ہے مثل بعض ان لوگوں کے جو اپنے آپ کو بڑا عابد زاہد جانتے ہیں۔ کہ اُنہوں نے حدیثیں فضائل میں اور رغبت دلانے کے لئے بنالیں جس طرح نصف شعبان اور لیلۃ الرغائب کی نماز کی فضیلت میں حدیثیں بنالیں اور اپنی نادانی اور جہالت سے اُسے ثواب کا کام جانا۔ اور اپنے تئیں اور دوسروں کو نقصان پہنچایا اپنی ذات کو تو اس طرح نقصان پہنچایا کہ وہ اُسے ثواب جانتے اور اس پر اجر کی اُمید رکھتے۔ دوسروں کو اس طرح ضرر پہنچایا کہ لوگوں نے اس پر اعتماد کیا اور بسبب اُن کے زہد اور نیکی اور پرہیزگاری کے اُن کی اقتدا کی۔ اُن کے قولوں کو نقل کیا۔ ان کی باتوں کو صحیح جانا یہاں تک کہ بعض بڑے بڑے عالموں سے یہ حقیقت پوشیدہ رہی اور بڑے بڑے نامی گرامی علما اس دھوکے میں آگئے اور ان بزرگوں کے اوپر بھروسہ اور اعتماد کرکے اُن موضوع حدیثوں کو نقل کردیا اس لئے وہ بھی اُسی بلا میں مبتلا ہوگئے جس میں اصل واضعین مبتلا تھے اور جامع الاصول میں بیان طبقات مجروحین میں لکھا ہے کہ سب سے بدترین طبقات مجروحین میں وہ طبقہ ہے جس میں وہ لوگ داخل ہیں جنہوں نے رسول خدا صلے اللہ

لہ والحامل للواضع علی الوضع اما عدم الدین کالزنادقۃ او غلبۃ الجھل کبعض المتعبدین المتناسبین الی العبادۃ والزھادۃ وضعوا الاحادیث فی الفضائل والرغائب کصلوٰۃ لیلۃ نصف شعبان ولیلۃ الرغائب ونحوھما وقد یتوھمون بذالک فی زعمھم وجھلھم وھم اعظم الاصناف ضررا علی انفسھم وغیرھم لانھم یرون قربۃ ویرجون علیہ المثوبۃ فلا یمکن ترکھم لذلک والناس یعتمدون علیھم ویرکنون الیھم لما نسبوا الیہ من الزھد والصلاح ویقتدون بافعالھم وینقلون بنقل اقوالھم حتی قد یخفی علی بعض علماء الامۃ واکابرھم ثقۃ واعتماداً علی ما نقلوہ فیقعون فیما وقعوا۔

علیہ وآلہ وسلم کی نسبت جھوٹی حدیث کو منسوب کیا کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ لگاتا ہے چاہیئے کہ وہ ٹھکانا اپنا دوزخ میں ٹھہرا دے اور ایسے جھوٹ کا ارتکاب ایک بڑی جماعت نے کیا ہے جن کی جھوٹی حدیث بنانے سے غرضیں مختلف تھیں۔ بعضوں نے الحاد و زندقہ کے سبب سے اس کا ارتکاب کیا مثل مغیرہ ابن سعید کوفی اور محمدؐ ابن سعید شامی کے اور سوائے اُن کے اوروں نے حدیثوں کو بنایا اور واسطے شک پیدا کرنے کے لوگوں کے دلوں میں اُس کو صحیح حدیث کی طرح بیان کیا جیسا کہ محمدؐ ابن سعید نے انس ابن مالک سے اس حدیث کو روایت کیا انا خاتم النبیین لا نبی بعدی الا ان یشاء اللہ پس اپنے الحاد کے سبب سے اس استثناء کو زیادہ کر دیا۔ اور بعضوں نے بسبب فساد عقیدہ کے حدیثوں کو موافق اپنے عقیدہ کے بنایا کہ لوگ اس طرف مائل ہوں چنانچہ ایسے لوگوں میں سے بعضوں نے توبہ کی اور جھوٹی حدیث بنانے کا اقرار کیا چنانچہ ایک شخص نے خوارج میں سے بعد توبہ کے کہا کہ حدیثیں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دین ہیں پس دیکھو کہ کس سے تم دین لیتے ہو کیونکہ ہم نے جس بات کو چاہا اُس کے لئے ایک حدیث بنالی۔ ابو عینا نے کہا کہ میں نے اور جاحظ نے حدیث فدک کی بنائی اور اس کو بڑے بڑے شیوخ بغداد سے نقل کیا کہ سبھوں نے اُسے مانا سوائے ابن شیبہ علوی کے کہ اس حدیث کا آخر اول سے نہیں ملتا اور اس کے قبول کرنے سے انکار کیا سلیمان ابن حرب لکھتے ہیں کہ میں ایک بزرگ کے پاس گیا اُسے روتا ہوا پایا جب میں نے رونے کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ میں نے چار سو حدیثیں بنا کر لوگوں میں مشہور کر دی ہیں۔ اب میں نہیں سمجھتا کہ کیا علاج کروں اور بعضے ان واضعین سے وہ لوگ ہیں جنھوں نے حدیثوں کو اپنے گمان میں بنظر ثواب کے وضع کیا مثل ابو عصمہ نوح ابن مریم المروزی اور محمد بن عکاشہ کرمانی اور احمد بن عبداللہ جویباری وغیرہ کے چنانچہ ابو عصمہ سے کسی نے پوچھا کہ روایت مالک کی عکرمہ سے کی عباس سے قرآن کی سورتوں کے فضائل میں تم نے کہاں سے پائی۔ اُس نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ لوگ قرآن کو چھوڑ کر ابو حنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کی تاریخ پر متوجہ ہو گئے ہیں اس لئے بنظر ثواب کے میں نے ان حدیثوں کو بنا لیا۔ اور بعض ان واضعین میں سے وہ لوگ ہیں جنھوں نے حدیث کو صرف بنظر تقرب بادشاہوں کے وضع کیا مثل غیاث بن ابراہیم کے کہ وہ خلیفہ مہدی ابن منصور کے پاس گیا۔ اُس خلیفہ کو اڑنے والے کبوتروں سے شوق تھا اس لئے اس نے ایک حدیث بنا دی کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لا سبق الا فی خف او حافر او نصل او جناح خلیفہ نے اُسے دس ہزار درم دیئے۔ جب وہ چلا گیا تو خلیفہ نے اپنے نوکر سے کہا کہ کبوتروں کو ذبح کر دے چنانچہ وہ ذبح کر دیئے گئے لوگوں نے پوچھا

کہ یا امیر المومنین کبوتروں کا کیا گناہ ہے۔ کہا انہیں کے سبب سے اس شخص نے پیغمبرِ خدا کی طرف جھوٹ لگایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ راوی پیغمبرؐ پر جھوٹ لگانے والا تھا۔ کبھی حضرتؐ نے نہیں فرمایا اوجناحؐ اور مامون بن احمد مروزی سے لوگوں نے کہا کہ دیکھو شافعی اور ان کے توابعین کو کہ کس کثرت سے خراسان میں ہیں۔ اس نے فوراً یہ حدیث بنا دی کہ حدثنا احمد بن عبد اللہ قال حدثنا عبد اللہ بن معدان الازدی عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکون فی امتی رجل یقال لہ محمد ابن ادریس اضر علی امتی من ابلیس و یکون فی امتی رجل یقال لہ ابو حنیفہ ھو سراج امتی۔ اور اور بعض وضعین سے وہ لوگ ہیں جو بازاروں اور مسجدوں میں بیٹھ کر حدیثیں بنایا کرتے تھے اور باسناد صحیح جو انہیں یاد تھیں ان موضوعات کو روایات کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جعفر ابن محمد طیالسی نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ ہم نے اور احمد بن حنبلؓ اور یحیی بن معین نے مسجد میں نماز پڑھی کہ ایک قصہ گو کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ حدثنا احمد بن حنبل و یحیی بن معین قال حدثنا عبد الرزاق قال حدثنا معمر عن قتادہ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الہ الا اللہ یخلق اللہ من کل کلمۃ منہا طائراً منقارہ من ذھب و ریشہ من مرجان یعنی جس نے لا الہ الا اللہ کہا پیدا کرتا ہے خدا ہر کلمہ سے اس کے ایک جانور جس کی چونچ سونے کی اور جس کے پر مونگے کے ہوتے ہیں اور اسی طرح پر وہ قصہ گو کہنے لگا اور قریب بیس ورق کے بک گیا۔ یہ سنکر احمد بن حنبلؒ یحیی بن معین کو اور یحیی بن معین احمد بن حنبلؒ کو دیکھنے لگے اور ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ کیا تم نے یہ حدیث روایت کی ہے دونوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہم نے تو اس کو اس وقت سنا ہے پس دونوں چپ ہو رہے۔ جبکہ وہ شخص فارغ ہوا تو یحیی نے پوچھا کہ تجھ سے اس حدیث کو کس نے روایت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ احمد بن حنبلؒ اور یحیی بن معین نے یحیی نے کہا کہ میں یحیی بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبلؒ ہیں۔ ہم نے تو کبھی اس حدیث کو سنا بھی نہیں۔ تب وہ کہنے لگا کہ میں سنتا تھا کہ یحیی بن معین بڑا احمق ہے اور اب مجھے اس کا یقین ہو گیا۔ یحیی نے پوچھا۔ کیوں۔ تب اس نے جواب دیا کہ کیا دنیا میں سوائے تمہارے یحیی بن معین اور احمد بن حنبلؒ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ میں نے تو سترہ احمد بن حنبلؒ سے سوائے اس احمد بن حنبل کے روایت پائی ہے اور یہ کہہ کر اپنے منہ پر آستین رکھ کر ٹھٹھا کرنے والے کی طرح مسجد سے چل دیا۔ انتہی ترجمہ بلفظہ۔

اور منجملہ ان لوگوں کے جو وضع کرنے اور جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں ابن ابی یحییٰ مدینہ میں اور واقدی بغداد میں اور مقاتل بن سلیمان خراسان میں اور محمد بن سعید شام میں تھا۔ حالانکہ

مقاتل بن سلیمان کو لوگوں نے تفسیر کا امام اور باقی لوگوں کو تفسیر میں اُس کا مقتدی جانا ہے اور واقدی سے باوجود اس کے ضعف کے سند لی ہے جیسا کہ مجمع البحار میں لکھا ہے محمد بن الواقدی قاضی العراق اخذ واعنہ العلم علی ضعفہ بل اجمعوا علیہ اخرج لہ ابن ماجہ اور جویباری اور ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی کی روایتیں بھی داخل کتابوں کے ہو گئی ہیں حالانکہ زیادہ دس ہزار حدیث سے انہوں نے وضع کی ہیں اور نعیم بن حماد سے بھی بعض محققین نے روایت[1] کی ہے حالانکہ ابن عدی نے اس کی شان میں کہا ہے کان نعیم یضع الحدیث فی تقویۃ السنۃ کہ وہ سنت کی تقویت میں حدیثیں بنایا کرتا تھا اور منجملہ وضعین کے اسحاق بن بشر ہے جس سے بیہقی اور دارقطنی نے روایت لی ہے حالانکہ ابن جوزی موضوعات میں لکھتے ہیں کہ اسحٰق بن بشر حدیثیں بناتا تھا۔ اور بہت سے ایسے ہی جھوٹی حدیث کے بنانے والے گذرے ہیں جس کی تنقیح محققین نے نہایت تحقیق سے کی ہے۔ میزان الاعتدال ذہبی اور تقریب ابن حجر عسقلانی اور موضوعات ابن جوزی اور اور کتابوں سے جو تحقیق رجال میں ہیں تنقیح اس کی ہوتی ہے۔ غرض کہ جس بات پر اطلاق حدیث کا کیا گیا ہے اسے حدیث نبوی جاننا بڑی ہے بلکہ مذہب میں رخنہ پیدا کرنے اور عقائد حقہ میں شبہ ڈالنے اور غیر مذہب والوں کی زبان طعن کھولنے اور دین اسلام کو مطاعن کے تیروں کا نشانہ بنانے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ میں اس مقام پر دو قول اپنے مذہب کے بڑے اماموں کے نقل کرتا ہوں ۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ بعضوں[2] نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس حدیث کو روایت

[1] ملا علی قاری کتاب رجال میں لکھتے ہیں و ما یقولہ الناس ان من روی لہ الشیخان فقد جاز القنطرۃ ھذا ایضا من التجاھل فقد روی مسلم فی کتابہ عن اللیث عن ابی مسلم وغیرہ من الضعفا فیقولون انما روی عنھم فی کتابہ للاعتبار والشواھد التابعات وھذا لا یقوی لان الحفاظ قالوا الاعتبار امور یتعرفون بھا حال الحدیث وکتاب مسلم التزم فیہ الصحۃ فکیف یتعرف حال الحدیث الذی فیہ بطرق ضعیفۃ الی قولہ وروی مسلم ایضا حدیث الاسراء فیہ وذالک قبل ان یوحی الیہ وقد تکلم الحفاظ فی ھذہ القصۃ وبینوا ضعفہ الی قولہ وقد قال الحافظ ان مسلما لما وضع کتابہ الصحیح عرضہا علی ابی زرعۃ فانکر علیہ وتغیظ وقال سمیتہ الصحیح وجعلتہ سلما لاھل البدع وغیرھم انتھی والاصل انہ صحیح عن ظن مصنفۃ وغلبۃ ظنہ وامام السھو والنسیان فمن لوازم طبع الانسان وقد ابی اللہ الا ان الصحیح کتابہ بقولہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۔

[2] واعلم ان بعض الحشویۃ روی عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم انہ قال (حاشیہ بر صفحہ ۲)

کیا کہ حضرت ابراہیم نہیں جھوٹ بولے مگر تین مرتبہ تو میں نے جواب دیا کہ ایسی حدیثوں کو نہ ماننا چاہیے تو کہنے والے نے براہ انکار کہا کہ اگر ہم نہ مانیں تو راویوں کی تکذیب لازم آتی ہے اس پر میں نے جواب دیا کہ اگر ہم مانیں تو حضرت ابراہیم کی تکذیب کرنی پڑتی ہے حالانکہ حضرت ابراہیم کو کذب کی نسبت سے بچانا بہتر ہے چند نامعتبر آدمیوں کی طرف جھوٹ کے منسوب ہونے سے ۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ[1] سے ابو مطیع بلخی نے پوچھا کہ آپ کیا فرماتے ہیں اس حدیث کی نسبت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵) ماکذب ابراھیم الا ثلث کذبات فقلت لا ولی ان لا یقبل مثل ھذہ الاخبار فقال علی طریق الاستنکار ان لم نقبله لزمنا تکذیب الرواۃ فقلت له یا مسکین ان قبلناہ لزمنا الحکم بتکذیب ابراھیم علیه السلام وان رددناہ لزمنا الحکم بتکذیب الرواۃ ولا شك ان صون ابراھیم عن الکذب اولی من صون طائفة من المجاھل عن الکذب ۔

[1] کتاب العالم والمتعلم میں لکھا ہے کہ قال ای ابو مطیع البلخی ما قولك فی اناس رووا ان المؤمن اذا زنی خلع الایمان من راسه کما یخلع القمیص ثم اذا تاب اعید الله ایمانه اتشك فی قولهم او تصدقهم فان صدقت قولهم دخلت فی قول الخوارج وان شککت فی قولهما شککت فی قول الخوارج ورجعت عن العدل الذی وصفت وان کذبت قولهم الذی قالوا کذبت قول النبی علیه السلام فانهم رووا عن رجال عن شئی حتی ینتهی به الی رسول الله علیه السلام ۔ قال الامام ای ابوحنیفة الکذب ھؤلاء ویکون تکذیبی لھؤلاء وردی علیھم تکذیبا للنبی علیه السلام وانما یکون التکذیب لقول النبی علیه السلام ان یقول الرجل انا مکذب للنبی علیه السلام واما اذا قال انا مومن بکل شئی تکلم به النبی علیه السلام غیر ان النبی صلی الله علیه وسلم لم یتکلم بالجور ولم یخالف القرآن فھذا من التصدیق بالنبی وبالقرآن وتنزیه له من الخلاف علی القرآن ولو خالف النبی علیه السلام والقرآن تقول علی الله لم یدعه تبارك وتعالی حتی یاخذہ بالیمین و یقطع منه الوتین کما قال الله تعالی فی القرآن ونبی الله لا یخالف کتاب الله ومخالف کتاب الله لا یکون نبی الله وھذا الذی رووہ خلاف القرآن الا تری الی قوله تعالی الزانیة والزانی ثم قال واللذان یاتیانھا منکم ولم یعن به من الیھود ولا من النصاری ولکن عنی به المسلمین فرد علی کل رجل یحدث عن النبی علیه السلام بخلاف القرآن لیس ردا علی النبی ولا تکذیبا له ولکن ردا علی من یحدث علی النبی علیه السلام بالباطل والتھمة دخلت علیه لا علی نبی الله وکل شئی تکلم به النبی علیه السلام سمعناہ او لم نسمعه علی الراس والعین قد امنا به نشھد انه کما قال النبی علیه السلام (حاشیہ بر صفحہ ۱۴۷)

جو لوگوں نے روایت کی ہے کہ جب مومن زنا کرتا ہے تو ایمان اُس کے سر سے ایسا نکل جاتا ہے جیسا کہ قمیص بدن سے ۔ آیا اس حدیث کے راویوں کی تصدیق کرتے ہیں یا شک یا تکذیب فرماتے ہیں۔ اگر تصدیق کرتے ہیں تو آپ کا اعتقاد خوارج کے سا ہوا جاتا ہے اور اگر آپ شک کرتے ہیں تو خوارج کے قول میں شک رہتا ہے اور اگر آپ تکذیب کرتے ہیں تو ان بہت سے آدمیوں کی تکذیب لازم آتی ہے جنہوں نے بسند اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے ۔ تو امام نے جواب دیا کہ میں ان سب راویوں کی تکذیب کرتا ہوں اور میرا جھٹلانا ان لوگوں کو اور رد کرنا ان کے قولوں کا کچھ تکذیب پیغمبر خدا علیہ التحیتہ والثنا کی نہیں ہے اس لئے کہ تکذیب قول پیغمبر کی یہ ہے کہ کوئی شخص کہے کہ میں پیغمبر خدا کے قول کو نہیں مانتا لیکن جب کہ وہ یہ کہے کہ میں ہر بات پر جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے ایمان رکھتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ کوئی بات پیغمبر خدا نے خلاف قرآن شریف کے نہیں فرمائی تو یہ حقیقت میں تصدیق پیغمبر کی اور تصدیق قرآن کی ہے اور اس سے تنزیہ اور پاکی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت قرآن سے ثابت ہوتی ہے اور اگر پیغمبر خدا خلاف قرآن کے کچھ کہتے تو خدا اُن کو کب چھوڑتا اور کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا کا نبی ایسی بات کہے جو مخالف خدا کی کتاب کے ہو اور جو مخالف خدا کی کتاب کا ہو وہ کیونکر خدا کا نبی ہو سکتا ہے پس حدیث خلع ایمان کی زنا سے جو لوگوں نے روایت کی ہے خلاف ہے قرآن کے پس ایسے آدمیوں کے قول کو رد کرنا جو پیغمبر خدا کی طرف ایسی بات منسوب کرے۔ جو مخالف ہو قرآن کے پیغمبر کی بات کا رد کرنا نہیں ہے اور نہ ان کی تکذیب ہے بلکہ حقیقت میں وہ رد ہے اس کے قول کا جو کچھ پیغمبر خدا کی طرف سے ایک باطل بات کو نقل کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت لگاتا ہے اور ہم ہر بات کو پیغمبر خدا کی خواہ ہم نے سُنی ہو یا نہ سُنی ہو بسر و چشم قبول کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ وہ بات ایسی ہی ہوگی جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو لیکن اسی طرح پر ہم یہ شہادت دیتے ہیں کہ کوئی بات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خلاف قرآن کے نہیں فرمائی نہ کسی ایسی چیز کا حکم دیا جسے خدا نے منع کر دیا ہو نہ کسی ایسی چیز کو جدا کیا جس کے ملانے کا اللہ نے حکم کیا ہو اور نہ کسی چیز کی ایسی صفت بیان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۶) ونشهد ايضا على النبي عليه السلام انه لم يأمر بشئ نهى الله عنه ولم يصل
امر الله تعالى ولم يقطع شيئا وصله تعالى ولا وصف امر وصف الله تعالى ذالك الامر بخلاف
ما وصفه النبي عليه السلام ونشهد انه كان موافق الله عز وجل في جميع الامور
لم يبدع ولم يقول غير ما قال الله تعالى ولا كان من المتكلفين ولذالك قال الله تعالى
من يطيع الرسول فقد اطاع الله ٥

کی جو مخالف بیان خدا کے ہو اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ سلم کا ہر قول موافق تھا خدائے عزوجل کے اور اسی لئے خدا نے فرمایا ہے کہ جس نے اطاعت کی رسول کی اُس نے اطاعت کی خدا کی ٭

پس اب ہم مسلمانوں کو ان دونوں قولوں پر ذرا غور کرنا اور انصاف سے دیکھنا چاہئے کہ ان اماموں نے ان حدیثوں کو جن کا سلسلۂ سند آنحضرت تک پہنچتا ہے صرف اصول صحیحۂ عقلی پر ترک کرنے سے غلط ٹھہرایا اور راویوں کی روایتوں کو غلط کہہ کر اصول دین کو بچایا ورنہ ایک حدیث سے ایک پیغمبر کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری حدیث سے پیغمبر کا قول مخالف قرآن کے ہونا لازم آتا ہے پس کیا حال بیان کیا جاوے ان غلط قولوں کا جسے جاہلوں نے اپنی جہالت سے یا متعصبین نے اپنے تعصب سے یا ملحدوں نے اپنی لامذہبی کے سبب سے یا نادان دینداروں نے اپنی نادانی کی وجہ سے یا بے سمجھ واعظین نے لوگوں کے ڈرانے اور خوش کرنے کے لئے آنحضرت سے منسوب کیا اور ان اباطیل کو احادیث نبوی ٹھہرایا اور پھر کیا بیان کی جاوے تقلید کی وہ مصیبت جس نے اُن قولوں سے کتابوں کو بھر دیا اور ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے نقل کر کے ان کو تواتر کے درجہ پر پہنچا دیا ٭

الحاصل یہ خیال کرنا جس کتاب میں قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لکھا ہو اُسے سچی حدیث رسول خدا کی سمجھ لینا اور اس پر دین کی عمارت کھڑی کرنا نادانی ہے کیونکہ دین ایک بڑا نازک معاملہ ہے اور کسی قول کو بلا تحقیق یقین کر لینا کہ ہمارے پیغمبر صلعم صاحب کا قول ہے نہایت خطرہ کی بات ہے اس واسطے کہ پیغمبر صلعم کا قول ایک عام آدمی کا قول نہیں ہے جس کا ماننا نہ ماننا کچھ نقصان کا سبب نہ ہو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا قول ہمارے دین و مذہب کی بنیاد ہے اُس کو بعد صحت کے نہ ماننا یا اس پر یقین نہ کرنا یا اس کے مطابق عمل نہ کرنا ہمارے دین کی بربادی کا سبب ہے پس اُس شخص کا قول جو ہماری ہدایت کا ذریعہ ہو جس کے اوپر ہمارے اعتقاد اور اعمال کی بنیاد ہو ایسا ہے کہ ہم کو نہایت غور اور فکر سے اس کی تحقیق کرنا اور نہایت محنت اور دقت سے اس کی صحت ثابت کرنا واجب ہے پس جبکہ ہم کو اس کی صحت ثابت ہو جاوے اس وقت ہم کو اس پر یقین کرنا اور اس کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھنا ضرور ہے۔ پھر اگر ساری خدائی اُس قول کے مخالف ہو ہم کو کچھ اعتنا نہ چاہئے پس ہمارا عقیدہ تو اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی نسبت یہ ہے مگر جو لوگ اُسے سعدیؒ و نظامیؒ کا قول سمجھتے ہوں یا زید و عمرو کی باتوں کی طرح اُسے آسان جانتے ہوں وہ مختار ہیں کہ ہر بات کو حدیث سمجھیں یا ہر شخص کے قول کو قول رسول کا جانیں ٭

باقی رہا یہ امر کہ اب تحقیق اور تنقیح احادیث کی کیونکر کی جاوے اُس کی نسبت کچھ بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارے اگلے محققین یہ کام کر گئے ہیں اور احادیث کے ضعف اور صحت کی تنقیح کر چکے ہیں اور کتاب الرجال میں راویوں کے حالات لکھ گئے ہیں ہمارے واسطے اب کوئی زیادہ دقت نہیں ہے بجز اس کے کہ ہم اُن کی تحقیقاتوں کو دیکھیں اور اُن محققین اور محدثین کی ان تحقیقاتوں سے فائدہ اٹھاویں جو انہوں نے تنقیح احادیث میں کی ہیں پس جو حدیث ایسی ہو کہ جس کا تواتر یا شہرت یا صحت درجہ یقین پر پہنچے اُسے مثل آیات قرآن کے واجب الیقین اور واجب العمل جانیں جیسے موضوع اور غلط اور غیر صحیح پاویں اُس کی طرف حدیث کے لفظ کی نسبت کرنے سے بھی تامل کریں۔

غرض کہ اب انصاف پسند مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ غور کریں کہ ہم مسلمانوں کا کمال اسلام یہ ہے کہ جو بات جس تفسیر میں بنام حدیث لکھی ہو اُسے بلا تامل بلا تردد حدیث سمجھیں یا کمال اسلام یہ ہے کہ اُس کی صحت کی تحقیق کریں اُس کے ماخذ و مبدا پر غور کریں جب امام الحرمین اور امام حجۃ الاسلام سے مولفین اور ہدایہ سے معتبر کتاب کے تالیف کرنے والوں کو احادیث غیر صحیح میں دھوکا ہو گیا ہے تو پھر کس کی کتاب پر بلا تحقیق اعتبار کیا جاوے پس اگر ہم کافر یا مرتد ہیں تو صرف اس گناہ میں کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر کا قول اوروں کی باتوں سے جدا ہو جاوے اور ہمارے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی جھوٹی بات کو منسوب نہ کرے اور وہ اعتراضات اور مطاعن جو دین اسلام پر وضعی اور غیر صحیح حدیثوں کے سبب سے ہوتے ہیں مرتفع ہو جاویں اور وہ باتیں جن سے مخالفت اقوال رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی حقائق محققہ سے سمجھی جاتی ہے باطل ٹھہریں اور مذہب اسلام کو ایک مجموعہ ایمان اور نیکی اور سچائی اور عقل اور حقیقت کا جانیں سوائے اس کے نہ کچھ دوسری خواہش ہے نہ اور کوئی تمنا ہے۔ یہی ہماری خطا ہے اور یہی ہمارا گناہ ہے۔ مصرعہ

نیست یاراں را بطریقت غیر ازیں تقصیر ما

ذکر اقوال صحابہ کبار و تابعین کا جو تفسیر میں ہیں

اقوال صحابہ کبار کے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جیسے انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا پس وہ تو حدیث میں داخل ہیں۔ دوسرے وہ جو کچھ انہوں نے اپنی رائے اور اپنی سمجھ سے کہا پس یہ عقیدہ محققین کا ہے کہ روایت ان کی معصوم ہے رائے ان کی معصوم نہیں۔ مگر قطع نظر اس کے ان اقوال کا ثبوت بھی بسند صحیح چاہیے حالانکہ بعد تحقیقات کے بہت ہی کم ثابت

ہوگا کہ جو اقوال ان بزرگوں سے منسوب ہیں وہ سب کے سب صحیح ہوں چنانچہ صرف حضرت عبداللہ ابن عباس سے ہزارہا روایت تفسیروں میں بھری ہوئی ہیں اور اکثر ان میں سے جھوٹی اور وضعی ہیں اور حضرت عبداللہ ابن عباس پر تہمت ہے جیسا کہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں اور خود حضرت عبداللہ ابن عباس نے صرف چار حدیثیں آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنی ہیں مگر ہمارے علما نے ان کی روایت کو اور احادیث کی نسبت بھی قبول کیا ہے لیکن وہ اقوال جو حضرت عبداللہ ابن عباس سے تفسیروں میں منقول ہیں خواہ وہ ان کی روایت ہو یا درایت اس کی نسبت تحقیق کرنا کہ اس کا ثبوت ہوتا ہے یا نہیں ضرور ہے باقی رہے اقوال تابعین کے اگر ان کی صحت بھی ثابت ہو جاوے تو کانو رجالاً و نحن رجال والامر بیننا وبینہم عیال ؂

ذکر قصص اور اخبار کا جو تفسیروں میں ہیں

خدا ان قصوں اور کہانیوں کو کسی مسلمان کو نہ دکھلاوے نہ سناوے جو لوگوں نے تفسیروں میں بھر دیئے ہیں اکثر جھوٹے اور بے بنیاد ہیں اور یہودیوں سے سُنے سُنائے ہوئے ہیں احادیث صحیحہ سے قصص اور اخبار کا ہونا بہت ہی کم پایا جاتا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثوں میں اخبار امم سابقہ کو بہت ہی تھوڑا بیان کیا ہے ہمارے پچھلے عالموں نے اکثر قصے یہودیوں سے سُنکر اپنی کتابوں میں نقل کر دیئے اور جنہوں نے اپنی تالیف کو زیادہ طول دینا چاہا انہوں نے اور اس میں دخل در معقولات فرمایا۔ ہمارے نزدیک اکثر قصے اور اخبار امیر حمزہ کی سی داستان ہے۔ نہ اعتبار کے لائق نہ اعتماد کے قابل من شاء فلیقبل و من شاء فلیکفر ؂

؂ جو قصص اور اخبار اور غیب کی باتیں مفسرین نے لکھی ہیں ان کا لینا اہل کتاب سے یہ تحقیق ہمارے محققین کے ثابت ہے اور صرف پچھلے علما کی نسبت ابو الامداد ابراہیم حاشیہ نخبۃ الفکر میں جس کا نام قصا المراد ہے لکھتے ہیں کہ عبداللہ ابن سلام اور عبداللہ عمرو بن عاص نے اہل کتاب سے نقلیں کی ہیں ! ور جب شام کا ملک فتح ہوا تب ایک بار شتر کتابوں کا اہل کتاب سے عبداللہ عمرو بن عاص نے پایا اور اس کو روایت کیا اسی واسطے ان کی حدیثیں کم ہیں گر وہ باتیں جو کثرت سے ان سے منقول ہیں وہ صرف اخبار اور قصے بنی اسرائیل کے اور روایات اہل کتاب کی ہیں کہ اس میں ان کی حدیثیں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالے عنہ سے بھی زیادہ ہیں۔ وھذہ عبارتہ۔ ومثال الصحابی الذین لم یاخذ عن الاسرائیلیات ابوبکر و عمر و عثمان و علی ومثال من اخذ عنہا عبد اللہ بن سلام و قیل عبد اللہ عمر و من عاص فانہ لما فتح الشام اخذ حمل من کتب اھل الکتاب (حاشیہ بر صفحہ ۱۵۱)

ذکر واقعات آیندہ کا جو تفسیروں میں ہیں

واقعات زمانہ آیندہ کے جو کچھ بیان کئے گئے ہیں اُن کی نسبت تحقیق کرنا چاہئے کہ اس کا سلسلۂ روایت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے یا نہیں اور اس میں بھی وہ روایت بدرجۂ شہرت یا صحت پہنچی ہے یا نہیں اور اس میں محدثین نے وہ تساہل جو ایسی حدیثوں میں جائز سمجھا گیا ہے کیا ہے یا نہیں۔ اگر بعد تحقیقات کے اُس کی صحت ثابت ہو (حالانکہ یہ بہت کم ہوگا) تو اُسے ماننا چاہئے ورنہ اس کو ایک دل خوش کن کہانی سمجھنا چاہئے اور اس بات پر نازاں نہ ہونا چاہئے کہ بڑے بڑے بزرگوں نے ان واقعات کو بیان کیا ہے اور اچھے اچھے عالموں نے اُسے قبول کیا ہے کیونکہ بعض بلکہ اکثر باتیں ایسی ہیں کہ جن سے کذب کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوتی ہے۔ ونعوذ باللہ من ذالک ۔

میں ایک حدیث کو بیان کرتا ہوں[۱] جو کہ اگلے زمانہ میں بہت مشہور تھی اور لوگوں کی زبان پر تھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۰) وکان یحدث منها فلذا اتقاه الناس فقل حدیثه وان کان اکثر حدیثا من ابی هریرة یا عکرافه والمراد بها قصص بنی اسرائیل وما جاء فی کتبهم۔ اور ملا علی قاری شرح شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں۔ ای الحدیث الذی یقوله الصحابی الذی عرف النظر فی الاسرائیلیات کعبد الله بن سلام وکعبد الله عمرو بن عاص فانه کان حصل له من وقعة الیرموک کتب کثیرة من اهل الکتاب وکان یخبر بما فیها من الامور الغیبیة حتی کان بعض اصحابه ربما قال حدثنا عن النبی صلی الله علیه وسلم ولا تحدثنا من الصحیفة ۔ اور علامہ سیوطی عبد اللہ عمرو بن عاص کی تفسیر کی نسبت لکھتے ہیں ۔ وما اشبهها ان تکون مما یحمله عن اهل الکتاب ۔ اور دوسرے طبقہ کے بڑے مفسر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کی نسبت میزان الاعتدال ذہبی میں لکھا ہے کہ قال ابو بکر بن العیاش قلت للاعمش ما بال تفسیر مجاهد قال اخذها من اهل الکتاب ۔ اور تیسرے طبقہ کے بڑے مفسر مقاتل بن سلیمان ہیں جو امام المفسرین کہلائے جاتے ہیں۔ ان کی نسبت میزان الاعتدال ذہبی میں لکھا ہے کہ قال ابن حبان کان یاخذ عن الیهود والنصاری من علم القرآن ما یوافق کتبهم وکان یکذب بالحدیث وقال البخاری قال سفیان بن عیینة سمعت مقاتلا یقول ان لم یخرج الدجال فی سنة خمسین ومائة فاعلموا انی کذاب ۔

[۱] شیخ جلال الدین سیوطی کتاب کتاب الکشف عن مجاوزة هذه الامة الالف میں فرماتے ہیں۔ وبعد فقد کثر السوال عن الحدیث المشهور علی منة الناس ان النبی صلی الله علیه وسلم لا یمکث فی قبره الف سنة وانا اجیب بانه باطل لا اصل له ثم جاء فی (حاشیہ بر صفحہ ۱۵۲)

کہ پیغمبرؐ خدا ہزار برس سے زیادہ قبر میں نہ رہینگے گویا ہزار برس کے اندر قیامت آجائیگی اس حدیث کو ان لوگوں نے جو آٹھ سو برس تک ہوئے مانا اور دسویں صدی میں منتظر قیامت کے رہے مگر بعد جبکہ دسویں صدی ہوئی اور کچھ بھی آثار قیامت کے نظر نہ آئے تو اُس سے سبھوں نے انکار کیا اور اس کو غلط جانا پس اگر وہ لوگ زندہ رہتے جو اُس حدیث کی صحت کے معتقد تھے۔ تو دسویں صدی میں اُن کو اسلام چھوڑنا پڑتا کیونکہ وہ تکذیب رسولؐ کی کرتے اور اگر وہ بزرگ پہلے ہی سے اس حدیث کی تحقیقات کرتے اور راستے یے اصل سمجھ کر اس پر اعتقاد نہ رکھتے تو دس صدی کیا اگر لاکھ صدیاں گذر جاتیں تب بھی ان کے اعتقاد اور

(بقیہ حاشیہ ۱۵۱) رجل فی شهر ربیع من سنة ۸۹۸ معه ورقة بخط ذكر انه نقلها من فتیا افتی لهم بعض اکابر العلماء ممن ادركته فیها انه اخبر مقتضی هذا الحدیث وانه يقع فی المائة العاشرة خروج المهدی والدجال ونزول عیسیٰ وسائر الاشراط والنفخ فی الصور ومضی الاربعون سنة التی بین النفختین ونفخ نفخة البعث قبل تمام الالف فاستبعت حدوث هذا الكلام من هذا العالم المشار الیه وكرهت ان اصرح برده تادبًا منه فغفلت هذا الشیٔ لا امر قد حاولنی السائل تحریر المقال فی ذالك فلما ابلغ مقصوده الی ان قال فاجبت الی ماسالوا وشرعت لهم منهلًا فان شاؤا عاجلوا وان شاؤا امهلوا وسمیتہ الكشف عن مجاوزة الامة الالف فاقول اولا الذی دلت علیه الاثار ان هذه الامة تزید علی الف سنة ولا یبلغ الزیادة علیها خمسمائة سنة الی اخر ما قال فی تلك الرسالة رایت فی اخر بعض النسخ ما صورته وحكی بعض اهل التاریخ ان تاریخ الدنیا من لدن آدم علیه السلام حین هبط من الجنة الی طوفان نوح علیه السلام الفی عام ومأتی عام ومن طوفان نوح الی زمن ابراهیم علیه السلام الف عام ومائتہ عام ومن زمن ابراهیم الی زمن موسی علیه السلام الف عام ومن زمن موسیٰ علیه علیه السلام الی زمن عیسیٰ علیه السلام الف عام ومن زمن عیسی علیه السلام الی زمن نبینا محمد صلی الله علیه وسلم خمسمائة عام ومن الهجرة الی الان تسعمائة عام واربعة و عشرون سنة مجموع ذالك سنة الاف وسبعمائة سنة واربعة وعشرون سنة وعلی هذا یقال الباقی لقیام الساعة من یومنا هذا وهو سنة اربعة وعشرین وتسعمائة مائتا سنة وستة وسبعون سنة بدلیل قوله صلعم عمر الدنیا سبعة ایام من ایام الاخرة وبعث فی اخر یوم السادس وقال الله تعالی وان یوما عند ربك كالف سنة مما تعدون ۞

یقین میں کچھ شبہ نہ ہوتا شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ میں یعنی ۹۲۲ھ ہجری میں اُس حدیث کو غلط بتایا کیونکہ وہ دسویں میں تھے۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے بھی ایک دوسری حدیث سے کہ عمر الدنیا سبعۃ ایام ومن ایام الآخرۃ و بعثت فی اخر الیوم السادس اپنی کتاب میں لکھ دیا کہ اب عمر دنیا ۲۷۶ باقی ہے اب ہم اپنے پاک اور نیک سچے مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ ۲۷۶ برس بھی گذر گئے اور عمر دنیا کی ابھی تمام نہ ہوئی تو اب مسلمان کیا کریں نبیؐ کی سچائی میں شبہ کر کے اسلام کو چھوڑ بیٹھیں یا اُس حدیث کی صحت میں شبہ کریں۔ ہمارے نزدیک ہمارے مسلمانوں کو پہلی بات تو منظور ہوگی مگر دوسری بات پسند نہ کرینگے کیونکہ اُس تحقیقات کی غلطی ثابت ہوتی ہے جو بڑے نامی مشہور مفسرین نے کی ہے اور علامی سیوطی سے محقق محدث مفسر نے لکھی ہے پس کیا ہمارے بھائی مسلمان ملحد اور مرتد ہیں جو ایسے محدثین کی باتوں کو غلط جانیں اور اُن کے قول سے انکار کریں ۔

غرض کہ یہ افسانہ درد کہاں تک بیان کیا جاوے اور کتابوں کی کثرت اور اقوال غیر معتمد کے بھرنے سے جو کچھ خرابیاں ہوئی ہیں اُس کا کیا بیان کیا جائے۔ بڑے مرد اور کامل کا کام ہے کہ وہ اب صحیح کو غلط سے تمیز کرے اور بے اصل باتوں کو دینی کتابوں سے خارج کرے ورنہ ایسی ایسی روائتوں اور کہانیوں سے دین اسلام کی صحت سے اعتقاد آج نہیں کل کل نہیں پرسوں اٹھ جاویگا ۔

ذکر استنباط مسائل اصولی و فروعی کا جو تفسیروں میں ہیں

جو مسائل اصولی و فروعی صاف صاف قرآن مجید میں مذکور ہیں اس سے قطع نظر کر کے جو کچھ استنباط ان آیات کے اشارات و کنایات سے کیا ہے اس میں اختلاف کا ہونا بھی دلیل اس پر ہے کہ وہ سب منقول صاحب الشریعت سے بلکہ سلف صالح سے نہیں ہیں اور اس لئے جہاں تک موافق قواعد عربیہ کے استنباط اس کا ہے وہ واجب القبول ہے اور جو بعض فقہا نے بعض مسائل کے اثبات میں ایسی آیتوں سے استدلال کیا ہے جن کو حقیقت میں اُن آیتوں سے کچھ تعلق نہیں ہے وہ واجب القبول نہیں ۔

بعض متکلمین نے بھی دائرہ احتیاط سے پاؤں باہر نکالا ہے اور انہوں نے فریق مخالف کے الزام اور اپنے عقاید کے اثبات کے واسطے آیتوں کی ایسی ایسی تفسیریں کی ہیں کہ جس سے کچھ تعلق اس عقیدہ کو نہیں ہے اور اس کا ثبوت ان کتابوں کے دیکھنے سے ہوتا ہے جو معتزلی اور دیگر فرق مبتدعہ کے عقائد کی تردید میں تالیف ہوئی ہیں ۔

بعض متصوفین نے بھی اپنے عقاید کے اثبات میں تفسیر میں بہت بے احتیاطی کی ہے - بلکہ نوبت بہ تحریف پہنچا دی ہے کہ اپنے فاسد عقیدوں کے مطابق ایسے معانی قرآن کے بیان کئے ہیں - کہ جن کا کچھ تعلق الفاظ سے نہیں ہے اور بلا رعایت اصولی شرح کے اور بلا لحاظ قواعد عربیہ کے نئے معنی پیدا کئے ہیں جیسے کہ تفسیر محمود ابن حمزہ کرمانی کی ہے جس کا نام عجائب غرائب ہے اس میں ایسے عجیب اقوال لکھے ہیں کہ سننے والے کو تعجب آتا ہے اور بسبب غرابت کے عوام کو اچھے معلوم ہوتے ہیں - مگر حقیقت میں وہ اقوال ایسے ہیں کہ ان پر اعتقاد کرنا کیسا نقل بھی اُن کلمات کی جائز نہیں ۔

باطنیہ فرقہ نے بھی اپنے عقیدوں کے اثبات میں ایسی تفسیریں کی ہیں کہ انہوں نے دین ہی کو بدل ڈالا اور تمام ظواہر آیات کو پھیر کر اور ہی کچھ معنی بنائے مگر جو لوگ محققین ہیں اور اہل باطن انہوں نے نصوص کو اُن کے ظاہر معانی پر رکھا - مگر اس کے اصلی مطالب اور حقایق و دقایق کو ظاہر کیا کہ یہ امر عین ایمان اور کمال عرفان ہے - کیونکہ خود حدیث میں آیا ہے لکل آیۃ ظھر و بطن ۔

غرض کہ ہر فریق نے موافق اپنے اپنے عقیدہ اور خواہش کے تفسیر کی اور اس سے استنباط مسائل اصولی و فروعی کا کیا لیکن حقیقت میں اصل تفسیر وہ ہے جو مخالف قواعد عربی اور اعجاز قرآن کے نہ ہو اور جس سے نصوص واقعہ کی تحریف لازم نہ آئے اور نظم قرآنی اپنی فصاحت و بلاغت پر باقی رہے ۔

غرض کہ جو مسائل اصولی و فروعی آیات قرآنی سے استنباط کئے گئے ہیں اس کی صحت پر صرف تفسیروں میں لکھا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُس استنباط کو دیکھنا اور آیات قرآنی سے اس استخراج کو جانچنا محقق کا کام ہے کیونکہ جو تفسیریں لوگوں نے بعد طبقہ تبع تابعین کے کی ہیں[1] ان کا یہ حال ہے

---

[1] ثم صنف بعد ذلک قوم برعوا فی شیٔ من العلوم ومنهم من ملأ کتابه بما غلب علی طبعه من الفن واقتصر فیه علی ما تمهر هو فیه کان القرآن انزل لاجل هذا العلم لا غیر مع ان فیه تبیان کل شیٔ فالنحوی تراه لیس له هم الا الاعراب وتکثیر الاوجه المحتملة فیه وان کانت بعیدة وینقل قواعد النحو ومسائله وفروعه وخلافیاته کالزجاج والواحدی فی البسیط وابی حیان فی البحر والنهر والاخباری لیس له شغل الا القصص واستیفاؤها والاخبار عمن سلف سواء کانت صحیحة او باطلة ومنهم الثعلبی والفقیه یکاد یورد فیه الفقه جمیعا وربما استطرد الی اقامة ادلة الفروع الفقهیة التی لا تعلق لها بالآیة اصلا والجواب عن الادلة للمخالفین کالقرطبی (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۵۵)

کہ جو مفسر جس علم اور جس فن کا شائق ہوا اُس نے اُسی علم اور اسی فن کو اپنی تفسیر میں بھر دیا اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ اُس کے نزدیک گویا خدا کو قرآن کے نازل کرنے سے انہیں علموں کا بیان کرنا مقصود تھا اور اپنے کلام کو خدا نے اسی لئے نازل کیا تھا۔ مثلاً جو لوگ بڑے نحوی تھے انہوں نے اپنی تفسیروں میں اعراب اور قواعد کو بھر دیا اور سارے مسئلے نحو کے قرآن سے نکال لے اور تفسیر کو انہوں نے کافیہ کی شرح بنا دیا۔ جو لوگ تاریخ میں خوب ماہر تھے انہوں نے اپنی تفسیروں کو قصوں سے بھر دیا اور اگلی پچھلی خبریں جھوٹی سچی تفسیروں میں بھر دیں اور انہوں نے تفسیر کو الف لیلہ بنا دیا جیسا کہ ثعلبی نے کیا (جسے لوگ بڑا مفسر جانتے ہیں) جو لوگ فقہ کو خوب جانتے تھے انہوں نے تفسیر سے سوائے فقہ اور مسائل فروعی کے دوسری غرض ہی نہیں جانی اور ان مسائل کا استنباط آیات سے کیا جو کسی طرح ان لفظوں سے نہیں نکلتی مثل علامہ قرطبی کے جو لوگ علم کلام کے شائق تھے اور عقلی مسائل سے اپنے عقیدوں کو ملاتے تھے انہوں نے تو تفسیر کو فلاسفہ یونان کے قولوں کا مجموعہ کر دیا اور ان مباحث کو ایسا طول دیا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی ہے جیسے کہ تفسیر امام فخر الدین رازی کی ہے۔ جس کی نسبت ابوحیان وغیر محققین نے کہا کہ فیہ کل شیٔ الا التفسیر کہ اس میں سوائے تفسیر کے سب کچھ ہے ٭

پس اب ہم نہایت ادب سے اپنے پاک نیک بھائیوں سے عرض کرتے ہیں کہ جب کتب تفاسیر کی نسبت ہمارے محققین یہ فرما گئے ہوں اور اس کی ایسی حقیقت لکھ گئے ہوں تو اگر ہم ان کتابوں پر اجمالی ایمان نہ رکھیں اور سب کو مثل قرآن کے واجب الیقین نہ جانیں بلکہ ان مختلف کتابوں و غیر محدود روایتوں اور بیشمار قولوں اور لاانتہا قصوں کی تحقیق پر مستعد ہوں اور اس کی اصلیت دریافت کرنے پر توجہ کریں تو یہ ہمارے ایمان کی نشانی ہے یا الحاد و زندقہ کی۔ اگر یہی الحاد اور زندقہ ہے تو وہ ہزار اسلام سے بہتر ہے ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ٭

ذکر تشریح حقائق موجودات کا مطابق علوم عقلی کے جو تفسیروں میں ہے،

یہ بات ظاہر ہے کہ قرون ثلاثہ میں علوم عقلی کا کچھ چرچہ نہ تھا اور حکمت اور فلسفہ یونان سے کوئی واقف نہ تھا مگر بعد اس کے وہ زمانہ آیا جس میں مسائل فلسفہ کا جاری ہونا شروع ہوا آخر اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۴) وصاحب العلوم العقلیة خصوصاً الامام فخر الدین الرازی قد ملأ تفسیره باقوال الحکماء والفلاسفة وخرج من شیء الی شیء حتی یقضی الناظر العجب قال ابوحیان فی البحر جمع الامام الرازی فی تفسیره اشیاء کثیرة طویلة لا حاجة بها فی علم التفسیر ولذلک قال بعض العلماء فیه کل شیء الا التفسیر ٭

یہانتک ترقی ہوئی کہ وہ مسائل دین میں داخل ہو گئے اور مذہبی کتابوں میں ان پر بحثیں ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ ان سے تفسیریں بھر دی گئیں اور جس طرح تفسیر میں اقوال پیغمبرؐ اور صحابہ کے نقل کئے جاتے تھے اسی طرح افلاطون اور ارسطو وغیرہ حکمائے یونان کے قول نقل ہونے لگے اور جب یہ سلسلہ جاری ہوا تو پھر ایک مفسر نے دوسرے مفسر سے اور دوسرے نے تیسرے سے اس کا نقل کرنا یا انتخاب کرنا شروع کیا اور ان قولوں کے قائلین کا نام بھی لکھنا چھوڑ دیا یہانتک کہ آخر وہ اقوال تفسیروں میں ایسے مل گئے کہ لوگوں کو تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ قول ارسطو کا ہے یا صاحب شریعت کا یا کسی صحابی کا یا کسی امام کا اور اسی واسطے ان اقوال پر دین کا مدار ٹھہر گیا اور ان سے انکار کرنا بھی انکار آیات کے برابر سمجھا گیا چنانچہ ہم نے مختصر آ وجود آسمان کی بحث میں اسے بیان کیا ہے کہ اب لوگوں کے نزدیک اس امر سے انکار کرنا کہ آسمان مثل گنبد کے وجود مجسم محیط ارض ہے اور ستارے اس میں جڑے ہوئے ہیں کفر ہے حالانکہ سبب اس کا یہ ہے کہ تفسیروں میں بہت سے یونانیوں کے مسائل مفسرین نے بھر دیئے ہیں اُسے لوگ دیکھتے سنتے رہے ہیں اور اسی واسطے وہ ان اقوال کو بھی دینی مسائل جانتے ہیں گو وہ کیسے ہی غلط اور لوچ اور بے اصل ہوں ۔

ان معمولی مسائل کے تفسیروں میں داخل کر دینے سے ایک بڑا نقص یہ ہوا کہ وہ باتیں جن کی واقع میں کچھ حقیقت نہ تھی اور جن کی اب غلطی کھل گئی لیکن اب ان سے انکار کرنا اور ان مسائل ہی کو غلط کہنا تنفر اور الحاد سمجھا جاتا ہے بہت ہی کم لوگ ایسے ہونگے جو یہ سمجھیں کہ ان مسائل کا تفسیروں میں داخل کرنا ہی بیجا تھا اور اب اس سے انکار کرنا اور جو حقایق موجودات اب ثابت ہوئے ہیں اور ہوتی جاتی ہیں اس کا ماننا کچھ قادح اسلام نہیں ۔

بہت سی باتیں بہ نسبت اخبار اور واقعات اور کیفیت موجودات کے تفسیر کبیر وغیرہ میں ایسی بھری ہوئی ہیں کہ جن کے دیکھنے سے ہنسی آتی ہے اور جن کے ذکر کرنے سے کسی پڑھے لکھے ہوئے تربیت یافتہ آدمی کے سامنے شرم معلوم ہوتی ہے اور گو وہ باتیں ہی ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائیں نہ کسی صحابی و تابعین نے نہ ان کی کچھ صحت ہے مگر اب اس سے بھی انکار کرنا اور اس کو غلط سمجھنا الحاد کی نشانی سمجھی جاتی ہے پس سوائے اُن پاک مسلمانوں کے جو خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے اور جو سوائے اپنے پیروں کے مکتوبات و ملفوظات کے کچھ نہیں دیکھتے اور جو کچھ کسی شخص نے عربی زبان میں عربی خط سے لکھ دیا ہو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو بڑی بڑی موٹی موٹی کتابوں سے روایتوں اور حکایتوں کے نقل کرنے ہی کو اس کی صحت کی سند جانتے ہیں اور حقایق موجودات سے سوائے اس کے کہ کوہ قاف زمرد کا ہے اس کی چوٹی پر ستون آسمان کے رکھے ہوئے ہیں اور زمین گائے کے سینگ پر ہے اور گائے مچھلی کے پیٹ پر کھڑی ہے کچھ نہیں سمجھتے اور اسی کو خدا کی

قدرت سمجھ کر وجد و حال میں مصروف رہتے ہیں وہ شخص جواب معقولات سے کسی قدر واقف ہو اور تحقیقات جدیدہ سے جس سے موجودات کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے آگاہ ہو کیونکہ اپنے عقیدہ میں ان روائیتوں اور حکایتوں کو اصل دین سمجھے گا اور کس طرح اُس کا دل ان قولوں کی صحت پر یقین کریگا اور وہ اپنے ایمان اور اسلام کی تقریب میں کس لئے کفر کے فتووں سے ڈریگا ۔

ضرورت نئی تحقیقات کی بلکہ نئی تفسیر لکھنے کی

ہمارے نزدیک اس زمانہ میں ایک بڑی ضرورت نئی تفسیر لکھنے کی ہے جو حشو و زوائد سے خالی ہو اور جو غلط روائتوں سے اور جھوٹی حکایتوں سے پاک ہو اور جس میں کچھ یونانی باتوں کا ذکر نہ ہو اور جس میں حقائق موجودات کی تشریح کماہی ہی ہو جس میں وہ احادیث صحاح جن کی صحت بلکہ جن کی شہرت درجۂ یقین پر پہنچی ہو اپنے اپنے موقع پر مذکور رہوں اور جس میں وہ اقوال صحابہ کبار کے جس سے مسائل اصولی و فروعی کا انہوں نے استنباط کیا ہو منقول ہوں اور جس میں ان شبہات کا جو اہل عقل اس زمانہ کے کرتے ہیں ایسا جواب ہو کہ مخالف قواعد عربی اور مغائر شریعت محمدی کے نہ ہو اور جس میں ان اخبار کی صداقت ظاہر کی جائے جو الفاظ قرآن سے ثابت ہیں اور جس کی تصدیق میں بعض منکرین بسبب مخالفت تاریخ و تحقیقات زمانہ حال کے شبہہ کرتے ہیں اور جس میں ان اقوال اور روایات کی تکذیب بہ سند صحیح بیان کی جائے جو غفلت سے یا سہو سے یا تساہل سے تفسیروں میں دخل ہو گئے ہیں اور جس سے گو اگلے زمانہ میں کچھ نقصان نہ تھا مگر اب وہی روائتیں اور وہی اقوال مادہ الزام کا قرآن اور صاحب الوحی پر ٹھہرائے گئے ہیں تاکہ اب جو زمانہ آیا ہے اور جو لوگ علوم عقلی کی تعلیم پاتے جاتے ہیں وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں اور اُن کا دل کسی طرح پر کسی ایک نقطہ سے بھی قرآن کے نہ پھرے اور وہ اپنے دین کو نہایت سچا اور خدا کا دیا ہوا جانیں اور نہ صرف ہماری ہی اولاد اُس سے فائدہ پاوے بلکہ ساری دنیا کے دانشمند اور حکیم اور عاقل اور محقق اُس کی تصدیق کریں اور خدا کے اقوال کو مطابق اُس کے فعل کے جان کر لقد صدق اللہ و رسولہ صدق دل سے کہنے لگیں اگرچہ اس خواہش کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے مگر سب مسلمانوں پر اس طرف توجہ کرنا فرض کفایہ ہے اور گو کچھ امید نہیں لیکن خدا سے امید ہے کہ ضرور ایسا کریگا اور ہم مسلمانوں کو ایسی توفیق دیگا ۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۔

اجماع

منجملہ اُن مذہبی الفاظ اور فقہی مصطلحات کے جن کی حقیقت نہ جاننے سے لوگوں کے خیالات غلط ہوئے اور ہوتے ہیں اور جن پر استدلال کرنے سے بے اصل باتیں صحیح مسائل کی صورت پر ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں لفظ اجماع ہے علما نے کتاب و سنت کی طرح اسے ایک شرعی حجت مانا ہے۔ فقہا نے اس کے منکر کو کافر سمجھا ہے پابندی ہر رسم و عادت کی جو مسلمانوں میں جاری ہے اسی پر استدلال کرنے سے ایمان کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ اُن کے حسن و قبح سے بحث کرنے والے پر خرق اجماع کا الزام لگا کر تکفیر کی نسبت ہوتی ہے اس لئے ان کی حقیقت کا بیان کرنا اور اُن نتائج سے جو اُس پر مترتب کئے جاتے ہیں کچھ بحث کرنا مناسب ہے۔

یہ بات مسلمات سے ہے کہ ایمان نام ہے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا ان سب باتوں میں جو وہ خدا کی طرف سے لائے پس حاضرین کے واسطے خود اُن کا زبان مبارک سے سُننا حجت تھا اور اس کی تصدیق کے لئے دوسرے ذریعہ کی ان کو حاجت نہ تھی لیکن ہم لوگوں کے لئے ان باتوں کی تصحیح ان کی تصدیق پر مقدم ہے اس لئے کسی ذریعہ کی ضرورت ہے وہ ذریعہ کیا ہے نقل اور روایت لیکن چونکہ اس میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے اس لئے کذب کے احتمال دُور کرنے کے لئے کوئی قطعی دلیل چاہیے۔ وہ کیا ہے تواتر و اجماع۔ پس اگر کسی خبر کی نسبت مخبر صادق کے وقت سے لے کر آلے یومنا ہذا سب کا اتفاق ہو اور اس کی صحت پر سب کا اجماع تو وہ خبر ہمارے حق میں بھی روایت کے برابر ہے اور ایسی متواتر اور مجمع علیہ خبر حقیقت میں فی نفسہ شرعی حجت ہے لیکن اگر کسی خبر کی نسبت یہ درجہ ثابت نہ ہو یعنی مخبر صادق کے وقت سے اس کا تواتر اور اس کی صحت پر اجماع نہ ہو عام اس کے کہ وہ خبر پھر کسی اور زمانہ میں شہرت اور تواتر کے درجہ پر پہنچ جاوے یا آیندہ زمانوں میں بھی وہ اس مرتبہ پر نہ پہنچے تو وہ خبر اپنی اصلی حالت پر رہیگی یعنی محتمل الصدق والکذب۔ پس پہلے زمانہ سے لے کر ہمارے وقت تک جتنے واسطے اس کی نقل کے ہوئے ہوں ان کی صداقت اور اعتبار ثابت ہو اور وہ شمار میں بھی لائق لحاظ ہوں تو اُس کا جانب صدق غالب ہو گا۔ اور اگر ان میں سے کسی کی صداقت بخوبی ثابت نہ ہو یا اُن کا تسلسل اور اتصال معلوم نہ ہو یا اس کے بیان کرنے والے ابتدا میں ایک دو سے زیادہ نہ ہوں تو اُس کی دونوں جانب صدق و کذب کی برابر ہونگی اور ایک کے رجحان کو دوسرے پر کسی اور دلیل کی حاجت ہوگی اور اگر اس کے بیان کرنے والوں کی بے اعتباری پائی جاوے

تو اس کا جانب کذب راجح ہوگا بلکہ اگر اُن کا کذب بمرتبۂ یقین ثابت ہو تو اس میں احتمال صدق کا باقی نہ رہے گا۔

پس منجملہ اخبار مخبر صادق کے وہ خبر جس کا تواتر اُس کے وقت سے لیکر اب تک ثابت ہے اور جس کی صحت پر اجماع ہے قرآن مجید ہے اور جو اس مرتبہ پر نہیں ہے وہ حدیث ہے پھر بعض اس میں یعنی حدیثیں میں سے وہ ہیں جن کا جانب صدق غالب ہے اور بعض وہ ہیں جن کے دونوں پلے برابر ہیں اور بعض وہ ہیں جن کا جانب کذب غالب ہے اور بعض وہ ہیں جو بڑے غلط اور بالکل جھوٹے ہیں۔ غرضکہ یہ دونوں چیزیں ہم پر حجت ہیں پہلی چیز یعنی کتاب قطعی حجت ہے کیونکہ اس کی صحت قطعاً ثابت ہے اور دوسری چیز یعنی سنّت ظنی حجت ہے کیونکہ اس کی صحت ظنی ہے اور باعتبار اپنے مرتبۂ صحت کے وہ ہم پر حجت ہے۔ رہا اجماع پس اگر اس سے مراد ہے اجماع سب کا اوپر صحت اُس خبر کے تو آمنّا وصدّقنا کہ ایسا اجماع حجت شرعی ہے لیکن لا فی ذاتہ بل بغیرہ۔ کیونکہ صحت میں وہ اجماع ایک قائل شہادت اور قطعی دلیل اس خبر کی صحت کی ہے اور وہ خبر فی نفسہٖ ہم پر حجت ہے اور اسی اجماع کا منکر بھی یقینی کافر ہے کیونکہ وہ منکر اس خبر کا ہے جس کی صحت ثابت ہو چکی اور جس کا انکار فی ذاتہٖ کفر ہے پس اگر کوئی کسی آیت قرآن مجید کا منکر ہو تو وہ ویسا ہی کافر ہے جیسا کہ صاحب الوحی کی زبان سے سنکر اس کا منکر ہوتا کیونکہ تواتر اور اجماع نے اُس کی صحت کو ایسے یقین کے درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ احتمال غلطی کا باقی نہیں رکھا۔ لیکن اگر اس سے مراد ہے اتفاق کر لینا لوگوں کا اوپر کسی معنی و مقصد کے جو مخبر صادق کے لفظوں سے صراحتاً ثابت نہ ہو یا اوپر حقیقت کسی چیز کے جس کا بیان بہ تصریح خود مخبر صادق نے نہ کیا ہو یا اوپر تفصیل کسی اجمال کے جسے اُس نے مجمل ہی رہنے دیا ہو یا اوپر تصریح کسی شئے کے جس میں اُس نے اشارہ استعارہ پر ہی کفایت کی ہو یا اوپر ان باتوں کے جو شارع کی باتوں کی علت دریافت کر کے قیاساً اُس پر نکالی گئی ہوں جبکہ اُس علت کو خود شارع نے بیان نہ کیا ہو یا اوپر کسی ایسے مذہبی اعتقاد یا قول یا فعل کے جو اُس کے اخبار متواترہ سے ثابت نہ ہو یا اس کے منصوصات کے مخالف اور اس کے اصلی اصول کے معارض ہو تو ایسا اتفاق کچھ قطعی حجت نہیں اور نہ ایسے اجماع کا منکر کافر ہے اور نہ اُن باتوں کا جو ایسے اتفاق پر مبنی ہوں نہ ماننا یا ان سے مخالفت کرنا تکذیب رسول ہے کیونکہ یہ اجماع ایک قیاس یا قول یا فعل ایسی جماعت کا ہے جس میں سے نہ کوئی مخبر صادق ہے نہ جس میں سے کسی کی رائے معصوم ہے نہ جس میں سے کوئی صاحب الوحی والکتاب ہے۔ نہ ان کی تصدیق و تکذیب پر ایمان و کفر کا مدار ہے پس جبکہ بانفرادہ کوئی ایک ان میں سے ایسا نہیں ہے جس کی رائے یا قول یا فعل ہم پر حجت ہو تو مجموعہ ان کی رائے یا قول یا فعل

کی حجت ہونے کی وجہ ہے۔ ہاں ان کی بات کو ایک ایسی وقعت ہے کہ اس کی صحت کا پلہ بہ نسبت اُس کی غلطی کے غالب سمجھا جاوے گا اور جب تک کہ اُس کی غلطی ثابت نہ ہو تب تک وہ ماننے کے لائق ہوگی مگر احتمال غلطی کا موجود رہے گا۔ اور ممکن ہے کہ کبھی اس کی غلطی ثابت ہو جاوے اور کسی زمانہ میں اُس کی غلطی پر دوسرا اتفاق ہو جاوے اور یہ بھی اُس حالت میں ہے جبکہ اتفاق سب لوگوں کا ہوا اور کوئی اُس رائے یا قول یا فعل سے کسی زمانہ میں منکر نہ ہوا ہو یا کم سے کم جو لوگ صلاحیت رائے دینے کی رکھتے ہوں انہوں نے مخالفت نہ کی ہو لیکن اگر کسی جماعت یا کسی گروہ میں کوئی بات بغیر بحث و مباحثہ کے جاری ہوگئی ہو یا کسی عارضی وجہ سے مثل خوف یا شرم یا لحاظ یا جہالت کے لوگوں نے مان لیا ہو اور امتداد زمانہ نے اسے قوی کر دیا ہو یا اس کی صحت میں اہل رائے نے اختلاف کیا ہو اور بعض مجتہدین نے اُسے صحیح نہ جانا ہو گو کسی خارجی سبب سے اس انکار کو شہرت یا قوت نہ ہوئی ہو تو ایسے اتفاق کو وہ وقعت بھی نہیں ہے بلکہ اس پر اتفاق یا اجماع کا اطلاق کرنا ہی غلطی[1] ہے

[1] میں اپنے علما کے اقوال بھی بہ نسبت اس مسئلہ کے بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ ان کی رائے بھی لوگوں کو معلوم ہو جاوے امام غزالیؒ نے کتاب المستصفیٰ میں لکھا ہے وشرطہ (ای الاجماع) ان یجتمع اهل الحل والعقد علی صعید واحد فیتفقون علی امر واحد اتفاقاً بلفظ صریح ثم یستمرون علیہ مدۃ عند قوم والی انقراض العصر عند قوم اور مسلم میں لکھا ہے کہ قیل اجماع الاکثر مع ندرۃ المخالف اجماع والمختار انہ لیس باجماع لانتفاء الکل فقیل لیس بحجۃ اصلاً وقیل ھو حجۃ ظنیۃ اور مرقات الاصول میں لکھا ہے کہ الاجماع اما بالتواتر والشہرۃ والاحاد واقوی التواتر اجماع الصحابۃ اذا انقرضوا حتی اذا لم ینقرضوا لم یکن الاجماع اتفاقیاً کما ھو فھو کالآیۃ القطعیۃ الدلالۃ والخبر المتواتر فیکفر جاحدہ وان لم یکن سکوتیاً لم یکن متفقاً علیہ ایضا فلا یکفر لمخالفتہ ثم اجماع من بعدھم بالشرط السابق فیما لم یرو فیہ خلاف فھو کالمشہور من الخبر یضلل جاحدہ ولا یکفر اجماعاً ثم الاجماع المختلف فیہ فھو کالصحیح من اخبار الاحاد لا یضلل جاحدہ ایضاً کما لا یکفر اور امام حجۃ الاسلام نے منخول میں لکھا ہے انہ قد یثبت الخلاف فی کون الاجماع حجۃ ولا یکفر منکرہ فمنکر المجمع علیہ اذا لم یکن من حشو وربات الدین لم یکفر اور امام الحرمین ابو المعالی نے فرمایا ہے کیف نکفر من خالف الاجماع ونحن لا نکفر من رد اصل الاجماع وانما نبدعہ ونضللہ و المعتمد عند الشافعیۃ عدم اطلاق تکفیر المجمع علیہ۔ اور امام نووی نے روضہ میں لکھا ہے کہ لیس تکفیر جاحد المجمع علیہ علی اطلاقہ بل من جحد مجمعاً علیہ فیہ نص فھو من الامور الظاہرۃ التی یشترک فی معرفتھا الخواص والعوام کالصلوٰۃ (حاشیہ بر صفحہ ۱۶۱)

پس یہ مختصر حقیقت اجماع اور انکار اجماع کے کفر ہونے کی ہے اس پر غور کرنے کے بعد اب ہم کو کوئی بتائے کہ جو عوام و خواص ہر جزیۂ فقیہ اور ہر مسئلہ کلامیہ کی نسبت اجماع کا لفظ زبان پر لاتے ہیں اور اس کے انکار کو بوجہ انکار اجماع کے کفر بتاتے ہیں وہ کس قدر صحیح ہے اور کس قدر غلط سوائے قرآن مجید کی نصوص صریحہ کے اور عقاید و مسائل جو استخراج و استنباط کئے گئے ہیں اور جو کتابوں میں بڑی شدومد سے لکھے گئے ہیں ان میں سے کتنے عقیدوں اور کتنے مسئلوں پر اجماع کا اطلاق ہو سکتا ہے اور کتنے پر نہیں - اگر اجماع کا نام ہی چند کتابوں میں لکھا ہوتا - اور اس کو ایک مخصوص طائفہ یکساں اور تعصب سے تلقی بالقبول کرتا تو بلاشبہ وہ اجماع اجماع ہے مگر اُسے ہم لایعبأبہ کہتے ہیں اور خود ہمارے ہی علما کے بیان سے اس پر اجماع کا اطلاق نہیں ہو سکتا نہ کہ معاذ اللہ اس کے انکار پر اطلاق کفر کا ہو پھر اکثر مسائل اعتقادی یا عملی ایسے ہیں - جن کی بنا حقیقت میں ایک خبر احاد پر اور بعض حالات میں ایک خبر ضعیف پر یا فقط قیاس اور رائے پر ہے مگر تقلید کی برکت سے اُسے عوام و خواص میں ایسی شہرت ہوگئی ہے کہ وہ خبر متواتر اور نص قطعی سمجھی جاتی ہے - وحد المتواتر ما لا یمکن الشك فیه كالعلم بوجود الانبیاء ووجود البلاد المشهورة وغیرها وانه متواتر فی الاعصار كلها عصراً بعد عصر الی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۰) وتحریم الخمر ونحوها كافر ومن جحد مجمعا علیه لا یعرفه الا الخواص كاستحقاق بنت الابن السدس مع بنت الصلب ونحوه فلیس بكافر اور ابن دقیق العید نے شرح عمدہ میں لکھا ہے اطلق بعضهم ان مخالف الاجماع یكفر والحق ان المسائل الاجماعیة تارة یصحبها التواتر عن صاحب الشرع كوجوب الخمس وقد لا یصحبها فالاول یكفر جاحده لمخالفة التواتر لا لمخالفة الاجماع اور تلویح میں لکھا ہے وان انكار الحكم الشرعی المجمع علیه فان كان اجماعاً ظنیاً فلا یكفر جاحده اتفاقاً وان كان قطعیاً فقیل یكفر وقیل لا یكفر والحق ان نحو العبادات الخمس مما علم بالضرورة كونه من الدین یكفر جاحده اتفاقاً وانما الخلاف فی غیره وان سب عمدہ وہ ہے جو در مختار کے حاشیہ شامی میں لکھا ہے اذا لم تكن الآیة او الخبر المتواتر قطعی الدلالة او لم یكن الخبر متواتراً او كان قطعیاً لكن فیه شبهة او لم یكن الاجماع اجماع الجمیع او كان ولم یكن اجماع الصحابة او كان ولم یكن اجماع جمیع الصحابة او كان اجماع جمیع الصحابة ولم یكن قطعیاً فان لم یثبت بطریق التواتر او كان قطعیاً لكن كان اجماعاً سكوتیاً ففی كل هذه الصور لا یكون الجحد كفراً - یعنی اگر آیت یا خبر متواتر قطعی الدلالت نہ ہو یا خبر ہی متواتر نہ ہو یا متواتر تو ہو مگر قطعی ہو اور اس میں شبہ ہو یا اجماع سب کا اجماع نہ ہو یا سب کا اجماع ہو مگر صحابہ کا اجماع نہ ہو یا وہ بھی مگر سب صحابہ کا اتفاق نہ ہو یا سب صحابہ کا اتفاق بھی ہو مگر قطعی ہو یعنی بطریق تواتر ثابت نہ ہو یا قطعی بھی ہو مگر اجماع سکوتی ہو - پس ان سب حالتوں میں انکار اجماع کا کفر نہیں ہے +

زمان النبوۃ ولم ینقص عن التواتر فی عصر من الاعصار فالقول با لتواتر فی غیر القران من اغمض الاشیاء ✦

پس ہمارا اپنے مسائل اعتقادی وعملی کی نسبت جس کا ثبوت بہ نص صریح قرآن مجید یا بحدیث متواتر نہ ہوا اجماع کا دعوے کرنا ہی غلط ہے اور اسی غلطی کی وجہ سے بہت دھوکے ہوئے اور اکثر مغالطہ میں پڑ گئے ہر گروہ نے اپنے اپنے خیالات کے موافق ایک مذہب کھڑا کر لیا ہر طائفہ نے اپنی رسمیات اور عادات کو اجماع کی دلیل سے فرائض وواجبات سمجھ لیا اور اپنے چال چلن کو ایک مبدل شریعت بنا لیا یہاں تک کہ جب اُن بڑی بڑی عالی شان عمارتوں کی جن کے کنگرے آسمان سے ملے ہوئے ہیں بنیاد دیکھی جاتی ہے تو ایک ریت کے ذرہ کے سوائے کچھ نظر ہی نہیں آتا اور کوئی بنیادی پتھر دکھلائی نہیں دیتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف لوگوں کے ہاتھوں پر رکھی ہوئی ہے نہ فی نفسہ اس کی اصل مضبوط ہے نہ درحقیقت اس کی بنا مستحکم ہے اگر لوگ اپنے ہاتھ اٹھا لیں اور بنیاد کے سہارے پر اُسے چھوڑ دیں تو نہ اُس کی خوبصورت دیواروں کا نشان ملے نہ اس کی خوش نما محرابیں نظر آویں نہ اُس کی ملمع کاری کی چھت باقی رہے بلکہ وکنت الارض دکا کی کیفیت ہو جاوے۔ اور تبدل الارض غیر الارض کی صورت نظر آوے یہ حقیقت ہے اجماع کی جو میرے نزدیک از روے اصول شریعت کے ثابت ہے فمن اعتقد غیر ذالک فلیجد وعقیدتہ وایذب عن تعصبہ ثم من ادعے بطلان ہذا البیان فعلیہ ان یظہر فی میدان البرہان اما بتقریر اللسان واما بتحریر البیان والحق یعلو علی البطلان ✦

دوسرا حصّہ

پہلا ریویو

مقدمۂ تاریخ ابن خلدون پر

ابن خلدون ایک نامور مؤرخ مسلمانوں میں گذرا ہے۔ اس کی تاریخ مشہور ترین کتابوں سے ہے۔ بالفعل یہ کتاب عربی زبان اور عربی خط میں نہایت عمدہ اور خوشخط دار السلطنت فرانس میں

چھاپی گئی ہے۔ اس نامور مورخ نے ایک نہایت عمدہ مقدمہ اپنی کتاب کا لکھا ہے جس میں علم تاریخ کی فضیلت بیان کی ہے اور تاریخی واقعات کی تنقیح کے اصول لکھے ہیں اور قوموں کی ترقی و تنزل کے اسباب اور اقالیم سبعہ کے حالات اور اہل عرب کی حکومت کے نتائج اچھی طرح بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کو دکھایا جائے کہ ان کی قوم میں کیسے دل و دماغ کے آدمی گذرے ہیں اور کیا کیا وہ لکھ گئے ہیں تاکہ ان کو عبرت ہو اور حیرت۔ عبرت تو اس خیال سے کہ ہمارے بزرگ کیسے تھے اور ہم کیسے ہیں اور حیرت اس نظر سے کہ جن باتوں کو اس زمانہ میں کفر و الحاد سمجھتے ہیں۔ صدہا برس ہم سے پہلے بڑے بڑے محقق مسلمان کہہ گئے ہیں ❖

اگرچہ اس میں شبہ نہیں ہے کہ متقدمین اہل اسلام نے تنقیح روایات و تصحیح منقولات میں بہت توجہ کی اور اس کے لئے نہایت عمدہ اصول اور قاعدے قرار دیئے۔ اور اس پر عمل کیا۔ لیکن اکثر لحاظ اس کا دینیات اور احکام شرعی میں کیا گیا۔ اور گو کہ سوائے چند نامی محققوں کے اور عالموں نے دینیات میں بھی ان اصول کی پوری پوری رعایت نہ رکھی اور آخر دینی روایتیں بھی ایسی مختلط اور مشتبہ ہو گئیں کہ جن کی تنقیح نہایت مشکل ہے۔ مگر سوائے دینیات کے اور واقعات تاریخی میں تو کچھ بھی رعایت ان اصول کی نہ کی گئی اس لئے پچھلے زمانوں۔ اور پچھلی قوموں اور غیر ملکوں کے حالات جو مسلمانوں نے اپنی کتاب میں لکھے۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو تاریخی واقعات کہا جاوے۔ یا قصہ اور کہانی سے زیادہ کچھ بھی ان کا اعتبار کیا جاوے ایک عام عادت ہمارے مورخوں کی ہے۔ کہ پچھلے زمانہ کی ابتدا جنات سے کرتے ہیں۔ اور ان کے واقعات کے بیان کرنے میں صفحے کے صفحے رنگتے چلے جاتے ہیں۔ جن کے دیکھنے اور پڑھنے سے افسوس آتا ہے۔ کہ کیوں مسلمان مورخوں نے ایسی لغو اور پوچ باتوں کا لکھنا جائز سمجھا۔ اور یہ بھی ایک عادت ان کی ہے۔ کہ انبیا اور اولیا کی عظمت و شان ظاہر کرنے کے لئے محال اور غیر ممکن باتوں کو اس خوبی سے لکھتے ہیں کہ گویا فی الواقع وہ واقع ہوئی ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسی باتوں سے دین اسلام پر سخت الزام آتا ہے اور مسلمانی مذہب بدنام ہوا اور ہوتا ہے غرضکہ عموماً مسلمانوں میں جو فن تاریخ کا ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ اسے فن تاریخ کہا جاوے اور جو واقعات ان میں مذکور ہیں اکثر اس قابل نہیں۔ کہ ان پر تاریخی واقعات کا اطلاق کیا جاوے۔ اور اسی سبب سے کہ یہ فن ایسی ذلیل اور ابتر حالت پر ہمارے یہاں پہنچ گیا ہے۔ کوئی اس طرف توجہ نہیں کرتا اور اسے عمل نہیں سمجھتا چنانچہ منجملہ ان سببوں کے جو مسلمانوں کے تنزلات کے باعث ہوئے فن تاریخ سے ناواقفیت بھی ایک بڑا سبب ہے ❖

میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کے مفید مضامین منتخب کر کے تہذیب الاخلاق میں چھپواؤں۔ چنانچہ بالفعل تاریخ کی حقیقت اور اخبار کی تنقیح کے اصول جو اس کتاب میں بہ تفصیل بیان کئے گئے ہیں منتخب کر کے لکھتا ہوں ٭

اس نامور عالم نے اول فن تاریخ کی فضیلت اور فوائد کو بیان کیا ہے پھر اُن سببوں کو لکھا ہے جو اس فن کو واہی اور غلط اور غیر مفید کر دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "فن تاریخ بظاہر تو نہایت آسان ہے اور اس کا سمجھنا ہر خاص و عام اور عالم و جاہل کو یکساں۔ کیونکہ پچھلے زمانہ کی باتیں اور گذشتہ واقعات کی خبریں اس سے معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس کے لئے نہایت غور اور فکر درکار ہے تاکہ ان واقعات کے اسباب دریافت ہوں۔ مثلاً فلاں واقعہ کیوں ہوا اور اس کے شروع ہونے کے اسباب کیونکر ظاہر اور پیدا ہوئے اور انجام اس کا کیا ہوا اور کیوں پس درحقیقت فن تاریخ کو ایک عمدہ فن فنون حکمت سے سمجھنا چاہئے" ٭

"اگرچہ بڑے لائق مسلمان مورخوں نے تاریخ اور اخبار کو اچھی طرح جمع کیا۔ مگر بعض اُن کے جو مورخ ہوئے انہوں نے تاریخ کو لغو اور باطل اور وہمیات سے خلط ملط کر دیا۔ اور بہت سی باتیں بیہودہ اُس میں ملا دیں اور اکثر ضعیف اور بنائی ہوئی روائتیں داخل کر دیں۔ اور بہت لوگوں نے جو بعد اُن کے ہوئے۔ انہیں نادانوں کی پیروی کی۔ اور انہیں پوچ پوچ روایتوں اور واہی تباہی کہانیوں کو جیسا سنا تھا ہم تک پہنچا دیا۔ نہ واقعات کے اسباب پر غور کیا۔ نہ ان حالات کی تصدیق اور تنقیح پر توجہ کی۔ نہ بیہودہ باتوں کو سچے واقعات سے جدا کیا اور نہ لغو روایتوں سے تاریخ کو پاک۔ اس لئے تاریخ ایسا فن رہ گیا جس میں تحقیق کم ہے اور تنقیح تھوڑی۔ اور غلطیاں اور اوہام بہت اور گو کہ تقلید انسان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے اور ایک دوسرے کی پیروی کا عادی ہو رہا ہے اور جہالت آدمیوں کو گھیرے ہوئے ہے مگر حق ہمیشہ حق ہے جس پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا اور باطل ہمیشہ باطل ہے کہ ذرا سی غور و فکر سے اس کا بطلان ظاہر ہو سکتا ہے اور ناقل فی نفسہ ناقل ہے جو بلا تمیز صحت و غلطی کے نقل کر سکتا ہے۔ اور غور و تامل اور سمجھ بوجھ وہ چیز ہے جو صحت غلطی کو اور خطا و ثواب کو جدا کر سکتی ہے۔ اور علم وہ شئے ہے جس سے ہر بات کی اصلیت اور ہر چیز کی حقیقت کھل جاتی ہے" ٭

اس کے بعد ایک جداگانہ فصل میں ایک محقق نے اُن باتوں کا بیان کیا ہے جو مورخ کے لئے صحیح تاریخ لکھنے کے واسطے ضروری ہیں۔ اور ان غلطیوں اور اوہام کا بطور مثال کے تذکرہ کیا ہے جن کو بڑے بڑے مورخین اور مفسرین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ اور پھر اُن سببوں کی تشریح کی ہے۔ جو باعث ایسی غلطیوں اور اوہام کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جو

شخص دینی و دنیاوی باتوں کی تحقیق چاہتا ہو اُسے فن تاریخ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ لیکن اس فن میں چند باتوں کا لحاظ رکھنا واجبات سے ہے اوّل ماخذ کا دریافت کرنا۔ دوسرے اس پر غور و تامل کرنا۔ اور اس کی تصدیق و تنقیح میں ثابت قدم رہنا کہ یہی دو باتیں حق پر پہنچاتی اور لغزشوں اور غلطیوں سے انسان کو بچاتی ہیں اگر ایسا نہ کیا جائے اور فقط نقل و روایت پر اعتبار کر لیا جائے اور عادت اور سیاست اور دنیا کی طبیعت (نیچر) اور انسان کی سوسائٹی کے مستحکم اصول پیش نظر نہ رکھے جاویں اور غایب کو حاضر پر۔ اور گذشتہ کو حال پر قیاس نہ کیا جاوے تو کچھ شک نہیں ہے کہ انسان لغزش سے کبھی نہ بچے گا! اور قدم اُس کا راہ راست سے ضرور ڈگ جائیگا۔ اور اکثر مورخین اور مفسرین اور ائمہ نقل سے واقعات روایات کے بیان کرتے میں بھی غلطی ہوئی کہ انہوں نے محض نقل پر بھروسہ کر لیا۔ اور اس کے عیب و صواب پر نظر نہ کی۔ نہ ان کو اصول اور قواعد سے جانچا۔ نہ اور نظایر و شواہد پر قیاس کیا نہ حکمت و عمل کی کسوٹی پر کسا۔ نہ خود موجودات کے طبایع (نیچر) سے واقف ہوئے۔ نہ غور و تامل اور سمجھ بوجھ کو ان باتوں کی تحقیق میں دخل دیا۔ اس لئے وہ حق سے بہک گئے۔ اور وہم اور غلطی کے جنگل میں جا پڑے خصوصاً اعداد کے بیان اور مال اور لشکر کی شمار میں تو انہوں نے ایسا مبالغہ کیا ہے کہ بادی النظر میں جھوٹ اور غلط معلوم ہوتا ہے پھر لکھ کر محقق موصوف نے چند مثالیں اس قسم کے مبالغہ کی لکھی ہیں۔ اور محض نیچر اور عقل کی مخالفت سے ان کو باطل ٹھہرایا ہے ٭

اسی تذکرہ میں ایک مقام پر اس محقق نے توریت کی تحریف لفظی کا ذکر کر کے مثل اور محققین کے اُس سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے "وانما ادس وفی التوراۃ انو الیھود نس بل لوقا علی ماھو معروف فالقول یھتی الاالخبیل مرجوح عند المحققین ولیس علی ظاھرہ لان العادۃ مانعۃ من اعتماد اھل الادیان ذالک فی صحفھم الا لھیتہ ذکرہ البخاری فی صحیحھم"٭

منجملہ ان واہی تباہی خبروں کے جن کو محقق موصوف نے بطور مثال کے لکھا ہے۔ ایک وہ خبر ہے جو یہ نسبت تبابعہ بادشاہان یمن اور جزیرہ عرب کے مورخین تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ یمن سے براہ مغرب افریقہ اور بربر تک اور مشرق کی طرف سے ترک اور تبت کے شہروں پر حملہ کرتے تھے۔ اور افریقس بن قیس ان کا بڑا اور پہلا بادشاہ تھا جس نے حضرت موسے علیہ السلام

۱؎ یہ بھی کاتب کی غلطی معلوم ہوتا ہے ٭

کے زمانہ میں یا کچھ دنوں اُن سے پہلے افریقہ پر حملہ کیا۔ اور اسی طرح چند اور بادشاہوں کا احوال اور اُن کی چڑھائیوں اور حملوں اور لڑائیوں کے حالات مسعودی وغیرہ نے لکھے ہیں۔ ان سب کی نسبت اس محقق نے بڑی ہنسی اُڑائی ہے اور ان لکھنے والوں کو بڑا احمق بنایا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ " یہ سب خبریں قصہ گویوں کی بنائی ہوئی کہانیوں کی طرح ہیں۔ اور صحت اور سچائی سے بہت دُور ہیں مثلاً جو ذکر بادشاہان تبابعہ کے حملوں کا اور ان کی چڑھائیوں کی راہوں کا بیان کیا گیا ہے۔ وہ محض غلط ہے اس لئے کہ وہ لوگ عرب کے جزیرہ میں رہتے تھے اور دار القرار ان کا صنعا یمن تھا۔ اور عرب کے جزیرہ کے تین طرف سمندر ہے جنوب کی طرف بحر ہند اور مشرق سے بصرہ تک دیکھ سکتا ہے پس جو کوئی یمن سے مغرب کو جائیگا وہ سوائے سوئیس کے کوئی دوسری راہ نہیں پا سکتا۔ اور فاصلہ بحر سوئیس اور بحر شام کا دو روزہ راہ سے زیادہ نہیں ہے پس عادتاً غیر ممکن ہے کہ اس راہ سے کوئی بادشاہ اتنا بڑا لشکر لے کر نکلے اور سوئیس پر جو مصر کے علاقہ میں ہے قابض نہ ہو۔ اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ ان صوبوں پر عمالقہ۔ اور شام پر کنعانی۔ اور مصر میں قبطی بادشاہ تھے۔ پھر مصر کی حکومت عمالقہ کے ہاتھ میں۔ اور شام کی بنی اسرائیل کے قبضہ میں آئی۔ اور کبھی ان بادشاہوں کی تاریخ سے پتہ اس بات کا نہیں چلتا کہ تبابعہ ان میں سے کسی سے لڑے یا ان کے کسی صوبہ پر قابض ہوئے ہوں۔ بہرحال بہت سی اور معقول دلیلیں ہیں جن سے اُن واقعات کا جو مورخین نے بیان کیا ہے غلط ہونا ثابت ہوتا ہے ؞

ان پرانی کہانیوں کی غلطی اور بناوٹ بیان کر کے محقق موصوف مفسرین پر متوجہ ہوتا ہے اور ان بزرگواروں نے جن کہانیوں کو قرآن کی تفسیر میں بھر دیا ہے اور جن کا بد اثر دین اسلام پر پہنچتا ہے اِن کہانیوں کا واہی تباہی ہونا بیان کرتا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ان سب بیہودہ روایتوں سے بڑھ کر وہ ہے جیسے مفسرین نے سورہ فجر کی آیہ الم تر کیف فعل ربک بعاد ارم ذات العماد کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ ارم نام شہر تھا جس کے ستون بڑے بڑے تھے اور ابن عوص ابن ارم کے دو بیٹے تھے شدید و شداد۔ جو اس کے بعد بادشاہ ہوئے۔ شداد نے جنت کی صفت سنکر اس کے مثل ایک جنت بنانی چاہی۔ چنانچہ عدن کے جنگلوں میں تین سو برسوں میں اس نے ایک شہر بنایا۔ اور خود اس کی عمر نو سو برس کی تھی اور جو شہر کہ اُس نے بنوایا وہ بہت بڑا تھا۔ دیواریں اُس کی چاندی سونے کی اینٹ سے تھیں اور ستون اس کے زبرجد و یاقوت کے۔ اور جبکہ وہ بن کر طیار ہوا۔ شداد اپنی سب فوج و لشکر کے ساتھ چلا۔ جب وہ شہر ایک منزل رہ گیا تب خدا نے ایک ایسی ہولناک آواز آسمان سے بھیجی کہ وہ سب مر گئے

اس روایت کو طبری اور ثعلبی اور زمخشری وغیرہ مفسرین نے لکھا ہے۔ اور عبداللہ ابن قلابہ صحابی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ اپنے اونٹ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس شہر میں پہنچے۔ اور جو کچھ کہ اٹھا سکے وہاں سے جواہرات اٹھا لائے۔ اور جب یہ خبر معاویہ کو پہنچی۔ انہوں نے عبداللہ ابن قلابہ کو طلب کر کے سارا حال پوچھا پھر کعب احبار سے اُس کی تصدیق کی کعب احبار نے کہا کہ یہ شہر ارم ذات العماد ہے اور اس میں ایک شخص مسلمانوں میں سے آپ کے زمانہ میں داخل ہوگا سُرخ رنگ پست قد جس کی ابرو اور گردن پر تل ہوگا۔ اور وہ اونٹ کی تلاش میں وہاں پہنچیگا۔ پھر جب انہوں نے ابن قلابہ کو دیکھا۔ تو کہا کہ قسم ہے خدا کی یہ وہی آدمی ہے انتہیٰ۔ اس نقل کو لکھ کر محقق موصوف لکھتا ہے کہ " اس شہر کی خبر آجتک کبھی سنی نہیں گئی نہ یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچی کہ زمین کے کسی ٹکڑے پر ایسا شہر آباد ہے! ور عدن کا میدان جہاں ایسے شہر کا بننا گمان کیا جاتا ہے۔ وسط یمن میں واقع ہے۔ اور برابر اس کی آبادی چلی آتی ہے۔ اور مسافر اور سیاح تمام ملکوں سے وہاں آتے جاتے رہتے ہیں لیکن کسی نے ایسے شہر کی خبر نقل نہیں کی۔ نہ کسی اور قوم نے اُس کا حال بیان کیا۔ پس اگر یہ کہا جاتا کہ یہ شہر ویران ہوگیا اور اس کے آثار باقی نہیں رہے۔ تو زیبا تھا۔ مگر ان کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب تک موجود ہے! ور بعضوں کا ہذیان یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ شہر نظر سے غایب ہے اور صرف ساحر اور اہل ریاضت اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سب باتیں از قبیل خرافات و مضحکات ہیں! ور یہ دھوکا صرف لفظ ذات عماد کے سبب سے ہوا ہے جس کی وجہ سے ان نادانوں کو ایسی حکایتوں کے بنانے کی ضرورت ہوئی جو شل بناٹے ہوئے قصوں کے ہے۔ ورنہ اگر عماد سے ستون ہی مراد لئے جائیں تو وہ صفت قوم کی ہے۔ کہ بوجہ اُن کی قوت کے اس صفت سے ان کو موصوف کیا۔ نہ یہ کہ مراد اس سے کوئی خاص عمارت ہو پس کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ایسی واہی کہانیاں بنائی جاویں۔ تو خدا کی کتاب کی آیتوں کی توجیہ کے لئے ایسے محامل بعیدہ تلاش کئے جاویں جن سے وہ ہر طرح سے پاک اور منزہ ہے اور اسی قسم سے دیوار قہقہہ اور صحرا سجلماسہ کے مدینۃ النحاس کی روائتیں ہیں کہ جن کو قصہ گویوں نے بنالیا اور طبایع عالم کے نہ جاننے سے عالموں نے ایسی لغو روایتوں کو قبول کر لیا۔ اور اسی قسم سے وہ روایت ہے جو حبشیوں کے سیاہ رنگ ہونے کی نسبت بیان کی جاتی ہے کہ وہ حام ابن نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں! ور نوح علیہ السلام کی بد دعا سے حام کی اولاد کا رنگ کالا ہوگیا حالانکہ توریت میں تو لکھا ہے کہ نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ اُس کی اولاد اپنے بھائیوں کی غلام ہو لیکن پھر لوگوں نے رنگ کی سیاہی بھی اُس میں بڑھادی لیکن یہ بھی طبایع کائنات کی ناواقفیت

کا سبب ہے۔ اگر وہ ہوا کے مزاج اور حرارت کی تاثیرات پر واقف ہوتے تو ایسا غلط خیال نہ کرتے۔ پھر یہ محقق مسعودی پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ آپ باوجود بے علمی کے عقلی تحقیق پر بھی متوجہ ہوئے ہیں اور حبشیوں کی خفت عقل۔ اور طیش و غضب کے سبب لکھنے پر آمادہ، مگر وہ باتیں لکھی ہیں کہ جن کی کوئی دلیل ہے نہ برہان نہ جس سے کچھ حاصل محقق موصوف نے ایک فصل میں جہاں حکومت اور دولت کے ضعف و قوت کے اسباب بیان کئے ہیں وہاں بڑی بڑی عمارتوں۔ اور دنیا کی عجیب چیزوں کو جو اس وقت موجود ہیں مثل شہر شال مغرب۔ اور اہرام مصر کے بیان کر کے لکھا ہے کہ یہ بڑی بڑی ہیکلیں اور عجیب و غریب عمارتیں صرف قوم کی دولتمندی اور صاحب قوت ہونے سے بنیں۔ مگر مورخوں نے طبایع عالم کی ناواقفیت سے ان عظیم الشان عمارتوں کے بنانے والوں کے جسم اور قد و قامت کو بھی ایسا ہی بڑا اور عجیب سمجھ کر ان کے لئے ایک روایت گھڑ لی اور عاد اور ثمود اور عمالقہ اور کنعانیوں کے جسموں کو ایسا بیان کیا کہ جن کے سننے سے حیرت ہوتی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عوج بن عناق ایک شخص قبیلہ عمالقہ سے تھا جس سے بنی اسرائیل لڑے تھے وہ ایسا طویل القامت تھا کہ سمندر کی تہ سے مچھلی پکڑ لاتا اور آفتاب پر رکھ کر بھون لیتا۔ ان بزرگواروں نے اپنے اس جہل پر جو انسان کی حقیقت کی نسبت تھا اس جہل کو اور مستزاد کیا جو وہ کواکب کے حالات سے رکھتے تھے۔ آفتاب کی گرمی کو اس کے قرب و بعد پر منحصر کیا اور یہ نہ سمجھے کہ آفتاب فی نفسہ نہ سرد ہے نہ گرم ہے اس کے خطوط شعاعی جب سیدھے پڑتے ہیں تو صرف اس ہوا کو گرم کرتے ہیں جو سطح ارض سے ملی ہوئی ہے اور جتنا بعد زمین سے ہوتا جاتا ہے اتنی ہی گرمی کم ہوتی ہے۔ اور اسی طرح عوج بن عناق کو ہم عہد بنی اسرائیل کا لکھا ہے اور بنی اسرائیل کا جسم اور ان کا قد و قامت ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمارا ہے اور بیت المقدس کے دروازے اگرچہ وہ بعد خراب ہو جانے کے پھر بنے ہیں مگر ان کی شکل اور ان کا طول و عرض قریب قریب سابق کے ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں کے قد و قامت پر شاہد ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بہت تفاوت اور بڑا فرق ہم لوگوں کے قد و قامت سے نہ تھا۔ تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بنی اسرائیل کا ہمعصر ایسا طویل القامت ہو۔ یہ بات طبیعت اور فطرت کے برخلاف ہے۔ مگر سبب اس غلطی کا یہ ہوا۔ کہ جب مورخوں نے ان عمارتوں کو بہت لمبا چوڑا پایا تو وہ اسباب کے دریافت پر تو متوجہ نہ ہوئے اور قومی دولت اور قوت پر خیال نہ کیا۔ بلکہ بنانے والوں کے جسم اور ان کے قد و قامت کو ایسا بیان کیا ہے۔ جن سے ایسی عمارتوں کا بنانا ناممکن ہو۔ اور مسعودی نے ایک اور غلطی کی ہے

اور فلاسفہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ سوائے تحکم کے کوئی اُس کا سند نہیں ہے۔ یعنی از روئے قانون فطرت کے اُن کے جسموں اور عمروں کا بڑا ہونا ثابت کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان کی قوت از روئے مقتضائے طبیعت کے کامل اور زیادہ تھی۔ اس لئے عمر اور جسم بڑے ہوتے تھے۔ جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا وہ قوت گھٹتی گئی۔ اور اس کا مادہ کم ہوتا گیا۔ اور اسی طرح آیندہ روز بروز کمی ہوتی جاویگی۔ حالانکہ یہ محض ایک غلط اور پوچ رائے ہے۔ کبھی کوئی فلسفی ایسی حماقت کی بات نہ کہیگا۔ نہ اس پر کوئی دلیل ہے۔ نہ یہ مسئلہ قانون فطرت کا ہے۔ بلکہ بالکل مشاہدہ کے برخلاف ہے کیونکہ ہم اگلوں کے گھروں۔ اور ان کے دروازوں۔ اور ان کی راہوں کو ان کی بنائی ہوئی عمارتوں میں جو اب تک یادگار اور موجود ہیں۔ دیکھتے ہیں اس کو قریب قریب اپنے زمانہ کے پاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ زمانہ بہت گذرا ہمارے جسموں اور عمروں میں کچھ زیادہ کمی نہیں ہوئی۔ جس سے ہم خیال کریں کہ زمانہ گذرنے سے عمر و جسم میں کمی ہوتی ہے۔ بہرحال یہ سب غلط خیال اور بیہودہ اقوال علم فطرت کی ناواقفیت کے نتیجے ہیں اس لئے ایسے اخبار کے جانچنے میں سب سے اول علم فطرت کی موافقت اور مخالفت کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ؏

اسی قسم کی بہت سی باتیں لکھ کر آخر محقق موصوف لکھتا ہے کہ "کہاں تک میں اسے طول دوں۔ کیونکہ ایسی باتوں اور ایسی رایوں میں بڑے بڑے مورخین اور علمائے مشہورین کے پاؤں ڈگمگا گئے ہیں۔ اور وے بے تحقیق و تنقیح اس قسم کی باتوں کو مانتے چلے آئے ہیں۔ اور سب لوگ غور و فکر نہ کرنے اور عقل و قیاس کو دخل نہ دینے سے بے بحث و تکرار ان کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اکثر کتابیں ایسی ہی باتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ اس خرابی سے فن تاریخ کو بالکل واہی اور پوچ کر دیا۔ اور غلط اور صحیح باتوں کی اُس میں اس قدر آمیزش ہوگئی کہ اُس کا دیکھنے والا دلدل و کیچڑ میں پھنس جاتا ہے یعنی صحت و غلطی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور اسی واسطے اس علم کی کچھ وقعت نہ رہی پس اب مورخ کو ضرورت اس کی ہے کہ وہ حکومت کے قاعدوں اور موجودات کی طبیعتوں اور قوموں اور ملکوں کی مختلف حالتوں اور اگلوں کے اخلاق اور عادتوں۔ اور رسموں۔ اور مذہبوں اور ایسی ہی تمام باتوں کا اصلی علم حاصل کرے۔ پھر اپنے زمانہ کی موجودہ حالتوں کو اُن سے ملائے اور اس پر پچھلی باتوں کا قیاس کرے۔ اور جو اختلاف اس میں پایا جائے اس کی وجوہ و اسباب پر غور کرے۔ اور سلطنتوں۔ اور حکومتوں۔ اور مذہبوں کے پیدا ہونے اور ان کی ترقی و قوت پانے کی علتوں کو بنظر تامل دیکھے اور ان کے بانیوں اور پھیلانے والوں کے حالات تحقیق کرے تاکہ ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا اصلی سبب معلوم ہو جائے۔ مگر ہمیشہ لحاظ اس کا رکھنا چاہیئے کہ جو خبر سُنے یا جس بات کا علم حاصل کرے اُسے سُنتے ہی سچ نہ جانے بلکہ تو قواعد اور اصول سے ان کا امتحان کرے۔

ران کے موافق پاوے قبول کرے۔ ورنہ اُس پر خط رد کھینچے" اس کے بعد محقق موصوف تاریخ
حقیقت بیان کرکے جھوٹ اور غلطی کے اسباب بتاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ " اُن
سببوں میں سے ایک سبب رائے اور مذہب ہے۔ کیونکہ جب انسان کا نفس اعتدال کی حالت
رہوتا ہے تو خبر کی تحقیق کرکے سچ کو جھوٹ سے جُدا کرسکتا ہے لیکن اگر پہلے سے کسی رائے یا
سی مذہب کا معتقد۔ اور اس طرف مائل ہو تو مقتضائے طبیعت یہ ہے کہ وہ ان خبروں کو سنتے
ی قبول کرلیتا ہے جو اُس کی رائے اور مذہب کے موافق اور موید ہوں۔ پس وہ اعتقاد اور
میلان اس کی بصیرت کی آنکھ کا پردہ ہوجاتا ہے اور تحقیق اور تنقید سے باز رکھتا ہے اس لئے
جھوٹی بات کے قبول کرلینے اور پھر اُس کے نقل کرنے کی مصیبت میں پڑجاتا ہے اور دوسرا
سبب راویوں کا اعتماد ہے یعنی نقل و روایت کرنے والوں کو سچا سمجھ کر ان پر بھروسہ کرنا۔ اور ان
کی خبر کو لایق تنقیح نہ سمجھنا۔ اور تیسرا سبب مقصود و مراد سے غفلت کرنا ہے۔ چنانچہ اکثر نقل کرنے
والے اور راوی ایسے ہیں کہ جو مقصود اور مراد پر غور نہیں کرتے۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے دیکھا یا
سنا۔ اور جیسا وہ اپنے گمان میں غلط سلط سمجھے اُسے نقل کردیا۔ اور مقصود پر خیال نہ رکھنے سے
سچ کا جھوٹ ہوگیا یعنی بات تو کچھ تھی اور راوی کچھ سمجھے۔ اور اپنی ہی سمجھ کے موافق روایت
کرنے لگے۔ اور چوتھا سبب خوش اعتقادی اور حسن ظن ہے۔ اور اس کا اصلی باعث نقل و روایت
کرنے والوں پر اعتماد اور بھروسہ کرلینا ہے۔ اور پانچواں سبب حقیقت اور اصلیت کی تحقیق
نہ کرنی۔ اور فریب اور دغا اور تصنع کی باتوں کو نادانی سے مان لینا ہے۔ چنانچہ اکثر نقل و
روایت کرنے والوں نے جیسا دیکھا ویسا نقل کردیا۔ مگر انہوں نے اصلیت پر نظر نہ کی
کہ وہ بات حقیقت میں ویسی نہ تھی بلکہ فی نفسہ اُس کی اصلیت اور کچھ تھی۔ اور چھٹا سبب خوشامد
اور چاپلوسی ہے اور ان سب سببوں سے بڑھ کر تاریخی واقعات میں جھوٹ کے رواج
پانے کا بڑا سبب طبائع موجودات (نیچر) کی واقفیت ہے۔ کیونکہ دنیا میں جو چیز موجود
ہے۔ اور آئندہ ہوتی جاتی ہے۔ اس کی کوئی خاص طبیعت ضرور ہے۔ جو اس کی ذات
اور اس کی حالتوں سے مخصوص ہے جس میں کسی طرح فرق نہیں ہوسکتا۔ (اس لئے کہ نیچر کا
بدلنا یا قانون قدرت کے خلاف کچھ ہونا غیر ممکن ہے) پس اگر سننے والا موجودات کی طبیعتوں
اور ان کے خواص اور مقتضیات سے واقف ہوگا۔ تو ضرور اخبار کی تنقیح میں اس کا لحاظ رکھیگا
اور جب وہ کسی خبر کو مخالف اُس کے پائے گا فوراً غلط سمجھ لے گا۔ اور جب سننے والے
کو ان باتوں کا علم ہی نہ ہوگا وہ غیر ممکن اور محال خبروں کو قبول کرلیگا۔ اور ان خبروں کی نقل و
روایت میں اُسے کچھ پس و پیش نہ ہوگا۔ جیسا کہ مسعودی نے سکندر کی خبر لکھی ہے کہ جب وہ پانی

جانور اسکندریہ کے بنانے سے اُس کو مانع ہوئے۔ تو اس نے ایک لکڑی کا تابوت بنایا۔ اُس کے اندر شیشہ کا صندوق رکھا۔ اُس میں خود بیٹھا اور سمندر کی تہ تک غوطہ لگایا۔ وہاں اُن شیطانی جانوروں کی تصویریں بنائیں۔ اور ان کی صورتیں تانبے پیتل سے بنا کر بنیاد کے محاذی رکھ دیں۔ پس ان تصویروں کو دیکھ کر وہ دریائی جانور بھاگ گئے غرضکہ مسعودی نے ایک لغو اور بیہودہ خرافات کہانی کو صرف اپنی بےعلمی کے سبب سے مان لیا۔ اگر قطع نظر اور باتوں کے جو بادی النظر میں اس حکایت کے پوچ اور بیہودہ ہونے پر شاہد ہیں۔ اگر صرف اس بات کا علم ہوتا کہ جو ذی حیات صندوق میں بند ہو کر غوطہ لگائیگا۔ اور دیر تک پانی کے نیچے رہیگا۔ تو بے تنفس طبعی کے اُس کا جینا محال ہے۔ تو کبھی اس حکایت کو نقل نہ کرتا۔ اس حکایت کے بعد اور چند کہانیاں مسعودی وغیرہ کی اس محقق نے نقل کر کے اُس پر افسوس کیا ہے۔ اور کسی کو عقل کے برخلاف اور کسی کو نیچر کے مخالف۔ اور کسی کو واقع کے برعکس پا کر غلط اور باطل اور خرافات بتایا ہے اور آخر پر اُس نے صاف یہ لکھا ہے کہ اگر موجودات اور مخلوقات اور دنیا کی آبادی وغیرہ باتوں کا علم ان مورخوں کو ہوتا تو کبھی ایسی کہانیاں کتابوں میں لکھی نہ جاتیں ؂

ایک نہایت حکیمانہ اور محققانہ اصول اس نامور مورخ نے اخبارات کی تحقیق میں لکھا ہے کہ۔ "عالم کی طبیعت یعنی نیچر کا جاننا۔ اخبارات کی تنقیح کے لئے سب سے زیادہ ضرور ہے۔ اور راویوں کی تعدیل پر مقدم ہے پس ہم جس خبر کو سنیں پہلا کام ہمارا یہ ہے کہ ہم سوچیں کہ یہ خبر فی نفسہ ممکن ہے یا ممتنع۔ اگر معلوم ہو کہ اس کا ہونا محال ہے یعنی ہوا ہی نہیں۔ تو کچھ فائدہ نہیں۔ کہ ہم راویوں کی تعدیل و تجریح کریں کیونکہ اہل دانش نے یہ اصول ٹھہرا لیا ہے۔ کہ وہ خبر ماننے ہی کے لائق نہیں ہے جو فی نفسہ محال ہو۔ کہ اس میں ایسی تاویل کرنی مناسب ہے جسے عقل قبول نہ کرے۔ پس راویوں کی جرح و تعدیل کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں راویوں کی تعدیل و تجریح شرعی خبروں کی صحت کے لئے ضرور ہے کیونکہ بڑی خبریں شریعت کی وہ ہیں جو احکام اور عملیات سے متعلق ہیں اور جن میں امر اور نواہی کا اور شارع کے احکام کا بیان ہے۔ ایسی خبروں کی تحقیق کے لئے ظن کافی ہے اور صحت ظن کے لئے راویوں کی عدالت اور ضبط بس ہے لیکن وہ خبریں جو واقعات سے متعلق ہیں ان کی تصدیق کے لئے مطابقت بہت ضرور ہے۔ اور اس لئے ہم پر واجب ہے کہ اول سب سے یہ دیکھیں۔ کہ اُس کا واقع ہونا فی نفسہ ممکن ہے یا نہیں۔ اور یہ دیکھنا راویوں کی تعدیل سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے کیونکہ احکام کے لئے فقط خبر کافی ہے۔ اور واقعات کے لئے مطابقت واقع سے بھی ضرور ہے پس اخبار اور واقعات کے جھوٹ و سچ میں تمیز کرنے کا اصلی اصول امکان۔ اور استحالہ ہے۔ پس اگر ہم انسان کے مجمع اور دنیا کی آبادی

اور موجودات کی طبیعت اور اس کی عوارض ذاتی پر نظر کر کے کسی خبر کو محال سمجھیں اسے جھوٹا جانیں ورنہ اسکی تصدیق کیلئے راویوں کیحالات دریافت کریں اگر ہم اس اصلی اصول پر جس کی صحت میں ذرہ شک نہیں ہے خبروں کی جانچ کریں تو ضرور ہم غلط خبروں کے قبول کرنے سے محفوظ رہینگے اور جو حکائتیں یا روائتیں مورخین لکھ گئے ہیں ان کی صحت و غلطی اس اصول پر لحاظ رکھنے سے سمجھ سکینگے ۔

جو کیفیت اخبار کی اس محقق نے بیان کی۔ اور جو اصول اس کی تنقید کے قرار دیئے کون ہے کہ اس سے انکار کریگا اگرچہ ہر زمانہ میں محققین اہل اسلام نے اس طرف توجہ کی۔ اور اخبار اور تاریخ کی درستی میں کوشش کی۔ اور اب تک ان نیک کوششوں کے آثار بھی باقی ہیں۔ مگر ایسا زمانہ اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتا جس میں پوری کامیابی ہوئی ہو۔ اور عموماً صحیح تاریخ نے رواج پایا ہو۔ بلکہ بدنصیبی سے علوم حکمیہ کی ترقی نہ پانے سے محققین کی کوششوں کا پورا اثر نہ ہوا۔ اور متقشفین فقہا نے جہانتک ہو سکا۔ اُن کی کتابوں اور تحریروں کو شائع نہ ہونے دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ اور سیر کی صدہا کتابیں مسلمانوں کے پاس موجود ہیں۔ مگر محققین اہل اسلام کی عمدہ اور مفید تحقیقاتوں کا کچھ نشان نہیں! اور بغیر یورپ کے محققین کی اعانت کے ہم ان کی کتابوں اور تحریروں سے واقف نہیں ہوسکتے لیکن یہ بات تعجب کی نہیں ہے کیونکہ اگر گرفتاران زنجیر تقلید ایسی محققانہ تحریروں کو بآزادی شائع اور مشتہر ہونے دیتے تو اُن کا عنکبوتی کارخانہ قائم نہ رہتا! اور تقلید کی غلامی سے مسلمان کبھی کے آزاد ہو جاتے مگر جو زمانہ گذر گیا۔ اس میں اخبار اور تاریخ کی غلطی یا غیر معتبر ہونے نے بہت نقصان اسلام کو نہیں پہنچایا۔ اور سوائے اس کے کہ اور قوموں کے نامور مورخوں کی طرح انہوں نے قدیم زمانہ کی تاریخ لکھنے اور واقعات تاریخ کی تنقیح میں نام نہیں پایا۔ دین و مذہب پر بد اثر اس کا نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ اس وقت عموماً مذہب اور خیال اور علم اور مذاق سب کا ایک تھا۔ اور ایک ہی طریقہ سے مذہب کی حمایت اور اسلام کی اشاعت جاری تھی پس ہر ایک غلط اور غیر صحیح خبر جس میں کوئی حیرت۔ اور بوالعجبی پائی جاتی۔ یا جس سے کوئی بات عزت اور شان کی پیدا ہوتی بے عذر مان لی جاتی۔ اور عوام الناس فوراً سے معجزہ یا کرامت یا خرق عادت سمجھ کر فوراً ایمان لے آتے! اور گو وہ خبر از روئے اصول عقل اور فطرت کے کیسی ہی محال اور غیر ممکن ہوتی لیکن اس کی تنقیح اور تنقید نہ کی جاتی کیونکہ جاہل فقیہوں کے پاس ہر محال اور غیر ممکن الوقوع واقع کے امکان کے لئے ان کے غلط خیال میں خدا کا کلام موجود تھا۔ جو بات عقل میں نہ آتی۔ سادگی سے اُس پر ایمان لے آتے اور کہہ دیتے کہ ان اللّٰہ علےٰ کل شیئٍ قدیر یا لیس ذالک من اللّٰہ ببعید۔ مگر یہ زمانہ جو چل رہا ہے۔ اس میں اخبار اور تاریخ سے غفلت کرنا۔ اور بے تحقیق و تنقیح کے اُن کا مان لینا نہ مسلمانوں کے لئے مضر ہے۔ بلکہ آخر اس کا مذہب اسلام پر پہنچتا ہے کیونکہ اس وقت مختلف مذہب اور مختلف

خیال اور مختلف مذاق والوں سے اس کا مقابلہ ہے اور ہر مذہب اور ہر خیال اور ہر مذاق کو علم اور عقل اور حکمت سے مدد اور اعانت پہنچتی ہے پس ایسے نازک زمانہ میں اگر ہم مسلمان غلط اور غیر صحیح اخبار سے جو علم اور عقل اور حکمت کے مخالف ہوں اپنے مذہب کی حمایت اور دوسرے کا مقابلہ کریں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اگرچہ ہم کو اپنے تمام اخبار اور تاریخی واقعات کی تنقید کی حاجت ہے لیکن جو اخبار اور تاریخی واقعات مذہب سے علاقہ رکھتے ہیں ان کی تنقیح تو اس پر فرض عین ہے جو اسلام کا حامی اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہو۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ اور قدیم زمانہ کے واقعات کی تنقیح کے مشکل کام سے مورخین یورپ نے ہم کو مستغنی کر دیا ہے ❊

اخبار جن کو مذہب سے تعلق ہے۔ وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک متعلق احکام شریعت کے دوسرے غیر متعلق اس سے پہلی قسم کے اخبار کی تسلیم کے لئے ظنی ثبوت کافی ہے اور محدثین اور فقہائے محققین نے ایسے اخبار کی تنقیح بھی بدرجہ غایت کی ہے۔ مگر دوسری قسم کے اخبار کی تصدیق کے واسطے ثبوت یقینی درکار ہے۔ اور محدثین اور فقہا نے بھی ان کی طرف زیادہ اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ بڑے بڑے اماموں نے صاف کہہ دیا ہے " اذا روینا فی الحلال والحرام وغیرهما شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوهما تساهلنا "

وہ اخبار اور اقوال جن میں طبائع موجودات اور حقائق اشیاء کی تعریف یا تشریح ہے اکثر مفسروں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے ایسے کم ہونگے جن کے غلط سمجھنے اور باطل کہہ دینے میں کچھ بھی تامل کیا جائے کیونکہ حقائق اشیا اور طبائع کائنات سے بحث کرنا شارع کے منصب سے بعید ہے۔ جیسا کہ روح اور اہلّہ[۱] کے سوال کے جواب میں کہا گیا اور نیز ایسی بات کہنی جو عقل اور فطرت کے برخلاف ہو شان سے انبیاء کے بعید ہے اور ائمہ کرام اور محققین اہل اسلام اسے تسلیم کر چکے ہیں ❊

❊ کما قال الامام الاشعری ان الرسل صلوات اللہ علیهم لم یخبروا بما تحیله العقول و تقطع باستحالته الی قوله وکل خبر یظن ان العقل یحیله فلا یخلوا اما ان یکون الخبر کذبا علیهما او یکون ذالک العقل فاسدا " اس قسم کے اخبار گو ان کی سند بادی النظر میں کسی صحابی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو۔ مگر محققین نے تصفیہ کر دیا ہے کہ وہ پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ مثلاً اکثر مفسرین نے آسمانوں کی حقیقت میں لکھا ہے کہ پہلا آسمان ایک رکی ہوئی موج ہے اور دوسرا پتھر کا ہے اور تیسرا لوہے کا وغیرہ وغیرہ " اور اسی طرح کہا ہے کہ موٹائی ہر ایک کی اور فاصلہ ایک کا دوسرے سے پانچ سو برس کی راہ کا ہے۔ یہ سب غیر معتبر اور سننے کی باتیں

---

[۱] جمع ہے ہلال کی ❊

ہیں جیسا کہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ "وما عدا ھامن الوجوہ المنقولۃ من اھل التفسیر فذالک من جملۃ ما یا بالعقل مثل ما یقال السموات السبع اولہا موج مکفوف وثانیہا صخر و ثالثہا حدید ورابعہا نحاس وخامسہا فضۃ وسادسہا ذھب سابعہا یاقوت وقول من قال بین کل واحد منہا مسیرۃ خمس مائۃ سنۃ وغلظ کل واحدۃ منہا کذالک غیر معتبر عند اھل التحقیق"۔ یہ ایک قول ہے جو تمثیلاً بیان کیا گیا۔ ورنہ صدہا اخبار اور روایتیں آسمان اور زمین اور چاند اور سورج اور ستاروں اور دریاؤں اور پہاڑوں کی حقیقت کی نسبت ایسی بیان کی گئی ہیں کہ اگر وہ سب جمع کی جاویں تو نہایت عمدہ رسالہ فلکیات اور طبعیات اور جغرافیہ کا ایسا تیار ہو کہ اہل یورپ بھی محو حیرت ہو جاویں ۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں علم حقائق اشیاء کا شائع نہ تھا۔ اور فلسفہ یونانیوں کا جو کسی قدر مسلمانوں نے سیکھا وہ قیاسی اور ذہنی تھا اور بسبب دقت اور اشکال کے عوام اس فلسفہ سے بھی ناواقف تھے اس لئے مفسرین کو موقع تحقیقات حقائق اشیاء کا نہ ملا اور جو نام آسمان اور زمین وغیرہ کے قرآن مجید میں مذکور تھے۔ اُن کی حقیقت دریافت کرنے پر متوجہ ہوئے۔ مگر بوجہ ناواقفیت کے علوم عقلی سے وہم اور خیال میں پڑ گئے اور ان کہانیوں اور روائتوں کو جو یہودیوں کی تفسیروں اور تالمود یعنی حاشیوں میں بھری ہوئی تھیں یا ان کے عالموں کی زبانوں پر تھیں سچ جانا۔ اور اپنی تفسیروں اور مذہبی کتابوں میں لکھ لیا۔ اور آخر کار وہ غلط خبر اور جھوٹی روایت ایک غلط خیال اور باطل مذہبی عقیدہ ہو گیا اس پر یہ آفت اور ہوئی کہ وہ روایت اور خبر بعض بزرگوں نے امام یا صحابی یا پیغمبر کی طرف مستند کر دی۔ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو دھوکے میں ڈال دیا مگر محققین اہل اسلام نے ان دھوکوں کو کھول دیا۔ اور ایسی پوچ پوچ روائتوں پر خط نسخ کھینچ دیا لیکن گرفتاران بلائے تقلید اب تک اس دھوکے میں پڑے ہیں۔ اور خوش اعتقادی اور حسن ظن اُن کی جہالت کے پاؤں کی زنجیر ہے ۔

ایک یورپین عالم نے اپنے ایک لیکچر میں ہندوؤں کی نسبت بیان کیا تھا کہ "ہندو جو علم حقائق اشیا کی تحصیل پر اعتراض کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کے باعث ان کا مذہب لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے اس لئے ایک ہندو یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اس کے بیٹے علم جغرافیہ کی تحصیل کریں کیونکہ کسی تربیت یافتہ ہندو کا اس وقت اپنے مذہب پر اعتقاد نہیں رہ سکتا جبکہ سلمی تحقیقاتوں کے ایسے ثبوت سے جو اس کے مذہب کے برخلاف ہو اور جو اس ظاہری اس کو تسلیم کرتے ہوں واقف ہو جائے"۔ اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں پر بھی یہ مضمون ویسا ہی صادق ہے جیسا کہ ہندوؤں پر۔ کیونکہ وہ بھی غلط اخبار اور پوچ پوچ روایات سے ایسے غلط خیال اور باطل

عقیدہ میں پھنسے ہوئے ہیں کہ علم و حکمت کی روشنی دیکھ نہیں سکتے اور علوم حکمیہ کے سچے مسائل کے شائع ہونے سے اپنے وہمی و فرضی مذہب پر قائم نہیں رہ سکتے۔ مگر مسلمانوں کے ان باطل خیالات سے اصل اسلام کی سچائی اور حقیقت میں کچھ داغ نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ جب ایسی غلط اور بے اصل روایتوں اور حکایتوں سے مذہب فی نفسہ پاک ہے تو ان کی غلطی کا اثر اصل مذہب پر نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں مسلمانوں پر جو ان اخبار و اقوال کو تالوحی المنزل من السماء سمجھتے ہیں اس کا اثر پہنچتا ہے چنانچہ کون ہے دنیا میں جو ایسے مسلمانوں کو ہند و نہیں کہتا اور ان کو تعصب اور اوہام کا پتلا نہیں سمجھتا۔

یہ خیال کہ گو غیر معتبر اور غیر مستند کتابیں ایسی لغویات سے مملو ہیں مگر معتبر اور مستند کتابیں تفسیر و سیر کی اس الزام سے پاک ہیں۔ صحیح نہیں۔ ہے اس لئے کہ جو کتابیں تفسیر و سیر کی معتبر و مستند سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں بھی بہت سے اخبار اور اقوال تاریخ اور جغرافیہ اور طبائع کائنات کے مخالف موجود ہیں چنانچہ بیضاوی اور معالم التنزیل اور نیشاپوری وغیرہ معتبر تفسیریں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں ہم نے معالم التنزیل اور نیشاپوری وغیرہ تفسروں کو غور سے دیکھا مگر اس الزام سے ان کو بھی پاک نہ پایا۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض روایتوں کی تصدیق اور تائید کے لئے توریت سے بھی سند پیش کی گئی ہے مثلاً معالم التنزیل میں وجدھا تغرب فی عین حمئۃ کی تفسیر میں اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کہ سچ مچ آفتاب دلدل میں ڈوبتا ہے کعب احبار سے یہ خبر نقل کی گئی کہ توریت میں بھی ایسا ہی لکھا ہے کما قال تجد فی التوریۃ انھا تغرب فی ماء وطین۔ اگر کوئی اہل کتاب پوچھے کہ کہاں ہے یہ روایت توریت میں تو کیا جواب ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ جو فنموھا وبدلتموھا اسی قبیل سے اور بہت سی لغو روایتیں ہیں۔ مثلاً وجد عندھا قوما کی تفسیر میں مفسر موصوف فرماتے ہیں کہ ایک شہر تھا جس کے بارہ ہزار دروازے تھے اگر اس کے باشندوں کا شور و غل مانع نہ ہوتا تو آفتاب کی آواز سنائی پڑتی !! سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ وبحمدہ۔

اس سے بڑھ کر یاجوج و ماجوج کی روایت ہے کہ جو حضرت حذیفہ سے مرفوعاً نقل کی گئی ہے کہ یاجوج و ماجوج دو قومیں ہیں۔ ہر ایک قوم میں چار لاکھ گروہ ہیں اور جب تک ہر ایک شخص اپنی اولاد ذکور سے ایک ہزار جوان ہتھیار بند نہیں دیکھ لیتا نہیں مرتا!!! ہاں کیا عجب ہے۔ ان اللہ علے کل شیئ قدیر۔

اس سے بڑھ کر وہ روایت ہے جو ان کے قد و قامت کی نسبت کی گئی ہے جس کے آگے گل بکاؤلی کے دیووں کی بھی حقیقت نہیں۔ یاجوج ماجوج تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا طول ایک سو بیس

گز ہے۔ دوسرے وہ جن کا طول و عرض برابر ہے یعنی ایک سو بیس گز لمبے ایک سو بیس گز چوڑے اور کسی پہاڑ کی ان کے آگے حقیقت نہیں تیسرے وہ جو ایک کان اپنا بچھاتے ہیں اور ایک اوڑھتے ہیں۔ اور ہاتھی اور سوئر اور کتا وغیرہ کوئی وحشی جانور ان کے سامنے آوے اُسے چٹ کر لیتے ہیں!!! شکر خدا کا کہ اس اخبار کے نقل کرنے والوں اور لکھنے والوں کو اس قوم نے نہ دیکھا۔ بڑائی اس قوم کی تو سُن لی! اب اُن کی چھوٹائی بھی سُن لیجیئے۔ کہ حضرت علیؓ اُس کے راوی ٹھہرائے گئے ہیں۔ کہ بعض ان میں سے ایسے چھوٹے ہیں کہ ان کا طول بالشت بھر سے زیادہ نہیں۔ اب اس عجیب و غریب قوم کی پیدائش کی تاریخ بھی سُن رکھیئے کہ حضرت کعب احبار اُس کے مورخ قرار دیئے گئے ہیں ایک روز حضرت آدمؑ کو احتلام ہوا۔ اور نطفہ ان کا مٹی میں مل گیا۔ اُس سے خدا نے یاجوج و ماجوج کو پیدا کیا پس یہ قوم بے ماں کے پیدا ہوئی ہے!!! افسوس افسوس ہائے افسوس۔ کہ ہمارے یہاں کی مشہور اور معتبر تفسیروں میں یہ خرافات اور مضحکات بھرا ہوا ہے اور ہم اب تک اُن کی تصدیق کو ایمان اور تکذیب کو کفر سمجھیں۔ فاعتبروا یا اولی الالباب ان هذا الشیٔ عجاب۔ علاوہ ان اخبار کے جو حقایق اشیاء اور طبائع موجودات سے علاقہ رکھتے ہیں ایک قسم کے اور اخبار اور روایات ہیں جن کی تحقیق اور تنقیح ضرور ہے یعنی وہ جو سیر کی کتابوں میں منقول ہیں اور جن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اقوال اور افعال اور اخلاق اور عادات اور غزوات کا بیان ہے کیونکہ ہر مذہب کی حقیقت و بطلان کے لئے بانیٔ مذہب کی سیرت ایک عمدہ دلیل ہوتی ہے مسلمانوں میں زہری اور ابن اسحاق اور ابن ہشام اور واقدی اور طبری بڑے ناقل اور مورخ ہیں لیکن ان کی روائتیں اور خبریں ہنوز تصدیق اور تنقید اور تصحیح کی محتاج ہیں اور ان کی تصحیح و تمیز کے ذریعے اب تک ہمارے پاس موجود ہیں جن سے ہم ضعیف کو قوی سے اور غلط کو صحیح سے جدا کر سکتے ہیں۔

اس بحث کو نہایت عمدہ طرح سے مولوی سید احمد خاں صاحب نے خطبات احمدیہ میں۔ اور منشی چراغ علی صاحب نے اپنی بے نظیر کتاب موسوم بہ تعلیقات میں لکھا ہے اور علمائے اہل اسلام اور علمائے اہل یورپ کے ہر قسم کے قولوں کو نقل کر کے بہت عمدہ طرح سے داد تحقیق دی ہے اس زمانہ میں وہ تحریریں تنقیح اخبار اور تصحیح روایات کے لئے نہایت مفید ہیں۔

اگرچہ اس مختصر بیان سے جو اوپر کیا گیا۔ تاریخ کی حقیقت اور اخبار میں جھوٹ و غلطی کے دخل پانے کے اسباب کسی قدر معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر ہنوز ضرورت اس کی ہے کہ یہ نازک اور دقیق مضمون ذرا تفصیل سے بیان کیا جاوے۔ تاکہ معلوم ہو کہ مسلمانوں نے غلط اور غیر صحیح تاریخ اور اخبار اور روایات کو کیونکر قبول کر لیا۔

حال یہ ہے کہ اسلام کے ظاہر ہونے سے پہلے اہل عرب تعلیم و تربیت - تہذیب و شائستگی سے محض بے بہرہ تھے - مدت سے ان کے مذہبی خیالات بھی نہایت تیرہ و تاریک ہوگئے تھے جس وقت اسلام کا ستارہ طلوع ہونے پر تھا - اُس وقت کل ملک پر جہالت کی تاریکی چھا رہی تھی - کوہستانی عرب کے شمالی حصے اور ملک شام قسطنطنیہ کے بادشاہ کے قبضے میں تھے - بحر قلزم کے ساحل کا ایک حصہ مکہ معظمہ کے جنوب تک حبشہ کے ایک عیسائی بادشاہ کی حکومت میں تھا - خلیج فارس کے کنارے اور وہ ملک جس میں دریائے دجلہ و فرات بہتے ہیں - اور ملک جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کیانیوں کے ملک میں شامل تھے - ان ملکوں کے رہنے والے یا عیسائی تھے یا آتش پرست یا یہودی اور اکثر آزاد اور خود مختار عرب بتوں اور سیاروں اور جنات اور مختلف قسم کے دیوتاؤں کو بھی پوجتے تھے - ان تمام مذہبوں میں اگر کوئی مذہب عمدہ ہو سکتا - تو یہودیوں اور عیسائیوں کا تھا - مگر اس وقت یہ دونوں مذہب نہایت درجہ پر خراب تھے - یہودیوں میں سوائے بناوٹ اور نخوت اور قساوت قلب کے کچھ باقی نہ تھا - ان کے احبار اور فقہا اور محدثین نے مذہب کا دار مدار قصہ گوئی اور رسموں کی پیروی پر سمجھ رکھا تھا - عیسائیوں کی یہ کیفیت تھی کہ پادریوں نے پنے مکر و دغا بازی اور جھوٹ اور دنیا طلبی سے مذہب کو بالکل خراب کر رکھا تھا - مصنوعی روایتوں اور جھوٹی نقلوں اور وضعی کہانیوں اور باطل کرامتوں اور غلط معجزوں کے بیان کرنے کے سوائے اُن کا کچھ کام نہ تھا - بہتیری بدعتیں ان میں جاری تھیں - گنڈے - تعویذ - جھاڑ پھونک - جاہلوں کے گمراہ کرنے والی باتیں بہت رائج تھیں - پادریوں نے آپس کے مباحثے اور مناقشے اور مناظرہ سے اصلی مذہب کو بالکل چھوڑ دیا تھا - ان کے سوائے عرب کے جنگلوں میں جاہل اور مجنون راہب کثرت سے نظر آتے تھے - پس جب یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب کی یہ کیفیت تھی تو اہل عرب کو جن کے بڑے ہادی اور استاد عیسائی اور یہودی تھے - کیا ذریعہ تھا کہ وہ اپنے علم - اپنے مذہب - اپنے خیالات کے روشن کرنے میں ان دو بجھی ہوئی مشعلوں سے کچھ روشنی حاصل کرتے اور سوائے اُن باتوں کے جو ان مذہبوں کے قصہ گویوں سے سُنا کرتے تھے - کسی شئے کی حقیقت سے واقف ہوتے - ایسے خراب اور تاریک زمانہ میں خدا نے اُس پاک زمین کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور اسلام کا نور اُس میں پھیلایا - لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ◆

اسلام کی برکت سے اہل عرب کے خیالات بالکل بدل گئے - ان کی طبیعتوں میں نئی کیفیتیں پیدا ہوگئیں - عیسائیوں اور یہودیوں اور بت پرستوں کے بُرے دستور اور بیہودہ قاعدے

سب مٹ گئے لیکن جیسا زمانہ گذرتا گیا اُس صفائی اور سادگی میں اسلام کے پھر پُرانے خیالات۔ اور پرانے دستوروں کی آمیزش۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کے اخبار۔ اور مراسم کا دخل ہونے لگا۔ چنانچہ بہ نسبت دخل ہونے غلط اخبار اور غیر صحیح روایات کے اہل اسلام کی تفاسیر میں محقق ابن خلدون لکھتا ہے کہ "متقدمین کی کتابیں اور روائیں صحیح اور غلط اور مقبول اور مردود قولوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ عرب نہ تو اہل کتاب تھے۔ نہ صاحب علم۔ بلکہ محض وحشی اور جاہل تھے۔ جب وہ ان چیزوں کے جاننے کے شائق ہوئے جن کا شوق نفوس انسانی کو ہوا کرتا ہے مثلاً مخلوقات کے پیدا ہونے کے اسباب۔ دنیا کے پیدا ہونے کی ابتدا پیدائش کے بھید خلقت کے اسرار۔ تو وہ اہل کتاب سے جو اُن سے پہلے تھے پوچھنے پر مجبور ہوئے۔ اور اہل کتاب یا یہود تھے یا نصاریٰ۔ جو کہ ان باتوں میں یہودیوں کے پیرو تھے۔ یہ دونوں فرقے اس زمانہ میں مثل عرب کے جنگلی اور وحشی ہو رہے تھے۔ اور صرف سنی سُنائی باتیں جانتے تھے ان سب میں مشہور اور نامور حمیر تھے جو یہودی ہو گئے تھے۔ جب یہ مسلمان ہو گئے۔ ان کے دلوں میں وہ اخبار۔ منقولات جن کو احکام شرعی سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اپنی اصلی حالت پر باقی رہے چنانچہ کعب احبار۔ وہب ابن منبہ۔ عبد اللہ ابن سلام وغیرہ انہیں میں سے ہیں۔ پس انہیں کی روایتوں اور منقولات سے تفسیریں بھر گئیں۔ اور چونکہ پرانے واقعات اور دنیا کی پیدائش کی کیفیت اس کے اسرار وغیرہ باتیں ایسی نہ تھیں جن کو احکام شرعی سے تعلق تھا۔ اور اس کی تحقیق اور تنقیح عمل کرنے کے لئے ضرور ہوتی اس لئے مفسرین نے ایسی باتوں سے تساہل کیا۔ اور اُنہیں نقلوں سے اپنی تفسیروں کو بھر دیا۔ اور جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں۔ اصل ماخذ ان روایتوں کے وہی یہودی صاحب توریت ہیں جو عرب کے جنگلوں میں مارے پھرتے تھے۔ اور جن کو خود تحقیق ان روایتوں اور نقلوں کی اپنے طور پر بھی نہ تھی۔ مگر بعد اسلام کے جب وہ لوگ دین و مذہب میں بڑے مقام پر پہنچ گئے ان کے علم اور فضل کا آوازہ بلند ہوا اور مشہور اور نامور ہو گئے۔ اس لئے اُس وقت وہ روایتیں جو اُن پر موقوف تھیں قبول کر لی گئیں۔ مگر جب پھر مسلمان تحقیق اور تنقیح پر متوجہ ہوئے تو انہوں نے ان لغویات کو چھانٹ دیا۔ اور جو صحیح تھا اس کو لے لیا۔ جیسا کہ ابو محمدؒ ابن عطیہ نے (جو علماء متاخرین سے مغرب میں ہوا) کیا۔ کہ اس نے ایک صحیح تفسیر بعد چھانٹنے ان روایات کے تالیف کی"

یہ عمدہ اور مفید جو اس محقق نے کیا۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری تفسیروں کی روایتوں اور نقلوں کا کیا حال ہے اور اسلام ان کی غلطیوں کا کس قدر ذمہ دار ہے۔

یہ حال تفسیروں کی روایات کا ہے۔ اب باقی رہیں وہ روایتیں جو اسی قسم کی احادیث میں منقول

ہیں۔ ان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اکثر محققین نے ایسی روایتوں کی تحقیق کر کے غلطیاں ان کی ثابت کر دی ہیں اور اکثر کا ان میں سے موضوع اور غیر صحیح ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اور اگر غور سے خیال کیا جائے تو ایسی حدیثیں جن میں تاریخی واقعات یا اخبار قصص۔ طبائع عالم کیفیت مخلوقات سے بحث ہو۔ بہت کم نکلینگے جو صحت کے درجہ پر پہنچے ہوں۔ یا تنقیح اور تحقیق کے وقت ضعیف ہونا ان کا ثابت نہ ہو۔ افسوس ہے کہ اب تک ہمارے زمانہ میں پُرانے خیال کے مُلّا یہودیوں کی کاسہ لیسی پر جان دیتے ہیں اور ان غیر صحیح۔ غلط۔ خلافِ عقل روایتوں کو جن کی صحت کا اقرار اسلام کے غلط ہونے کا مستلزم ہے اب تک صحیح کہہ رہے ہیں۔ بلکہ ان سے استدلال اور استناد کرتے ہیں۔ جو شخص نور الآفاق[1] دیکھتا ہوگا اور آسمانوں۔ زمینوں۔ دریاؤں کی حقیقت کا علم ان روایتوں سے حاصل کرتا ہوگا وہ اس سے ناواقف نہ ہوگا کہ یہ مبارک پرچہ اس امر میں کہ اسلام عقل اور علم کے مخالف ہے کیسی کوشش کر رہا ہے۔

اکثر ان لوگوں کو جو درجہ تحقیق پر نہیں پہنچے نیک نیتی سے یہ شبہ ہوتا ہوگا کہ اخبار اور منقولات اور روایات غیر صحیح نے احادیث میں کیوں دخل پایا۔ اور ان کا انکار ایک مسلمان کو کب زیبا ہے لیکن جو ذرا بھی اس پر غور کریگا۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ خیال محض دھوکا ہے۔ اسلام میں صدہا ہزارہا لکوکہا عالم ہوئے جن کے خیالات جن کے عقائد۔ جن کے ارادے۔ جن کی خواہشیں۔ جن کی طبیعتیں مختلف تھیں۔ کوئی ان میں سے تحقیق کے اعلےٰ درجہ پر پہنچا۔ کوئی دھوکا اور غلطی کے عمیق گڑھے میں گرا کسی نے نیک نیتی سے حق کی تحقیق میں کوشش کی کسی نے نفسانی خواہشوں سے باطل اظہار پر جرأت کی پس ان تمام مختلف خیال مختلف مزاج مختلف طبیعت والوں کی نقل و روایت کا التزام اسلام نہیں اٹھا سکتا۔ اور ہر شخص کا تصدیق اور تکذیب کی غرض سے تجھ سلمان اسلام کو جھوٹا نہیں ٹھہرا سکتا۔ ہاں اسلام اسی بات کا ذمہ دار ہے جو اسلام کے بانی نے فرمائی ہو اور جس کے فرمانے کا ثبوت یقین کے درجہ پر پہنچ گیا ہو۔ اور مسلمان اسی بات کے انکار و تکذیب سے کافر ہو سکتا ہے جس کا ثبوت علم یقین تک پہنچ گیا ہو۔ جب مسائل فروعی کی تحقیق کے لئے اگلے مجتہدین اور محققین نے نہایت سختی سے روایات کو قبول کیا اور جرح کو تعدیل پر مقدم سمجھا تو مسائل اصولی کی تنقیح میں اس عمدہ اصول کا التزام کیوں نہ کیا جائے اور جو روایتیں معقولات صحیح اور طبائع عالم اور تاریخی واقعات کے مخالف ہیں۔ ان کی تصدیق سے اسلام کا ابطال کیوں کیا جائے۔ کیا خوب لکھا ہے محقق ابن خلدون نے کہ "جو لوگ بعض مجتہدین پر اعتراض کرتے ہیں کہ اُن کو حدیث کا علم نہ تھا۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کی نسبت کیا گیا ہے۔

---

[1] سرسید احمد کے نورانی اور پاکیزہ خیالات کے رد میں یہ ایک رسالہ نکلا کرتا تھا۔

کہ سترہ حدیث سے زیادہ روایت ان کی نہیں ہے۔ یہ اعتراض ان کا صحیح نہیں ہے حدیث کا کم روایت کرنا ان کی احتیاط کا مقتضا تھا۔ انہوں نے بسبب ان مطاعن اور وجوہ کے جن سے حدیث کی صحت میں شک ہوتا ہے۔ کثرت سے حدیثوں کو روایت نہیں کیا۔ اور اُن کے اجتہاد نے جرح کو مقدم سمجھ کر ضعیف روایتوں کے قبول کرنے سے باز رکھا چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے حدیث کے قبول کرنے میں بہت احتیاط کی۔ اور روایت کی شرطوں میں بہت سختی کی۔ چنانچہ انہوں نے یہ اصول ٹھہرایا کہ جو حدیث یقیناً عقل کے برخلاف ہو وہ ضعیف ہے اسی احتیاط اور سختی سے ان سے کم حدیثیں منقول ہیں۔ کما قال والامام ابو حنیفۃ انما قلت روایتہ لما شدد فی شروط الروایۃ والتحمل فاستصعب وضعف الحدیث اذا عارضہ العقل القطعی فاستصعب وابتز فقل حدیثہ لا انہ ترک روایۃ الحدیث متعمداً فحاشاہ من ذالک +

غرض کہ اس بیان سے بخوبی معلوم ہو گیا کہ اخبار اور روایات اور تاریخ میں اول اول غلطی نے کیونکر دخل پایا۔ اور مذہبی کتابوں میں یہ غلط روائتیں کیسے درج ہو گئیں۔ اس موقع پر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان اخبار اور روایات کا کچھ بیان کروں جو درجۂ تواتر پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جن میں آئندہ کا بیان ہے چنانچہ منجملہ ان کے بڑی مشہور خبر وہ ہے جو بہ نسبت امام مہدی کے بیان کی گئی ہے۔ اُس کی نسبت یہ محقق یوں لکھتا ہے کہ "تمام اہل اسلام میں یہ بات مشہور ہے کہ اخیر زمانہ میں ایک شخص اہل بیت میں سے ظاہر ہوگا دین اور عدل اور حکومت کو ترقی دینے والا اُس کا نام ہوگا مہدی اور اُسی کے پیچھے دجال خروج کریگا۔ اور حضرت عیسےٰ آسمان سے اُترینگے۔ اس قول کی صحت دو طرح سے تسلیم کی گئی ہے ایک بسند اُن اخبار کے جو اس باب میں ائمہ حدیث نے نقل کئے ہیں۔ دوسرے بدلیل اُن اقوال کے جو اہل تصوف نے اپنے کشف سے بیان کی ہیں۔ اس محقق نے دونوں سندوں سے بخوبی بحث کی ہے چنانچہ تمام ان حدیثوں کو جو اس باب میں ترمذی اور ابو داؤد اور بزار اور ابن ماجہ اور حاکم اور طبرانی اور ابو یعلی موصلی وغیرہ نے بیان کیا ہے نقل کر کے ایک ایک پر جرح کی ہے اور ان میں سے اکثر حدیثوں کو واہی اور ضعیف اور غیر صحیح یا نا قابل الیقین ٹھہرایا ہے۔ اور قبل اس کے کہ وہ ایک ایک حدیث کے راویوں پر جرح کرے یہ اصولی مسئلہ اچھی طرح سے بیان کیا ہے۔ کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے جیسا کہ وہ لکھتا ہے کہ "لان المعروف عند اھل الحدیث ان الجرح مقدم علے التعدیل فاذا وجدنا طعناً فی بعض رجال الاسناد بغفلۃ او سوء حفظ او قلۃ ضبط او ضعف او سوء رای تطرق ذالک الی صحۃ الحدیث واوھن منہ +

یہ محقق لکھتا ہے کہ "جو احادیث امام مہدی کی شان میں نقل کی گئی ہیں ان میں یہانتک مبالغہ

اور غلو کیا گیا ہے کہ ان کے ظہور کا منکر کافر ٹھہرا دیا گیا ہے جیسا کہ ابو بکر اسکاف نے فوائد الاخبار میں روایت جابر یہ حدیث لکھی ہے کہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کذب بالمھدی فقد کفر ومن کذب بالدجال فقد کذب" اس کو نقل کر کے یہ محقق لکھتا ہے کہ "وحسبک بھذا غلوا" تمام حدیثوں کو جو اس باب میں وارد ہیں نقل کر کے اور ہر ایک پر جرح کرنے کے بعد اخیر پر یہ محقق لکھتا ہے کہ "ھذہ جملۃ الاحادیث التی خرجھا الائمۃ فی شان المھدی وخروجہ آخر الزمان وھی کما رایت ولم یخلص منھا علی النقد الا القلیل او الاقل منہ"

دوسری سند یعنی ان اقوال کی نسبت جو اہل تصوف نے اپنے کشف سے بیان کیے ہیں یہ محقق لکھتا ہے کہ "اگلے اہل تصوف اس باب میں کچھ خوض نہ کرتے تھے۔ ان کا کلام مجاہدۂ نفس اور نتیجہ اعمال اور تزکیہ قلب پر منحصر تھا۔ ہاں امامیہ اور شیعہ امامت کے بارے میں بہت غلو رکھتے تھے چنانچہ ان میں ایک فرقہ اسماعیلیہ پیدا ہوا جن میں سے بعض تو بطور حلول کے ائمہ کی الوہیت کے معتقد ہوئے اور بعض از قسم تناسخ رجعت کے قائل اور بعض ایک امام کے ظہور کے منتظر ہوئے۔ ان مختلف خیال کے ظاہر ہونے کے بعد متاخرین اہل تصوف نے کشف میں کلام کرنا شروع کیا اور جو چیزیں کہ حواس سے دریافت نہیں ہو سکتیں اس کے ادراک کا دعوے کیا۔ چنانچہ بعض حلول اور وحدت کے قائل ہوئے اور یہ قول ان کا مشابہ شیعوں کے اس قول کے تھا جو وہ الوہیت ائمہ اور حلول کی نسبت بیان کرتے تھے۔ اور بعضے قطب اور ابدال کے، یہ قول اُن کا درحقیقت نقل امامیہ کے اس قول کی تھی جو وہ ائمہ اور نقبا کی نسبت کہتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ان متصوفین نے شیعوں کے قولوں کو لیا۔ اور اپنے طور پر اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ یہاں تک کہ اپنے طریقوں کی سند بھی پہنچا دی۔ جیسا کہ خرقہ کی نسبت کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے حسن بصریؒ کو پہنایا۔ اور اُن سے اس طریقہ کی پابندی کا عہد لیا۔ اور اس طرح سلسلہ بسلسلہ حضرت جنیدؒ بغدادی تک پہنچا۔ لیکن یہ امر ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اور کوئی ایسا طریقہ مخصوص حضرت علیؓ نے جاری نہیں کیا۔ بہر حال ادھر تو فرقہ اسماعیلیہ نے اور ادھر صوفیوں نے اس منتظر فاطمی امام کی نسبت بہت سی روایتیں اپنی اپنی کتابوں میں اپنے طور پر بھر دیں اور ایک نے دوسرے سے اخذ کیں وکلہ مبنی علی اصول واھیۃ من الفریقین"

ان دونوں سندوں یعنی اخبار اور کشف کی غلطیاں ظاہر کر کے یہ مورخ ایک اور تیسری دلیل نقل کرتا ہے کہ بعض لوگ نجومیوں کی باتوں پر ایسے امام کے ظہور کا اعتقاد رکھتے ہیں اور ایسے اعتقاد رکھنے والے اکثر متصوفہ متاخرین ہیں چنانچہ ابن عربی حاتمی نے کتاب عنقا مغرب میں اور ابن قسی نے کتاب خلع نعلین اور عبد الحق ابن سبعین اور ابی ابن واطیل نے شرح خلع نعلین میں

اس قسم کی باتیں لکھی ہیں مگر ان کو اس قسم پہیلیوں اور کہاوتوں کے سمجھنا چاہیئے اور ان میں بعض نے زمانہ بھی امام کے ظہور کا ٹھہرایا ہے جیسا کہ ابن عربی کہتا ہے کہ ظہورہ یکون بعد مضی خ ف ج من الہجرۃ ۔ اس حساب سے ظہور اس امام کا ساتویں صدی کے اخیر میں ہونا چاہیئے تھا جب یہ زمانہ گذر گیا اور امام ظاہر نہ ہوئے تو بعض مقلدین نے تاویل شروع کی اور کہا کہ مراد اس زمانہ سے زمانہ پیدائش ہے نہ زمانہ ظہور اور بعضوں نے یہ بھی گمان کیا ہے کہ دجال ۷۴۳ھ محمدی میں خروج کریگا اور محمدی سنہ کا حساب روز وفات آنحضرت صلعم سے کرتے ہیں ۔ غرضکہ اسی طرح مشائخ امام کے ظہور کا زمانہ بڑھاتے آتے ہیں اور بشارتیں اور خوشخبریاں سناتے رہتے ہیں ۔"

اس قسم کی روایتوں اور قولوں اور کہانیوں اور پہیلیوں کو تفصیلاً بیان کرنے کرتے آخر کو یہ محقق عاجز ہو کر لکھتا ہے ومن امثال ھذا کثیر یعینون فیہ الوقت والرجل والمکان فینقضی الزمان ولا اصل لشئ من ذالک فیرجعون الی تجدید رای اٰخر منتحل کما تراہ من مفہومات لغویۃ واشیاء تخیلیۃ واحکام نجومیۃ فی ھذا انقضت اعمار الاول منہم والاٰخر۔

آخر کار اس مشہور قول کی نسبت ایک عمدہ مورخانہ رائے اس محقق نے دی ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ "حدیثیں اور خبریں اور بشارتیں جو کچھ امام آخر الزمان کی نسبت تھیں ۔ وہ سب بقدر اپنی طاقت کے میں بیان کر چکا ۔ مگر تصفیہ اس کا میرے نزدیک یوں ہے کہ کوئی دعوت دین کی ہو یا سلطنت و حکومت کی پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ شوکت اور عصبیت نہ ہو کیونکہ شوکت اور عصبیت ہی مزاحمت کو دفع کرتی ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ اب فاطمیین بلکہ قریش کی شوکت و عصبیت دنیا میں باقی نہیں ہے اور تمام جہان سے ان کا غلبہ اور رعب جاتا رہا ہے اور سوائے حجاز کے وہ لوگ شہروں میں منتشر اور پریشان ہو رہے ہیں ۔ ہر ایک ان میں سے اپنی جُدی رائے اور جدا خیال رکھتا ہے پس اگر کوئی ان میں سے دعوت کرنے والا ظاہر ہو تو ضرور ہے کہ فاطمیین کی شوکت اور عصبیت پھر قائم ہو اور خدا اُس متفرق قوم کے دلوں کو اُس کی اطاعت پر متفق کرے ۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت ظہور کی معلوم نہیں ہوتی ۔ کیونکہ کسی بنی فاطمہ کا زمین کے کسی ٹکڑے پر ظاہر ہونا بغیر عصبیت اور شوکت کے بیکار محض ہے اور فقط نسب اُس کا اُس کے کام پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے ۔ کیونکہ ہم مضبوط دلیلوں سے ثابت کر چکے ہیں کہ کوئی دولت بے شوکت و عصبیت اور قوم کے اتفاق کے قائم نہیں ہو سکتی ۔ اور جو لوگ بغیر ان اصول پر نظر کرنے کے انتظار ظہور کا کرتے ہیں اور حقیقت پر نظر نہیں رکھتے وہ نادان ہیں چنانچہ بعض کو یہاں تک خبط ہے کہ وہ اس کی زیارت کو غاروں تک جاتے ہیں اور اپنی نادانی سے تباہ اور ہلاک ہوتے ہیں ۔ کما قال ولقد تقصد ذالک للموضوع کثیر من ضعفاء القول للتلبیس بدعوۃ تمنیۃ النفس

تمامہا وسوا سًا وحمقًا وقتل کثیرٌ منہم ۔

دُوسرا ریویو

مقدمہ

تاریخ ابن خلدون پر

اس مورخ نے تاریخ کی حقیقت اور اخبار کی تنقیح کے اصول بیان کرکے باقی کتاب کو چھ فصلوں میں تقسیم کیا ہے پہلی فصل جغرافیۂ عالم کے بیان میں۔ دوسری فصل وحشی قوموں کے حالات ۔تیسری فصل خلافت اور سلطنت اور اس کے مراتب اور لوازم کی تشریح ۔چوتھی فصل تمدن کی حقیقت میں۔ پانچویں فصل صنعتوں اور پیشوں اور حرفتوں کے بیان میں ۔چھٹی فصل علوم اور اُن کے تحصیل کے طریقوں کی تفصیل میں ۔

پہلی فصل میں کئی مقدمے ہیں ۔ پہلے مقدمہ میں نہایت خوبی سے انسان کا مُدنی الطبع ہونا اور اس کی زندگی اور بقا کے لئے بہت سے بنی نوع کی مختلف قوتوں کے یکجا جمع ہونے کی ضرورت ثابت کی ۔ دوسرے مقدمہ میں زمین کی آبادی اور دریاؤں اور نہروں وغیرہ کا اجمالاً اور ساتوں ولایت کے جغرافیہ کا تفصیلاً بیان ہے ۔ہم اس فصل کے اُن دونوں مقدموں کا انتخاب لکھنا اور اس پر رائے دینا ضرور نہیں سمجھتے کیونکہ اس تمام فصل کے مضامین کا مدار بطلیموس کے جغرافیہ پر ہے اور خاص اس مورخ نے کتاب نزہتہ المشتاق سے جو کہ علوی ۔ ادریسی حمودی نے روجر ابن روجر بادشاہ صقلیہ کے لئے تالیف کی تھی کل مضمون اخذ کیا ہے ۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ زمانہ حال کی تحقیقات سے اُس کا ناقص یا غلط یا غیر کامل ہونا بخوبی ثابت ہوچکا ہے اور یہ بات اصل فصل کے تیسرے مقدمہ میں اس مورخ نے نہایت عمدہ بیان ہوا کی تاثیرات کا جو انسان کے رنگوں اور اُس کی حالتوں پر ہوتا ہے کیا ہے ۔ اور اگرچہ بمقابلہ اس زمانہ کی تحقیقات کے وہ بیان ناقص ہے مگر بلحاظ اُس زمانہ کے نہایت تعریف کے لائق ہے ۔

وہ لکھتا ہے کہ ”جو ولائتیں قطب شمالی وجنوبی کے بیچا بیچ ہیں ۔ان کی ہوا معتدل ہے اس لئے چوتھی اقلیم سب سے زیادہ معتدل ہے اور تیسری اور پانچویں قریب باعتدال ہے اور دوسری

اور چھٹی غیر معتدل۔ اور پہلی اور ساتویں اعتدال سے بالکل دُور ہے اسی واسطے چوتھی اور تیسری اور پانچویں ولایتوں میں علوم اور صنائع حیوانات اور مکانات اور لباس اور جو کچھ ان میں ہے نہایت خوب اور عمدہ ہے۔ ان کے رہنے والوں کے قدو قامت سڈول۔ رنگ روپ اچھے۔ اخلاق و عادات پسندیدہ ہوتے ہیں۔ اور تمام چیزوں میں اُن کی شائستگی پائی جاتی ہے۔ کیا عمارات و مکانات میں۔ اور کیا لباس و پوشاک میں۔ اور کیا کھانے پینے اور غذا میں۔ اور کیا کاریگری اور صنعت میں۔ وہ سنگ تراشی خوب جانتے ہیں۔ تعمیر کے فن میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں۔ نئے نئے آلات اور کلوں کا بنانا خوب آتا ہے۔ سونا چاندی لوہا رانگ تانبا وغیرہ قدرتی معدنیات کے کام میں لانا بخوبی جانتے ہیں۔ اپنے معاملات میں چاندی سونے کے سکے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اہل مغرب اور شام اور عراقین اور سندھ اور چین اور اندلس اور جو اُس کے قریب فرنگستان کا ملک ہے ان سب میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ برخلاف ان ولایتوں کے پہلی اور دوسری اور چھٹی اور ساتویں ولایت کا حال ہے کہ تمام باتیں ان کی غیر معتدل اور ناموزون ہیں ان کے گھر مٹی اور سرکنڈے کے ان کی غذا جوار اور ساگ پات اُن کی پوشاک درخت کے پتے یا جانوروں کی کھال اور اکثر بالکل برہنہ اور ننگے اور ان کی داد و ستد اور معاملات میں چاندی سونے کے سکہ کا نام نہیں اخلاق اور عادتیں ان کی بے زبان حیوانوں کی سی۔ یہاں تک کہ اکثر حبشی اقلیم اول کے رہنے والے پہاڑوں اور کھوؤں میں رہتے ہیں اور خود رو گھاس کے سہارے جیتے ہیں۔ بلکہ بعض ان میں سے ایسے وحشی ہیں کہ ایک دوسرے کو کھاتے ہیں۔ وہ دین اور علم سے بے خبر ہیں۔ ہاں ان ولایتوں میں سے بعض ملک مثل یمن اور بلاد حجاز اور یمامہ اور جو اُس کے متصل جزیرہ عرب ہے اس سے مستثنٰی ہے کیونکہ بوجہ اس کے کہ تین طرف سمندر اُس کو گھیرے ہوئے ہے آب و ہوا اُس کی کسی قدر معتدل ہو گئی ہے "۔

اس محقق نے اس مقدمہ میں اور نیز چوتھے اور پانچویں مقدمہ میں دو نازک اور دقیق مسئلوں سے بحث کی ہے۔ ایک یہ کہ آدمیوں میں اختلاف رنگ کا کیا باعث ہے دوسرے ہوا اور غذا کا انسان کے بدن اور اس کے اخلاق پر کیا اثر پہنچتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں مسئلے اس نے اپنے وقت کے موافق نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں۔ مگر ہمارے زمانہ کی ترقی یافتہ حالت کے لحاظ سے کامل نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مسئلوں کا کچھ کچھ ذکر کرتے ہیں *

پہلے مسئلہ کی نسبت یہ محقق کہتا ہے کہ اختلاف رنگ کا باعث صرف سورج کی شعاعیں ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "جن ملکوں کے باشندوں کے سروں کو آفتاب سال میں دو دفعہ گرم کرتا رہتا ہے۔ اُن ملکوں کے رہنے والے کالے ہوتے ہیں۔ اور جو ملک سرد ہیں۔ اور جہاں

آفتاب کی شعاعیں ترچھی پڑا کرتی ہیں وہاں کے رہنے والے سفید رنگ ہوتے ہیں اس زمانہ کے حکما نے بھی اسے تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس ملک میں آفتاب کی شعاعیں زیادہ سیدھی پڑتی ہیں وہیں کے آدمی کالے ہوتے ہیں اور ان میں بھی ان کا رنگ بہت زیادہ سیاہ ہوتا ہے جو کہ کھلے ہوئے میدان میں دھوپ میں کام کرتے ہیں لیکن فقط یہی ایک سبب اختلاف رنگ کا نہیں ہے بلکہ اور اسباب بھی اس کے ہیں چنانچہ اسی دلیل پر اعتراض کیا گیا ہے۔ کہ اگر آفتاب کی شعاعیں رنگ کے سیاہ کرنے کی اصلی وجہ ہیں۔ تو کیا سبب ہے کہ ایسکیمو جو سال بھر تک کئی مہینوں تک سورج نہیں دیکھتے۔ رنگ ان کے سانولے ہوتے ہیں۔ جواب اس کے یہ بیان کیا گیا کہ ان لوگوں کے ملک کی خاصیت اور ان کا طریق زندگی بھی ان کے رنگ پر موثر ہے۔ ایسکیمو کے ملک والے اگرچہ کئی مہینوں تک سورج نہیں دیکھتے مگر کئی مہینے تک اُن پر سورج ہر وقت چمکتا رہتا ہے اور سورج کے چھپنے کے بعد وہ لوگ زمین کے نار گرم تہ خانوں میں جہاں خالص ہوا کا نام نہیں ہوتا رہتے ہیں۔ اور غذا بھی نہایت ناقص ناقص کھاتے ہیں پس درحقیقت اُن کی ناقص غذا اور خراب طریقہ زندگی کا اُن کے خون کو سُرخ نہیں ہونے دیتا جس کے اثر سے اُن کا بدن بھی سرخ سفید ہو۔ غذا کو بھی رنگ پر بڑا اثر ہوتا ہے چنانچہ چین اور جاپان والے ایسی غذا کھاتے ہیں۔ اور ایسے طور سے زندگی بسر کرتے ہیں کہ صفرا زیادہ پیدا ہوتا ہے اور اس وجہ سے کہ وہ مادہ خون کی طرف رجوع اور اخراج اُس کا جگر کی راہ سے نہیں ہوتا کھال کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور اسی لئے چینی اور جاپانی زرد رنگ ہوتے ہیں علاوہ اس کے رنگوں کا اختلاف موروثی بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ صد ہا نسلوں میں اختلاف رنگ موروثی ہے۔ مگر اس میں یہ امر تحقیق طلب ہے۔ کہ اختلاف رنگ میں آیا خون زیادہ مؤثر ہے یا ہوا۔ مگر آب و ہوا کا مؤثر ہونا زیادہ ماننے کے لائق ہے چنانچہ جزیرہ لنکا میں کسی زمانہ میں قوم ڈچ کے اور پرتگال کے آدمی رہتے تھے۔ اور اب تک ان کی بہت سی نسلیں وہاں موجود ہیں۔ مگر مثل اپنے آباؤ اجداد کے گورے نہیں ہیں۔ اسی طرح امریکہ کی ریاست متفقہ میں اینگلوسیکشن کی نسل کے جو لوگ آباد ہیں ان کے رنگوں میں بھی فرق آگیا ہے۔

ہوا کی صفائی اور لطافت اور انسان کی محنت بھی رنگ پر مؤثر ہے۔ چنانچہ پہاڑ کے اوپر رہنے والوں کا رنگ بمقابلہ گھاٹیوں اور میدانوں میں رہنے والوں کے زیادہ صاف ہوتا ہے مقام پیرو میں آدمی جس قدر سمندر کی سطح سے اونچے رہتے ہیں اتنا ہی ان کا رنگ صاف ہوتا ہے۔ ہیرا کے پہاڑی ضلعوں کے رہنے والے بالکل انگریزوں کی طرح گورے ہوتے ہیں۔ اور جو نیچے میدانوں میں بود و باش کرتے ہیں وہ اکثر گندمی رنگ ہوتے ہیں ایشیا کی بھی یہی کیفیت ہے کہ جو لوگ

ہمالیہ پہاڑ کے دامن کے ملکوں میں رہتے ہیں اُن کا رنگ بمقابلہ اُن کے جو میدان میں رہتے ہیں بہت صاف ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ زیادہ ٹھنڈی خالص ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ اور خوب محنت کرتے ہیں جس سے خون اُن کا جلد پھرتا اور صاف ہوتا ہے۔ دوسرے مسئلہ کی نسبت کہ انسان کے بدن اور اخلاق پر ہوا اور غذا کا کیا اثر ہے۔ یہ محقق کہتا ہے کہ جو ولایتیں وسط میں قطبین کے واقع ہیں۔ اُن کی ہوا کا اثر انسان کی تمام اندرونی و بیرونی حالتوں پر اچھا۔ اور جو اُن سے دُور ہیں اُن پہ بُرا ہوتا ہے۔ اور جن ملکوں میں غذا کے ذریعے اچھے اور آسانی سے بہم نہیں پہنچتے۔ اور جہاں کے رہنے والے دودھ اور گوشت پر قناعت کرتے ہیں اور جن کو گیہوں اور میوے میسر نہیں۔ اکثر وہ بہ نسبت اُن ملکوں کے باشندوں کے جن کو غذا ہر قسم کی میسر ہے اور جو بفراغ بال ہر قسم کی غذائیں استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر خوش رنگ اور خوش صورت اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ اور فاسد خلطیں بڑھتی ہیں۔ اس بیان میں اُس محقق نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جو زیادہ توجہ کے لائق ہو۔ یا اُس زمانہ کی حکیمانہ تحقیق کے سامنے کچھ مفید معلوم ہو۔ آب و ہوا کا اثر بلاشبہ قوموں کی اندرونی و بیرونی حالتوں پر بہت مؤثر ہے اور غذا کی تاثیر سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر صرف یہی دو سبب انسان کی اندرونی و بیرونی حالتوں پر مؤثر نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ اور بھی سبب ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے فلسفیوں نے چار چیزوں کو سب سے زیادہ مؤثر قرار دیا ہے۔ اوّل زمین۔ دوسرے آب و ہوا۔ تیسرے غذا۔ چوتھے قدرت کے عام ظہور[1]۔

ایک یورپین فلسفی لکھتا ہے کہ ملک کی اراضی کا بارآور و زرخیز ہونا انسان کی حالتوں پر بہت اثر کرتا ہے۔ چنانچہ جن ملکوں کو بہت جلد اور اوّل ہی اوّل ترقی نصیب ہوئی وہ سب بارآور تھے۔ مصر اور ہندوستان اور ایشیائے کوچک کے رہنے والوں کی حالتیں ابتدا ہی سے ترقی پر رہیں۔ اور غیر آباد اور ویران ملک مثل تاتار اور تبت اور عرب وغیرہ کی حالتیں اچھی نہ رہیں۔ اور اگر ان قوموں میں سے کسی نے ترقی کی۔ تو اُسی حالت میں جب کہ وہ اور بارآور و زرخیز ملکوں پر قابض ہوئی۔

زمین کی نسبت آب و ہوا کو انسان کی حالتوں پر بہت زیادہ دخل ہے۔ جن ملکوں کی آب و ہوا اچھی ہے۔ وہاں کے لوگ قوی اور توانا اور تندرست اور محنتی اور صاحب استقلال ہوتے ہیں۔ اور اگر زمین کم بارآور ہو تو اُسے اپنی عقل اور محنت سے بہت درست کر لیتے ہیں۔ بلکہ زمین کی تاثیر یہ ہے کہ انسان کو ایک درجہ پہنچا کر آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ اور آب و ہوا

[1] قدرت کے عام ظہوروں سے وہ تمام مخلوق اور قدرتی پیداوار مراد ہے جو ہر ایک ملک میں موجود ہوتی ہے۔

ہمیشہ انسان کو ترقی دیتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور آور بار آور گرم ملکوں کی ترقی ایک درجہ پر پہنچ کر آگے نہ بڑھی۔ اور جن ملکوں کی آب و ہوا نہایت عمدہ ہے جیسے یورپ ان کی ترقی کسی حد پر پہنچکر نہ رکی ٭

ایک دوسرا فرانسیسی عالم لکھتا ہے کہ مصر اور ہندوستان میں اصول ترقی کے ایک ہی طرح اور ایک ہی قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اور اسی لئے وہاں کے لوگوں کی مجموعی حالت ایک درجۂ خاص پر ٹھہر گئی۔ اور اس سے آگے نہ بڑھی۔ ان کے تمام حالات اور معاملات میں ایسا یکساں طریقہ پایا جاتا ہے جس سے طبیعت پژمردہ ہوتی ہے۔ ملک ویران اور برباد تو نہیں ہوا۔ مگر لوگوں کی مجموعی حالت کے وجود کا یہ حال ہو گیا۔ کہ اس میں حس و حرکت نہ رہی۔ اور برف کی مانند جم گیا۔ ہندوستان کے قدیم باشندے ہندوؤں پر تو یہاں کی آب و ہوا اپنا پورا پورا اثر کر چکی تھی مگر اس کے نو وارد مسلمانوں کی علمی اور عقلی اور اخلاقی حالتوں پر بھی اس کا ویسا ہی اثر ہوا۔ چنانچہ اب ان کی شائستگی کے اصول اس پرانے ملک کے باشندوں کے اصول سے ایسے مشابہ ہو گئے ہیں کہ دونوں میں تمیز کرنی نہایت مشکل ہے۔ ان کے علمی اور عقلی اور اخلاقی اصول میں جو اصلی قوت تھی وہ باقی نہ رہی۔ اور نہ ان کے دلوں کی تحریک دینے والی کوئی دوسری قوت بجائے اس کے قائم ہوئی۔ اُن کا انتظام۔ ان کا تمدن ان کا علم ایسا بے حس و حرکت ہو گیا کہ کچھ بھی جان اس میں باقی نہ رہی۔ ایک عالم ہندوستان کے علوم و اخلاق کی نسبت لکھتا ہے کہ "اُن سب میں ایک ہی طرز و طریقہ ایک ہی پایا جاتا ہے اور وہ سب واقع و احساس کے نتیجے اور خیال واحد کے مظہر معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی مذہبی کتابوں اخلاقی تصنیفوں تاریخی روایتوں میں جو بات پائی جاتی ہے وہی ان کی عقل کے کاموں اور علمی کتابوں اور رسم و رواج اور قاعدوں میں جلوہ دکھاتی ہے" یہ مضمون ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی ویسا ہی صادق آتا ہے جیسا کہ ہندوؤں پر۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تمام حالتوں میں وحدت اور یک رنگی موجود ہے۔ ان کے علوم۔ ان کے خیالات۔ ان کے جلسے۔ ان کے دستور۔ ان کے قاعدے اُسی ایک خاص اور ترقیوں کے مزاحم اصول کے پابند ہیں۔ جو ہندوستان کی زمین کا پھل ہے یعنی رسم کی پیروی اور باطل اوہام ٭

آب و ہوا کے علاوہ غذا بھی انسان کی حالتوں پر بہت مؤثر ہے۔ جن ملکوں میں غذا آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔ جیسے ہندوستان۔ وہاں ترقی بھی اول اول ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ نقصان ہوتا ہے کہ آئندہ وہ بڑھنے نہیں پاتی۔ اس لئے کہ حاجت سے زیادہ آدمی موجود ہوتے ہیں۔ اور ان کی آمدنی اور کمائی بہت تھوڑی۔ اور دولت نہایت غیر مساوی تقسیم ہوتی ہے۔ بخلاف اُن ملکوں کے جہاں غذا کم ملتی ہے۔ ہر شخص اپنے واسطے کماتا ہے اور آدمیوں کے کم ہونے

سے صنعتوں اور کاریگروں کی طرف ہر شخص رجوع کرتا ہے اور بیجان قوتوں سے جاندار کی قوت کو مدد پہنچاتا ہے ۔

قدرت کے عام ظہوروں کی نسبت اس مورخ نے کچھ نہیں لکھا اور اس میں وہ معذور تھا کیونکہ اُس کے زمانہ میں خیالات ایسے وسیع اور روشن نہ تھے کہ ایسے سببوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا۔ مگر اس زمانہ میں انسان کی حالتوں پر تینوں سببوں مذکورہ بالا سے بڑھ کر یہ سبب مؤثر قرار دیا گیا ہے اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔ چنانچہ ایک یورپین لکھتا ہے۔ کہ "قدرت کے عام ظہوروں کا اثر لوگوں کی ترقی پر تینوں چیزوں مذکورہ بالا سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام قوم کی عادت اور خصلت انہیں سے قائم اور منقرر ہوئی ہے جس کا پھر بدلنا سخت مشکل بلکہ غیر ممکن ہے اس کا ثبوت یونانِ قدیم اور ہندوستان کے حالات کے مقابلہ کرنے سے بخوبی حاصل ہوتا ہے یعنی ہندوستان میں بہت بڑے بڑے پہاڑوں اور جنگلوں اور دریاؤں اور بیابانوں کے ہونے اور زلزلوں اور طوفان کے آنے اور اور ایسی عجائبات قدرت کے واقع ہونے سے جن سے آدمی کی عقل حیران اور ششدر رہ جائے ہندوستان کے باشندوں یعنی ہندوؤں کی عقل ابتدا ہی سے دنگ رہ گئی وہ اُن کے اسباب اور قوانین دریافت نہ کر سکے۔ اس سے اُن کو اپنے ناچیز اور حقیر ہونے کا خیال بندھ گیا۔ اور شروع ہی سے ہمت ہار گئے جس کا بہت بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان عجائبات سے حیران ہو کر وہم و خیال میں پڑے اور ان کی قوت خالیہ کو ازبس تحریک اور برانگیختگی ہوئی۔ ہر شے کے سبب اور اثر کو دریافت کرنے میں عقل نہ دوڑائی۔ بلکہ وہم و خیال سے کام لینا شروع کیا۔ غرضکہ عقل کو کمال افسردگی ہوئی۔ اور خیال کو عقل پر بدرجۂ غایت غلبہ ہوا۔ اور ان لوگوں کی طبیعتوں میں معقول اور سنجیدہ باتوں سے اجتناب اور عجیب و غریب اور مہیب چیزوں سے رغبت اور شوق پیدا ہوا۔ یہ قوت خالیہ ہی کے غلبہ کا باعث ہے کہ تمام بڑی بڑی کتابیں مثل رامائن اور گیتا اور مہابھارت اور جبر و مقابلہ اور حساب اور صرف نحو کے رسالے سنسکرت کے سب کے سب نظم میں تصنیف ہوئے اور عجیب عجیب شکلیں دیویوں کی قائم اور ایجاد ہوئیں اور بہت سے خیالی رسم و رواج جن کو عقل تسلیم نہیں کرتی جاری ہوئے اور یونان کا یہ حال تھا کہ وہاں قدرت کے ظہور نہایت نرم اور ملائم طور سے ہوتے جن کے دیکھنے بھالنے سے یونانیوں کو کچھ افسردگی اور حیرت نہ ہوئی۔ اور ان کے دلوں میں آدمی کے حقیر اور ناچیز ہونے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ بلکہ قدرتی اشیا کو پیچیدہ اور پریشانی انگیز نہ پا کر ان کی عقل کو جرأت اور مستعدی ہوئی۔ چنانچہ قدرتی ظہوروں کے سبب اور اثر معلوم کرنے میں کوششیں کیں۔ غرض کہ ان میں خیال کو پستی اور عقل کو فروغ اور فوقیت رہی جس کا یہ عمدہ نتیجہ ہوا

کہ ان کے ہاں بڑے بڑے حکیم اور عالم اور فاضل اور مدبر ہوئے۔ اور وہ عمدہ عمدہ تصنیفات اور کتابیں چھوڑ گئے۔ دولت اور تجارت کو بڑی ترقی ہوئی۔ اُن کی قوم عقل و حکمت کی پابند ہوئی جس کو روز بروز ترقی ہوتی چلی گئی۔ اس طرح سے قدرت کے ظہوروں کا عجیب و غریب نہ ہونا اہل یورپ کی ترقی کے حق میں بڑا مفید کارآمد ہوا یعنی وہم اور خیال کو ان میں رونق نہ ہوئی جس سے انسان ناامید ہو کر اپنی ترقی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور عقل آزمائی اور سعی اور کوشش سے باز آتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں ہوا۔ یورپ میں ہندوستان کے برخلاف ہوا۔ جس کا عمدہ اثر روز بروز ظہور پذیر ہوتا جاتا ہے

قومی عزت

ہم اس کتاب کو قبول کرتے ہیں کہ کسی اگلے زمانہ میں مسلمان علوم کے عالم اور فنون کے ماہر تھے۔ اور تہذیب اور شائستگی اور انسانیت کو بذریعۂ تعلیم و تعلم کے انہوں نے بخوبی حاصل کیا تھا لیکن اب ان کو غور کرنا چاہیئے کہ آیا فقط اس بات کا ثابت کر دینا ہماری عزت کے لئے کافی ہے یا ہم کو اس پر فخر و ناز کرنا زیبا ہے یا دوسری قوموں کی نظروں میں یہی امر ہماری عزت کے لئے بس ہے یا تہذیب و شائستگی پر ہمارے یہی ثبوت کافی ہے اگر ایسا ہے تو ہم اپنی عزت کے ثبوت میں موٹی موٹی کتابیں لکھ دیں اور تمام دنیا کی قوموں کے اچھے اچھے نامی آدمیوں کی سند سے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیں لیکن حقیقت میں یہ کافی نہیں ہے بلکہ ہماری حالت موجودہ ہی عزت اور ذلت کی باعث ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی حالتِ موجودہ پر نظر کرنی چاہیئے کہ آیا آج ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے یا نہیں ۔ چنانچہ اس امر کے لئے ہمیں اپنی ملکی اور قومی تعلیم پر لحاظ کرنا چاہیئے کیونکہ علم ہی عزت اور ذلت کی کسوٹی ہے پس اگر ہماری تعلیم آج کل اور قوموں سے بہتر ہو اور دنیا کے اور ملکوں کے رہنے والے ہمارے علوم کی قدر و منزلت کرتے ہوں اور ہمارے ملک سے علوم و فنون کی تحصیل کرتے ہوں تو بے شک ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ملکی فخر اور قومی عزت کا ہم کو نام لینا بھی زیبا نہیں ۔

ہم کو اپنی قومی عزت ظاہر کرنے کے لئے اتنی بات ثابت کر دینا ہی کافی نہیں ہے کہ جو علوم ہمارے بزرگوں نے نکالے یا اور قوموں سے لیکر اپنے ہاں جاری کئے تھے وہ ہم میں جاری

ہیں اور جن علوم و فنون کی ان کے زمانہ میں تعلیم ہوتی تھی وہی ہماری قوم میں رائج ہیں کیونکہ عزت اور ذلت اور ترقی اور تنزل امور اضافی ہیں ان کا اطلاق بلحاظ حالات زمانہ کے ہوتا ہے پس ہمارے بزرگوں کو علوم و فنون کے سبب سے جو عزت تھی وہ اُس زمانہ کے موافق تھی کیونکہ جو علوم و فنون اُس وقت اور قوموں میں جاری تھے ان سب کو انہوں نے سیکھا اور علم و ہنر کے خزانے جو اور ملکوں میں گڑے ہوئے تھے اُن پر رسائی حاصل کی اور جو پرانے جواہر تھے ان کی جلا کاری کی اور اُن کو تراش خراش سے چمکا کر خوبصورت بنایا۔ اور پھر بہت سے بیش قیمت علم کے نئے جواہر خود تلاش کئے آخر اُن کا خزانہ علوم و فنون کا ایسے شاہوار موتیوں اور نایاب جواہر سے بھر گیا جن سے اور قوموں کے خزانے خالی تھے۔ لیکن چونکہ اب ہمارے زمانہ میں علم و ہنر کو اور قوموں نے نہایت ترقی پر پہنچایا اور علوم و فنون کے نورانی چہرہ سے پردہ اور حجاب اٹھا دیا ہے اور اس دریائے ناپیدا کنار میں سے اور بہت سے نئے نئے اور عمدہ عمدہ موتی و جواہر ڈھونڈ کر نکالے ہیں۔ پس اگر ہمارے علوم و فنون ان سے بڑھ کر ہوں اور ہمارے ملک اور قوم کے لوگ علم و فنون میں اور قوموں پر فائق ہوں تو بے شک آج ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے لیکن چونکہ یقینی معلوم ہے کہ بمقابلہ یورپ کے یہ فخر و عزت ہمارے ملک کو حاصل نہیں ہے اس لئے اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ آیا مثل اُن کے علوم و فنون میں ہم کو دستگاہ بھی ہے یا نہیں اور جو صورت تعلیم کی اس ملک میں ہے وہ ہمارے ملک میں بھی ہے یا نہیں اگر ایسا ہو تب بھی برابری کا دعوےٰ ہم کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم اپنی ملکی تعلیم پر لحاظ کرتے ہیں اور اپنے ہاں کے علوم و فنون پر نظر کرتے ہیں۔ تو ملکی فخر و عزت کا دعوےٰ کرنا کیسا اپنی جہالت اور نادانی کے خیال سے اور اپنی بے تہذیبی کے لحاظ سے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ طبیعت بے اختیار چاہتی ہے کہ کاش ہم اس ملک سے منسوب نہ ہوں اور ہم کو کوئی اس قوم سے نسبت نہ کرے کیونکہ ہم بجائے اس کے کہ کچھ پیدا کرتے اپنے بزرگوں کی کمائی ہوئی دولت کو کھو بیٹھے اور علم کی دولت میں ترقی کرنے کے بدلے بزرگوں کے پیدا کئے ہوئے سرمایہ کو بھی ہم نے ضائع کر دیا۔ ایسی غفلت کی نیند میں سوئے کہ ہمارے بزرگوں کے سرمایہ کو اور لوگ لے گئے اور ہم خالی ہاتھ رہ گئے اور دنیا کی اور اقبالمند قومیں تو علوم و فنون میں اعلےٰ درجہ کی ترقی کر گئیں اور ہم ذلت اور نکبت کی حالت میں مبتلا ہو گئے پس اب ہم کو اپنی ذلت کی حالت پر رونا چاہیئے نہ کہ اپنے بزرگوں کے ناموں پر مغرور ہونا۔

یہ ملکی ذلت اگرچہ نہایت قابل افسوس کے ہے مگر جب سلسلہ کلام کا قومی ذلت پر پہنچتا ہے اور خاص مسلمانوں کی تعلیم پر نظر کی جاتی ہے تو نہ زبان سے کچھ کہا جاتا ہے نہ قلم سے کچھ لکھا جاتا ہے کیونکہ اور قومیں ہمارے ملک کی کچھ کچھ خواب غفلت سے بیدار ہوتی جاتی ہیں اور تعلیم اور تربیت

پر اپنی مستعدی ظاہر کرتی ہیں گو ان کو اب تک کچھ کامل ترقی نہیں ہوئی۔ مگر بعض بعض قوموں کے آثار نیک نظر آتے ہیں اور ان کی عزت اور بہتری کے سامان دکھلائی دیتے ہیں مگر مسلمانوں کے حال پر افسوس اور ہزار افسوس ہے کہ ان کی آنکھوں میں غفلت کی نیند ویسی ہی بھری ہوئی ہے۔ اور ان کے چونکنے اور جاگنے کی کوئی نشانی اب تک دیکھنے میں نہیں آتی کیسے افسوس کی بات ہے کہ بجائے اس کے کہ آج کیمبرج یونیورسٹی کے موافق مسلمانوں کا کوئی عربی مدرسہ علوم کا دلی میں ہوتا یا مثل اکسفورڈ یونیورسٹی کے ہماری تربیت کے لئے کوئی دار العلوم لکھنؤ میں ہوتا اور جو علوم و فنون ان یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان کے ذریعہ سے سکھلائے جاتے ہیں ہم مسلمانوں کے مدرسوں میں بھی بذریعہ عربی یا دیسی زبان کے تعلیم کئے جاتے کوئی چھوٹا سا مکتب بھی تو نظر نہیں آتا جس میں کسی قسم کے علم و فن کی تعلیم ہوتی ہو۔ اور کسی شہر میں ایک بھی مقام تو ایسا سننے میں نہیں آتا جہاں کچھ بھی تہذیب و شائستگی کی باتیں سکھائی جاتی ہوں ٭

اگر ہم عربی یا دیسی زبان سے بھی قطع نظر کریں اور اپنے بھائیوں کو اس لائق بھی نہ جانیں لیکن اس غفلت کی کیا انتہا ہے کہ جو مدرسے گورنمنٹ نے ہماری تعلیم کے لئے جاری کئے۔ اور جن میں اور علوم و فنون کی تعلیم ہمارے ملک کے فائدے کے لئے شروع کی ان میں بھی ہماری قوم کے آدمیوں کی صورتیں کم ہی دکھائی دیتی ہیں اور مسلمان لڑکے تعلیم کے لئے بہت ہی تھوڑے جاتے ہیں ٭

ہم نے مانا کہ ہم مسلمانوں کو اب علوم و فنون کے ایجاد کرنے کی قوت اور کیمبرج اور اکسفورڈ یونیورسٹی کے موافق علوم کے مدرسے جاری کرنے کی قدرت باقی نہیں رہی بلکہ کسی ادنے درجہ کی تعلیم کے واسطے بھی ابتدائی مدارس کے مقرر کرنے کی ہمت نہیں ہے لیکن وہ کونسی چیز ہے جو سرکاری کالجوں اور گورنمنٹ اسکولوں میں جانے کے لئے مسلمانوں کے لڑکوں کے پاؤں کی زنجیر ہے اور وہ کونسی بات ہے جو ان کو اس ابتدائی تعلیم کے حاصل کرنے کی مانع ہے پھر اس سے بھی زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ سب کے سب آنکھ پر پردہ غفلت کا ڈالے ہوئے اور منہ پر خاموشی کی مہر لگائے بیٹھے ہیں نہ کسی کے دل میں تعلیم کے موانع کا خیال آتا ہے نہ کوئی زبان اپنی اس علمی تنزلات کے اسباب بیان کرنے کے لئے کھولتا ہے سب کے سب چپ چاپ خاموش بیٹھے ہوئے ہیں ٭

تدبیر و اُمید

عالم اور غیر سب اس قاعدہ قدرت کے قانون کا کہ ہر ایک چیز کے ہونے کے لئے اُس سے پہلے ان چیزوں کا ہونا ضرور ہے جو کہ اس کے ہونے کے لئے ایک ضروری سبب ہیں ایسا ہے کہ کوئی چیز مادی ہو یا غیر مادی۔ خارجی ہو یا ذہنی اُس سے مستثنےٰ نہیں جتنی چیزیں ہماری آنکھ کے سامنے آتی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو ان چیزوں کے بغیر ہو گئی ہو جو اس کے ہونے کے لئے قدرۃً مقدم ہیں۔ جتنے خیالات ہمارے ذہن میں گذرتے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کی۔ پہلے وہ باتیں ہمارے ذہن میں نہ آ یا تی ہوں جو اس خیال کے پیدا ہونے سے پہلے عادۃً ضروری ہیں جتنی چیزیں ہیں ان میں قدرت نے باہم ایسا تسلسل اور ارتباط رکھا ہے کہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری پیدا ہوتی ہے پس ہر چیز کے حاصل کرنے کے لئے ان چیزوں کا پہلے مہیا کرنا جو اُس کے لئے بطور آلات اور معدات اور مقدمات کے ہیں تدبیر ہے اور ان کے مہیا کرنے پر اُس چیز کے حاصل ہونے کی توقع کرنا امید ہے۔ اور بغیر اسباب کے کسی چیز کے پیدا ہونے کا خیال کرنا جنون و نادانی ہے اور بلا مہیا کرنے ان اسباب کے اس شے کے حاصل ہونے کی توقع کرنا حماقت ہے اور جو چیزیں کسی چیز کے ہونے کی اصلی سبب نہ ہوں اُن سے اس شے کے ہونے کی توقع کرنا تدبیر کی غلطی ہے

یہ بات جو ہم نے بیان کی اُسے نادان سے لے کر کامل حکیم تک اور جاہل سے لیکر عارف بلند تک اور ملحد سے لیکر شارع تک سب نے تسلیم کیا ہے اور سب مانتے چلے آئے ہیں اور ہم سب ہر وقت اور ہر لحظہ ہر چیز میں اس قاعدہ کا برتاؤ دیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم اسے ایک صاف اور روشن مثال میں سمجھاتے ہیں دیکھو ایک دہقان غلہ پیدا کرنے کے لئے کیا کرتا ہے۔ اور اُسے غلہ حاصل کرنے سے پہلے کس کس چیز کا مہیا کرنا ضرور ہوتا ہے۔ وہ پہلے وہ اچھی زمین تلاش کرتا ہے۔ جس میں زراعت کی قابلیت ہو پھر وہ ان آلات کو جمع کرتا ہے جن کی زمین بنانے کے لئے ضرورت ہے۔ پھر وہ ان آلات کو کام میں لاتا ہے اور جو خود رَو گھاس یا پرانی کھیتی کی بیکار اور نکمی چیزیں اُس میں پڑی رہ جاتی ہیں ان کو صاف کر کے زمین کو اصلی ہیئت پر لا کر اُسے بناتا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ کس جنس کی اس وقت ضرورت ہے۔ تاکہ لوگوں کی حاجت رفع ہو اور مجھے قیمت ملے۔ آخر وہ مختلف جنسوں میں سے ایک یا چند چیزوں کو اختیار کر کے اُس کا عمدہ بیج ڈھونڈتا ہے۔ اور مختلف دوکانوں مختلف بازاروں میں خود پھر پھر کر

اُسے تلاش کرتا ہے اور اپنے نزدیک وہ ایسا بیج جو نہ سڑا ہو نہ گلا۔ نہ بوسیدہ ہو نہ ناقص سوائی قیمت دیکر لیتا ہے۔ پھر اُسے ایک اندازہ معین سے زمین میں ڈالتا ہے۔ پھر اُسے مٹی میں ملا کر چھپا دیتا ہے پھر اُگنے کے بعد وقتاً فوقتاً پانی دیتا ہے۔ اور جو خودرو گھاس پیدا ہو جاتی ہے اُسے دُور کرتا رہتا ہے پھر سب سے زیادہ اُسے اُس وقت حفاظت کرنی پڑتی ہے جبکہ دانہ پڑتا ہے اور جس کے کھانے کیلئے چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے ہیں۔ پھر جب ان تدبیروں کے کرنے کے بعد اُسکی کھیتی ارضی و سماوی آفات سے محفوظ رہے اور ان باتوں سے جو اُس کے اختیار سے خارج ہیں خدا نے اس کی زراعت کو بچا یا تب وہ ایک ایک دانہ کے سو سو اور ہزار ہزار حاصل کرتا ہے اور اپنی محنت اور تدبیر کا ثمرہ پاتا ہے پس ان چیزوں کا مہیا کرنا اور اُس تسلسل اور ارتباط اور ترتیب کا لحاظ رکھنا تدبیر ہے اور بعد اس کے پھل پانے کی توقع کرنا سچی امید ہے اور ان میں کسی چیز کا چھوڑ دینا یا کسی ترتیب ارتباط میں چوک جانا یا کسی امر کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ نہ کرنا یا وقت پر کسی چیز کو استعمال میں نہ لانا تدبیر کی غلطی ہے اور کسی چیز کا باوجود سعی کے نہ ملنا یا کسی اتفاقی امر کا پیش آجانا یا کسی ارضی و سماوی آفت سے اُس زراعت کا خراب ہو جانا تقدیر کی مخالفت ہے ❊

اب ہم تدبیر و امید کو اپنی قوم کے حال سے ملاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی ترقی کی اُمید کرتے ہیں اور جیسے وہ اُس کی تدبیر کر رہے ہیں وہ حقیقت میں سچی امید اور پوری تدبیر ہے یا نہیں۔ چنانچہ ہماری قوم میں ایسا تو کوئی نہیں جو اپنی ترقی نہ چاہتا ہو یا اپنی دولت و عزت کی امید نہ رکھتا ہو مگر ایسے کم ہیں جو اُس کی تدبیر کرتے ہوں اور جو کرتے ہیں اُن میں بھی ایسے کم ہیں جو اُس میں غلطی نہ کرتے ہوں اور جس ترتیب ارتباط کا لحاظ رکھنا اُس کے لیے ضروری ہے اُس کا خیال رکھتے ہوں ❊

ہاں وہ تدبیر جو کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی ہے ہمارے نزدیک وہ ایسی تدبیر ہے جس کے پورے ہونے پر قومی ترقی کی سچی امید ہے کیونکہ اُس کے بانی نے اول ہی سے قدرتی سلسلہ کا نہایت خیال رکھا ہے۔ وہ پہلے اس بات کے دریافت کرنے پر متوجہ ہوا کہ قومی عزت کا اصلی سبب کیا ہے آخر اُس نے ثابت کیا کہ صرف علم ہے تب وہ اُس کا مستفسر ہوا کہ موانع اُس کے ہماری قوم میں کیا ہیں اس سوال کو اُس نے اپنی تمام قوم میں پیش کیا اور مختلف صوبوں کے مختلف لوگوں سے اس کا جواب لے کر اُن موانع کو تحقیق کر کے ایک انجمن مقرر کی اور نہایت بحث و مباحثہ کے بعد اُن کے دُور کرنے کی تدبیر سوچی۔ آخر سب کے اتفاق سے سوائے قائم کرنے ایک مدرسۃ العلوم کے دوسری صورت قرار نہ پائی چنانچہ اُس نے اُس کی بنیاد ڈالنے کی راہ نکالی۔ اور اس کے قائم

ہونے کے سامان جمع کرنے پر ہمت کی چنانچہ اب تک جو کچھ اُس نے کیا ٹھیک ٹھیک کیا اور وہ ایک ہوشیار دہقان کی چال پر چلا اُس نے زمین بھی اچھی تلاش کرلی ہے اُس جنس کو بھی تحقیق کرلیا ہے جس کی ضرورت ہے اور جو اس وقت بازار میں اچھے نرخ پر بک سکتی ہے اُس کا بیج بھی تلاش کرلیا ہے پس اب اس قدر سرمایہ کا جمع ہوجانا چاہیے جو اُس کی قیمت کے واسطے اور دیگر آلات کے جمع کرنے کے لیئے کافی ہو ❊

یہ ہوشیار دہقان صرف اِس تدبیر کے بتانے ہی پر کفایت نہیں کرتا بلکہ سب کا بوجھ اپنے سر پر اُٹھانے اور ساری محنت کو جو اُس کھیتی میں ہوگی اپنے اوپر لینے پر مستعد ہے۔ وہ اپنی قوم سے صرف یہ چاہتا ہے کہ سامان خریدنے کے لائق سرمایہ جمع کریں اور اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے رہیں جب فصل تیار ہوجاوے تب اُس کا پھل لے لیں ❊

اب میں اپنی قوم کے دلوں پر نظر کرتا ہوں کہ بہ نسبت اُس تدبیر کے اُن کے دلوں میں کیا خیال گذرتے ہیں۔ جہانتک میں واقف ہوں میرے نزدیک بہت ہی تھوڑے آدمی ہونگے جو اس تدبیر کو کامل اور اس تجویز کو عجیب نہ سمجھتے ہوں۔ مگر اُس کے انجام کو ایسا مشکل جانتے ہیں۔ کہ قریب بہ محال سمجھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ یہ فقط ایک خیالی عمارت ہے جو ہوا میں کھڑی کی گئی ہے۔ کوئی فرماتا ہے۔ کہ یہ محض ایک فرضی تجویز ہے جو دل بہلانے کے لیئے کی گئی ہے۔ کوئی اسے گورنمنٹی کا انتظام کہتا ہے۔ کوئی اسے محال اور غیر ممکن بات سمجھتا ہے لیکن یہ سب پست ہمتی کی نشانیاں اور ہمدردی اور محبت قومی نہ ہونے کے نتیجے ہیں کیونکہ یہ سب باتیں دس لاکھ روپیہ کے جمع ہونے پر خیال کی جاتی ہیں حالانکہ یہ روپیہ اُس سے زیادہ نہیں ہے جو ایک بڑے شہر میں ایک برس کے اندر کھیل تماشے میں امراء خرچ کردیتے ہیں اور لڑکوں لڑکیوں کے شادی بیاہ میں برباد کردیتے ہیں پس اگر ہم اپنی قوم کے اصراف تو بہ تو یہ اسراف پر نظر کرکے اس سرمایہ کو زیادہ سمجھتے تو ہم بھی ایک تکلیف مالا یطاق اور تدبیر محال کہتے۔ مگر جب ہم اب بھی اپنے امراء کے جود وسخا کی یہ کیفیت دیکھتے ہیں کہ ایک ایک باہمت ایسے ہیں جو لاکھ لاکھ روپیہ چندہ میں حاکموں کو خوش کرنے کے لئے دیتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس سرمایہ کی بمقابل ان کے حوصلہ کے کیا حقیقت ہو۔ رہا دینا یا نہ دینا۔ یہ ہمدردی اور محبت قومی پر منحصر ہے۔ اس کی نسبت البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا قحط بلا شبہ ہماری قوم میں ہے۔ اگر اُس پر خیال کرکے کچھ مایوسی ہو تو عجب نہیں۔ مگر پھر ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنا اور سعی میں کوتاہی نہ کرنا ضرور ہے۔

السعی منی والاتمام من اللہ ❊

طعام اہل کتاب

محاکمہ مولوی سید احمد خاں کی کتاب طعام اہل کتاب اور اُس کے جواب امداد الاحتساب پر

چند روز ہوئے کہ سید احمد خاں صاحب نے ایک کتاب بہ نسبت حلت طعام اہل کتاب اور جواز مواکلت اُن کی تالیف کی اور مولوی امداد العلی صاحب نے اُس کا جواب لکھا۔ مگر اب تک کسی شخص نے دونوں کتابوں کی نسبت نہ کوئی رائے ظاہر کی نہ اُن کے مضامین کی صحت و غلطی سے بحث فرمائی اس لئے میں نہایت غور و تامل کے بعد اُن دونوں کتابوں کے خاص اہم مسایل کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتا ہوں اور جو کچھ میری ناقص سمجھ میں ان میں غلطی و صحت ہے اُسے لکھتا ہوں ؀

جس شخص نے سرسری نظر سے بھی دونوں کتابوں کو دیکھا ہے وہ سمجھ گیا ہوگا کہ دونوں کتابوں کی تالیف کا اصول مختلف ہے۔ سید صاحب نے اپنی کتاب کو بلا پابندی تقلید کے لکھا ہے اور اپنے اقوال پر کتاب و سنت سے استدلال کیا ہے نہ فقہی کتابوں اور فقہا کے قولوں پر۔ اور اگر کسی مقام پر کسی فقیہ یا عالم کا قول نقل بھی کیا ہے تو صرف واسطے اطمینان خاطر مقلدین کے۔ اور مولوی امداد العلی صاحب نے اپنے رسالہ کو اصول تقلید پر لکھا ہے اسی واسطے اپنے جواب میں اکثر فقہا اور علماء کے فتاوے اور فقہی روایات سے استناد فرمایا ہے اور اپنے کلام کو بہت خوبی سے بسند اقوال علماء مدلل کیا ہے مگر میں اپنی رائے بہ نسبت خوبی اور عمدگی اُس اصول کے ظاہر کرتا ہوں جس کا سید صاحب نے التزام کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک تقلید نہ تحقیق حق کے لئے کافی ہے نہ بمقابل کتاب و سنت کے کسی کا قول ماننے کے لایق ہے۔ مگر چونکہ ہمارے بھائیوں کے نزدیک دنیا میں اب کوئی ایسا آدمی ہی نہیں ہے جو کتاب و سنت سے کسی مسئلہ کا استناد کر سکے یا اُس کے معنی تک سمجھ سکے بلکہ اب ارقیاس کا فیض بھی اُنکے نزدیک اگلے لوگوں پر تمام ہو چکا۔ اس لئے ان کے سمجھانے اور مطمئن کرنے کے لئے اگلی کتابوں اور پرانے عالموں کے اقوال جو مطابق کتاب و سنت کے ہوں نقل کرنا اور اپنے کلام کی تائید و تقویت میں اُسے بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں سمجھتا چنانچہ میں نے اپنے اس محاکمہ میں اسی اصول کا لحاظ کیا ہے ؀

ہیں دونوں کتابوں کے کل مسائل سے بحث نہیں کرتا بلکہ صرف انہیں باتوں سے جو نہایت ضروری اور اہم ہیں اور نہ ان غلطیوں پر توجہ کرتا ہوں جو متعلق اُن خاص مسئلوں کے نہیں ہیں جن کی تحقیق منظور ہے کیونکہ میری غرض اس محاکمہ سے نہ مناظرہ ہے نہ مجادلہ نہ تردید کسی کی بلکہ صرف حق کا ظاہر کرنا ہے اور چونکہ ایک زمانہ ایسا مجھ پر گذرا ہے کہ میں سید صاحب کی تحریر پر معترض اور ان کی تالیف کی تردید کرتا تھا اس لئے میں اپنے اوپر واجب سمجھتا ہوں کہ میں اپنی سچی رائے جو اب ہے ظاہر کروں اور ایک غلط بات کی پیروی کرنے پر جہل مرکب کی بیماری میں مبتلا رہنے سے بچوں ۔

میں اوّل جواز و عدم جواز طعام اہل کتاب سے بحث کرتا ہوں پھر مواکلت سے ساتھ اہل کتاب کے بحث کرونگا ۔

سید احمد خان صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۷ میں ایک حدیث ترمذی سے نقل کی ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے بہ نسبت طعام نصاریٰ کے سوال کیا آپ نے فرمایا کہ لا یتخلجن فی صدرک طعام ضارعت فیہ النصرانیۃ کہ نہ خلجان میں ڈالے تیرے دل کو کوئی کھانا کہ مشابہ ہو گیا تو نصرانی لوگوں کے ۔ اور ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ والعمل علی ھذا عند اھل العلم من الرخصۃ فی طعام اھل الکتاب ۔ کہ عمل ہے اس حدیث پر اہل علم کے نزدیک رخصت اور جواز میں کھانے اہل کتاب کے ۔

مولوی امداد العلی صاحب بہادر اپنی کتاب کے صفحہ ۵ میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ترمذی اگرچہ رخصت طعام اہل کتاب کی سمجھتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس حدیث میں منع ہے کھانے طعام نصاریٰ سے بسبب مشابہت کے ساتھ نصرانیت کے پس ترجمہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ ہے کہ نہ چبھے تیرے دل میں ساتھ شک کے حرمت اس طعام کی کہ مشابہ ہوتا ہو اس میں نصرانیت کے اور اپنے اس قول کی تائید میں سیوطی اور ابوالطیب کے دو قول اور مجمع البحار کی ایک عبارت نقل کی ہے ۔

میری رائے میں سید صاحب کی رائے صواب پر اور مولوی صاحب کی رائے غلطی پر ہے چند وجوہ سے ۔

پہلی وجہ ۔ اگر اس حدیث سے حرمت طعام اہل کتاب ثابت ہو تو وہ مخالف ہوتی ہے نص قرآنی کے جو اہل کتاب کے طعام کی حلت میں نازل ہوئی ہے یعنی آیۃ طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم ۔

دوسری وجہ ۔ چونکہ مشرکین اور بت پرستوں کا کھانا بھی حرام نہیں ہے پس اہل کتاب

کے کھانے کی حرمت کی کوئی وجہ نہیں رہی۔ حلت طعام مشرکین و اہل کتاب کی وہ اگلے لوگوں میں ایسی مشہور اور صاف تھی کہ آیت مذکورہ میں طعام کے معنی ذبیحہ کے اسی لئے لئے گئے ہیں کہ تخصیص اہل کتاب کی ثابت ہو اور کلام الٰہی کا نزول عبث اور بے فائدہ نہ ٹھہرے اگر مقلدین کو الفاظ آیت اور حدیث سے حلت میں طعام اہل کتاب کے شبہ ہو تو وہ مفسرین اور محدثین کے قولوں پر رجوع کریں اور ان اقوال کو جو سید صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۱ اور ۱۴۲ میں نقل کئے ہیں ملاحظہ فرماویں۔ تاکہ طعام اہل کتاب کے حلال ہونے میں شبہ نہ رہے بلکہ خود مولوی امداد العلی صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۷۶ میں جہاں آیۃ طعام الذین اوتوا الکتاب سے بحث کی ہے صاف لکھ دیا ہے کہ "ہاں اس قدر البتہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ طعام اہل کتاب کا کھانا اور ان کو کھلانا جائز ہے" پس جبکہ آیت سے طعام اہل کتاب کا حلال ہونا مولوی صاحب نے قبول فرمایا تو پھر اس حدیث میں ان سب سے اور صاف معنوں سے جو بہ نسبت حلت اور جواز طعام کے ہیں عدول کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی مگر ہاں شاید اس حدیث سے اُس کھانے کی حرمت مراد ہو جس سے مشابہت نصاریٰ کی پائی جاوے اور جو کھانا صرف انہیں سے مخصوص ہو تا کہ مسلمان من تشبہ بقوم فھو منھم کی وعید میں داخل نہ ہوں لیکن کیا خوب ہوتا اگر مولانا صاحب اُس طعام کی کچھ تھوڑی سی تفصیل بھی فرما دیتے تاکہ معلوم ہو جاتا کہ کس کھانے میں تشبہ اُن کا ہے اور کس میں نہیں ۔

تیسری وجہ۔ اسی حدیث کو جسے ترمذی سے سید صاحب نے نقل کیا ہے ابو داؤد نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہے اور جس باب میں اُسے لکھا ہے اُس باب کے عنوان پر یہ تحریر کیا ہے باب کراھیۃ التقذر للطعام یعنی باب مکروہ ہونے میں گھن کرنے سے کھانے میں۔ لیکن اگر اس حدیث کے وہ معنی ہوتے جو مولوی صاحب نے فرمائے تو ابو داؤد کو یہ لکھنا مناسب ہوتا کہ باب مکروہ یا حرام ہونے میں طعام نصاریٰ کے

چوتھی وجہ۔ اس حدیث کو جس طرح سے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں وسالہ رجل فقال ان من الطعام طعاما اتحرج منہ فقال لا یتخلجن فی نفسک شیء اور اس سے حلت طعام ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب پوچھنے والے نے اپنے وسواس اور کراہیت کو بیان کیا اور اس کے جواب میں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ کچھ شک نہ کر تو یہ فرمانا صاف حلت طعام پر اور منع کرنے وسواس پر دلالت کرتا ہے نہ اس کی حرمت پر اور اگر اسی سوال کے جواب میں ان لفظوں سے حرمت کے معنے مراد لئے جاویں اور نبیؐ کے کلام مبین کی ایسی تفسیر کی جاوے تو اُس میں اور تحریف میں کیا فرق ہوگا ۔

پانچویں وجہ واسطے اطمینان خاطر مقلدین کے میں چند عالموں کے قولوں کو بھی نقل کرتا ہوں تاکہ اس سے بھی حلت طعام اور منع وسواس ثابت ہو جاوے ۔

مجمع البحار میں لکھا ہے ۔ قوله لا یتخلجن ای لا یتحرك فیه شیء من الشك ویروی بالحاء ای المهملة واصل الاختلاج الحركة والاضطراب قوله ضارعت ای شابهت النصرانية والرهبانية في تضييقهم وتشديدهم وكيف وانت على الحنيفية السهلة یعنی نہ آوے تیرے دل میں کچھ اور اختلاج نہ ہووے تجھے یعنی حرکت اور اضطراب کیا تو مشابہ ہوگا نصرانیوں اور رہبانیوں کے اپنے اوپر تنگی کرنے اور تشدد کرنے میں اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ تو ایسے دین پر ہے جو سیدھا اور آسان ہے ۔

فتح الودود میں نقلاً عن السیوطی لکھا ہے کہ جملہ ضارعت جواب شرط محذوف ای ان شككت شابهت فيه الرهبانية والجملة الشرطية مستانفة لبيان سبب النهي والمعنى لا يدخل في قلبك ضيق وحرج لانك على الحنفية السهلة فاذا شككت وشددت على نفسك بمثل هذا شابهت فيه الرهبانية یعنی ضارعت جواب ہے شرط محذوف کا اور معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ اگر تو شک کریگا تو مشابہ ہوگا رہبانیت کے اور جملہ شرطیہ واسطے بیان سبب نہی کے ہے اور معنی یہ ہیں کہ نہ آوے تیرے دل میں کچھ تنگی اور شک کیونکہ تو ایسے دین پر ہے جو سیدھا اور آسان ہے پس اگر تو شک کریگا اور اپنے اوپر سختی اور شدت روا رکھیگا ایسی باتوں میں تو مشابہ ہوگا تو رہبانیت کے فقط اور چونکہ نصاریٰ میں رہبانیت جاری تھی اور رہبان حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے اور اُسے نیکی اور عبادت جانتے تھے اور ہر بات میں شک وشبہ کرنے کو زہد سمجھتے تھے اور چونکہ حضرت نے اپنے دین میں ایسے تشدد اور وسواس کو منع کر دیا اس لئے شک کرنے کی حالت میں طعام اہل کتاب کے رہبانیت سے مشابہ فرمایا ۔

مرقات شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ قوله لا یتخلجن معناه بالمهملة لا یدخل في قلبك فيه شيء فانه مباح وبالمعجمة لا يتحركن في قلبك الشك .

غرضکہ ہمارے نزدیک جواز طعام اہل کتاب میں از روئے قرآن و حدیث کے کچھ کلام نہیں رہا یہ امر کہ اہل کتاب سے وہی یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو اپنے تئیں ملت موسوی اور مذہب عیسوی کا مقلد کہتے ہیں یا نہیں چنانچہ سید احمد خاں صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۳ میں اسی امر کے مدعی ہیں مگر مولوی امداد العلی خاں صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۵۵ اور صفحہ ۴۶ میں اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ مراد اس آیت میں وہ اہل کتاب ہیں کہ جن کی عادت تسمیہ کی وقت ذبح کے تھی اور وہ موحدین یہود و نصاریٰ میں سے تھے ۔

میرے نزدیک ثابت کرنا اس امر کا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض نصارے کی عادت تسمیہ کی وقت ذبح کے تھی اور وہ موحدین سے تھے اور بعض کی عادت تسمیہ کی نہ تھی اور وہ مشرکین سے تھے ایسا مشکل ہے کہ سوائے دعوے کرنے کے شاید کوئی عالم اس کو ثابت نہیں کرسکتا کیونکہ کوئی فرقہ نصارے کا ایسا نہ تھا اور نہ ہے کہ جس میں تسمیہ اور عدم تسمیہ کی عادت کا وقت ذبح کے اختلاف ہو ۔

یہ خیال کرنا کہ نصاریٰ بسبب اعتقاد مسئلہ تثلیث کے مشرکین میں ہیں اور اس لئے ذبیحہ اُن کا ناجائز ہے غلطی ہے کیونکہ وہ مدعئے توحید ہیں اور جو کہ مدعئے توحید ہو اُس پر اطلاق شرک نہیں ہوسکتا ۔ علماء حنفیہ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے چنانچہ ہدایہ کی کتاب الذبائح میں لکھا ہے ومن شرطہ ان یکون الذابح صاحب ملۃ التوحید اما اعتقادا کالمسلم او دعوی کالکتابی ۔ اور کفایہ خوارزمی میں اس کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ فانہ یدعی التوحید پس ظاہر ہوا کہ جو شخص مدعی توحید ہو مثل یہود و نصارے کے اُس کا ذبیحہ ویسا ہی جائز ہے جو کہ موحد ہو اعتقاداً پھر اس کی تائید صاحب ہدایہ کے دوسرے قول سے ہوتی ہے وہ یہ ہے وذبیحۃ الکتابی والمسلم حلال لما تلونا ولقولہ تعالیٰ وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم والاطلاق الکتابی ینتظم الکتابی الذمی والحربی والعربی والتغلبی لان الشرط قیام الملۃ علی ما مر اس سے ظاہر ہے کہ کتابی کا اطلاق سب اہل کتاب پر ہے خواہ وہ ذمی ہوں یا حربی عربی ہو یا تغلبی اور ان کا ذبیحہ جائز ہے کیونکہ قیام ملت واسطے جواز ذبح کے شرط ہے اور پھر صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ ولا توکل ذبیحۃ المجوسی لانہ لا یدعی التوحید فانعدمت الملۃ اعتقادا و دعوی کہ ذبیحہ مجوسی کا کھانا جائز نہیں کیونکہ وہ توحید کا دعوے نہیں کرتا پس ملت معدوم ہے اعتقاداً اور نیز دعوے اور اس کی تائید عینی شرح صحیح بخاری کے قول سے بھی ہوتی ہے ۔ فقال ھذہ الآیۃ فی معرض استدلال علی جواز اکل ذبائح اھل الکتاب من الیہود والنصاریٰ من اھل العرب وغیرہ لان المراد من قولہ تعالیٰ ذبائحھم قال ابن عباس وابو امامۃ و مجاھد وسعید بن جبیر وعکرمۃ وعطاء والحسن والمکحول وابراھیم النخعی والسدی ومقاتل بن حیان وھذا امر مجمع علیہ بین العلماء ان ذبائحھم حلال للمسلمین لانھم لا یعتقدون الذبح لغیر اللہ تعالیٰ ولا یذکرون علی ذبائحھم الا اسم اللہ وان اعتقدوا فیہ ما ھو منزہ عنہ ۔ اگرچہ حلت ذبیحہ اہل کتاب میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اگر تسمیہ اور عدم تسمیہ پر وقت ذبح کے لحاظ کیا جائے تو ابو داؤد کی حدیث پر رجوع کرنا چاہئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکم تسمیہ وقت ذبح کے اہل کتاب سے متعلق نہیں ہے ۔ چنانچہ وہ حدیث ابن عباس کی ابو داؤد سے سید احمد خان صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ میں نقل کی ہے ۔ قال

فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ فنسخ واستثنیٰ من ذالک فقال طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم یعنی یہ آیت کہ نہ کھاؤ تم اُس چیز سے جس پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو منسوخ ہوئی اور کھانا اہل کتاب کا بموجب آیت طعام الذین اوتوا الکتاب کے مستثنیٰ ہوگیا مولوی امداد العلی صاحب بھی اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۳ میں اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس قول ابن عباس سے یہ نہیں نکلتا ہے کہ اہل کتاب کے ذبح میں موافقت ہمارے قواعد ذبح کی شرط نہیں ہے کہ ذابح کتابی ہو یا مسلم جیسا کہ مذہب ابن عباس کا ہے کہ متروک التسمیہ مطلقاً عمداً ہو یا سہواً اُن کے نزدیک حلال ہے اگرچہ بعد اس کے مولوی امداد العلی صاحب نے عمداً متروک التسمیہ کی حرمت ثابت کی ہے لیکن اس قول کو حضرت ابن عباس نے تسلیم کیا ہے اب ہم اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ایک جماعت عام صحابہ و تابعین کی آیۃ لا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ کے منسوخ ہونے کی قایل ہے جیسا کہ تفسیر ابن الکمال میں لکھا ہے وروی عن ابی الدرداء وعبادۃ ابن الصامت وجماعۃ من التابعین انھا منسوخۃ لقولہ تعالیٰ وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم واجازوا ذبائح اھل الکتاب وان لم یذکر اسم اللہ علیھا ولا نسی ذالک تحایل ھو تخصیص اور روایت خطابی سے شرح سنن ابوداؤد میں بذیل حدیث حضرت عائشہ رض کے عدم شرط ہونا تسمیہ کا ثابت ہوتا ہے کما قیل فیہ دلیل علی ان التسمیۃ غیر شرط علی الذبیحۃ لانھا لو کانت شرطا لم تجز الذبیحۃ بالامر المشکوک فیہ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ترک تسمیہ سے عمداً ہو یا سہواً حرمت ذبیحہ نہیں ہوتی وہ دو دلیلیں بیان کرتے ہیں۔ اوّل ایک حدیث پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی جسے صاحب ہدایہ نے نقل کیا ہے المسلم یذبح علی اسم اللہ تعالیٰ سمّیٰ اولم یسم کہ مسلمان خدا ہی کے نام پر ذبح کرتا ہے خواہ اُس نے وقت ذبح کے تسمیہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ دوسرے ترک تسمیہ کا سہواً باعث حرمت ذبیحہ نہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ تسمیہ حلت ذبیحہ کے لئے شرط نہیں جیسا کہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے ولان التسمیۃ لو کانت شرطا للحل لما سقطت بعذر النسیان کالطھارۃ فی باب الصلوٰۃ ولو کانت شرطا فالملۃ اقیمت مقامھا کما فی الناسی کہ اگر تسمیہ واسطے حلت ذبیحہ کے شرط ہوتا تو وہ شرط بعذر بھول کے ساقط نہ ہوتی جیسے کہ طہارت نماز کے لئے ہے اور اگر تسمیہ شرط بھی ہو تو ملت اور مذہب ہی قائم مقام تسمیہ کے ہے جیسے تسمیہ کے بھولنے والے کے ذبیحہ کی نسبت سمجھا گیا ہے پس موافق قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی تسمیہ شرط ذبیحہ نہیں غیر مقلدین کو ہر مسئلہ میں تقلید کسی امام کی لازم نہیں پس ترک تسمیہ کو شرط ذبیحہ نہ جاننے سے

زیادہ اُس سے کوئی الزام نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ امام شافعیؒ یا اُن کے مقلدین کی نسبت دیا جاسکتا ہے۔

سید صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۶ میں حدیث ابو داؤد کی سند پر جو اوپر مذکور ہوئی یہ لکھا ہے کہ اگر اہل کتاب کسی جانور کی گردن توڑ کر مار ڈالتا یا سر پھاڑ کر مار ڈالتا ذکوٰۃ سمجھتے ہیں تو ہم مسلمانوں کو اس کا کھانا درست ہے۔ اس کے جواب میں مولوی امداد العلی صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۶۳ میں لکھا ہے کہ اس روایت سے صرف یہ نکلتا ہے کہ تسمیہ ذبح میں شرط نہیں ہے میرے نزدیک اس مسئلہ میں سید احمد خاں صاحب نے بڑی غلطی کی ہے کیونکہ جو دعوےٰ اُنہوں نے کیا ہے وہ اس روایت سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور کتابی کا ذبیحہ بلا تسمیہ کے جائز ہونے کے سوائے اس قول سے اور کچھ نہیں نکلتا اور چونکہ منخنقہ[۱] کی حرمت صراحتہً ایک دوسری آیت محکم سے ثابت ہے اور اس کی تخصیص یا تنسیخ کسی دوسری آیت سے نہیں ہوئی تو تعجب ہے کہ کیونکر انہوں نے اس روایت سے یہ خیال کیا کہ اہل کتاب کا گردن مروڑ کر مار ڈالنا بھی ذبیحہ میں داخل ہے اور جو قول ابن عربی اور معیار کا انہوں نے نقل کیا ہے وہ ایک عالم کی رائے[۱] ہے جو قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ سے مخالف ہے اس لئے ہم کو کچھ اعتبار نہیں۔

پھر سید صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۱۲ میں لکھتے ہیں کہ طعام اہل کتاب میں ہم کو تفتیش اس بات کی کرنی کہ کس نے ذبح کیا اور کیونکر ذبح ہوا ہے کچھ حاجت نہیں۔ بجواب اُس کے مولوی امداد العلی صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۶۷ میں لکھتے ہیں کہ جب نصاریٰ ہمارے ملک کے ذبح نہیں کرتے اور کسی جانور کا گوشت ہو اور کسی کا مارا ہوا ہو کھا لیتے ہیں تو اہل اسلام کو جب اُن کے یہاں کا گوشت پکا یا کچا سامنے آوے تفتیش اس کی بہت ضرور ہے ہمارے نزدیک اس میں بھی رائے سید احمد خاں صاحب کی خطا پر ہے اُن کو سوچنا چاہئے تھا کہ ذبیحہ مشرکین کا قطعاً حرام ہے اور اکثر مشرکین مثل چمار وغیرہ کے باورچی انگریزوں کے ہوتے ہیں اور پرند جانوروں کو وہی باورچی گردن مروڑ کر مار ڈالتے ہیں تو بغیر تفتیش کے ایسے پرند جانوروں کا کھا لینا گویا چماروں کے ہاتھ کے گردن مروڑی ہوئے جانور کا کھا لینا ہے۔ اگر حسن ظن پر خیال کیا جائے تو یہ اس وقت ہو سکتا تھا جب کہ انگریزوں کا تعامل مسلمانوں سے ذبح کرانے یا خود ذبح کرنے کا ہوتا برتاؤ اُن کا باطل برخلاف اس کے ہے تو ایسی صورت میں کوئی وجہ حسن ظن کی نہیں لیکن مجھ سے جب سید صاحب سے زبانی گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں جب جانتا ہوں کہ باورچی کسی انگریز کا ہندو ہے تو ضرور ذبیحہ کی تحقیق کر لیتا ہوں ہاں جہاں یہ معلوم ہے کہ باورچی مسلمان ہے وہاں تحقیق نہیں کرتا۔

---

[۱] اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں سید محمد خاں صاحب متفرد نہیں بلکہ بعض علمائے متقدمین نے بھی اسکو حلال سمجھا ہے۔ مہتمم

سید احمد خاں صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۲۵ میں لکھتے ہیں کہ اگر ہم کو بہت احتیاط ہو تو اہل کتاب سے پوچھ لینا چاہئے کہ یہ ذبح کیا ہوا ہے یا نہیں مگر مولوی امداد العلی خاں صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۶۷ میں لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کے قول معتبر سمجھنے میں اختلاف ہے - میرے نزدیک اول تو اہل کتاب کے قول کے معتبر ہونے میں شبہ کرنا اس وقت چاہیئے تھا جبکہ جھوٹ بولنا ان کی شریعت میں یا اُن کے نزدیک جائز ہوتا و اذ لیس فلیس اور ظاہر کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی کہ وہ غیر ذبیحہ کی نسبت کسی مسلم سے ذبیحہ ہونا اُس کا کہیں۔ دوسرے فقہا کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ من ارسل اجیرا لہ مجوسیا او خادما فاشتری لحما فقال اشتریتہ من یہودی او نصرانی او مسلم وسعہ اکلہ پس مجوسی مشرک کا یہ کہہ دینا کہ میں نے گوشت کو یہودی یا نصرانی یا مسلم سے لیا ہے واسطے کھانے اس گوشت کے کافی ہے پس خود اہل کتاب کا قول کیونکر لایق اعتبار کے نہ ہوگا ❊ اور نوازل میں لکھا ہے کہ سئل ابو مطیع عن نصرانی دعی رجل الی طعام وقال اشتریت اللحم من السوق انا کلہ قول ابو مطیع سالت ابن ابی عروۃ عن ذالک قال وکذالک قال مقاتل ابن حبان اما اصحابنا فانھم قالوا لا ناکل حتی تربہ انہ قد ذبح یعنی کسی نے ابو مطیع سے پوچھا کہ اگر ایک نصرانی کسی کی دعوت کرے اور کھانے کو بلائے اور یہ کہے کہ میں نے گوشت بازار سے مول لیا ہے - تو ہم اُسے کھاویں - ابو مطیع کہتے ہیں کہ میں نے ابی عروہ سے پوچھا انہوں نے کھانے کی اجازت دی اور ایسا ہی کہا مقاتل ابن حبان نے لیکن ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ ہم نہ کھاوینگے جب تک نہ دیکھ لیں کہ اس نے ذبح کیا ہے - پس اس روایت سے ابو مطیع اور ابن ابی عروہ اور مقاتل ابن حبان کے نزدیک نصارٰے کے گھر کا گوشت کھانا صرف اس کہنے پر کہ اُس نے بازار سے مول لیا ہے جائز ہے بغیر اس کے کہ اُس کا ذبیحہ خود اُس نے کیا ہو اور مسلمان نے دیکھا ہو لیکن جب اہل کتاب ذبح کا ہونا خود بیان کرے تو اُس کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں ❊

دوسری بحث بہ نسبت مواکلت کے

سید احمد خاں صاحب نے مواکلت کو ساتھ اہل کتاب کے جائز قرار دیا ہے اور مولوی صاحب نے اُسے نہ صرف ممنوع اور حرام ٹھہرایا ہے بلکہ نسبت کفر کی اُس کے مرتکب[1] کی طرف کی ہے اور بہت سی

---

[1] مسلم ہمراہ کھانے والے نصرانی کو نصرانی کہنا جہالت کی بات ہے اس سے بلا شبہ گنہگار ہوتا ہے کہنے والا تو بہ کرے (فتویٰ مولوی سعد اللہ مفتی رامپوری) ❊

وجوہ حرمت کی بیان کی ہیں مگر جتنی وجوہ حرمت کی بیان کی گئی ہیں وہ سب ایسی ہیں کہ جن کا نقل کرنا اور رد کرنا بھی فضول ہے کیونکہ اُن سے صرف مواکلت اہل کتاب کی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ سوائے اعلےٰ درجہ کے متقی پرہیزگاروں کے اور سب مسلمانوں کے ساتھ کھانا کھانا بھی حرام اور ممنوع ہوتا ہے اور اہل کتاب سے ملنا۔ ان کی تعظیم کرنا۔ ان کی نوکری کرنا بھی نہ صرف حرام بلکہ قریب بکفر ہوا جاتا ہے لیکن جب ہم میں سے اکثر مسلمان ہیں جو غیر متقی مسلمانوں کی صحبت سے نفرت نہیں کرتے اور مشرکین اور بت پرستوں کے اختلاط اور ارتباط دوستانہ سے باز نہیں رہتے اور انہیں اہل کتاب کے سامنے جن کی مواکلت کو حرام بتاتے ہیں اس ادب اور تعظیم سے پیش آتے ہیں کہ ایک ادنےٰ درجہ کا خانہ زاد غلام اپنے اعلےٰ مرتبہ کے آقا کے سامنے بھی اس تذلل سے پیش نہ آوے گا اور پھر نہ صرف عوام اور جاہل اس میں مبتلا ہیں بلکہ بڑے بڑے جناب مولانا و سیدنا و قبلہ و کعبہ ادنےٰ درجہ کے انگریزوں کی رضا کے خدا کی رضا سے زیادہ طالب ہیں اور خلاف مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْہِ کے احکام صادر کرکے اُن سے ترقئے دنیا کی خواہش کرتے ہیں اور پھر اُن میں سے نہ کوئی کافر ٹھہرتا ہے نہ کرستان تو پھر وہ شخص جو انگریزوں کے ساتھ بدعوئے مساوات کھانا کھاوے کیونکر کافر و کرستان ہوگا۔ ذالک ظن الذین لا یعلمون ❊

جہانتک میں غور کرتا ہوں مولوی صاحب نے بہت مبالغہ کیا ہے اور حد سے زیادہ تشدد فرمایا ہے شاید مولوی صاحب نے جواب ترکی بہ ترکی کے مضمون پر عمل کیا ہے کہ جب سید صاحب نے انگریزوں کے کھانے کو بلا تحقیق و تفتیش جائز کر دیا اور اہل کتاب کی گردن مروڑی ہوئی مرغی کو بھی حلال ٹھہرا دیا تو اُس کا جواب یہی ہے کہ انگریزوں کا کھانا اور ان کے ساتھ کھا لینا نہ صرف مکروہ اور خلاف تقوےٰ ٹھہرایا جاوے بلکہ ممنوع اور حرام اور قریب بکفر کر دیا جاوے ورنہ جو شخص ذرا بھی انصاف کریگا اور اصول شریعت کو غور سے دیکھیگا وہ ہرگز نہ کہیگا کہ مسلمانوں کا مذہب کھانے پینے میں ہندوؤں کا سا ہے یا اُن کیطرح چھوت و پرہیز کا قاعدہ اُن میں بھی جاری ہے کہ کسی کے ساتھ کھا لینے یا کسی کے گھر کے کھانا کھا لینے سے دین جاتا رہتا ہے نعوذ باللہ من ذالک ❊ اگر مولوی صاحب اسی پر قناعت فرماتے۔ کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانا بلا تحقیق و تفتیش طعام کے مکروہ اور بعد تحقیق بھی خلاف تقوےٰ ہے۔ تو بعض منصف مزاج سکوت کر جاتے مگر انہوں نے تو اس قدر مبالغہ کیا کہ مواکلت کو مرتبہ شرک باللہ و انکار نبوت بنا دیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو رسموں میں ہندوؤں کے مقلد ہو گئے اور چھوت و پرہیز میں اُن کی طرح کفر و اسلام کا اطلاق فرمانے لگے ہیں کوئی ذی ہوش سمجھ دار آدمی تو اس بات کو نہ مانے گا ❊

ان باتوں سے قطع نظر کرکے اگر ہم عمل پر مسلمانوں کے نظر کریں تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ نہ اگلے زمانہ میں احتراز مواکلت سے تھا اور نہ اب اور ملک کے مسلمان محترز ہیں چنانچہ ہم نے کتاب اغاثۃ اللہفان سے ایک روایت نقل کرکے اُسے دکھا دیا ہے کہ اصحاب نبوی نے ایک رومن کیتھلک عیسائی کی دعوت قبول کی اور اس کے عبادت خانہ میں جاکر اُس کا کھانا کھایا اور نوازل میں لکھا ہوا ہے کہ سئل ابو مطیع عن نصرانی دعا رجلاً الی طعام وقال اشتریت اللحم من السوق انا کل قال ابو مطیع سالت بن ابی عروۃ عن ذالک قال کل وکذ الک قال مقاتل ابن حبان کہ کسی نے ابو مطیع سے پوچھا کہ اگر کوئی نصرانی ہماری دعوت کرے اور کھانے پر بلاوے اور کہے کہ میں نے گوشت بازار سے مول لیا ہے تو ہم کھاویں یا نہ کھاویں تو انہوں نے ابن عروہ سے پوچھا انہوں نے اجازت دی پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ دعوت قبول کرنا نصرانی کی جائز ہے اور اس کے کہہ دینے پر کہ گوشت بازار کا خریدا ہوا ہے گوشت کا کھانا بھی درست ہے پس اگر ان کی دعوت قبول کرنا درست نہ ہوتا تو یہی جواب کافی ہوتا کہ ان کی دعوت کی اجابت ہی حرام اور کفر ہے نہ کہ ان کے گھر کا پکا ہوا گوشت کھانا اور ان کے قول کو دیانت میں معتبر جاننا ۔

سب سے زیادہ تصریح جواز مواکلت کی سیرت سلطان صلاح الدین سے ہوتی ہے جو تالیف بن عباس کی ہے اور جس میں خود اُس نے اپنی آنکھ دیکھی ہوئی باتوں کو لکھا ہے کہ اس نے اس کتاب میں چند مقام پر لکھا ہے کہ سلطان صلاح الدین نے عیسائی بادشاہوں کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور ان کی تعظیم و تکریم کی حالانکہ اس بادشاہ کی سطوت اور صلابت مشہور ہے اور بیت المقدس کا فتح کرنا اُس کے اسلام کی اب تک ایک بڑی نشانی موجود ہے میں اُس کتاب سے دو نقلیں کرتا ہوں جس کسی کو زیادہ اس سے دیکھنا منظور ہو وہ اصل کتاب کو دیکھے صفحہ ۲۵ میں اُس کتاب کے یہ لکھا ہے

و لقد رایتہ وقد دخل علیہ صاحب صیدا بالناصرۃ فاحترمہ واکرمہ واکل معہ الطعام ومع ذالک عرض علیہ الاسلام فذکر لہ طرفاً من محاسنہ وحثہ علیہ یعنی میں نے خود دیکھا کہ سلطان صلاح الدین کے پاس امیر صیدا آیا تو سلطان نے اُس کا احترام اور اکرام کیا اور اُس کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر باوجود اس کے خوبیاں اسلام کی اس کے سامنے بیان کیں اور مسلمان ہونے پر اُسے برانگیختہ کیا ۔ اور پھر صفحہ ۹۰ میں لکھا ہے کہ وصاحب الشقیف یرسے منفیتقن مرعدم السلامۃ ان اصلح حالہ معہ قد تعین طریقاً الی سلامتہ فنزل بنفسہ وما حسہا بہ الا وھو قایم علی باب خیمۃ السلطان فاذن لہ فدخل فاحترمہ اکرمہ وکان من کبار الفرنجیۃ وعقلائہا وکان یعرف بالعربیۃ محضی بین

یدی السلطان واکل معہ الطعام۔ خلاصہ یہ کہ والی تنفیق جو بڑے امیروں اور دانشمندوں سے فرنگیوں کے تھا سلطان کے پاس آیا تو سلطان نے اُس کی تعظیم و تکریم کی اور اُس کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ یہ حال تو اگلے لوگوں کا تھا اور اب روم کے سلطان اور اُس کے علما و فضلا کا حال ظاہر ہے کچھ پوشیدہ نہیں کہ شاہ فرانس اور ملکہ انگلستان کے مہمان ہوئے اور خوب عوتیں لیں اور خوب کھانے کھلائے اور کسی نے علمائے مکہ یا فقہائے مدینہ میں سے اُن کے کفر و ارتداد کا فتوےٰ نہ دیا ۔

جہاں تک میں نے سوچا اور غور کیا مجھے نفس مواکلت کے جواز میں کچھ شبہ نہیں یعنی اگر اہل کتاب ہمارے یہاں آکر ہمارے ساتھ کھانا کھاویں تو یہ مواکلت بلاشبہ جائز ہے اور اگر ہم ان کے یہاں جاویں اور ان کے گوشت کا ذبح کیا ہوا ہونا ثابت ہو جاوے اور شراب و سؤر نہ ہووے تو بھی اس مواکلت میں کچھ کلام نہیں اور اگر گوشت کا ذبیحہ نہ ہونا ثابت ہو جاوے تو اُس گوشت کی حرمت میں کچھ شک نہیں اور اگر شراب و سؤر بھی اس میز پر ہووے تو وہ شرکت اور مواکلت کراہت سے خالی نہیں اس سے زیادہ جو کوئی کچھ کہے وہ افراط اور عناد و تعصب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

عزّت

عزت ایک اچھا خیال ہے جو انسان کی خود اختیاری اچھی حالتوں کے سبب سے اُس کی بڑائی کی نسبت دل میں پیدا ہوتا ہے عام اس سے کہ وہ حالتیں علمی ہوں یا عملی۔ قولی ہوں یا فعلی۔ باطنی ہوں یا ظاہری لازمی ہوں یا متعدی پس جو انسان جس قدر اپنی حالتوں کو درست کریگا اور جتنا اچھے خیالوں۔ اچھی باتوں۔ اچھے کاموں۔ اچھی عادتوں سے موصوف ہوگا اتنی ہی عزت کا مستحق ہوگا ۔

عزّت ہی وہ شے ہے جس کے حاصل کرنے کا شوق انسان سے بڑی بڑی سخت محنتیں کرتا ہے اور اُسے بڑے بڑے رنج دیتا ہے اور جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو انسان اپنی زندگی بڑی خوشی سے کاٹتا ہے۔ سارے رنج و غم بھول جاتا ہے۔ انسان مر جاتا ہے اس کی ہڈیاں خاک ہو جاتی ہیں۔ اس کی خاک کا نشان بھی نہیں ملتا پر اُسکی عزت نہ مرتی ہے نہ خاک ہوتی ہے ہمیشہ قائم اور برقرار رہتی ہے اور درحقیقت موت کی گمنامی سے محفوظ رکھ کر انسان کو زندہ جاوید رکھتی ہے ۔

عزت درحقیقت ایک نتیجہ اچھے کمالات کا اور ایک ثمرہ عمدہ صفات کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی کسی کمال سے مکمل اور کسی صفت سے موصوف نہ ہو وہ عزت کا مستحق نہیں ہو سکتا اور اسی طرح جو اچھے کمال کا جامع اور اچھی صفت سے متصف ہو وہ عزت کے استحقاق سے محروم نہیں رہتا۔

انسان کے اچھے خیال اچھی باتیں۔ اچھے کام عزت کو ایسا کھینچ لیتے ہیں جیسا کہ مقناطیس لوہے کو یا کہربا گھاس کو وہ کسی سے اپنی بزرگی و عزت کا طالب نہیں ہوتا۔ مگر لوگ خود بخود اُس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ کسی سے اپنی تعریف نہیں چاہتا مگر سب اُس کی صفت خود کرتے ہیں کیونکہ انسان کی اچھی حالتوں کا یہ قدرتی خاصہ اور ذاتی تاثیر ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ جو شخص اچھے خیال رکھتا ہے اچھی صفات کا جامع ہوتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اچھا جانتا ہے اپنی آپ عزت کرتا ہے۔ وہ مغرور تو نہیں ہوتا مگر اپنے آپ کو سچی عظمت میں جانتا ہے۔ وہ کمینہ آدمی کی طرح جھوٹی شیخی تو نہیں رکھتا مگر ممدوح خودداری کا خیال رکھتا ہے اُس کا دل سچی عزت اور ممدوح خودداری کے سبب سے ایک پُر رعب شاہنشاہ کی مانند ہوتا ہے جسے اپنی شاہنشاہی پر خود ناز ہو اسی واسطے وہ مخالفوں کے ذلیل کہنے سے اپنے آپ کو ذلیل نہیں جانتا۔ وہ دشمنوں کے حقیر کہدینے سے اپنی حقارت نہیں سمجھتا اُس کا دل ایک سچے آبدار موتی کے موافق جوہری کا طالب تو ہوتا ہے مگر جھوٹے موتی کی جھوٹی چمک دکھانے سے اپنی بے آبروئی نہیں سمجھتا۔ وہ لعل بدخشانی کی طرح سلطانی تاج کی خواہش تو رکھتا ہے مگر کسی نادان مفلس کے پھینک دینے سے اپنی بے قدری نہیں جانتا درحقیقت سچی عزت ایک قدرتی چشمہ کے موافق ہوتی ہے جسے کوئی خس و خاشاک روک نہیں سکتا اور ایک روشن آفتاب کی مانند ہوتی ہے جس کی نورانی شعاعوں کو کوئی شپرہ چشم بند نہیں کر سکتا۔

جو شخص کسی قوم میں ایسی عزت کا مستحق ہو وہ درحقیقت اُس قول کا سُہیل ہے جو اپنی نور کے دلوں کو اپنے روشن خیالات کی برکت سے ساری غلاظتوں اور کثافتوں سے پاک صاف کر کے ادیم یمنی کی طرح معطر اور منور کر دیتا ہے یا وہ نسیم بہاری کی خاصیت رکھتا ہے کہ اپنے نرم و لطیف روح افزا جھونکوں سے اپنے ملک کو باغ ارم بنا دیتا ہے جس قوم میں کوئی ایسا شخص نہ ہو وہ خاروں کا ایک گلدستہ ہے جس میں کوئی پھول نہ ہو یا ریت کا ایک چٹیل میدان ہے جس میں کوئی باردار سایہ دار درخت ہو۔

عزت کی خوبی جو کچھ ہم بیان کریں وہ کم ہے لیکن جبکہ وہ موقوف ہے انسان کی اچھی حالتوں پر ہم کو اچھائی برائی کی تحقیق کے اصول بھی بیان کرنا ضرور ہے تاکہ ہم اصلی عزت کا ادراک کر سکیں

ورنہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعضے خیال بعضے کام کسی ایک قوم یا کسی ایک فرقہ یا کسی ایک شخص کے نزدیک اچھے سمجھے جاتے ہیں اور وہ عزت کے سبب تصور کئے جاتے ہیں اور وہی خیال وہی کام دوسری قوم یا دوسرے فرقہ یا دوسرے شخص کے نزدیک بُرے سمجھے جاتے ہیں اور ذلت کے باعث ہوتے ہیں تو اگر اچھائی بُرائی کی تحقیق کے اصول اور ان کے اختلافات ظاہر نہ کئے جاویں تو اصلی عزت کی تنقیح بھی مشکل ہو جاوے۔

اچھائی بُرائی کی تحقیق کیلئے تین اصول ہیں ایک عقل۔ دوسرا شرع۔ تیسرا عرف عام مگر درحقیقت اصل اصول ایک ہی ہے یعنی عقل اور شرع اگر سچی ہو تو اچھائی بُرائی کی ظاہر کر دینے والی ہے اور عقل اسکی ثابت کر دینے والی۔ دونوں میں اختلاف نہیں ہے۔ اور عرف عام جسے رسم و رواج کہتے ہیں وہ فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے مگر ہم تینوں سے کچھ کچھ بحث کرتے ہیں۔

اکثر مذہبی لوگ وعظ کہتے ہیں کہ عقل سے اچھائی برائی کی تنقیح نہیں ہو سکتی نہ وہ مذہب کی بتائی ہوئی اچھائی بُرائی کی حقیقت دریافت کر سکتی ہے مگر ہمارے نزدیک یہ اُنکی سمجھ کی غلطی ہے۔ اور یہ قول ان کا عقل اور مذہب دونوں سے باطل ہوتا ہے کیونکہ مذاہب مختلف ہیں سے ایک سچے مذہب کا تحقیق کرنا اور پھر سچے مذہب کی سچی باتوں کو جھوٹی اور ملائی ہوئی لوگوں کی باتوں سے جدا کرنا عقل ہی کا کام ہے ورنہ ہر مذہب کی حقیقت اور مذہب کی ہر سچی جھوٹی بات کی تصدیق لازم ہو جسے سوائے نادان کے کوئی نہ مانیگا پھر سچے مذہب کی خوبیوں کے دریافت کرنے کا عقل ایک کامل ذریعہ ہے اور مذہب نے بھی عقل ہی سے کام لینے پر ہدایت کی ہے افلا تعقلون اور افلا تذکرون کا خطاب عقل ہی کے سبب ہے۔ انهم لا يعقلون شيئا اور اولئك كالانعام کی جھڑکیاں عقل سے کام نہ لینے ہی کے باعث سے ہیں پس جو لوگ اچھائی بُرائی کی تحقیق یا اس کی تسلیم سے عقل کو عاجز جانتے ہیں درحقیقت وہ انسان کی اس قوت سے منکر ہیں جو خدا نے اُسے بھلائی برائی کے سمجھنے کے واسطے دی ہے ان کے نزدیک حیوان اور انسان میں کچھ فرق نہیں حقیقت میں ایسے لوگ خود نادان ہیں۔

جو لوگ عقل کو حسن و قبح اشیاء کی تحقیق سے معطل جانتے ہیں ان کو وہ اختلاف جو مذہبی باتوں اور عقلی تحقیقاتوں میں ہے اس خیال پر داعی ہوا ہے مگر ان سے دو غلطیاں ہوئی ہیں ایک تو انہوں نے شخصی اور جزئی عقل کو پیش نظر رکھا اور عقل انسانی اور عقل کلی کو چھوڑ دیا۔ دوسرے ظاہری اختلافات شرع اور عقل کو اپنی عقل کے نقصان کے سبب سے دور نہ کر سکے۔ اور تحقیق اور تسلیم میں جو فرق بیّن ہے اُس سے بھی واقف نہ ہوئے ورنہ وہ ایسے غلط خیال میں نہ پھنستے اس لئے اب ہم ان کو بتاتے ہیں کہ ہماری مراد عقل سے عقل شخصی نہیں ہے۔ بلکہ

عقل انسانی ہے جو لوگوں کے تجربہ اور تحقیقات اور علم سے کامل ہو جاتی ہے اور ہماری غلطیوں کو دُور کر دیتی ہے اور آخر سچی بات کو ایسا تحقیق کر دیتی ہے کہ کوئی اُس سے انکار نہیں کر سکتا +

پھر مذہب کی اچھی باتوں کو گو اوّل عقل ظاہر نہ کر سکے مگر بعد ظاہر ہو جانے کے اُس کی اچھائی کو تسلیم کر سکتی ہے اگر تسلیم کی استعداد بھی اس میں نہ ہو تو ہمارے نزدیک تکلیف شرعی عبث اور عذاب و ثواب فضول ہو جاوے اور انسان کو ایمان کی تکلیف ایسی ہو جیسی کسی جانور کو صنعت اور حکمت کی تکلیف دینا۔ معاذ اللہ کہ خدا ایسی تکلیف دے +

خود کسی بات کو تحقیق کرنے اور اس کے تسلیم کرنے میں بڑا فرق ہے جیسے ہم ایک ظاہری مثال سے بیان کرتے ہیں مثلاً خیال کرو کہ اقلیدس نامی ایک دانا حکیم تھا اُس نے چند شکلوں کو ایجاد کیا اور اس ترتیب مناسبت سے تحریر کیا کہ جس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں اور ان خطوط ونقوش میں اُن باتوں کا لحاظ رکھا کہ تمام انجینئری کاموں کا مدار اُس پر ہے تو اب خیال کرو کہ اُس کی تحقیق اور ہماری اُس کی صحت اور خوبی کی تسلیم میں فرق ہے یا نہیں درحقیقت بڑا فرق ہے گو ہر شخص بلکہ لاکھوں میں سے دس بیس بھی اُس کی سی ایجاد و ترتیب کی استعداد نہیں رکھتے مگر اُس کی صحت اور اچھائی کی تسلیم کی عقل سب کو ہے پس نادان ہے وہ جو ایسی تسلیم کرنے والی عقل سے منکر ہو +

الحاصل ہم اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سچے مذہب نے ہم کو وہی باتیں بتائی ہیں جو فی نفسہ اچھی ہیں اچھے خیال ہم کو سکھائے اچھی باتیں ہم کو بتائیں اچھے کام کی ہم کو تاکید کی اور چونکہ ہماری عقل کو اُس کی اچھائی کے تسلیم کرنے کی استعداد اور اُس کی سمجھ کی قوت ہے پس ہم اُس کی اچھائی کو جسے مذہب نے ظاہر کیا اپنی عقل سے ثابت کر سکتے ہیں اسی طرح جیسے کہ اقلیدس کی کھینچی ہوئی شکلوں کی اپنی عقل سے تصدیق کر سکتے ہیں پھر ہماری عقل مذہب کی ظاہری باتوں اور ظاہری لفظوں سے اپنے خیالات کی اصلی پاکی و صفائی اسی طرح کر سکتی ہے جس طرح کہ ہم اقلیدس کی لکیروں اور شکلوں سے بڑے بڑے کام انجینئری اور ریاضی کے اپنی سمجھ بوجھ کے کام میں لانے سے لے سکتے ہیں ہم اگر مذہب کی ساری باتوں کو یاد کر لیں اور اپنے خیال میں لکھ لیں پر عقل سے اُس کی حقیقت کا ادراک نہ کریں تو ہماری مثال بعینہ ایسی ہوگی جیسے کہ ہم تحریر اقلیدس کے سارے خطوط ونقوش کو یاد کر لیں پر اُس کا مطلب سمجھ کر اُس سے کچھ کام نہ لیں اور اس بات کی تحقیق نہ کریں کہ اس شکل و خط کے کھینچنے والے کا اصلی مقصود ان لکیروں میں کیا تھا +

ہم اس بحث کو اس وقت نہیں بڑھاتے اور ان دونوں اصولوں کی موافقت پر زیادہ دلیل نہیں لاتے کیونکہ اس وقت ہمارا مقصود دوسرا ہے اس لئے ہم اپنے اصل مطلب پر رجوع کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ جس کسی نے اپنے خیالات اور اپنی باتوں کی اچھائی عقل سے ثابت کر لی تو وہ ضرور عزت کا مستحق ہوگا کہ جب تک اور دل پر اس کی اچھائی ثابت نہ ہو وہ اس کی عزت نہ کرینگے لیکن آخر ایک روز اس کی عزت ہوگی کیونکہ کوئی سچی بات جب ایک مرتبہ ظاہر ہو جاوے رک نہیں سکتی کسی نہ کسی دن ظاہر ہوتی ہے ✦

✦ بہت سے حکیم فلسفی دانا آدمی گذرے جنہوں نے بہت اچھی باتیں ایجاد کیں۔ ان کے خیالات ان کے کام اچھے ہوئے۔ مگر مدت تک بجائے عزت کے لوگوں نے ان کی حقارت کی اور اُن کو ذلیل جانا۔ اور اُن سے بمخالفت پیش آئے مگر اُس سچی عزت نے جس کا خیال خود ان کے دل میں تھا اُن کی خود عزت کی اور انہوں نے کبھی اپنے آپ کو ذلیل نہ جانا۔ پر آخر جب اُن کے خیالات اور اعمال کی اچھائی ظاہر ہوئی تو مخالفوں نے ان کی عزت اور اپنے آپ ہی کو حقیر جانا اور اپنی مخالفت پر نادم ہوئے پس جس بات کی سچائی اور اچھائی عقل سے ثابت ہو جاوے اُس کا حاصل کرنے والا سچی عزت کا مستحق ہوتا ہے ✦

اب ہم دوسرے اصول سے بحث کرتے ہیں یعنی شرع سے مذہبی باتوں کی اچھائی ثابت کرنا دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو جھوٹے مذہبوں میں سے ایک سچے مذہب کی اچھائی پر یقین کرنا۔ دوسرے جو سچا مذہب مان لیا جاوے اُس کی اصلی اور سچی باتوں کو تحقیق کرنا۔ بغیر اس کے کوئی انسان مذہبی عزت کا مستحق نہیں ہو سکتا ✦

میں بہ نسبت اپنے مذہب اسلام کے جس کی سچائی اور اچھائی پر مجھے یقین ہے دوسرے امر سے کچھ مختصر بحث کرتا ہوں کہ اب ہمارے زمانہ میں مذہبی عزت کا استحقاق کیونکر حاصل ہو سکتا ہے ✦

اب تو غالباً سب مسلمان متفق ہونگے کہ مذہب موجودہ آمیزش سے غلط خیالات اور بے اصل باتوں کے خالی نہیں ہے۔ اور جیسا اُس کے بانی نے ہم کو بتایا تھا ویسا ہی پاک صاف نہیں ہے اور تحقیق کی ضرورت ہے لیکن تحقیق کے اصول شاید مختلف ہیں۔ ہمارے ہم مذہب کہتے ہیں کہ جو باتیں اب تک مذہب کے لوگوں نے بتائیں اور جیسا خیال خلفاً عن سلفٍ چلا آیا۔ اور جن کاموں کو مشہور مذہبی لوگ کرتے آئے ان کی تقلید ہی اصلی مذہب کی اچھائی کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ اس واسطے وہ لوگ مذہبی عزت کے مستحق ہیں جو ویسے ہی خیال رکھتے ہوں۔ ویسے ہی کام کرتے ہوں۔ اور جو لوگ اس کے مخالف ہوں وہ از روئے مذہب کے ذلت کے مستحق ہیں چنانچہ اسی خیال سے لوگ ان کی ذلت کرتے ہیں جو کہ اس اصول کو نہیں مانتے اور اپنے مذہبی خیال اور

مذہبی چال میں اُن سے موافقت نہیں رکھتے ہمارے نزدیک وہ اس خیال میں معذور ہیں اور تا وقتیکہ وہ اپنی غلطئے خیال کے قائل نہ ہوں ایسی تحقیر و تذلیل میں لائق عفو ہیں مگر ہمارے نزدیک یہ سمجھ ان کی صحیح نہیں ہے کیونکہ سچے مذہب کی سچائی صرف اسی وقت تک باقی رہ سکتی ہے کہ سوائے بانئے مذہب کے دوسرے کا قول یا عمل مثل بانئے مذہب کے نہ مانا جاوے اور کوئی مثل اس کے معصوم تسلیم کیا جاوے کیونکہ جب ایسا ہوتا ہے تو اصل مذہب کی اصلی باتوں کو آدمی بھول جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مذہب اور کا اور بلکہ آندھے کی تیڑھی کھیر ہو جاتا ہے۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ مذہب کے جاننے والے یا اُس کے سچے طور پر ماننے والے نہیں ہوئے یا اُن کی باتوں سے ہم کو فائدہ نہیں پہنچا۔ ہم بڑے ہی نامنصف اور ناشکر ہوں بلکہ نادان جو ایسا خیال کریں لیکن ہم کو اپنے مذہب کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا اور اسی پر اپنی نظر اپنا خیال جمانا چاہیئے اور لوگوں کی تحقیقاتوں سے صرف استفادہ کرنا چاہیئے نہ کہ اُس کا کامل اتباع اور پوری تقلید کیونکہ جب ہم ایسا کریں گے تو وہ صاف نورانی شعاعیں مذہب کی ہمارے دل پر نہ پڑیں گی جن کو مذہب نے ساری دنیا کے روشن کرنے کیلئے ظاہر کیا ہے اور ہمارے خیال لوگوں کے حجاب اور پردہ کی آڑ سے تاریکی میں پڑ جاوینگے کیونکہ سب مذہبوں میں ایسا ہی ہوا ہے اور اس کی نشانیاں ہمارے مذہب میں بھی موجود ہیں ۞

پس ہمارے نزدیک مذہب بھی اُسی کی عزت کریگا جو کہ مذہب کی عزت کرے اور مذہب کی عزت یہ ہے کہ وہ اپنی سچائی پر قائم رہے اس لئے ہمارے نزدیک وہ لوگ مذہبی عزت کے مستحق ہیں جو کہ مذہب کی سچائی ظاہر کرنے اور اُس کی اچھائی ثابت کرنے پر مستعد ہوں اور جن کے مذہبی خیالات لوگوں کی پیروی سے جن کے مذہبی اعمال عامیوں کے چال چلن کی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں ۞

جو لوگ مذہب کی جھوٹی باتوں کو مذہب سمجھتے ہیں اور اور مذہب کی خوبیوں کو چھپاتے ہیں اور غلطی سے اپنے آپ کو مذہبی عزت کا مستحق جانتے ہیں حقیقت میں وہ جھوٹی عزت کا دعوے کرتے ہیں ان کی عزت اسی قدر ہو سکتی ہے جتنی کہ قلب زر اندوز سکہ کی کہ سوائے نام اور شکل کے سچائی سے خالی اور عیار و محک سے ہمیشہ خائف ہے مگر جو لوگ مذہب کو مذہب کے طور پر اس کے بانی کی مرضی کے موافق مانتے ہیں ان کی عزت ایسی ہی ہو سکتی ہے جیسے کہ سونے کے ایک خالص ٹکڑے کی جسے نہ نام و شکل پر دعوے سچائی کا ہے بلکہ اپنی ذات اور اپنی سچائی پر وہ ہمیشہ عیار و محک کا طالب ہوتا ہے وہ اپنی صفائی کے امتحان کرنے کا خواہاں ہوتا ہے ۞

اگلے زمانہ میں بھی بعض بعض ایسے مذہبی عزت کے مستحق گذرے ہیں مگر جھوٹی عزت رکھنے والوں نے ان کی بڑی تحقیر کی اور بجائے عزت کرنے کے ان کو ذلیل جانا مگر آخر ان کی سچی عزت ظاہر ہوئی اور

وہ اپنے استحقاق سے محروم نہ رہے ۔

اب ہم تیسرے اصول سے بحث کرتے ہیں یعنی عرف عام سے جتنا کہ یہ اصول بے بنیاد و باطل ہے اور اچھائی برائی کی تحقیق کا مزاحم ہے ویسا ہی وہ نہایت جاری اور مروج ہے بلکہ ہمارے زمانہ میں تو وہی عیار امتحان ہے ۔

ہمارے ہم مذہب رسم و رواج ہی کو شرع اور عقل سمجھتے ہیں اور اسی کی موافقت اور مخالفت کو اچھائی برائی جانتے ہیں ۔ ان کے نزدیک وہی شخص عزت کا مستحق ہے جو ان اچھی باتوں پر چلتا ہو جسے سب لوگ اچھا جانتے ہوں گو وہ عقل کے مخالف ہوں یا مذہب کے ۔

ہمارے ہم قوم بڑی ہی ذلت اور حقارت کی نظر سے اُسے دیکھتے ہیں جو کہ رسم کا پابند نہ ہو گو وہ کیسا ہی عقیل اور مذہب کا پابند ہو ان کے نزدیک رسم کی مخالفت ہی ایک بڑا خیال ہے جس کے سبب سے انسان بڑی تحقیر اور ذلت کا مستحق ہوتا ہے ۔

پھر اگر ہماری قوم نے سچ سمجھ کر کچھ رسمیں جاری کی ہوں ان کی بھلائی تحقیق کر کے اُن پر عامل ہوئی ہوتی تو بھی کچھ کہنا ان کا لائق لحاظ کے ہوتا پر افسوس ہے کہ وحشیانہ تمدن اور عامیانہ چلن نے جاری ہونے سے پہلے اس کا لحاظ نہ کرایا اور اب نادانی اور جہالت نے تحقیق سے منع کر دیا لیکن جو لوگ اب اس کی تنقیح پر متوجہ ہیں اور جن کو ہماری قوم نہایت ہی ذلت کی نظر سے دیکھتی ہے امید ہے کہ اپنی محنت کا ثمرہ پاویں اور ان کی سچی عزت ان کے مخالفوں کے دل میں ایسی سما جاوے جیسے کہ روشنی ایک تاریک گھر میں جب کہ اس کا دروازہ توڑ دیا جاوے ۔

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ

ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا اور اس طلسم کدہ کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصور قدرت نے کھینچ رکھی ہے دکھایا در حقیقت اُسے میں نے ویسا ہی پایا۔ جیسا کہ سُنا کرتا تھا بلا شبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے +

جب میں اس طلسم خانہ کے مغرب جانب پہنچا تو ایک چار دیواری دیکھی جو میرے خیال سے بھی زیادہ بلند اور میرے حوصلہ سے بھی زیادہ وسیع اور میری ہمت سے بھی زیادہ مضبوط تھی قدرت نے ایسا سنہرا رنگ دیا تھا کہ جب سورج کی کرن اس پر پڑتی تو وہ دیوار زرنگار کندن کی طرح ایسی چمکتی جس سے آنکھوں کو چکا چوند ہو جاتا۔ اس دیوار کے چاروں طرف پھرا پر میں نے دروازہ نہ پایا۔ مگر ایک جگہ ایک بڑی نہر دیکھی جو دیوار کے نیچے سے اندر جاتی ہے اور ایک بلندی پر چشمہ دیکھا جس سے نہر میں پانی گرتا ہے +

میں نے وہاں ایک رفیق پایا جس کا نام خرد تھا اس سے حقیقت اُس کی پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کے اندر ایک ایسا پُر فضا باغ ہے جسے جنت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو اور یہ نہر اسی کے شاداب کرنے کے لئے بنائی گئی ہے تب تو مجھے اندر جانے کا شوق ہُوا اور اپنے رہنما سے دروازہ کا نشان پوچھا اور میں نے اُس کی کامل اطاعت اور بڑی تابعداری کی۔ تب اُس نے پانچ برس کے بعد دروازہ بتایا میں اس دروازہ کی محراب کی بلندی اور اُسکے طاق اور کنگرہ کی خوبی کیا بیان کروں میں جاتے ہی بیتابانہ دوڑنے لگا اور باغ کی سیر سے سیر ہونا چاہا میری بوالہوسی پر میرا رہنما ہنسا اور کہا کہ اے نادان دروازہ تو پانچ برس کی محنت کے بعد پایا۔ اس باغ کی سیر کیا آسان ہے جس کا ایک کنارہ ازل اور دوسری حد لحد ہے +

خیر میں نے ہوس کو روکا اور جس چال سے خرد نے چلایا چلا کئی برس کے بعد چند کیاریاں اس باغ کی دیکھ پائیں مگر ان کی خوبی اور لطافت میرے بیان سے باہر ہے ہر چمن قدرت کا کارخانہ اور صنعت کا تماشا تھا۔ اس باغ کے سبزہ کا مستانہ جھومنا قمری کی آواز بلبلوں کا پھولوں پر گرنا پھولوں کا کھلنا کلیوں کا چٹکنا۔ نرگس کی نظر بازی شمشاد کی سرو قدی نے مجھے ایسا مست کر دیا کہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا +

میں چندے اس باغ میں رہا۔ پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلاتا اور اس باغ کی بہار لوٹتا۔ آخر اپنی تنہائی سے گھبرایا اور باہر نکلا کہ کوئی مجھ سا ملے تو یہاں لاؤں اور اپنا دل خوش کروں ٭

میں اس باغ سے نکل کر برسوں اسی تلاش میں پھرا لیکن کوئی نہ ملا۔ آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چاردیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی اور نہر بھی ویسی ہی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا مگر دروازہ کھلا ہوا۔ دیوار شکستہ اور کچھ نئی قسم کے آدمی آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنے رہنما سے پوچھا کہ یہ تو وہی باغ ہے۔ مگر کیا سبب کہ نہ دیوار کی وہ خوبی و خوشنمائی ہے نہ دروازہ کی وہ زینت و شان ہے چشمہ بھی میلا نظر آتا ہے۔ پانی کی بھی صورت بدلی ہوئی ہے اُس نے کہا کہ یہ وہ باغ نہیں ہے دوسرا ہے مگر پہلے اسی باغ کی طرح آراستہ تھا خزاں کی ہوا نے اُس کو سکھا دیا اور زمانہ کے انقلاب نے پامال کر دیا ٭

جب میں باغ کے اندر گیا تو چمن کے نشان کچھ نظر آئے مگر نہ وہ صفائی نہ وہ خوبی یا نہریں بھی کچھ بہتی معلوم ہوئیں مگر نہ پانی کی وہ لطافت نہ وہ شیرینی۔ پھول جتنے تھے سب کملائے ہوئے میوے جس قدر تھے وہ سوکھے پچکے ہوئے۔ سبزہ کے زمردین رنگ پر سیاہی چھائی ہوئی تھی گلوں کی سرخی پر زردی آگئی تھی نسیم کے بدلے صرصر کی تندی پریشان کرتی تھی۔ بلبلوں کی جگہ زاغ و زغن کا شور ہو رہا تھا۔ نرگس اپنی پھوٹی آنکھ سے حیرت کی نگاہ کر رہی تھی۔ حوض کی آنکھ اپنی خشکی پر رو رہی تھی ٭

میں باغ میں پھرتے پھرتے نہر کے کنارے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں چند خوبصورت خوش شکل ماہرو نوجوان آئے اور اس نہر میں پانی پینے اور غوطہ لگانے لگے جب وہ نہا دھو کر اُس سے نکلے تو ان کے چہرے بدلے ہوئے نظر آئے نہ وہ شکل و شمائل تھی نہ وہ نزاکت و نرمی۔ اور ہر ایک کے دو دو سینگ نکل آئے تھے۔ وہ نہر سے نکلتے ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور سینگ سے سینگ لڑانے لگے۔ یہانتک لڑے کہ کسی کا سینگ ٹوٹا کسی کا چہرہ بگڑا کسی کا غصہ سے چہرہ لال ہوا کسی کا کف مُنہ سے اُڑ کر مجھ تک پہنچا کسی کی گردن کی رگیں مارے غصہ کے تن گئیں کسی کے منہ سے آواز غضب کے سبب سے نہ نکلی۔ اسی طرح وہ وحشیانہ لڑائی لڑتے ہوئے ایک عالیشان مکان کی طرف چلے میں بھی ساتھ ساتھ ہو لیا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے وہاں کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک نصف وحشی نصف انسان جس کا چہرہ آدمی کا دُم طاؤس کی مُنہ چڑیا کا پیٹ بیل کا بچھال لومڑی کی۔ ایک رنگین سنبور کی کھال اوڑھے ہوئے کبوتر کی طرح غٹرغوں غٹرغوں کر رہا ہے جب وہ سب نوجوان اس کے پاس پہنچے تو اُس کے آگے گر پڑے

اُس نے ایک کریہ ہولناک آواز سے اُن کو پکارا اور آپس کے جھگڑے کا حال پوچھا۔ ان لوگوں نے کچھ ایسی بولی میں اُسے جواب دیا کہ میں نہ سمجھا۔ مگر یہ دیکھا کہ اسی وحشی آدمی نے کچھ خوش ہو کر کسی کا مُنہ چوما اور کسی کو پیار کیا اور کسی کو مرحبا کہا۔

میں اس معاملہ کو دیکھ کر حیران ہوا اور پناہ مانگتا باہر نکلا اور اپنے رہنما سے اس اسرار کی خبر پوچھی اُس نے کہا کہ اس نہر کے پانی کی ایسی ہی تاثیر ہے کہ سب ایسی شکل کے ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ نصف وحشی نصف انسان تم نے دیکھا ہے۔ یہ نوجوان نازک ماہرو لڑکے بھی جب زیادہ پانی پینیگے خوب غوطے نہر میں لگاویں گے ایسے ہی ہو جاوینگے۔ اور جو کچھ لڑائی تم نے دیکھی یہ لڑائی نہ تھی بلکہ اُن کا علمی مباحثہ تھا جس کے لفظ بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔

جب میں نے اس تاثیر کا سبب پوچھا تو رہنما مجھے چشمہ کے کنارہ پر لے گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ باہر چشمہ کے دو چشمہ آ کر ملے ہیں ایک تو سیدھا چلا گیا ہے جو کہ نہایت صاف اور پاک اور خوشگوار ہے دوسرا خم و پیچ سے گیا ہے جس میں جا بجا نالے ندیاں ملتی گئی ہیں جو کہ سب کثیف اور میلے اور ناپاک ہیں۔ مگر پہلے چشمہ کے دہانہ پر ایک پتھر کی چٹان آگئی ہے جس سے صاف پانی نہیں آسکتا۔ مگر دوسرا چشمہ کھلا ہوا ہے۔ اسی کا میلا بدبودار زہریلا پانی گرتا ہے اور وہی باغ میں جاتا ہے جس کی تاثیر سے آدمی مسخ ہو جاتے ہیں۔

جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامی رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اُس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا مدت بعد سب حال دریافت کر کے اس فکر میں پڑا کہ اس پتھر کی چٹان کا حال کسی سے پوچھوں کہ تاریخ نامی ایک روشن ضمیر ملا اُس نے کہا کہ ہزار برس ہوتے ہیں۔ تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ اور سرسبز و شاداب تھا۔ جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا ہے اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گندے چشمہ پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ صاف چشمہ پر آگیا ہے۔

تب تو میں نے خیال کیا کہ اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لیکر چلا۔ گرچند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا اور پتھر سرکانے پر مجھے موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا لیکن میرے رہنما نے کہا کہ اور بھی تیری طرح اس ارادہ پر آئے مگر ان کے خوف سے بھاگ گئے۔ میں تجھے ایک مشعل دیتا ہوں جس کی روشنی سے یہ اندھے ہو کر بھاگ جاوینگے چنانچہ بصیرت کی مشعل اُس نے مجھے دی۔ درحقیقت جب میں وہاں مشعل کو لے کر پہنچا تو کوئی میرے پاس نہ آیا آخر میں بفراغت پتھر سرکانے لگا۔ پر وہ ایک مجھ سے کب سرکتا تھا۔ میں تھک کر بیٹھ رہا کہ ھمدردی نامی واعظ میرے سامنے آیا اور کہا کہ مجھے اجازت دو تو کچھ مدد کرنے والے

لے آؤں۔ میں نے خوش ہو کر اُس کا شکر کیا اور بڑے زور شور سے اُسے اپنی ہی سی صورت و شکل والوں کے پاس بھیجا۔ پر افسوس کہ بہت کم لوگوں نے اُس کی بات سنی جو لوگ اُس نہر کا پانی پی چکے تھے وہ تو مارنے دوڑے اور جو لوگ ابھی اُس سے بچے ہوئے تھے ان کے کان بہرے تھے انہوں نے کچھ نہ سنی آخر وہ باحسرت و یاس واپس آیا۔ اُس کے لوٹنے کے بعد میں نے چاہا کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور یہ پتھر جیسا رکھا ہے ویسا ہی رہنے دوں۔ پر استقلال نامی ایک رجز خوان نے میرا دل بڑھایا اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اُس نے کہا کہ میں نے ایمان نامی فقیر سے سنا ہے کہ اس چشمہ کا ایک کھودنے والا ہے۔ وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اُس تک ہو سکتی ہے۔ اُس کی راہ میں اول تو ایک بڑا صحرا لق و دق ملتا ہے جہاں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اس سے بچ گئے تو رسوائی بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں تب دروازہ اُس کا ملتا ہے جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ وہ دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے گو کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں نذر کی قبولیت کی نوبت نہیں آتی۔ پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ اگر اُس تک تمہاری رسائی ہوئی اور اُس نے تمہاری نذر لے لی تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کرے گا جب تم لوگوں کے سامنے کرو گے سب کی آنکھیں کھل جاویں گی جتنی کہ وہ اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور تمہارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے آخر چند ہی روز میں گدلے چشمہ کا پانی بند کر کے صاف چشمہ کے پانی سے اپنی نہریں بھر لیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب کریں گے اور تب تم دیکھو گے کہ یہ سوکھا ہوا باغ اس بیچ باغ سے بھی تمہاری نظروں میں زیادہ سرسبز اور خوش نما معلوم ہو کیونکہ نہ وہ باغ تمہارا باغ باغ ہے نہ وہاں کوئی تم سا ہے۔ اور یہ باغ تمہارا ہی ہے اور سب تم سے ہیں میں نے اس رفیق کا شکر کیا اور اس کے کہنے کے مطابق چلا کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے ۔

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کہا تو وہ سب یک لخت اس کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے میں صرف یہ کہکر کہ جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدیدہ کا باغ ہے جس کے پھل پھول اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں پر ہمارا دل بہلانے والا کوئی وہاں نہیں ہے جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر

پڑ گیا ہے۔ جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی نیکی کا تعصب علم کا نادانی جھوٹا زہد جھوٹی شیخی۔ جاہلانہ تقلید۔ عامیانہ غلامی۔ ضرر انگیز حرارت۔ وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے جس کے نتیجے مسخ انسانیت ہے جو کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے ۔

طعام اہل کتاب

جب سے ہم لوگوں میں طعام اہل کتاب کی اباحت اور حرمت کی نسبت گفتگو شروع ہوئی ہے تب سے اکثر لوگوں کو اس امر کی تحقیق کی خواہش ہے کہ اصحاب نبوی اور ان لوگوں کا جو قرون ثلثہ میں تھے کیا طریقہ تھا۔ آیا وہ اہل کتاب کے کھانے کو حلال جانتے تھے یا حرام یا مکروہ سمجھتے تھے اور ان کی دعوت کو قبول کرتے تھے یا نہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے اہل کتاب کے کھانے اور ان کے ساتھ کھانے کو مباح اور جائز تصور کیا انہوں نے اسلاف کرام کے اقوال سے اُس کے جواز کو ثابت کیا۔ مگر اب تک کسی نے صحابہ کی عام رسم و رواج کو اس معاملہ کی نسبت ہمارے پچھلے محققین اور علما کے کلام سے ثابت نہ کیا ۔

میں مدت سے اس کی تحقیق میں ہوں۔ چنانچہ اتنا تو مجھے ثابت ہو گیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی اہل کتاب سے مصالحہ کرتے اور ان سے عہد لیتے تو عہد نامہ میں منجملہ اور شرائط کے ایک یہ بھی شرط کرتے تھے کہ جب کسی مسلمان کا ان کے یہاں گذر ہووے تو تین دن تک مہمانی کریں گے۔ مگر یہ بات صاف معلوم نہ ہوتی تھی کہ اس وقت مہمانی کا کیا قاعدہ تھا آیا اہل کتاب خشک دانے دیا کرتے تھے یا قیمت کھانے کی نذر کیا کرتے تھے یا اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا کھلاتے تھے یا خود بھی ان مسلمان مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ چنانچہ مدت سے مجھ کو اس امر کی تلاش تھی کہ آج میں کتاب بعید الشیطان بتقریب اغاثۃ اللھفان کو

جو خلاصہ کتاب اغاثۃ اللہفان فی مصائد الشیطان تصنیف علامہ ابن قیم کا ہے دیکھ رہا تھا کہ اُس میں مَیں نے ایک مضمون دیکھا جس سے صاف ثابت ہو گیا کہ اصحاب نبوی نہ صرف اہل کتاب کے کھانے کو جائز جانتے تھے بلکہ ان کی ضیافت کو قبول کرتے ان کے یہاں کے پکے ہوئے کھانے اُن کے گھر اور ان کے عبادت خانوں میں جا کر کھاتے چنانچہ اس کتاب کی اصل عبارت اور ترجمہ کو ذیل میں لکھتا ہوں پس جو دیندار مسلمان آج کل کے لوگوں پر اطلاق کفر او تنصر کا اس بات کے کرنے سے جو صحابہ نبوی کیا کرتے تھے کیا کرتے ہیں نہ کریں اور صرف پابند رسم و رواج سے در پردہ الزام اصحابؓ رسولؐ پر نہ لگا دیں ۔

عبارت اصل کتاب

ومن ذلك انہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم کان یجیب من دعاہ فیاکل من طعامہ واضاف یہودی بخبز شعیر واھالۃ سنخۃ واحل اللہ اطعمۃ اھل الکتاب وکان المسلمون یاکلون من اطعمتھم وشرط علیھم عمر ضیافۃ من یمر بھم من المسلمین وقال اطعموھم مما تاکلون ولما قدم عمر الشام صنع لہ اھل الکتاب طعاما فدعوہ فقال این ھو قالوا فی الکنیسۃ فکرہ دخولھا وقال لعلی اذھب بالناس فذھب بالمسلمین واکلوہ وجعل علیؓ ینظر الی الصور بالکنیسۃ ویقول ما علیٰ امیر المومنین لو دخل واکل ۔

ترجمہ

اور اس میں سے ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو شخص دعوت کرتا آپ قبول فرماتے اور اس کا کھانا کھاتے اور ایک یہودی نے آپ کی ضیافت جو کی روٹی اور بگڑے سالن سے کی تھی اور خدا تعالےٰ نے اہل کتاب کا کھانا حلال فرمایا ہے اور مسلمان اُن کا کھانا کھایا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے شرط کر لی تھی کہ جو مسلمان تمہارے پاس آئے اُس کی ضیافت کرو اور جو تم کھاتے ہو اُس کو کھلاؤ۔ اور جب آپ شام میں تشریف لائے تو آپ کے لئے اہل کتاب نے کھانا تیار کیا اور بلایا۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے انہوں نے کہا کہ گرجا میں ہے آپ نے اُس کے اندر جانا مکروہ سمجھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم لوگوں کو لیجاؤ چنانچہ وہ لے گئے اور کھانا کھایا حضرت علی رضی اللہ عنہ گرجا کی تصویروں کو دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر امیر المومنین عمرؓ بھی آتے اور کھاتے تو کچھ اُن کا ہرج نہ تھا ۔

واضح ہو کہ شام کے لوگ اُس زمانہ میں عیسائی مذہب رکھتے تھے ۔

خط مع جواب

برادر من سید مہدی علی صاحب زاد لطفہٗ

بعد سلام مسنون کے مدعا یہ ہے کہ آپ میرے پرانے یار ہیں اور میرے عزیز اور بھائی ہیں۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ میری تحریر سے جو صرف براہ محبت کرتا ہوں ناراض نہ ہونگے بھائی میرے مجھے نہایت افسوس ہے کہ تم سید احمد خاں کی صحبت میں لامذہب ہو گئے اور اس کا نصف تم میں بھی آگیا اور اُس کے خلیفہ مشہور ہو گئے۔ وہ وعظ کا کہنا اور مجلس میلاد میں ذکر خیر کرنا اور علماء کی تقلید کرنا اور اسلام کی وضع کا لحاظ رکھنا سب تم نے چھوڑ دیا۔ اور اُسی کرسٹان کی طرح تم مضامین لکھنے لگے۔ تقلید کے تارک ہوگئے علماء سے مخالفت کرنے لگے۔ وضع رہنی لباس و خوراک میں بدل ڈالی۔ سو بھائی اب بھی کچھ نہیں بگڑا تم اُس کی صحبت چھوڑ دو اور اپنے آپ کو بدنام نہ کرو آیندہ اختیار ہے۔ والسلام علےٰ من اتبع الہدےٰ ؏

جواب خط

جناب بھائی صاحب آپ کا نصیحت نامہ جس کے لفظ لفظ سے محبت کی بو آتی تھی اور جس کی سطر سطر سے ہمدردی اور دلسوزی ظاہر ہوتی تھی میں نے پایا۔ دل و جان سے اُس کا شکر کرتا ہوں اور نہایت ادب سے اُس کا جواب لکھتا ہوں ؏

بھائی صاحب۔ جب تک میں نے سید احمد خاں کو نہ دیکھا تھا اور ان کے اصلی حالات اور مذہبی خیالات سے ناواقفیت تھی میں سب سے بڑھ کر ان کا دشمن تھا۔ بلکہ ان کے الحاد اور زندقہ اور تہمت کا قائل تھا مگر جب سے میں ان سے ملا ہوں اور ان کے حالات اور خیالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں تب سے مجھے ان کی سچائی اور ایمان اور ان کے عقاید کی خوبی اور انکے مذہبی خیالات کی صفائی کا ایسا یقین ہوگیا ہے کہ لوکشف الغطاء ماازددت یقیناً ؏

میں اُن کے مذہبی خیالات کی خوبی اور صفائی کا صرف اقرار ہی نہیں کرتا بلکہ اُس پر حیرت بھی کرتا ہوں کہ ایسے زمانہ میں جبکہ اکثر لوگوں کے دلوں سے سچائی اور حق کی تحقیق کا نور جاتا رہا تھا اور رسم و رواج کی پابندی اور رہنماؤں کی تقلید اور عوام کی نگاہوں میں جھوٹی وقعت پیدا کرنے کی آرزو اور ریائی اتقا اور تورّع کی شہرت کے شوق نے جاہلانہ تعصبات میں لوگوں کو مبتلا کر رکھا تھا اور تقلید نے حقیقت اشیاء کے ادراک کی قوت کو جو ہر انسان کی فطرت میں خدا نے

رکھی ہے معطل اور بیکار کر دیا تھا اور خدا و رسولؐ کی اصلی ہدایتوں اور پاک حکموں سے چشم پوشی کرکے لوگوں نے زید و عمر کی روایات اور جھوٹے قصص و حکایات پر دین و مذہب کا مدار ٹھہرا رکھا تھا۔ اور مذہبی احکام کے علل اور اغراض اور اسرار کی تحقیق کا شوق دلوں سے جاتا رہا تھا اور برادری کی شرم اور جمہور کی مخالفت کے خوف اور کفر کے فتوے کے ڈر نے حق و باطل میں تمیز کرنے کی راہ بند کر دی تھی۔ کیونکہ ہماری ہی قوم میں سے ایک شخص کو حق کی تحقیق کا خیال آیا اور کس طرح حقایق اشیاء کے ادراک پر متوجہ ہوا۔ اور کیونکر اسلام کی محبت نے اس کے دل کو ایسا قوی کر دیا کہ حق کے ظاہر کرنے اور سچی راہ پر چلنے اور تقلید کے چھوڑنے میں نہ برادری کا خیال کیا نہ جمہور کی مخالفت سے ڈرا نہ کفر کے فتوے سے خائف ہوا۔ فللہ درہ وعلی اللہ اجرہ ۔

پس بھائی صاحب جب میرے دل میں اس شخص کی نسبت اسلام کی محبت کا یہ خیال ہو تو میں کیونکر اس کی محبت چھوڑ دوں اور کس طرح اس کو برا سمجھوں سچ یہ ہے کہ جس طرح آپ اور اور ناواقف لوگ صرف اسلام کی وجہ سے ان سے عداوت رکھتے ہیں ویسا ہی میں فقط ان کے سچے ایمان کے سبب سے ان سے محبت رکھتا ہوں وللناس فیما یعشقون مذاہبؐ ۔

حضرات! مولوی ہونا۔ فقیہ بن جانا۔ عربی عمامہ سر پر باندھ لینا۔ ہزار دانہ کی تسبیح زیتون کی زیب گلو فرما لینا قبائے نورانی سے بدن کو مزین کر لینا۔ مقدس و ابرار اور شیخ وقت ہو جانا۔ مجلس وعظ میں نکات و اسرار بیان کر کے سامعین کو ہلا دینا۔ خانقاہ میں بیٹھ کر تصوف کے دقایق اور توحید کے نکتے ارشاد فرما کر سننے والوں کو وجد میں لے آنا۔ یا کسی مزار و درگاہ میں جا کر مریدان با صدق و صفا کو حلقہ توحید میں بٹھا کر عرش کی زیارت کرا دینا آسان ہے اور نہایت آسان ہے مگر مشکل اور سب سے زیادہ مشکل ہے مسلمان ہونا اور خدا سے یکرنگی اور یکدلی کے ساتھ معاملہ رکھنا اور ریا اور مکر اور نفاق سے بچنا ۔

شراب پی کر۔ مردار کھا کر علانیہ سب کے سامنے اقرار کر دینا اور ممبر پر چڑھ کر اپنے اصلی حالات اور اپنے دلی خیالات کا خطبہ پڑھ دینا اسلام کی سچائی ہے۔ نہ کہ نورانی کرتہ پہنکر اپنے داغوں کو چھپانا۔ اور عربی عمامہ باندھ کر اپنے تئیں مقدس جتانا اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے اپنے آپ کو حضرت اور شیخ بتانا اور قرآن کے دام میں موٹی موٹی چڑیوں کا شکار کھیلنا۔ اور روکھی سوکھی صورت بنا کر لقمہ تر نوش فرمانا اسلام سے اور ان مکاریوں سے کیا سبب۔ ع

مرد ایں رہ را نشانے دیگر است

بھائی صاحب افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے سید احمد خاں کی حقیقت اب تک نہیں جانی۔ اور تعصب اور تقلید یا بغض اور حسد نے ان کی خوبیوں کو آپ کی نظروں سے چھپا دیا۔ ورنہ آپ

لوگوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے لئے جو کچھ انہوں نے کیا ہے اور کر رہے ہیں اُس کا شکر آپ لوگوں سے ادا نہ ہوتا اور جو کچھ اُن کے مساعئ جمیلہ سے فائدہ ہوا اُس سے آپ محروم نہ رہتے مگر امید ہے کہ آیندہ آنے والی نسل ان کے بوئے ہوئے بیج کا پھل پاوے اور آپ لوگوں کی اولاد اُن کے دست و بازو کا شکر ادا کرے۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

علما کی مخالفت کا الزام ان کی نسبت کرنے سے مجھے کچھ تعجب نہیں ہوتا کیونکہ اگر اس مہلک بیماری میں آپ لوگ مبتلا نہ ہوتے اور تقلید نے اسلام کو مجموعہ قصص و حکایات نہ بنا دیا ہوتا اور زید و عمر کے اقوال اور بہمان و فلاں کی رائیں مثل وحی کے واجب الاتباع نہ سمجھی جاتیں تو اُن کو مخالفت کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور تحقیق کے جھنڈے کا پرچم کھولنے پر ان کا ہاتھ ہی نہ اُٹھتا۔ آپ کی تقلید اور اتباع اقوال قدما کی عالمگیر مصیبت ہی نے ان کو اس طرف متوجہ کیا اور اسی وجہ نے یہ شور و شغب ہندوستان میں مچا دیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ اگر چندے ہندوستان کے مسلمان اسی نیند میں سوتے رہے اور حضرات علما قصے کہانیاں کہہ کر آئندہ آنے والی نسل کو بھی خواب خرگوش میں سلایا کرتے اور کوئی اُن کا چونکانے والا اور تازیانہ لیکر جگانے والا نہ ہوتا اور لوگ اسی طرح تقلید کے پابند رہتے اور مخالفت جمہور کے خیال سے تحقیق کا شوق نہ کرتے بلکہ ہر بات کی صحت و غلطی کے اوراق کے لئے اپنے پرانے نسخوں اور لال کتابوں ہی کے کھولنے کی بدعادت میں مبتلا رہتے اور خدا اور رسول کے کلام کو چھوڑ کر پرانے لوگوں کے قولوں ہی پر تحقیق کو منحصر سمجھتے اور حضرات علما رحمۃ اللہ علیہم تعصب کے سبب سے یا اپنے خیالات کی غلطی کی وجہ سے یا اپنے تقدس اور تورع کی اشاعت کی غرض سے فتووں سے ڈرایا کرتے اور ہم لوگ بھی جنت و دوزخ کی کنجیاں نہیں کے اختیار میں اور رضوان خازن جنت اور مالک داروغہ جہنم کو انہیں کا نوکر سمجھ کر ان کی تحریر ہی پر اپنے آپ کو قطعی جنتی اور یقینی دوزخی سمجھا کرتے اور ان کے کفر کے فتووں کے ڈر سے نہ تحقیق حق کا قصد کرتے اور نہ جس کیچڑ اور دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اس سے نکلنے پر کمر ہمت باندھتے تو بلا شبہ یُن مذہب پر مرثیہ پڑھتے اور اسلام اور ایمان پر نوحہ کرنے اور سچائی اور صفائی پر ماتم کرنے کا وقت آگیا تھا۔

لان العلماء هم ادلة الطريق وقد شغر عنهم الزمان ولم يبق الا المترسمون وقد استحوذ على اكثرهم الشيطان واستغواهم الطغيان واصبح كل واحد منهم بعاجل حظه مشغوفا فصار يرى المعروف منكرا والمنكر معروفا۔

بھائی صاحب میرے اوپر بھی ایک ایسا زمانہ گذرا ہے کہ میں علما کی مخالفت کو ارتداد اور الحاد کہتا تھا۔ بلکہ عربی عبارت میں جو کتاب لکھی ہوتی تھی اس کے ایک فقرہ سے انکار کرنے

کو بھی بداعتقادی جانتا تھا۔ اور آپ کی طرح ہر عالم اور ہر مولوی کی کتاب کو کالوحی المنزل من السماء سمجھ کر اس پر یقین کرنے کو ایمان کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ مگر ایک روز امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کی چند سطروں کو دیکھ کر میں بداعتقاد ہو گیا اور حضرات علماء کے اقوال اور رایوں کے اتباع کرنے اور ان کی ہر بات کو سچ جاننے اور ان کے ہر امر میں تقلید کرنے کو ضعف اسلام کا ثمرہ سمجھنے لگا۔ اور مخالفت جمہور کا جو خوف میرے دل میں تھا وہ بالکل جاتا رہا۔ امام صاحب اوّل تو حضرات علما کی نسبت لکھتے ہیں کہ "انہوں نے علم کی حقیقت کو لفظوں پر منحصر کر دیا ہے اور تبدیل الفاظ سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈال دیا ہے فقہ اور حکمت اور تصوف اور کلام کو حرام مال پیدا کرنے کا دام بنا رکھا ہے۔ اور جو مراد خدا اور رسولؐ کی ان لفظوں سے تھی اسے بدل دیا ہے اور اپنی وعظ گوئی اور قصہ خوانی اور فصاحت و بلاغت اور اصطلاحات جدیدہ اور عبارات مزخرفہ پر علم دین کا مدار ٹھہرا رکھا ہے" اور پھر امام صاحب مخالفت جمہور کی نسبت لکھتے ہیں کہ "بڑا مانع تحقیق حق کا مخالفت جمہور کا خیال ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سب لوگ ہم کو مجنون و دیوانہ بتاوینگے اور ہم سے مسخرگی اور ٹھٹھا کرینگے اس لئے اگر ہم باطل پر ہیں تو خیر کیا مضائقہ ہے جو سب کا حال ہوگا وہی ہمارا ہوگا مرگ انبوہ جشنے دارد۔ مگر ایسے خیال کرنے والے کو سوچنا چاہیے کہ اگر اس کے ساتھی ڈوبنے لگیں مگر وہ ایک کشتی پالے اور اس پر سوار ہو کر بچنے پر یقین کرے اور ان کے چھوڑنے پر اپنی نجات سمجھے تو کیا اس وقت لوگوں کا ساتھ دیگا۔ اور اپنی نجات کے ذریعہ کو چھوڑ دیگا۔ کوئی نادان بھی ایسی رفاقت کو پسند نہ کریگا۔ وبھذ یملک الکفار الا لموافقۃ اہل زمانھم حیث قالوا انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارھم مقتدون"

حضرت من بلاشبہ تحقیق حق کا بڑا مزاحم یہی خیال مخالفت جمہور کا ہے اور جاہلانہ خوش اعتقادی ہی راہ راست کے ڈھونڈنے کی بڑی مانع ہے۔ اچھے پڑھے لکھے یہی خیال کرتے کہ اگلوں نے کوئی بات نہیں چھوڑی اور سارے امور کی تحقیق کر لی ہے قصد ہی نہیں کرتے کہ اصلیت او حقیقت کو کما ہی ہی ثابت کریں مگر جو لوگ خیال نہیں کرتے کہ سب اگلے اور سارے بزرگ یہی کرتے آئے ہیں اور تحقیق ہی کے سبب سے وہ بزرگ اور محقق کہلاتے ہیں اگر ائمہ دین اور مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین یہ خیال کرتے۔ کہ اگلے سب کچھ کر گئے ہیں تو اصول فقہ اور فقہ کی تدوین کا کب قصد کرتے اور پھر آئندہ علماء اسلام علم کلام کے اصول و فروع کی تمہید کا کیوں ارادہ کرتے اور بعد اس کے علوم معقولات کی اشاعت پر حضرات علما کب توجہ فرماتے اور جو جو ترقیاں علمی اسلام میں ہوئیں وہ کیونکر ہوتیں اگر ہم سنی مسلمانوں کی طرح وے حضرات بھی خوش اعتقاد ہوتے اور مخالفت سلف کے خیال سے تحقیق کسی چیز کی نہ کرتے اور جن علموں کی ضرورت حاجت ہوتی

گئی اُس کی تدوین نہ فرماتے، اور تقلید کی دلدل میں پھنسے رہتے تو اسلام میں آجتک نہ کوئی عالم ہوتا نہ امام نہ کوئی مجتہد کہلاتا۔ نہ کوئی محقق پس ہم لوگوں کی غفلت اور جہالت اور بانصیبی ہے جو ہم تحقیق کو مخالفت علمائی سمجھتے ہیں۔ اور اجتہاد اور حقیقت اشیاء کے ادراک کو بد اعتقادی جانتے ہیں اور ساری تحقیقاتوں اور تمام اشیاء کی حقیقتوں کے دریافت کو اپنے اگلوں پر منحصر اور ختم سمجھتے ہیں۔ فنعم القول قول القائل الماهر كم ترك الاول للآخر وهذا هو قول الذى عليه التعويل ومن ذهب الى غيره لم يهتد الى سواء السبيل فان فضائل الله ليست محصورة فى قوم دون قوم ولا مختصر بيوم دون يوم ؛

بھائی صاحب۔ اس تقلید اور پابندیٔ رسم نے جیسے بدنتیجے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں پیدا کئے ہیں۔ اس پر اس شخص کو رونا آتا ہے جو ان باتوں پر غور کرتا ہے اور جو مسلمانوں کے علوم و فنون اور عقائد و اعمال کو نظر غور سے دیکھتا ہے مگر حضرات علما اور برادر ہماری قوم کے وہ آنکھ ہی نہیں رکھتے جس سے ان خرابیوں کو دیکھیں اور دل ہی نہیں رکھتے جس سے اپنی قوم کے تنزلات و زوال کو سوچیں بلکہ وہ تو ایمان و اسلام اور ورع اور تقویٰ اور تہذیب اور دینداری کو اسی پر منحصر سمجھتے ہیں کہ تیلی کے بیل کی طرح آنکھ پر پٹی باندھ کر رات دن ایک محدود و تنگ دائرہ میں گھوما کریں اور اس وسیع میدان کو تختۂ جنت کی طرح ہر قسم کے گل بوٹوں سے آراستہ ہیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں ؛

اسی تقلید کا سبب ہے کہ مسلمانوں کے علوم گھٹ گئے۔ ان کے عقاید مذہبی بگڑ گئے ان کے اعمال ہندوانہ ہو گئے ان کی دنیاوی ترقیاں رک گئیں ان کی عزت اور منزلت جاتی رہی غیر قوموں کی نظروں میں ذلیل ہو گئے تربیت یافتہ لوگ جاہل سمجھنے لگے۔ اگر کسی کو شک ہو وہ امتحان کر لے اور اپنی آنکھ سے دیکھ لے ؛

کسی ایسے بڑے سے بڑے نامی مدرسہ میں جاکر تعلیم کی کیفیت دیکھو جس کے مدرس کوئی بڑے مشہور منطقی اور نامی فلسفی اور جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول ہوں کہ وہاں بھی جلوہ تقلید کا چمکتا اور پابندی رسم کا نور جھلکتا ہوگا حضرت اُستاد علامہ زمان نہایت خوبی اور کمال قابلیت سے اسطقسات اربعہ کی کیفیت بیان فرماتے ہونگے اور نہایت فصاحت و بلاغت سے طبعیات کے مسائل کی تشریح کرتے ہونگے اور کمال خوبی سے برہان ترسی اور برہان سلمی کو ثابت کرتے ہوں گے اور صدرا کی شناۃ بالتکریر کے عقدے حل کرنے پر ملک العلما اور بحر العلوم کے حاشیے کھولے ہوں گے اور میر زاہد شرح مواقف کے منہی نہایت خوش تقریری سے طالب علم کو سمجھاتے ہوں گے۔ حالانکہ اگر وہی حضرت علامی فہامی ان مسائل حکمیہ کو مسائل جدیدہ سے مقابلہ کریں اور اُس طرز تعلیم

کو جواب جاری ہے دیکھیں تو وہ خود اقرار کرینگے کہ ہم جہل مرکب میں گرفتار ہیں اور اپنی اور اپنی قوم کے لڑکوں کی عمر فضول بحثوں اور عبث باتوں میں ضائع کرتے ہیں اور ہیچ پھر بیہودہ باتوں کو علم اور حکمت سمجھتے ہیں ❖

مگر عزازت علم اور شہرت فضیلت اور غیرت زہد و تقوے حضرت مولانا کی ایسی بلائے جان ہے کہ وہ کب اس تقلید سے نکلنے اور علوم و فنون جدیدہ کے دریافت کرنے اور موافق حال اور ضرورت وقت کے علوم مفیدہ کی تعلیم کرنے کا ارادہ کر سکتے ہیں ❖

اگر علوم و فنون سے بھی قطع نظر کی جائے اور دین و مذہب پر خیال کیا جائے تو اسی تقلید کے سبب سے اس کا بھی حال ابتر ہے اول تو تقلید آئمہ اربعہ رحمتہ اللہ علیہم کی ایمان نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اب ہر خاندان میں اس خاندان کے بزرگوں کی چال و چلن کی تقلید نشانی اسلام کی خیال کی جاتی ہے اور ہر رسم کی ٹھیک ٹھیک پابندی پرہیزگاری اور دینداری سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ حضرات صوفیہ کرام کی خانقاہوں اور مشائخ عظام کی درگاہوں اور حضرات علما کے وعظ کی مجلسوں اور عاشقان اہل بیت کے امام باڑوں میں ذرا قدم رنجہ فرمائے اور خدا کی کتاب کو ہاتھ میں لیکر اُن کے عقائد و اعمال کو اس سے ملائے اور انصاف کرے کہ اس میں اسلام کتنا ہے اور کفر اور شرک اور بدعت کس قدر ❖

امور دنیاوی پر اگر خیال کیا جائے تو وہی بلائے تقلید ذلت و ادبار کے نتیجے دکھا رہی ہے معاشرت کے طریقے۔ زندگی بسر کرنے کے قاعدے۔ معاش حاصل کرنے کی تدبیریں۔ مخالطت اور مجالست کے طور۔ شادی اور غمی کی رسمیں جو کچھ ہیں وہ سب تقلیدی ہیں۔ اور گو خود ہمارے بھائی بعض یا اکثر باتوں کی برائی کے منقر ہوں اور اس کی پابندی کو ذریعہ ذلت اور رسوائی اور افلاس اور نالائقی کا سمجھتے ہوں۔ مگر وہی ترک تقلید اور مخالفت جمہور کا خوف کچھ کرنے نہیں دیتا اور کسی کو اس پابندی سے نکلنے کی جرأت نہیں ہوتی ❖

پس بھائی صاحب ایسی حالت میں جب کہ تقلید اور پابندی رسم کی سیاہی نے دلوں کو تاریک کر دیا ہو اور وہ نور جسے عقل کہتے ہیں چھپ گیا ہو اور ہمارے عقیدے اور اعمال تقلیدی ہو گئے ہوں اور غیر قومیں ہمارے تعصب و جہالت پر خندہ زن اشارے کرتی ہوں اور شب و روز نکتا چیں اور اسباب ہماری ذلت کی باتوں سے سیاہ کئے جاتے ہوں۔ اگر خدا کسی کی آنکھ کھولے تو وہ کیا کرے۔ یا کہ جمہور کی موافقت کر کے جاہلانہ تقلید کی دلدل میں پھنسا رہے یا اسلام کی محبت اور اپنی قوم کی ہمدردی کے جوش میں آکر خود اپنا پاؤں اس

کیچڑ سے نکلے اور اپنے بھائیوں کے نکلنے کی خواہش کرے۔

بھائی میرے برا ماننے کی بات نہیں ہے لیکن آپ لوگ ہمدردی اور محبت قومی اور ملکی ترقی اور اسلام کی روشنی پھیلانے کی حقیقت ہی سے ناواقف ہیں اور اس کے اصول ہی سے بے خبر ہیں سچ یہ ہے کہ یہ الفاظ آپ کے نزدیک مہمل اور بے معنی ہیں۔ ورنہ کیا اب تک مسلمانوں کی یہی حالت رہتی اور آیندہ کو سوائے تنزلات روز افزوں کے کوئی بھی صورت ترقی کی نہ دکھائی دیتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے بھائی سخاوت نہیں کرتے۔ فیاضی ظاہر نہیں فرماتے۔ اب تک خدا کے فضل سے ایسے بلند حوصلہ۔ عالی ہمت۔ صاحب جود و سخا موجود ہیں کہ لاکھوں روپیہ ایک دم میں صرف کر دیتے ہیں لیکن چاہئے کہ اپنے بھائیوں کی بھلائی میں کچھ خرچ کریں اس کا کیا ذکر ہے۔

ان بدمعاشوں اور نالایقوں کا کچھ ذکر نہیں جو فواحش اور معصیت کے کاموں میں اسراف کرتے ہیں بلکہ ہم ان بلند ہمتوں کا ذکر کرتے ہیں جو اپنی شہرت اور عزت اور دین کے لئے بہت کچھ صرف کرتے ہیں جب ان کے اسراف پر نظر کی جاوے تو معلوم ہوگا کہ وہی تقلید اور پابندئ رسم کی اُن کے روپیہ کو برباد کرتی ہے اور جھوٹی شہرت اور بے اصل عزت کے حاصل ہونے کی تمنا ان کا روپیہ لٹاتی ہے۔

کیا کسی نے سنا ہے کہ سوائے شادی بیاہ میں ہزارہا روپیہ لگانے یا بھائیوں کو نورہ بندی کھانا تقسیم کرنے یا بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بنانے یا حاکموں کی خوشامد سے غیر مفید کاموں میں روپیہ لگانے یا جھوٹی دینداری اور جاہلانہ تعصب سے خانقاہوں اور مزاروں اور امام باڑوں میں شرک اور بدعت کے کاموں میں دولت برباد کرنے کے کسی نے اب تک کوئی ذخیرہ یا رقم کثیر بلکہ کچھ حصہ بھی اپنی کمائی کا اپنی قوم کی بھلائی کے کاموں میں لگایا ہو یا لگانے پر رغبت کرتے ہوں۔ پس کیا سبب اس کا صرف پست ہمتی اور بخل ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ سبب اس کا یہ ہے کہ تقلید اور پابندئ رسم کے سبب سے ہم کو اس بات کے کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی جواب تک ہم نے نہ کی ہو۔ اور اگر جرأت بھی ہو تو بوجہ نہ ہونے عادت کے اُس طرف رغبت ہی نہیں ہوتی اور اس کام کو کچھ مفید یا باعث ثواب یا موجب عزت ہی نہیں سمجھتے ورنہ اگر وہ روپیہ جو محرم اور عرس میں تیلوں کے جلانے اور چراغاں کرنے اور ڈھول بجانے میں صرف کیا جاتا ہے مسلمانوں کی تربیت اور تعلیم میں ایک جگہ جمع کر کے بطرز مناسب صرف کیا جاوے تو خود مسلمان دیکھیں کہ ان کو کیسی ترقی ہوتی ہے اور ان کی اولاد کیا عزت حاصل کرتی ہے۔

غرض کہ اس زمانہ میں پہلا کام مسلمان کا یہ ہے کہ وہ مشرک کی طرح تقلید اور رسم کی پابندی

چھوٹے اور اپنی گردن کو اس پھانسی کے پھندے سے نکالے اور کفر کے فتوے اور برادری کے طعنے سے نہ ڈرے اور جب تک مسلمان یہ نہ کرینگے تب تک ہمارے نزدیک کوئی امید ان کی ترقی کی نہیں ہے الا ان یشاء اللہ پس بھائی صاحب وہ شخص جس نے پہلا یہ کام ہندوستان میں کیا ہے اور جس نے فقط اسلام اور مسلمانوں کے پیچھے اپنا وقت اور مال بلکہ اپنی جان کو قربان کیا ہے وہی ہے۔ جسے لوگ سید احمد کہتے ہیں اور جس پر ہزاروں طعنے کفر اور ارتداد کے ہوتے ہیں۔ اگر محبت قومی کی کچھ حقیقت آپ کو دریافت کرنی ہو تو ذرا اُس کے پاس آبیٹے اور اس درد کو اُس کے دل سے پوچھئے اور اس جانسوز مصیبت کا افسانہ اُسی ملحد کی زبان سے سُنئے ؎

بحرم سوئے کلبۂ احزان اوشبے
تا بنگری کہ عشق تو با او چہ می کند

سوال و جواب

میرے ایک دوست نے بمقام الہ آباد میرے پاس ایک سوال تحریری بھیجا تھا اب میں اُس کا جواب لکھتا ہوں ؛

سوال

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین متین اور شرع مبین کہ اگر زید قرآن شریف کے کسی جزو سے انکار کرے اور کل احادیث کو یہ کہے کہ سب بالمعنی ہیں کوئی باللفظ نہیں اور باوجود اس کے عمرو زید کو پکا مسلمان اور سچا ایمان دار جانے اور کہے۔ تو شرعاً عمرو کی نسبت کیا حکم ہے ؛

جواب

اگر زید قرآن شریف کے کسی جزو سے انکار کرے یعنی کسی سورہ یا کسی آیت کو منزل من اللہ اور وحی متلو نہ جانے یا جن چیزوں کا ذکر اس میں ہے اس کے ہونے سے بوجود ذاتی یا بوجود حسی یا بوجود خیالی۔ یا بوجود عقلی یا بوجود تشبیہی منکر ہووے۔ یا اس کے مطلب سے جو الفاظ کی دلالت اور مقام کے قرینہ اور عبارت کے سیاق اور عرب کے محاورہ سے اجماعاً سمجھا گیا ہو اور اصول عقائد کے متعلق ہو بغیر کسی دلیل شرعی اور برہان قوی کے انکار کرے تو زید کافر ہے۔ اور اگر

اس انکار پر عمرو زید کو پکا مسلمان اور سچا دیندار جانے اور اس تکذیب و انکار میں اپنا اتفاق ظاہر کرے تو وہ بھی کافر ہے لیکن اگر زید قرآن کو لفظاً لفظاً خدا کا کلام جانتا ہو اور بسم اللہ سے لیکر تا والناس ہر آیت کو وحی متلو سمجھتا ہو اور جو کچھ اس میں مذکور ہے کیا از قبیل اخلاق و عقاید اور کیا از جنس عبادات و معاملات اور کیا از قبیل اخبار و قصص اور کیا از قسم حالات آخرت ان سب کو حق اور واجب الیقین والعمل جانتا ہو مگر ان الفاظ اور کلمات کے جن کے لفظی معنی مراد لینے سے مخالفت کسی اصل سے منجملہ اصول دین کے یا کسی مسئلہ سے منجملہ مسائل صحیحہ عقلیہ کے یا کسی امر سے منجملہ امور موجودہ واقعیہ کے ہوتی ہو۔ ظاہری معنی نہ لیتا ہو۔ بلکہ ایسے صحیح اور اصلی معنی مراد لیتا ہو جو قرینہ مقام اور محاورۂ عرب کے مخالف اور شارع کے مقصود اصلی کے برعکس نہ ہوں یا اسمائے موجودات سے جن کا ذکر قرآن میں بلا تشریح اُن کی حقیقت کے ہے۔ وہ حقیقت مراد نہ لیتا ہو۔ اور جس کے اثبات پر سوائے اوہام اور ظنون کے کوئی عقلی دلیل بھی نہ ہو یا ان آیات احکامی سے جن کی تعمیم بظاہر معلوم ہوتی ہو بلحاظ اصول صحیح کل عام یحتمل التخصیص کے بعض حالات کو بات۔لال کتاب و سنت مستثنےٰ کرتا ہو یا اُن مسائل اصولی و فروعی کو جن کا ثبوت صراحتاً نہ ہوتا ہو مگر بقیاس بعیدہ لفظوں سے ان کا استنباط کیا گیا ہو نہ مانے یا قرآن مجید کی ان تفسیروں کو جن کی کوئی سند صحیح صاحب الکتاب سے نہ ہو اور لوگوں نے اُسے اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق کیا ہو واجب القبول نہ جانتا ہو گو لوگوں کے نزدیک وہ باتیں جزو قرآن سمجھی جاتی ہوں اور اس کا انکار قرآن تصور کیا جاتا ہو اور ان سب حالتوں میں زید کی نیت سوائے اعلاء کلمۃ اللہ اور احقاق حق اور رفع الزام اور دفع مطاعن اور تطبیق اصول دین کی اصول صحیحہ عقلیہ سے اور ثابت کرنے حقیقت مذہب اسلام کی سب لوگوں پر کیا جاہل اور کیا عالم اور کیا حکیم اور کچھ نہ ہو تو زید بلاشبہ پکا مسلمان اور سچا ایماندار ہے اور عمرو بھی جو زید کو ایسا سمجھتا ہو ویسا ہی پکا مسلمان اور سچا ایماندار ہے ؂

اگر زید کل احادیث کو بالمعنی کہے اور ان کی روایات کو بالالفاظ نہ مانے یعنی یہ کہے کہ ان حدیثوں میں سے کسی میں کوئی لفظ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نہیں ہے تو وہ احمق اور جاہل ہے لیکن اگر وہ یہ کہے کہ احادیث کے الفاظ پر یقین نہیں ہے کہ یہ سب الفاظ وہی ہیں جو شارع نے فرمائے ہیں شاید ہوں یا نہ ہوں اور نہ اُس نظم و ترتیب کی نسبت جو الفاظ اور کلمات میں احادیث کے ہے یقین ہے کہ وہی نظم و ترتیب ہے جو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی شاید ہو شاید نہ ہو تو زید نہ کافر ہے نہ مرتد بلکہ ایک محقق مسلمان ہے اور عمرو جو اسے سچا مسلمان جانے وہ بھی ویسا ہی ہے ؂

میں اس جواب کی کچھ زیادہ تحریر کرنی مناسب سمجھتا ہوں تاکہ تنقیح قرآن و حدیث کی تصدیق و تکذیب کی حقیقت سے واقف ہو جاوے چونکہ یہ جواب متعلق دو چیزوں سے ہے قرآن اور حدیث اس لئے دونوں سے علیحدہ علیحدہ بحث کرتا ہوں ◆

بحث اوّل بہ نسبت تاویل قرآن

قرآن کی تصدیق حقیقت میں یہ ہے کہ اُسے وحی متلو سمجھنا اور منزل من اللہ جاننا اس کی تمام باتوں کو حق اور صحیح ماننا۔ اور اس کی تکذیب یہ ہے کہ اُسے ایسا نہ جاننا پس جب تک کوئی مسلمان قرآن کو خدا کا کلام جانے اور اس کی سب باتوں کو مانے تب تک تصدیق قرآن کی نسبت اُس کی طرف ہوگی اور وہ منکر قرآن نہ سمجھا جاویگا لیکن جب اُس نے اُسے ایسا نہ جانا یا اُس کی کسی بات کو غلط مانا تو وہ تکذیب کرنے والا قرآن کا ٹھہریگا اور تب کفر کی نسبت اس کی طرف جاویگی۔ یہ مذہب تو اصل محققین کا ہے مگر جو لوگ ہمارے مذہب کی تحقیق کے درجہ پر نہیں پہنچتے اور جنہوں نے کفر کو غلہ سے بھی زیادہ ارزاں کردیا اور بات بات پر مسلمانوں کی طرف کفر کی نسبت کی انہوں نے قرآن مجید کا انکار ذرا ذرا سے اختلاف پر لوگوں کی طرف منسوب کیا؛ اور نہایت بے احتیاطی سے کلام الٰہی کی تکذیب کے فتوے جاری کئے چنانچہ بعضوں نے فرمایا کہ جو شخص اصول مذہب ماتریدی کا معتقد نہ ہو وہ منکر قرآن ہے بعضوں نے کہا کہ جو کوئی عقائد اشعری کا قائل نہ ہو وہ مکذب قرآن ہے۔ پھر حنبلیوں نے اشاعرہ کو کافر جانا کہ وہ آیۃ علی العرش استوی کی حقیقت ظاہری سے منکر ہیں؛ اشاعرہ نے حنبلیوں کو منکر قرآن خیال کیا کہ وہ آیۃ لیس کمثلہ شئ کے مضمون کو نہیں مانتے سُنیوں نے معتزلیوں کی طرف انکار قرآن کی نسبت کی کہ وہ قرآن کی رویت کا جو قرآن سے ثابت ہے اعتقاد نہیں رکھتے معتزلیوں نے ان کی تکفیر کی کہ وہ اثبات صفات سے توحید کا اقرار نہیں کرتے۔ اس تکذیب و تکفیر نے یہاں تک ترقی کی کہ قطع نظر اختلاف اصول کے اختلاف فروع سے بھی ایک نے دوسرے پر تہمت تکذیب قرآن کی کی اور اپنے ظنون اور شبہات کی تائید میں خدا کے کلام کی سند لائے آخرکار بعض حنفیوں نے شافعیوں کو اور بعض بعض شافعیوں نے حنفیوں کو بدعتی اور گمراہ بتایا اور بدعتیوں نے وہابیوں کو اور وہابیوں نے بدعتیوں کو کافر اور مشرک ٹھہرایا اور عامی فقہا نے تو اپنی کتابوں میں بے سمجھے بوجھے تکفیر کے اتنے مسئلے بھر دیئے کہ گویا اُٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا سب کفر میں داخل ہوگیا پس اب ان لوگوں کی جو تقلید میں مبتلا ہیں کوئی چارہ اس بلا سے نکلنے کا نہیں کیونکہ اُن کا دین و ایمان عالموں کے اقوال اور مجتہدوں کی کتابیں ہیں اور وہ فقیر د

کے کشکول کی طرح ہر رنگ کے کھانوں سے بھرے ہوئے ہیں مگر ہاں جو شخص تحقیق کا آرزومند ہو اور بے سوچے سمجھے کسی بات کو نہ ماننے اُسے اس گرداب بلا سے نکلنے کا موقع حاصل ہے اور وہ منقح کیا ہے۔ قرآن کی اصلی تصدیق و تکذیب پر نظر رکھنا حقیقت تصدیق و تکذیب کی نوعیں اوپر بتا چکا۔ اب اُن قیود و شرائط کی تشریح کرتا ہوں جو ان میں کی گئی ہیں۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ ان حالات میں انکار قرآن کی نسبت کسی طرف کرنا جائز نہیں۔

اوّلاً۔ اُن الفاظ اور کلمات کی جن کے لفظی معنی مراد لینے سے مخالفت قرآن کی کسی اصل سے منجملہ اصول دین کے یا کسی مسئلہ سے منجملہ مسائل صحیحہ عقلیہ کے یا کسی امر سے منجملہ امور موجودہ واقعہ کے ہوتی ہو ظاہری معنی مراد نہ لینا بلکہ وہ اصلی اور حقیقی معنی مراد لینا جو قرینہ مقام اور محاورہ کے مخالف اور شارع کے مقصود اصلی کے برعکس نہ ہوں۔

ثانیاً۔ اسماء موجودات سے جن کا ذکر قرآن میں بلا تشریح اُن کی حقیقت کے ہے وہ حقیقت مراد نہ لینا جو لوگوں نے سمجھ رکھی ہو اور جس کا ثبوت نہ کتاب و سنت سے ہوتا ہو نہ جس کے اثبات پر سوائے اوہام و ظنون کے کوئی عقلی دلیل ہو اور ان اسماء سے موافق قرینہ مقام کے کوئی ایک وجود مراد لینا منجملہ وجود خارجی یا حسی یا خیالی یا عقلی یا تشبیہی کے۔

ثالثاً۔ اُن آیات احکامی سے جن کی تعمیم لفظاً ظاہر معلوم ہوتی ہو بموجب اصول صحیح ما من عام الا وقد خص منہ البعض بعض حالات کو باستدلال کتاب و سنت مستثنے کرنا۔

رابعاً۔ ان مسائل اصولی و فروعی کا جو صاف صاف لفظوں سے تو ثابت نہ ہوتے ہوں مگر بقیاس بعیدہ لوگوں نے استخراج کئے ہوں نہ ماننا۔

خامساً۔ قرآن مجید کی ان تفسیروں کو جسے بلا سند صحیح صاحب الکتاب کے لوگوں نے اپنی سمجھ اور اپنی فہم کے مطابق بیان کی ہو واجب القبول نہ ماننا۔

پہلی صورت کی تصریح یعنی قرآن کے بعض الفاظ سے ظاہری معنی مراد نہ لینا

جو الفاظ قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کی نسبت یہ خیال کرنا کہ ہر موقع اور ہر مقام پر ان کے وہی ظاہری معنی مراد لینا ضرور ہے جس کے واسطے وہ لفظ موضوع کئے گئے ہیں بڑی نادانی ہے اور اسی واسطے نہ اب تک کسی نے اہل تحقیق سے ایسا خیال کیا نہ کوئی کر سکتا ہے کیونکہ خدا نے قرآن مجید کو عرب کی زبان میں نازل کیا۔ ان کے محاورہ اور ان کی بول چال کے

مطابق الفاظ کا استعمال کیا پس ہم کو اُن کا محاورہ دیکھنا چاہئے کہ اہل عرب ہمیشہ لفظوں کو اُن کے ظاہری ہی معنی پر محمول کرتے تھے یا نہیں جیسا ہم عرب کے کلام میں پاویں ویسا ہی قرآن مجید کی نسبت خیال کریں پس جب ہم عرب کے کلام پر نظر کریں اور ان کے محاورہ اور استعمال کو دیکھیں بلکہ عرب کے سوا دنیا کے اور اہل زبانوں کی بول چال پر غور کریں تو کبھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ الفاظ ہمیشہ اپنے ظاہری معنی ہی پر محمول نہیں کئے جاتے بلکہ مختلف معنی اور مختلف مقصود پر اُن کا استعمال ہوتا ہے۔ اور ان معانئے مختلفہ میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ اور محاورہ کے مطابق خود ذہن سلیم پر منحصر ہے ۔

اب ہم کو ذرا غور سے ان معانئے مختلفہ پر غور کرنا چاہیے جن پر الفاظ دلالت کیا کرتے ہیں چنانچہ مراتب دلالت الفاظ پانچ ہیں۔ اوّل دلالت کرنا الفاظ کا وجود ذاتی پر۔ دوسرے دلالت کرنا وجود حسی پر۔ تیسرے دلالت کرنا وجود خیالی پر۔ چوتھے دلالت کرنا وجود عقلی پر۔ پانچویں دلالت کرنا وجود تشبیہی پر۔ دلالت کرنا لفظ کا وجود ذاتی پر یہ ہے کہ جس معنی کے واسطے وہ وضع کیا گیا ہو اسی پر دلالت کرے اور وہ شئے جس کی تعبیر اس لفظ سے کی گئی ہو وہ درحقیقت خارج میں موجود بھی ہو مثلاً ہمارا یہ کہنا کہ ابولہب کافر تھا اس مرتبہ میں داخل ہے کیونکہ یہ تواتر ثابت ہے کہ ابولہب ایک مرد مکہ کا رہنے والا تھا اور وہ کافر مرا ۔

دوسرے دلالت کرنا لفظ کا وجود حسی پر یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا گیا ہو وہ فی نفسہ موجود نہ ہو اور خارج عن الحس اس کا وجود پایا نہ جاوے بلکہ صورت مثالی اس کی خیال میں آنا ہی اس کا وجود سمجھا جاوے اور اس صورت مثالی کی تعبیر لفظوں میں کی جاوے جس طرح ہمارا کہنا کہ ہم نے جبرئیل امین کو خواب میں دیکھا پس حقیقت میں نہ وہ ہمارے پاس آئے نہ اُن کی صورت ظاہری ہمارے سامنے ہوئی۔ بلکہ ان کی صورت مثالی جو ہمارے ذہن میں گذری وہی ان کا وجود سمجھا گیا۔ پس اس مقام پر وجود جبرئیل سے مراد وجود حقیقی جسمانی نہیں ہے بلکہ صورت مثالی اور وجود روحانی مراد ہے اور چونکہ قرینۂ مقام اس کلام کو مرتبۂ اول پر یعنی وجود خارجی مراد لینے پر مانع ہے اس لئے وجود حسی مراد لینا ضرور ہوا ۔

تیسرے۔ دلالت کرنا لفظ کا وجود خیالی پر۔ وہ یہ ہے کہ محسوسات کی صورت اشکال کا جبکہ آنکھ سے غائب ہوں دیکھنا اور اس دیکھنے کو الفاظ کے ذریعہ سے بیان کرنا مثلاً ہمارا یہ کہنا کہ ہم کعبہ کو دیکھ رہے ہیں اور حاجیوں کا طواف کرنا ہماری آنکھ کے سامنے ہے حالانکہ ہم نہ کعبہ میں ہیں نہ حاجی ہمارے سامنے ہیں مگر کعبہ کی صورت اور حاجیوں کے طواف کی تصویر ہمارے خیال میں آئی اُسے ان لفظوں سے تعبیر کیا پس اس مقام پر بھی یہ الفاظ اپنے اصلی معنی پر محمول

نہیں ہوسکتے اور سوائے وجود خیالی کے دوسرا وجود رویت اور کعبہ اور طواف کا کسی کے ذہن میں نہیں گزر سکتا بخلاف اس کے اگر یہی بات ہم کعبہ میں کہتے جبکہ حاجی ہمارے سامنے طواف کرتے ہوتے تو اس وقت اس کلام سے اصلی معنی سمجھے جاتے اور یہ الفاظ وجود خارجی پر دلالت کرتے ؎

چوتھے۔ دلالت کرنا لفظ کا وجود عقلی پر۔ وہ یہ ہے کہ مطلب کا اُن لفظوں میں بیان کرنا جو اصلی حقیقت ان الفاظ کے معانی کی عقلاً ثابت ہو۔ مثلاً ہمارا کسی بے شرم آدمی کو کہنا کہ اُسے کچھ دکھلائی نہیں پڑتا پس نہ دیکھنے کا اطلاق ظاہر میں اسی پر ہوتا ہے جو کہ ظاہری آنکھ نہ رکھتا ہو مگر جو مقصود دیکھنے سے عقل کے نزدیک ہے وہ اس مقام پر مراد ہے یعنی نیک و بد میں تمیز کرنا پس اس مقام پر ان لفظوں کا محمل سوائے وجود عقلی کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا ؎

پانچویں۔ دلالت کرنا لفظ کا وجود تشبیہی پر۔ وہ یہ ہے کہ اُس چیز کا بیان کرنا جو کہ نہ خارج میں موجود ہو نہ حواس اور خیال سے متعلق ہو۔ نہ اُس کی کوئی حقیقت خاص ہو بلکہ کسی دوسری چیز کی کسی صفات یا خواص میں سے کسی ایک صفت یا ایک خاصہ سے مشابہ ہو اس مشابہت کا بیان کرنا جس طرح ہمارا یہ کہنا کہ فلاں شخص آفتاب ہے یعنی مثل آفتاب کے مشہور ہے ؎

پس یہ پانچ مرتبے موجودات کے ایسے ہیں کہ جب وہ الفاظ میں بیان کئے جاوینگے تو منجملہ ان مراتب پنجگانہ کے کسی ایک مرتبہ پر اُن کا محمول کرنا ضرور ہوگا اور یہ مرتبے کلام کے ایسے ہیں کہ ہر عامی اور ہر جاہل اپنی بول چال میں روزمرہ اس کا استعمال کرتا ہے اور ہمیشہ بات چیت میں ان حقائق و دقائق کو ادا کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ عرب کے ریگستان کے پھرنے والے اور حجاز کے پہاڑوں اور جنگلوں میں بکریاں چرانے والے بغیر سمجھائے بے بتائے قرینہ اور قیاس سے موافق قرینہ مقام کے ان الفاظ سے اُن کے کوئی ایک معانی ان معنوں میں سے خود بخود سمجھ جاتے تھے اور اب ساری دنیا کے جاہل اور بے پڑھے لکھے آدمی ان مراتب کی رعایت اپنے بولنے اور سمجھنے میں رکھتے ہیں گو وہ ان کی ترتیب اور درجات نہ سمجھیں اور اس حقیقت کو اپنی زبان سے ادا نہ کرسکیں پس الفاظ کے دلالت کرنے سے ان معانئے پنجگانہ پر کوئی شخص نہیں ہے جو انکار کرے اور جب یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے تو اب ہم خدا و رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام پر نظر کرنی چاہیئے کہ ان کے کلام میں بھی ان مراتب کی رعایت ہے یا نہیں۔ پس اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں ہے تو یہ سفسطہ اور جنون ہے۔ کیونکہ خدا کا کلام جو ہماری ہدایت کے لئے نازل ہوا ہمارے ہی محاورہ اور ہماری ہی طرز پر ہے۔ وہی بول چال ہے جو ہمارے روزمرہ میں ہے۔ وہی طرز و انداز ہے جو رات دن ہمارے استعمال میں ہے۔ اُس نے ہمارے مقصود کو ہماری ہی بولی میں ہمارے ہی

طور پر ادا کیا ہے۔ اُس نے اپنے کلام قدسی بے صوت و حرف کو ہمارے ہی لفظوں اور ہمارے ہی کلام کے پیرایہ میں ظاہر کیا ہے پس سوائے پلے سرے کے جاہل کے کون ہے کہ یہ کہے کہ اُس نے اپنے الفاظ کے مدلول کو محدود کر دیا اور سوائے وجود خارجی کے موجودات کے اور مراتب کا اپنے کلام میں لحاظ نہیں رکھا اور جس طرز پر ہم میں سے ہر جاہل و عامی گفتگو کرتا ہے اُس طرز کو بدل دیا۔ حقیقت میں نہ خدا نے ایسا کیا نہ ایسا ہو سکتا تھا۔ بلکہ اگر کوئی یہ کہے کہ چونکہ خدا کو ہماری روحانی تعلیم منظور تھی اور ہم کو وہ باتیں بتانا چاہتا تھا جسے نہ ہماری آنکھ نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا۔ نہ ہمارے دل میں اُس کا خیال آیا نہ وہم اپنے جیتے جی دیکھ سکتے یا خیال کر سکتے ہیں۔ اس لئے اپنے کلام کو عام کر دیا اور موجودات کے ان مراتب میں سے جن کا ہم استعمال کرتے تھے کوئی ایک مرتبہ اور بڑھا دیا۔ تو قیاس میں بھی آسکتا ہے نہ کہ اُس کا کم کر دینا اور باوجود ضرورت تعلیم کے اُسے محدود کر دیا فذالک ظن الذین لا یؤمنون اور پھر جبکہ ہم پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول پر خیال کرتے ہیں کہ ان للقرآن ظھراً و بطناً اور اصحاب نبوی اور علمائے شریعت اور محققین وقت کی باتوں اور تحقیقاتوں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک ایک لفظ سے قرآن کے مختلف معنی مراد لئے ہیں اور سارے حقائق روحانی و دقائق علمی کا استنباط انہیں لفظوں سے فرمایا ہے تو ہم کو اور بھی کامل یقین ہوتا ہے کہ ضرور خدا نے اپنے کلام کو اس طرز پر بیان کیا ہے کہ اُس کی ظاہری تفسیر سے تو ہر عامی و جاہل مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اور اُس کی باطنی تاویل سے ہر حکیم و عاقل حقیقت پر پہنچ سکتا ہے۔

غرض کہ جب مدلول الفاظ کے مراتب کی حقیقت معلوم ہوگئی تب ہم کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے الفاظ و کلمات کو منجملہ ان مراتب پنجگانہ کے مرتبہ اوّل پر محمول کرنا ظاہری تفسیر ہے اور جب دلیل قوی اس کے استحالہ پر قائم ہو اور کسی اور مرتبہ پر منجملہ ان مراتب کے کلام محمول کیا جاوے وہ باطنی تفسیر ہے اور اسی کو تاویل کہتے ہیں اور جب تک کوئی شخص خدا کے کلام کو منجملہ ان مراتب کے کسی مرتبہ پر محمول کرکے اُس کی تصدیق کرے تب تک وہ تصدیق کرنے والا قرآن کا ٹھہریگا نہ انکار کرنے والا۔

لیکن اب یہ بات بحث طلب باقی رہی کہ خدا کے کلام کو منجملہ مراتب کے کسی مرتبہ پر محمول کرنے کا اصول کیا ہے جس سے دین اسلام قائم رہے۔ کیونکہ اگر کوئی حد مقرر نہ کی جاوے تو ہر ملحد دست تاویل بڑھا دیگا اور لفظوں کے ظاہری معنی سے انکار کرکے اُس کے فرضی معنی بنانے لگے گا اور اپنے تئیں مصدق قرآن کہے گا یہ سمجھ کر کہ وہ کسی ایک مرتبہ پر منجملہ

ان مراتب پنجگانہ کے لفظ کو محمول کرتا ہے پس خدا کی توحید اُس کا علم بالجزئیات مسائل فرائض و واجبات وغیرہ کا انکار بھی انکار قرآن نہ سمجھا جاویگا وماھذا الا ضلال مبین اسی واسطے ہم نے ان معانی کے مراد لینے کو بے قید نہیں رکھا اور چند ایسی قیدیں لگادی ہیں کہ جن کے لحاظ کرنے سے کبھی دست تطاول الحاد نہ بڑھیگا اور لامذہبی اور دہریہ پن پر اطلاق تصدیق قرآن نہ ہوگا وہ قیود جو ہم نے کی ہیں یہ ہیں *

اوّل ۔ لفظی معنی مراد لینے سے مخالفت قرآن کی کسی اصل سے منجملہ اصول دین کے *

دوسری ۔ مخالفت اس کی کسی مسئلہ سے منجملہ مسائل صحیح عقلیہ کے *

تیسری ۔ مخالفت اس کی کسی امر سے منجملہ امور واقعیہ کے *

ان حالتوں میں لفظی معنی سے تجاوز کرنا اور جیسا موقع اور قرینہ مقام کا ہو ویسا کسی ایک مرتبہ پر منجملہ مراتب مدلول الفاظ کے لفظ کو محمول کرنا انکار قرآن نہیں ہے بلکہ اصلی تصدیق قرآن کی ہے اور اگر ایسی حالتوں میں لفظی معنی مراد لئے جاویں تو اندیشہ بلکہ ظن قوی تکذیب قرآن اور انہدام بنیان اصول اسلام کا ہے چنانچہ میں ہر ایک کی مختصر تشریح کرتا ہوں *

اوّل مخالفت قرآن کی کسی اصل سے منجملہ اصول دین کے

مثلاً میں کہتا ہوں کہ منجملہ اصول دین کے ایک بڑا اصول تقدس اور تنزہ باری تعالیٰ کا صورت اور جسم سے ہے اور یہ ایسا اصول ہے کہ اسلام کی بنیاد اسی پر ہے جو شخص اس کا منکر ہو وہ کافر ہے لیکن جب ہم کو قرآن و حدیث میں ایسے لفظ ملیں جن کے ظاہری معنی مراد لینے سے تشبیہ اور تجسم باری تعالیٰ کی ثابت ہو تو اس وقت ہم کو لازم ہے اس کے ظاہری معنی سے تجاوز کرنا اور اُس کی دوسری حقیقت جو موافق اس مقام کے ہو مراد لینا۔ مثلاً اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے ید اللہ فوق ایدیھم پس ہاتھ کے اصلی معنی ظاہری اور وجود خارجی اس کا گوشت پوست کا ایک عضو خاص ہے تو اگر اس موقع پر ہم اس لفظ کو

متناول پر محمول کریں اور وجود خارجی اس کا مراد لیں تو ہم کو خدا کا ہاتھ اور پنجہ اور گوشت اور پوست اور رگ اور خون سب چیزوں کا ماننا پڑے۔ اور جب ہم نے ایسا مانا تو ہمارے کفر میں کیا شبہ رہا پس بوجہ اس کے کہ لفظ کے ظاہری معنی مراد لینے سے مخالفت قرآن کی ایک اصل سے منجملہ اصول دین کے ہوتی تھی تجاوز کرنا اور اُس کا وجود اصلی مراد لینا ضرور ہوا ؛

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ مسلمانوں میں سے کسی نے ایسے ظاہری معنی مراد نہیں لئے بلکہ ہمارے اس زمانہ کے بھائیوں سے بھی زیادہ تر دانشمند اور ان سے بڑھ کر قرآن کی تصدیق کرنے والے گذر گئے ہیں جنہوں نے ایسے مقام پر بھی ظاہری معنی مراد لینے کو انکار او تکذیب قرآن خیال کیا ہے اور اپنی صفائی ایمان اور تصدیق قرآن کی بدولت خدا کی صورت و شکل کے قائل ہوئے ہیں چنانچہ میں بطور نمونہ کے بیان کرتا ہوں ؛

مشبہ حشویہ مثل مضر اور احمد ہجیمی کے اس بات کے قائل ہیں کہ خدا بھی جسم ہے گو اُس کا جسم ہمسا نہیں ہے اور اس کے عضو اور جوارح بھی ہیں اور اُس سے ملنا اور مصافحہ کرنا اور معانقہ کرنا بھی ممکن ہے ؛ مشبہ کرامیہ یاران ابی عبداللہ محمد بن کرام کا عقیدہ ہے کہ خدا عرش پر اوپر کی طرف سے لگا ہوا بیٹھا ہے اور اترتا چڑھتا رہتا ہے اور بعض حشویوں نے تو صاف کہا ہے کہ خدا جسم ہے پھر اختلاف کیا ہے کہ آیا وہ گوشت پوست سے مرکب ہے یا نہیں اور پھر قد اُس کا سات بالشت کا ہے یا نہیں اور پھر صورت اُس کی کیسی ہے آدمیوں کی سی ہے یا نہیں۔ پھر بعضوں نے کہا ہے کہ لونڈے کی سی شکل ہے اور گھونگر والے بال سر پر ہیں بعضوں نے فرمایا ہے کہ بڈھا ہے اور اس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ جگہ بدلتا رہتا ہے اور یہ سب خوش اعتقاد لوگ قرآن و حدیث کے لفظوں پر کامل ایمان رکھنے سے ایسے تنزہ اور تقدس کے معتقد اور خدا کے لونڈے یا بڈھے ہونے کے قائل ہوئے اور پھر اگر اُن کی دلیلوں کو کوئی دیکھے تو سوائے اس اصول کے جو ہم نے بیان کیا اور جسے ہمارے مذہب کے سارے محققین لکھتے آئے ہیں کوئی جواب ان کا دے ہی نہیں سکتا اور موافق اس عقیدے کے جو پابندئ الفاظ پر اس زمانہ کے لوگوں کا ہے سوائے ایسے اعتقاد رکھنے کے جس کا ثبوت الفاظ ظاھری سے ہوتا ہے ہر شخص منکر جزو قرآن سمجھا جاتا ہے ؛

پھر یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ غلطی صرف بعض لوگوں کو ہوئی۔ بلکہ افسوس اور ہزار افسوس ہے کہ بعض بڑے بڑے محدثین اس بلا میں پڑ گئے جیسا کہ محقق دوانی نے شرح عقائد عضدی

میں لکھا ہے کہ واکثر المجسمۃ ھم الظاھریون المتبعون بظواھر الکتاب والسنۃ واکثرھم المحدثون یعنی اکثر تجسیم کے معتقد وہ لوگ ہیں جو ظواہر الفاظ قرآن و حدیث کی تبعیت کرتے ہیں اور اکثر ان میں سے محدثین ہیں۔ پھر بعض کا یہ قول ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث ہے کہ رایت ربی فی احسن صورۃ تو صورت سے انکار کرنا قول رسولؐ سے انکار کرنا ہے کسی کا یہ ارشاد ہے کہ حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خلق اللہ آدم علے صورتہ یا علے صورۃ الرحمٰن۔ تو خدا کو آدمی کی صورت نہ سمجھنا انکار رسولؐ اور تکذیب حدیث ہے۔ کوئی فرماتا ہے کہ صحیح مسلم میں خدا کے پاؤں ہونے پر صحیح حدیث منقول ہے کہ جب وہ دوزخ میں اپنا قدم رکھدیگا تب دوزخ کا ھل من مزید کہنا بند ہوگا۔ تو اس کے پاؤں سے انکار کرنا صحیح حدیث کو غلط کہنا ہے۔ کوئی اس نشہ میں سرمست ہے کہ خدا نے خود اپنی ساق ہونے کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے کہ یوم یکشف عن ساق اور پھر ثبوت اس کا حدیث سے ہوتا ہے کہ ابن اثیر نے جامع الاصول میں لکھا ہے کہ فیاتیھم الجبار فی صورۃ غیر صورۃ التی راوہ فیھا اول مرۃ اخ تو اس کا نہ ماننا جزو قرآن کا منکر ہونا ہے پس میں مستفتی صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ ایسی صریح آیات اور ایسی صاف احادیث کو جن میں خدا کی صورت اور شکل اور پاؤں اور ہاتھ اور قد و قامت کا بیان ہے نہ ماننا اور ان کے لفظوں کے ظاہری معنی پر محمول نہ کرنا اس وجہ سے انکار جزو قرآن نہیں ہے اور کیونکر خدا کی صورت و شکل کے معتقدین باوجود ایسے استدلال کے گمراہ تصور کئے گئے ہیں پس جو وجہ اُس کی ہو وہی ان لوگوں کی نسبت سمجھی جاوے جو ایسی ہی ضرورت کے سبب سے ظاہری معنی چھوڑ کر دوسرے معنی مراد لیتے ہوں۔ پس ان لوگوں کو جو ایسے ظاہری لفظوں سے ان کے لفظی معنی مراد نہ لیں محقق اور امام اور دانشمند جاننا اور ان لوگوں کو جو ایسی ہی ضرورت سے اور کسی الفاظ کے لفظی معنی مراد نہ لیں کافر اور منکر جزو قرآن سمجھنا ایک عجیب بات ہے ٭

دوسری مخالفت قرآن و حدیث کی کسی مسئلہ منجملہ مسائل صحیحہ عقلیہ سے

جس طرح پر الفاظ کے ظاہری معنی اس حالت میں مراد نہیں لئے جاتے جبکہ وہ مخالف کسی اصل کے اصول دین سے ہوں۔ اسی طرح اس حالت میں بھی مراد نہ لئے جاوینگے جبکہ

وہ مخالف کسی اصل کے اصول صحیحہ عقلیہ سے ہوں لیکن پہلی اصل کا پہچاننا آسان ہے اور اس کا پہچاننا ذرا مشکل ہے اس لئے صرف الفاظ کا ظواہر سے اس اصول کی وجہ سے بہت دانا اور محتاط اور راس آدمی کا کام ہے جو کہ معقول و منقول دونوں سے بخوبی واقف ہو اور جس نے کسی معقولی مسئلہ کو ان صاف اور واضح اور قوی دلیلوں سے ثابت کر لیا جس میں کچھ شبہ نہ ہو سکے اور جس میں فت تبرا اور فیہ ما فیہ کا نام تک نہ ہو لیکن اس اصول کے فی نفسہ صحیح ہونے میں کچھ کلام نہیں ہے کہ جو الفاظ اصول صحیحہ عقلیہ کے مخالف ہونگے اُن کا صرف[۱] عن الظاہر ضرور ہوگا پس اگر کسی سے کچھ غلطی اصول صحیحہ عقلیہ کے اثبات میں ہو تو وہ اُس کی غلطی ہے مگر اس سے اصول کی صحت میں کچھ خلل نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں ایک دو مثال سے اسے سمجھاتا ہوں ؁

منجملہ اصول صحیحہ عقلیہ کے ایک یہ اصول ہے کہ اعراض اور کیفیات متشکل بشکل و صورت اور متقلب بہ جسم و ہیات نہیں ہو سکتیں مثلاً عقل اور زندگی اور موت کہ یہ سب اعراض ہیں پس ان کا کوئی وجود خارجی نہ ہوگا پس اگر ان کے وجود کا ذکر کسی جگہ قرآن یا حدیث میں ہو تو لامحالہ اس کا مرتبہ اول پر رکھنا یعنی اس سے وجود خارجی اس کا مراد لینا ممکن نہ ہوگا بلکہ دوسرے مرتبہ پر پہچاننا اور اس کے وجود سے وجود حسی یا وجود عقلی مراد لینے کی ضرورت ہوگی پس جہاں قرآن مجید میں خدا نے فرمایا ہے کہ خلق الموت والحیٰوۃ تو اس سے اگر کوئی ان کا وجود خارجی مراد لے تو ایک اصل صحیح کے اصول صحیحہ عقلیہ سے مخالف ہوتا ہے اس لئے ضرور اُس سے وجود عقلی اس کا مراد ہوگا اور اگرچہ ان لفظوں سے کسی کا زیادہ تر وجود خارجی پر ذہن منتقل نہیں ہوتا مگر جہاں اُس کی زیادہ تشریح ہے وہاں اُس کے معنی کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے عقل کو پیدا کیا اور اُس سے کہا کہ آگے ہو۔ وہ آگے ہوئی۔ پھر کہا کہ پیچھے ہٹ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ یا حدیث میں آیا ہے کہ موت کو بصورت مینڈھے کے قیامت کے دن لاویں گے اور اُسے درمیان دوزخ و جنت کے ذبح کریں گے تو اب اس مقام پر ان لفظوں سے اگر کوئی اُس کا وجود خارجی ظاہری مراد لے تو ضرور اسی اعراض اور کیفیات کا متشکل بشکل اور متقلب بجسمانیۃ ہونا ماننا پڑے اور اُسے نہ مانیگا۔ مگر جس کا عقل کے کوچہ میں گذر بھی نہ ہوا ہو ؁

یا قرآن مجید میں آیا ہے کہ اِن مِن شیءٍ اِلّا یسبّح بحمدہ کہ کوئی چیز نہیں ہے مگر کہ وہ خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ یہاں تسبیح سے مراد ہماری طرح سبحان اللہ کہنا نہیں ہے کیونکہ نباتات اور جمادات

---

[۱] ظاہر سے پھیرنا ؁

وغیرہ کچھ زبان نہیں رکھتے پس یہاں تسبیح کے وجود سے مراد اس کا وجود عقلی ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مذہب میں بعض ایسے بھی تصدیق کرنے والے گذرے ہیں کہ انھوں نے تسبیح سے مراد تسبیح زبان لی ہے ۰

یا قرآن مجید میں آیا ہے کہ فقال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین۔ تو یہ سمجھنا کہ خدا نے حقیقت میں ان سے کلام کیا اور آسمان اور زمین نے درحقیقت کچھ جواب دیا اور اپنی زبان سے یہ کہا کہ اتینا طائعین بڑی نادانی ہے بلکہ یہاں بھی یہ الفاظ اپنے ظاہری معنی پر محمول نہیں ہو سکتے اور اُس سے سوائے وجود عقلی کے دوسری مراد نہیں لی جا سکتی ۰

تیسری مخالفت اُس کی کسی امر سے منجملہ امور واقعیہ کے

جو الفاظ قرآن وحدیث کے ایسے ہوں جن کے ظاہری لفظی معنی کہنے سے مخالفت کسی امر کی امور واقعیہ سے ہووے عام اس سے کہ ان امور کی واقعی حقیقت عقل وعلم سے ثابت کی گئی ہو یا تحقیقات اور تجربہ سے یا رویت اور مشاہدہ سے یا اخبار صحیحہ متواترہ سے تو وہاں بھی اس لفظ کے ظاہری معنی سے تجاوز کرنا اور کسی ایک مرتبہ پر منجملہ مراتب پنجگانہ دلالت الفاظ کی لیجانا ضرور ہوگا۔ لیکن اس مقام پر بھی احتیاط اور عقل اور دیانت سے شرط ہے کیونکہ ان امور کا امور واقعیہ ثابت کرنا ذرا مشکل ہے لیکن گو اُس کی تفصیل اور تصریح اور اثبات مشکل ہو مگر یہ اصول بالکل ٹھیک ہے ۰

مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان کی قبر ستر ہاتھ وسیع ہو جاتی ہے اور چودھویں رات کے چاند کی طرح اس کا چہرہ روشن ہوتا ہے اور کافر کی قبر پر ننانوے اژدھے مسلط ہوتے ہیں اور ہر ایک اژدھا ننانوے ننانوے سانپ ہوتا ہے اور ہر سانپ کے سات سات سر ہوتے ہیں جو کہ قیامت تک اُسے کاٹتے رہتے ہیں پس یہ ایک امر ایسا ہے جس کا وجود خارجی کبھی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ نہ ظاہر میں مسلمان کی قبر چوڑی ہوتی ہے نہ اُس کا چہرہ بدر کے موافق روشن ہوتا ہے نہ کسی کافر کی قبر میں سانپ بچھو جاتے ہیں پس جو شخص اس حدیث کے الفاظ کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرے تو ضرور اس کا دل اس قول کی تکذیب کریگا کیونکہ واقع میں اُس کو نہ پاویگا پس سوائے اس کے اور کچھ چارہ نہیں ہے کہ ان الفاظ کو اس کے ظاہری معنی سے تجاوز کر کے اس کے دوسرے مرتبہ

پہنچاویں اور ان سب چیزوں سے اس کا وجود حسی مراد لیں ۔

بعض لوگ اس اصول کے انکار کرنے پر یہ شبہ کرینگے کہ جو کچھ قرآن وحدیث میں مذکور ہے وہی مطابق معقول کے ہے ۔ اور وہی مطابق واقع کے ہے پس معقولات اور مشاہدات اور تجربات کو اصل قرار دینا اور قرآن وحدیث کے لفظوں کو تاویل کر کے لئے معقولات وغیرہ کے مطابق کرنا شان ایمان نہیں ہے ۔ حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے اس لئے کہ جب الفاظ اور کلمات کا استعمال اس طور پر جاری ہے کہ اُن سے سوائے ظاہری معنی کے اور معنی بھی مراد لئے جاتے ہیں تو اُس کا ظاہری معنی سے متجاوز کرنا اور دوسرے اصلی معنی مراد نہ لینا نہ خلاف محاورہ کے ہے نہ برعکس ہماری بول چال کے ہے نہ کوئی عاقل اور اہل زبان اس پر طعنہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اُس تاویل کو بناوٹ سمجھ سکتا ہے ۔ خیال کرو کہ جب ہم کسی شخص کو غصہ میں دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ اس کے بدن میں آگ لگ گئی اس کے بدن سے چنگاریاں نکل رہی ہیں تو کیا اس سے حقیقی آگ اور اصلی چنگاریاں مراد لیتے ہیں اور جب ہم کسی شخص کو خوش تقریری سے بات کرتے ہوتے دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ اُس کے منہ سے کیا پھول جھڑ رہے ہیں تو کیا اس سے مراد گلاب اور چنبیلی کے حقیقی پھول ہوتے ہیں ۔ یا جب ہم کسی کو نہایت تکلیف میں دیکھ کر کہتے ہیں کہ اُس کے بدن سے سانپ بچھو چپٹے ہوئے ہیں اس سے مراد ظاہر سانپ بچھو ہوتے ہیں پس جبکہ یہ باتیں ہمارے محاورہ اور ہمارے استعمال میں موجود ہیں تو کیا اسی محاورہ اور استعمال پر الفاظ قرآن وحدیث کو محمول کرنا بناوٹ ہوگی یا تاویل ناجائز یا تکذیب ؟ نادان ہے جو کوئی ایسا خیال کرے !! پھر یہ کہنا کہ مخالفت معقولات کی اور مخالفت امور واقعیہ کی قادح صحت کلام نہیں ہے صرف جاہلوں کا قول ہے کوئی عاقل ایسا نہیں کہہ سکتا نہ کسی نے ایسا کہا چنانچہ میں اس بحث کو امام غزالیؒ کے اُس قول کے نقل کرنے پر تمام کرتا ہوں جو اُنہوں نے تہافت الفلاسفہ میں لکھا ہے ولنعم

قال رحمۃ اللہ علیہ الثانی مالا یفید من مذ ھبھم فیہ اصلاً من اصول الدین الخ

یعنی جو باتیں دلایل ہندسیہ اور براہین عقلیہ سے ایسی ثابت ہیں کہ جس میں کچھ شک نہیں ہے اس کے صحیح جاننے کو خلاف شرع جاننا بڑی غلطی ہے اور حقیقت میں دین کا ضعف ظاہر کرنا ہے کیونکہ جو شخص اُن دلیلوں سے آگاہ ہے وہ تو اُس پر کامل یقین رکھتا ہے پس جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ یہ مخالف شرع کے ہے تو وہ ان باتوں کو غلط سمجھ ہی نہیں سکتا ۔ اس لئے وہ نہایت قوی اور روشن دلیلوں سے ثابت ہے ہاں شرع میں شک کرنے لگے گا ۔ اور یہ سمجھ کر کہ شرع بھی خوب ہے جو مخالف معقولات صحیح کے ہے منکر دین ہو جاویگا پس جو شخص شریعت کی مدد اور حمایت غلط طور سے کرتا ہے اور شریعت کو نقصان پہنچاتا ہے تو اُس ضرر

کا وبال اُس شریعت کے دوست پر ہے کیونکہ شریعت میں تو درحقیقت کوئی بات خلاف معقولات صحیحہ کے نہیں ہے اُس کہنے والے کے نزدیک البتہ ہے پس اُس شریعت کے مددگار سے تو شریعت کا دشمن ہی اچھا ہے۔ اور سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ دوست جاہل سے دانا دشمن اچھا ہے اور اگر فرض کیا جاوے کہ شریعت میں کوئی بات ظاہر مخالف ان معقولات مسلّمہ کے ہو تو تاویل اُس کی آسان ہے بہ نسبت نہ ماننے ان امور قطعی یقینی کے ۔ اور یہ بات کچھ خلاف شرع نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے الفاظ کی تاویل کی گئی ہے ایسی وجوہ کے سبب سے جو کہ ان دلائل عقلیہ کے برابر قوت میں نہیں ہے تو کیونکر ان معقولات صحیحہ کی مطابقت کے لیے وہ الفاظ تاویل نہ کئے جاویں اور جو اُس کا انکار کرے اور ایسی تاویل کو ناجائز بتلاوے وہ حقیقت میں شرع کے باطل کرنے اور دین کے جھوٹے ہونے اور بددینوں کو خوش ہونے کی راہ کھولتا ہے۔ فمن یاخذ العلوم من الفاظ المنقولۃ الماولۃ والعمومات المخصصۃ کان الضلال علیہ اغلب فالمرء یھتدی بنور اللہ تعالیٰ الی ادراک العلوم۔ عفی ما ھی علیہ۔

غرضکہ یہ امر بخوبی ثابت ہوگیا کہ قرآن و حدیث کے الفاظ سے ہمیشہ ان کے ظاہری معنی مراد لینا ضرور نہیں بلکہ بعض حالات میں ان کے ظاہری معنی کہنا ناجائز اور منع ہے پس جو شخص کسی وجہ اور ضرورت اور سبب سے منجملہ ان وجوہ کے جو ہم نے بیان کئے ظاہری معنی کسی لفظ کے نہ لے تو بے سمجھے اُسے منکر جزو قرآن کہنا بڑی غلطی ہے کیونکہ اس کا اثر بہت دُور تک پہنچے گا۔ اور بڑے بڑے اماموں عالموں کی شان میں بھی کچھ کچھ داغ آویگا بلکہ حقیقت میں اصول شریعت کا قائم رکھنا مشکل ہوگا ؎

جو کہ اُس پہلے امر کا بیان ہوچکا کہ الفاظ ظاہری کو اُس کے لفظی معنی پر بعض مقام پر محمول نہ کرنا تکذیب قرآن نہیں ہے اس لئے اب میں دوسرے امر کا بیان کرتا ہوں کہ اسماء موجودات سے جن کا ذکر قرآن میں بلا تشریح ان کی حقیقت کے ہے وہ حقیقت مراد نہ لینا جو لوگوں نے سمجھ رکھی ہو اور جس کا ثبوت کتاب و سنت سے نہ ہوتا ہو اور نہ جس کے اثبات پر سوائے اوہام و ظنون کے کوئی عقلی دلیل ہو تکذیب قرآن نہیں ہے ؎

دوسرا امر کہ اسماء موجودات کی اس حقیقت سے انکار کرنا جس کا ثبوت کتاب و سنت سے نہ ہوتا ہو

بہت سی چیزوں کے نام قرآن و حدیث میں مذکور ہیں جن کی کچھ حقیقت بیان نہیں کی گئی۔ مگر جیسا کہ لوگ ان کی حقیقت سنتے آئے یا اپنی عقل اور سمجھ سے کچھ اس کی ماہیت ٹھہرا کے اُسے سنتے سنتے اور دیکھتے دیکھتے وہ حقیقت اس نام کے لفظی معنی کے طور پر تصور کی گئی۔ یہاں تک کہ جب وہ نام لیا جائے تو اُس سے وہی حقیقت جو ذہن میں سمائی ہوئی ہے سمجھی جاوے پس اگر کوئی ان ناموں کو مانے مگر اس کی اس مفروضہ حکمت کا منکر ہو تو وہ منکر جزو قرآن نہ سمجھا جاوے گا کیونکہ حقیقت ہیں وہ حقیقت جزو قرآن نہیں ہے۔ مثلاً آسمان کا جابجا ذکر قرآن میں ہے لیکن اس کی حقیقت اور ماہیت نہیں بتائی کہ وہ کس چیز سے بنا ہے اور کیا ہے اور کتنی دُور ہے اور فی نفسہ وہ کچھ وجود جسمانی خارجی رکھتا ہے یا نہیں اور اگر رکھتا ہے تو وہ کیا ہے اور کیسا ہے جاہل تو اس نیلگوں چھت کو جو آنکھ سے نظر آتی ہے آسمان سمجھتے ہیں اور عالم اُسے جسم کردی محیط للارض کہتے ہیں اور جو یونانی حکمت میں اُس کی حقیقت بیان کی گئی ہے وہ آسمان کے لفظ سے مراد لیتے ہیں۔ اور یہ حقیقت آسمان کی اس کے لفظ کے ساتھ ایسی مل گئی ہے کہ آسمان کے لفظ سے وہی سمجھی جاتی ہے پس اگر کوئی اس حقیقت کا انکار کرے اور اُسے نہ مانے اور یہ کہے کہ میں آسمان کے اوپر یقین رکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہ خدا کا بنایا ہُوا ہے نہ کسی دوسرے کا مگر اُس کی وہ حقیقت نہیں مانتا جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ پس اس کا انکار حقیقت میں انکار لوگوں کے بیان کرنے اور سمجھ کا ہے نہ خدا کے کلام کا۔ باقی رہا اُس کی حقیقت دریافت کرنا۔ اُس کے لئے میدان تحقیقات عقلی فراخ ہے شارع کو اُس سے کچھ غرض نہیں۔ من شاء فلیقل انہ جسم کردی محیط للارض و من شاء فلیقل دخان محیط للارض۔

یا قرآن مجید میں جابجا شیطان کا نام آیا ہے پس اگر کوئی اُس کے وجود سے مطلقاً منکر ہووے تو وہ تکذیب کرنے والا قرآن کا ہے لیکن اگر وہ اُس کے وجود کو مانے اور یہ کہے کہ میں اُس کی اس حقیقت کو نہیں مانتا جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ خناس اس کے باپ کا اور تلبیس اُس کی ماں کا نام تھا اور اس کی صورت ایسی ہے اور شکل ویسی ہے کیونکہ خدا نے اس کی کچھ حقیقت نہیں بتائی تو وہ بھی مکذب قرآن نہیں ہے اور چونکہ وجود سے ہمیشہ وجود جسمانی

خارجی ہی مراد نہیں ہوتا پس وجود جسمانی سے شیطان کے انکار کرنا کفر نہیں ہے گو بڑی غلطی اور نادانی ہو۔ میرے نزدیک ان لوگوں کی دلیلیں جو کہ شیطان کے وجود خارجی سے منکر ہیں[1] اور اور میں اُن سے مخالف ہوں اور ان کی سمجھ اور فہم کی غلطی پر افسوس کرتا ہوں مگر ان کی تاویل حشویہ اور باطنیہ کی تاویل سے زیادہ ضعیف نہیں ہے اور نہ اصول دین میں کچھ اس سے خلل واقع ہے پس جس طرح حشویہ اور باطنیہ پر ایسی تاویل سے اطلاق تکذیب قرآن نہیں ہوتا تو منکر وجود جسمانی شیطان پر کیونکر ہوگا۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ ہمارے مذہب کے بعض محققین سالقین کا بھی یہی قول ہے۔ مگر جو کوئی یہ کہے کہ جو ذکر شیطان کا قرآن میں ہے وہ جھوٹ ہے۔ نہ اُس کے معنی ہیں نہ اُس کی کچھ حقیقت ہے نہ اُس کا کچھ وجود ہے۔ تو بلاشبہ ایسا کہنے والا منکر قرآن اور کافر ہے۔ لیکن تاویل کرنے والا اور وجود کی حقیقت میں اختلاف کرنے والا کافر نہیں ہے۔ گو غلطی اور خطا پر ہو۔

یا قرآن مجید میں جنت اور آدمؑ اور درخت کے کھانے اور ملائکہ کے سجدہ کرنے وغیرہ کا ذکر ہے مگر ان کی کچھ زیادہ ترحقیقت خدا نے نہیں بتائی کہ وہ درخت کیا تھا اور کھانے سے کیا مراد ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ گیہوں کا درخت تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ اُسے کھا کر آدمؑ کو حاجت بیت الخلاء کی ہوئی پس جس قدر کہ خارج از قرآن مجید ان چیزوں کی حقیقت بیان کی گئی ہے اس کو نہ ماننا انکار قرآن نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ بہ نسبت اس کے قرآن مجید میں لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے اور یہ قصہ صرف فرضی اور بناوٹ ہے نہ آدمؑ کا وجود تھا نہ شیطان کا نہ فرشتوں کا۔ جو کچھ قرآن مجید میں لکھا ہے تو انکار نص صریح سے ہے۔ اور محمول کرنا اُس کو امور باطنی پر اور صرف کرنا ان لفظوں کا اُس کے ظواہر سے اور بیان کرنا اُس کی حقیقت روحانی کا بھی صراحتہً غلط تاویل[2] ہے پس ایسی تاویل بدعت ہے اور یہ شعار فرقہ باطنیہ کا ہے۔ اگر ایسی ہی تاویل نصوص صریحہ کی کی جاوے تو بالکل اعتبار ظاہر شریعت سے اٹھ جاوے اور عقاید اسلامیہ یونانی حکیموں کے سے مسئلے اور شریعت محمدیہ عیسائیوں کی سی شریعت ہو جاوے کہ ظاہر پر کوئی چیز باقی نہ رہے۔ ہر چیز سے مراد روحانیت اور حقیقت باطنی اس کی لی جاوے۔ حالانکہ یہ بالکل مخالف شریعت محمدیہ کے ہے۔

[1] اگرچہ حق یہ ہے کہ مدعیان وجود خارجی کو اس کے اثبات کی دلیل لانی چاہیئے ۱۲ منہ

[2] بشرطیکہ تاویل کرنے والا ضرورت پنجگانہ تاویل سے کسی ضرورت کا ہونا ثابت نہ کر سکے ۱۲

تیسرا امر کہ آیات احکامی کے عموم حکم سے بعض صورتوں کو مخصوص و مستثنیٰ سمجھنا باستدلال کتاب و سنّت کے انکار جزو قرآن نہیں ہے

اگر اُن آیات احکامی سے جن کا حکم عام ہو کوئی شخص اُن صورتوں کو مستثنیٰ کرے جس کا ثبوت کتاب و سنّت سے ہوتا ہو تو وہ تخصیص انکار جزو قرآن نہیں ہے اور اسی واسطے فقہا نے یہ اصول قائم کیا ہے کل عام محتمل التخصیص بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تو خبر احاد اور قیاس سے بھی تخصیص جائز رکھی ہے مثلاً آیۃ حرمت علیکم المیتۃ سے مرے ہوئے جانور حرام ہیں لیکن ٹڈی اور مچھلی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں پس اگر کوئی اس اصول کو نہ مانے تو وہ ٹڈی اور مچھلی کی حلت کو بھی انکار جزو قرآن سمجھیگا۔ حالانکہ یہ دو چیزیں اس حکم عام سے بقول شارع مستثنیٰ کر دی گئی ہیں یا فاغسلوا وجوھکم وایدیکم سے وضو نا پاؤں کا فرض ہے مگر جب آدمی موزہ پہنے ہو تو اس حکم سے مستثنیٰ ہے اور اس پر فقط مسح کرنا کافی ہے کیونکہ مسح خفین کی حدیث نے اس صورتِ خاص کو اس حکم عام سے مستثنیٰ کر دیا یا کوئی شخص آیۃ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ سے ذبائح اہل کتاب کو مستثنیٰ کرے۔ کیونکہ بقول حضرت ابن عباس کے جو ابو داؤد میں ہے آیۃ طعام الذین اوتوا الکتاب اس کی تخصیص ہے تو ایسی تخصیص کو انکار جزو قرآن سمجھنا نادانی ہے۔ اگر کسی سے اس تخصیص میں غلطی رائے کی ہو جائے تو وہ غلطی مجتہدانہ ہے نہ انکار کافرانہ جیسا کہ ترک تسمیہ کی نسبت باہم مجتہدین کے اختلاف ہے یعنی آیۃ لا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ سے صراحت اس کی ہے کہ جس پر خدا کا نام نہ لیا جاوے وہ ذبیحہ حلال نہیں۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ اگر مسلمان نام خدا کا وقت ذبح کے نہ لے عمداً یا سہواً تب بھی ذبیحہ حلال ہے کیونکہ اسلام اس کا تسمیہ کے بجائے ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر ذبح کے وقت تسمیہ کرنا بھول جائے تو ذبیحہ حلال ہے ورنہ نہیں پس یہ اجتہاد عامی کی نظر میں بالکل مخالف نص قرآن کے ہوگا اور اگر شاید سوائے ان اماموں کے اور کوئی کہتا تو وہ اُسے منکر نص قرآن سمجھتا مگر حقیقت میں یہ اجتہاد ہے نہ انکار۔

اسی طرح جو شخص یہ سمجھے کہ اہل کتاب کے ذبیحہ میں یہ شرط ضروری نہیں کہ وہ ہماری طرح

ذبح کریں بلکہ جس طرح پر وہ جانور کو مار ڈالنا ذبح سمجھتے ہوں وہی ذبح ہمارے واسطے حلال ہونے کے لئے کافی ہے اور اس سے وہ اُس جانور کو حلال جانتے جسے اہل کتاب نے گردن توڑ کر مار ڈالا ہو مگر وہ آیۃ طعام الذین اوتوا الکتٰب اور بعض احادیث سے استدلال کرتا ہو تو گو یہ غلطی لائق نہایت افسوس کرنے کے ہے مگر حقیقت میں انکار نص نہیں ہے بلکہ تخصیص عموم حکم آیت قرآنی کی ہے اور یہ عذر نہیں کہ جب تخصیص میں غلطی ہوئے تو اس تخصیص کرنے والے کی نسبت اطلاق انکار نص قرآنی کیا جائے اس لئے ایسے شخص کی غلطی پر اطلاق انکار جزو قرآن نہ ہوگا۔ ہاں اگر وہ کہے کہ منخنقہ جائز ہے یعنی جو خود گلا گھٹ کر مر گیا ہو یا اور کسی نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو اور بلا قید اہل کتاب کے اور بے استدلال کتاب و سنت کے تو ایسا کہنا انکار نص ہے اور ایسا کہنے والا کافر ہے۔ واذلیس فلیس ❊

چوتھا امر یعنی ان مسائل اعتقادی اور عملی کو جو نصوص صریحہ سے بالصراحت ثابت نہ ہوتے ہوں مگر بقیاسات بعیدہ ان لفظوں سے ان کا استنباط کیا گیا ہو واجب الیقین اور واجب العمل نہ جاننا

مسائل اعتقادی اور عملی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو صاف صاف لفظوں سے بلا وقت ظاہر ہوں جس طرح خدا کا ایک ہونا رسول کا برحق ہونا خدا کا عالم بالجزئیات ہونا یا نماز روزہ اور حج و زکوٰۃ کا فرض ہونا وضو میں ہاتھ منہ کا دھونا پس ایسے مسائل اعتقادی یا عملی سے انکار کرنا حقیقت میں انکار نص قرآن ہے دوسرے وہ جو لفظوں سے بتاویل بعیدہ یا بدلائل قیاسیہ منطقیہ اور اصول موضوعہ استنباط کئے گئے ہیں جیسا کہ یہ مسئلہ کہ خدا خالق خیر و شر ہے بندہ یا قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق فرشتے انسان سے افضل ہیں یا انسان اُن سے مسائل خلافت اور امامت اور رویت باری تعالےٰ وغیرہ کے، ان مسائل میں سے کوئی مسئلہ صراحۃً ثابت نہیں کسی نے کچھ سمجھا ہے کسی نے کچھ۔ اور بلاشبہ بعض صواب پر اور بعض غلطی پر ہیں لیکن حقیقت میں کوئی ان میں سے منکر قرآن اور کافر نہ سمجھا جاویگا۔ اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اشاعرہ کے مسائل اعتقادیہ کا نہ ماننا یا ماتریدی مذہب کے عقائد کا معتقد نہ ہونا انکار قرآن ہے وہ

اُن کی غلطی ہے کیونکہ اسلام نہ اشعری کے معتقدات پر ہے نہ ماتریدی کے مسایل پر بلکہ ایمان وہی ہے جو خدا نے فرمایا اور اس کے رسولؐ نے۔ اور یہ لوگ اُنکے قولوں کے شارح ہیں جہاں تک وہ صواب پر ہیں ہم مانیں گے جہاں اُن سے بھول چوک ہوگئی ہے اسے واجب القبول نہ سمجھیں گے ؞

اسی طرح اُن مسائل فرعی کا حال ہے جو متعلق حلت وحرمت اشیاء کے ہوں یا متعلق اور باتوں کے کہ اگر وہ صاف صاف قرآن سے ثابت نہ ہوں تو اُس کا نہ ماننا انکار جزو قرآن نہیں ہے مثلاً کچھوہ مینڈک وغیرہ کو جنہوں نے یہ سمجھ کر حرام قرار دیا ہے کہ وہ خبائث میں داخل ہیں اور خبائث بموجب حکم آیۃ ویحرم علیھم الخبائث کے وجہ حرمت کی ہے پس یہ کوئی حکم صریح نہیں ہے تو اگر کوئی اُس شئے کو خبیث نہ جانے اور اُس کی حلت کا قائل ہو۔ تو حقیقت میں یہ انکار اُس شے کی خباثت سے ہے نہ انکار حرمت خبائث سے جس کا ثبوت نص سے ہوتا ہے یا اگر کوئی کتب قدیمہ مقدسہ میں تحریف لفظی کا قائل نہ ہو تو وہ منکر قرآن نہیں ہے کیونکہ وہ تحریف لفظی جس کا دعوٰے کیا جاتا ہے ایسے صریح لفظوں سے ثابت نہیں ہے جس کا انکار انکار نص ہو پس جو شخص تحریف کا تو قائل ہو مگر تحریف لفظی کا نہ ہو منکر قرآن نہیں ہے۔ جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور امام محمد بن اسمٰعیل بخاری اور چند محققین مثل شاہ ولی اللہؒ وغیرہ کے منکر تحریف لفظی کے ہوئے ہیں ؞

بلکہ بعضوں نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ ان باتوں کو جو کہ متعلق ان اصول عقائد کے نہیں ہے جن کا ثبوت اجماعاً نہیں اگر تاویلاً کوئی نہ مانے اور کچھ اور معنی کہے تو وہ بھی منکر قرآن نہیں ہے جیسے کہ بعضوں نے چاند و سورج سے آیۃ ھذا ربی میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا جواہر نورانیہ ملکیہ مراد لی ہے یا القِ ما فی یمینک اور فاخلع نعلیک سے ماسوائے اللہ اور کونین مراد ہیں اور محققین نے لکھ دیا ہے کہ یہ اصل نص کا انکار نہیں ہے ؞

پانچواں امر یعنی لوگوں کے کہے ہوئے معنوں کو اور اُن زاید باتوں کو جو تفسیروں میں داخل ہیں نہ ماننا

اس کی تصریح کی مجھے کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے مستفتی کو اگر خواہش ہو تو میرا مضمون تفسیر کا جو تہذیب الاخلاق میں چھپا ہے ملاحظہ کرلے ؞

غرض کہ جو صورتیں میں نے اوپر بیان کیں ان ساری صورتوں میں زید منکر جزو قرآن نہ سمجھا جاویگا ۔

جو کہ بہ نسبت انکار جزو قرآن کے میں اپنے جواب کی شرح لکھ چکا اب بہ نسبت روایت حدیث کے بالالفاظ ہے یا بالمعنی کچھ بحث لکھتا ہوں ۔

روایت حدیث

اگرچہ مقصود اصلی میرا اس مقام پر صرف تحقیق کرنا اس امر کا ہے کہ آیا روایت احادیث کی بالالفاظ ہے یا بالمعنی ۔ مگر میں حدیث کی تدوین اور روایت اور درایت وغیرہ سے بہ تفصیل بحث کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ حقیقت تصدیق و تکذیب حدیث کی بھی بخوبی ظاہر ہو جائے اور لوگوں کے شبہات اچھی طرح سے دُور ہو جاویں اس لئے اس مضمون کو چند بحثوں میں لکھتا ہوں ۔

اوّلاً ۔ کیفیت حدیث کی روایت کی قبل تالیف ہونے کتب احادیث کے ۔

دوسرے ۔ تاریخ اور مختصر کیفیت کتب احادیث کی تالیف کی ۔

تیسرے ۔ تنقیح اس امر کی کہ روایت حدیث کی بالالفاظ ہے یا بالمعنی ۔

چوتھے ۔ بیان اس کا کہ سب احادیث صحیحہ مفید یقین ہیں یا نہیں ۔

پانچویں ۔ تحقیق اس بات کی کہ کل احادیث کتاب صحاح کی صحت بہ مرتبۂ یقین ثابت ہے یا نہیں ۔

پہلی بحث بہ نسبت کیفیت احادیث کی روایت کے قبل تالیف ہونے کتب احادیث کے

یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے زمانہ میں سوائے قرآن مجید کے احادیث کے لکھنے کا دستور نہ تھا اور وہ چند وجوہ سے کتابت احادیث کو پسند نہ کرتے اوّلاً اس لئے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی باتیں تین قسم کی ہوتی تھیں ایک وحی دوسرے غیر وحی متعلق امور دین کے ۔ تیسرے غیر متعلق امور دین کے ۔ پس جو وحی تھی وہی لکھی جاتی اور اسی کا نام قرآن ہے ۔ اور جو باتیں غیر وحی کی تھیں وہ ایک قسم کی نہ تھیں ۔ بعض مستند بالہام بعض مستند باجتہاد اور پھر بعض متعلق امور جزئیات کے اور بعض متعلق معاملات اور قضایا رخصاص

کے اور بعض ملتج ایجاب تحریم کے اور بعض موثر مذب کراہت کے اور بعض علے سبیل العبادت اور بعد علی سبیل العادت پس ان باتوں کا صحابہ موافق اپنے اپنے فہم کے قرینہ مقام اور ضرورت وقت پر نظر کر کے خیال رکھتے اور اس سے تفریع احکام کرتے اور جو باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں بلکہ امور دنیاوی سے علاقہ رکھتیں اس کی نسبت تو خود آنحضرت صلعم نے فرما ہی رکھا تھا کہ انتم اعلم بامور دینا کم کہ تم لوگ اپنے دنیا کے کاموں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ اس کو فقہا صحابہ دینی مسائل سے جدا سمجھتے تھے پس بخیال اس کے کہ اگر یہ سب باتیں لکھی جاویں تو التباس دینی مسائل کا دنیاوی امور سے اور شرعی احکام کا امور عادی سے ہوگا۔ صحابہ نے جمع کرنا اور لکھنا حدیثوں کا پسند نہیں کیا۔ دوسرے کل صحابہ ہر وقت اور ہمیشہ صحبت نبوی میں حاضر نہیں رہتے تھے۔ اور وہ باتیں جو حضرت فرماتے اور وہ کام جو آپ کرتے نہ سب اپنے کانوں سے سنتے نہ اپنی آنکھ سے دیکھتے بلکہ جو حاضر صحبت ہوتا وہ سنتا اور دیکھتا اور پھر اس کی نقل اور روایت سے اوروں کو علم ہوتا۔ اور چونکہ نقل اور روایت کی صحت پر درجہ یقین کا نہیں ہو سکتا اس لئے حدیثوں کے جمع کرنے اور لکھنے سے صحابہ نے احتراز کیا۔ بلکہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ سوائے قرآن کے مجھ سے اور کچھ نہ لکھو اور اسی واسطے بعد وفات آنحضرتؐ کے بھی صحابہ تحریر احادیث سے مانع رہے۔ اور اگر بعض صحابہ نے کچھ لکھا تو انہی خیالوں سے اُسے مٹا دیا اور اپنے لکھے ہوئے کو قبل از وفات جلا دیا۔ چنانچہ کوئی عالم ہمارے یہاں کا اس سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا ثبوت کتب اور روایات سے بخوبی ہوتا ہے چنانچہ میں چند اقوال بطور نمونہ کے بیان کرتا ہوں +

ایک مرتبہ زید بن ثابت کے پاس بہت سے لوگ آئے اور کہا کہ آپ کچھ حدیثیں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ہم کو سنائیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب آنحضرت پر وحی نازل ہوتی تو مجھے آپ بلاتے اور میں لکھ لیتا اور باقی پیغمبر خدا کے سامنے جب دنیا کا ذکر ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ اس کی باتیں کرتے جب آخرت کا ذکر ہوتا تو وہ اس کا ذکر کرتے جب کھانے پینے کا ذکر آتا آنحضرتؐ بھی اس کی باتیں کرتے۔ پس کیا ان سب باتوں کا ذکر میں تم سے کروں اور یہ سب حدیثیں تمہیں سناؤں اور نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اذا امرتکم بشئ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشئ من رای فانما انا بشر۔ کہ جب میں کوئی حکم متعلق امور دین کے دوں تم اُس کو لو اور جب کوئی کام دنیا کا بتاؤں اپنی رائے سے تو میں بھی بشر ہوں۔ اور محب طبری نے ریاض النضرۃ میں اور ملا علی متقی نے کنز العمال میں اور حافظ

عماد الدین نے سند صدیق میں بروایت حاکم اور ابو عبد اللہ نیشاپوری کے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی روایت سے یہ لکھا ہے کہ میرے والد یعنی حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پانچ سو حدیثیں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی جمع کی تھیں۔ پس ایک شب وہ نہایت بے چین ہوئے اور حد سے زیادہ مغموم۔ میں نے پوچھا کہ پریشانی کا سبب کیا ہے تو آپ نے کہا کہ وہ حدیثیں جو میں نے جمع کی تھیں۔ لے آ جب میں لے گئی تو آگ منگا کر انہیں جلا دیا۔ جب میں نے اس کا سبب پوچھا۔ تو کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں مر جاؤں اور یہ حدیثیں میرے پاس رہ جائیں اور شاید میں نے اعتبار ان آدمیوں کا روایت میں کیا ہو جو درحقیقت لائق اعتبار نہ ہوں۔ اور وثوق اُن باتوں کا کر لیا ہو جو دراصل صحیح نہ ہوں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایک شخص عبد اللہ بن عباسؓ کے پاس کتاب لکھ کر اصلاح کیلئے لایا۔ آپ نے اُسسے لے کر پانی سے دھو ڈالا۔ غرض کہ صحابہ نے یا بوجہ احتیاط کے یا بوجہ اس کے کہ ان کو چنداں ضرورت تالیف و تدوین کی نہ تھی۔ اور جو کچھ انہوں نے بلا واسطہ خود شارع کی زبان سے سنا تھا یا کرتے دیکھا تھا اُسے پیش نظر رکھتے تھے۔ احادیثوں کے جمع کرنے پر توجہ نہ کی اور بعد اس کے تابعین کے زمانہ میں بھی اس کی نوبت نہ آئی اور ۱۲۱ھ تک ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے زبانی روایت پر قناعت کی مگر بعد اس کے ضرورت تدوین اور تالیف کی ہوئی چنانچہ اس کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

دوسرا بیان بہ نسبت تاریخ اور مختصر کیفیت کتب احادیث کی تالیف کے

موافق قول خطیب بغدادی کے اوّل تالیف امام عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج بصری نے جو ۱۵۵ھ ہجری میں مرے۔ کی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اول مؤلف ابو نصر سعید بن ابی عروبہ ہیں جو ۱۵۶ھ ہجری میں مرے۔ اور بقول ابو محمد رامہرمزی کے ربیع ابن صبیح نے اول تالیف کی اور پھر بعد اس کے سفیان بن عیینہ اور مالک بن انس نے مدینہ منورہ میں اور عبد اللہ بن راہب نے مصر میں۔ اور معمر اور عبد الرزاق نے یمن میں اور سفیان ثوری اور محمد بن فضیل بن غزوان نے کوفہ میں۔ اور حماد بن سلمہ اور روح بن عبادہ نے بصرہ میں اور ہشیم نے واسط میں کیا اور عبد اللہ بن مبارک نے خراسان میں کتابیں لکھیں اور جو حدیثیں ان کو ملیں انہیں جمع کیا اور جب تالیف کا قاعدہ جاری ہوا تب بہت سے لوگ اس طرف جھکے اور مختلف طور سے

مختلف غرضوں کے واسطے کتابیں لکھنے لگے یہانتک کہ نوبت محمد اسمٰعیل بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما کی آئی اور انہوں نے اعلےٰ درجہ کی کوشش جمع کرنے میں حدیث کے کی فعلیہما رحمت اللہ الی یوم القیامۃ ❊

پس ۲۳۳ ہجری سے لے کر اس زمانہ تک ہزار ہا کتابیں حدیث کی تالیف ہوئیں اور مختلف غرضیں ان تالیفات کا سبب ہوئیں کہ ان سب کتابوں پر کتب احادیث کا اطلاق کیا جاتا ہے اور جو کچھ ان میں لکھا ہے اس پر حدیث کی نسبت کی جاتی ہے اور جب تک کہ تحقیق محققانہ نہ کی جاوے تب تک جو قول ان کتابوں میں ہے وہ قول قول رسول اور جو بات ان میں لکھی ہے وہ منسوب بشارع سمجھی جاتی ہے اور یہی امر غفلت اور غلطی اور دھوکے کا سبب ہے اور ایک عالم کو اسی دھوکے نے گرداب بلا میں ڈال رکھا ہے ❊

غرضکہ سب سے اول اس امر کو سمجھنا ضرور ہے کہ ہر مخفق اور ہر کتاب مستند نہیں ہے۔ اور ہر قول قول رسولؐ اور ہر حدیث حدیث پیغمبر صلوات اللہ علیہ وآلہٖ نہیں ہے بلکہ محدثین اور احادیث کی کتابوں کی مختلف صورتیں ہیں چنانچہ علاوہ صحاح کے میں اور کتب احادیث کے درجات کی کچھ مختصر کیفیت بیان کرتا ہوں ❊

بعض کتابیں حدیث کی وہ ہیں جن کو مسانید اور جوامع اور مصنفات کہتے ہیں جو کہ بخاری ومسلم کے زمانہ میں یا اس سے پہلے لکھی گئیں اور وہ صحیح اور حسن اور ضعیف اور معروف اور غریب اور شاذ اور منکر اور خطا اور صواب اور ثابت اور مقلوب کا مجموعہ ہیں اور جن کے بعد تالیفات کی کچھ شہرت بھی نہیں ہوئی اور جن کی پیچھے کسی نے کچھ خبر نہ لی یعنی نہ کسی نے شرحیں اُن کی لکھیں نہ کسی نے ان کی تطبیق مذاہب سے کی نہ کسی نے اُن کے رجال کی تحقیقات کی مثل مسند ابو علی اور مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابو بکر بن ابی شیبہ اور مسند عبد بن حمید اور طیالسی اور کتب بیہقی اور طحاوی اور طبرانی کے کہ انہوں نے جو کچھ پایا وہ بھر دیا۔ نہ اُسے چھانٹا نہ صحیح کو غلط سے جدا کیا پس ان کتابوں کے اقوال پر عمل کرنا یا ان کو ماننا اسی کا کام ہے جو کہ محقق ہو اور جو صحت اُس کی ثابت کرے جیسا کہ حجۃ البالغہ میں لکھا ہے فلا یباشر ها العمل علیه والقول بها الا النحاریر الجهابذة الذین یحفظون اسماء الرجال و علل الاحادیث نعم ربما یوخذ منها المتابعات والشواهد وقد جعل اللہ لکل شیٔ قدرا ❊

اور ان سے زیادہ نامعتمد وہ کتابیں ہیں جو بہت پیچھے تالیف ہوئیں اور وہ باتیں جو واعظوں کی زبانوں پر تھیں اور وہ خبریں اور قصے جو یہودیوں سے سُن کر لوگوں نے یاد کر لئے

تھے اور وہ حکیموں کی باتیں جنہیں لوگوں نے یونانیوں سے سیکھا تھا یا وہ رائیں جو قرآن و حدیث کے لفظوں سے استنباط کی گئی تھیں عمداً یا سہواً حدیثوں میں داخل کر دی گئیں۔ اور یہ سب صاحب لوحی کی طرف منسوب ہوگئیں مثل کتب خطیب و ابی نعیم اور جوزقانی اور ابن عساکر اور ابن نجار اور دیلمی وغیرہ کے کہ ان کی صحت کا اعلےٰ درجہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف ہو جس میں احتمال صحت کا ہو اور ادنےٰ درجہ یہ ہے کہ موضوع ہو اور نری تہمت ہو۔ اور یہی کتابیں دست آویز ان فرقوں کی ہیں جو جادہ حق سے منحرف ہوگئے اور سنت کی راہ چھوڑ کر رافضی اور معتزلی بن گئے کہ وہ اپنے عقیدوں کے اثبات اور اہل حق کے الزام دینے کے لئے انہیں کتابوں کی روایت پیش کرتے ہیں اور جو محقق نہیں ہیں وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ان سب باتوں پر ایک خرابی اور مستزاد ہوئی کہ بعض شخصوں نے براہ مغالطہ علم حدیث کا حاصل کر کے احادیث صحاح وحسان کی روایت کرنی شروع کی۔ مگر اسی درمیان میں اپنے عقائد باطلہ کو اسی اسناد سے جو انہوں نے یاد کر رکھی تھی روایت کر دیا اور اکثر محدثین نے دھوکہ کھایا جیسا کہ جابر جعفی اور ابو القاسم سعد بن عبداللہ اشعری قمی ہوا ہے کہ یہ ایسے اُستاد پرکار ہوشیار تھے کہ حقیقت میں تو رافضی تھے مگر بہت سے محدثین کو دھوکہ دیا اور حدیثوں کو بصورت صحیح کے بنا کر ان کو اُس کی صحت کا یقین دلا دیا۔ یہانتک کہ ترمذی اور ابو داؤد اور نسائی نے جابر جعفی کی حدیثوں کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا یا اجلح نامی ایک شیعہ کی جس نے بیخ و بن دین سُنیوں کے اکھاڑنے کی تدبیر کی تھی یحییٰ ابن معین سے محقق نے توثیق کی۔ اور اس پر اعتماد کیا یہانتک کہ آخر بعد تحقیق کے یہ حال کھلا اور ان فریبیوں کا فریب ظاہر ہوا لیکن چونکہ وہ روائتیں ان کی حدیثوں کی کتابوں میں لکھی گئیں اس لئے اکثر آدمیوں کو دھوکا ہوتا ہے اور حدیث کا نام سُنکر ان کے اعتماد میں خلل پڑتا ہے اور واقع میں نہ حدیث ہے نہ قول پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم بلکہ ایک مفتری جھوٹے مکار کا لطیفہ ہے ؁

علاوہ اِس کے یہ امر بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ صدر اوّل مجتہدین کے زمانہ میں راویوں کے حالات کی بہت زیادہ تحققات نہیں ہوئی اور جرح وتعدیل کی نوبت نہیں آئی اس واسطے بہت لوگوں کو حدیثوں میں دھوکا ہوا۔ اور غلط اقوال کو احادیث صحیح سمجھ لیا۔ یہانتک کہ اسی پر بعض نے احکام کی تفریع بھی کی بلکہ موضوع حدیثوں کو بھی غلطی سے مان لیا۔ یہانتک کہ جب اس کا حال کھلا تب راویوں نے حالات تحقیق کرنے اور جرح وتعدیل سے بحث کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی اور فن رجال میں تالیف شروع ہوئیں

چنانچہ اول ابن سعد نے ایک کتاب اسماء الرجال میں لکھی اور طبقات ابن سعد اُس کا نام رکھا اور اسمٰعیل بخاری اور ابن ابی خیثمہ نے اپنی اپنی تاریخوں میں اور ابن ابی حاتم نے کتاب جرح وتعدیل میں کچھ کچھ حالات راویوں کے لکھے مگر اس پر بھی رجال کا حال مشتبہ رہا یہانتک کہ آخر ابن حبان اور ابن شاہین نے ثقات کو اور ابن عدی اور ابن حبان نے ضعفا کو علحدہ علحدہ کتابوں میں جمع کیا اور بعد اُس کے بعضوں نے خاص خاص کتابوں کے رجال کی تحقیق میں علحدہ علحدہ کتابیں لکھیں جیساکہ ابونصر کلاابادی اور ابوبکر بن منجویہ اور ابوالفضل بن طاہر نے صحیح بخاری کے رجال کی نسبت اور ابوعلی نے ابوداؤد کے راویوں کی نسبت اور عبدالغنی مقدسی نے صحاح ستہ کی رواۃ کی نسبت کتاب لکھی جس کا نام کتاب الکمال رکھا پھر اُس کے بعد اوروں نے اُسے پورا کیا یہانتک کہ آخر تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب میں ان سب دفتروں کا خلاصہ جمع کیا گیا ؂

جس طرح فن اسماء الرجال کی تالیف ایک زمانۂ دراز کے بعد ہوئی اسی طرح فن درایت میں بھی اول اول کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مگر جب حدیث کی نقل و روایت کی کثرت ہوئی اور صحیح اور غلط کا التباس ہوگیا تب فن درایت کی تالیف کرنے کی ضرورت ہوئی چنانچہ سب سے اول قاضی ابومحمد حسن بن عبدالرحمٰن رامہرمزی نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی بعد اس کے حاکم نیشاپوری نے اصول حدیث میں ایک کتاب تالیف کی مگر وہ بھی پوری نہ تھی کہ اُس کے بعد ابونعیم اصبہانی نے کچھ اور مسائل اُس پر بڑھائے۔ بعد اُس کے خطیب ابوبکر بغدادی نے اصول روایت میں ایک کتاب لکھی جس کا نام کفایہ ہے۔ پھر ایک دوسری کتاب تحریر کی جس کا نام جامع رکھا۔ آخر کو قاضی عیاض نے اُسے پورا کرنا چاہا اور ایک کتاب لکھی جس کا نام الماع ہے اور اسی طرح ابوحفص اور حافظ ابوعمر و عثمان بن صلاح نے رسالے لکھے اور بعدہ بہت سے عالموں نے اپنی اپنی قابلیت دکھائی اور بہت سی کتابیں تالیف کیں ؂

یہ مختصر کیفیت حدیث کے جمع ہونے کی ہے پس کہاں ہے دیدۂ بینا اور گوش شنوا کہ اس تحقیقات کو دیکھے اور اس سے فائدہ اُٹھائے۔ اب تو اسلام کا مدار اس پر آرہا ہے۔ کہ چٹائی کی جانماز بغل میں اور مولود کا رسالہ ہاتھ میں ہے اور جوان قصوں کہانیوں کو نہ مانے اس پر تکفیر کا حکم جاری ہے۔ حدیث وہ بات جو کسی کتاب میں لکھی ہو۔ قول رسول وہ قول ہے جس کے شروع پر قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تحریر ہو نہ کسی کو تحقیق کی خواہش نہ تنقیح کی آرزو بلکہ کافر ہے وہ جو تحقیق پر مستعد ہو منکر نبی ہے وہ جو اُس کے اقوال کو اوردن

کی باتوں سے جدا کرنے پر متوجہ ہو کیا خوب ہے یہ اسلام اور کیا اچھا ہے یہ بیان ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر در پس امروز بود فردائے

تیسری بحث بہ نسبت تنقیح اس امر کے کہ روایت حدیث کی بالالفاظ ہے یا بالمعنی

جب سے کہ حدیث کی تدوین اور کتابت کا قاعدہ جاری ہوا تب سے الفاظ کی تصحیح اور اقوال کے ضبط اور روایت کی بلفظہٖ نقل کا ہونا مسلّم ہے اور بلاشبہ اُس وقت سے محدثین اور جامعین کتب احادیث نے نہایت احتیاط اور سچائی اور راستی اور دیانت سے لفظوں کو نقل کیا ہے اور اگر راویوں کی روایت میں اختلاف لفظوں کا ہوا ہے تو اس کو بھی اکثر اپنی تالیفات میں لکھدیا ہے لیکن جو زمانہ اس سے پہلے کا ہے اُس کی نسبت اگر کوئی روایت بالالفاظ کا دعوےٰ کرے تو وہ ثابت نہیں ہو سکتا نہ عقلاً نہ نقلاً۔

عقلاً اس وجہ سے کہ جو کچھ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے اُسے سننے والے سُن کر یاد رکھتے پس جو لفظ آنحضرت صلعم کی زبان مبارک سے نکلتے اور جس نظم و ترتیب سے بہ تقدیم و تاخیر کلمات آنحضرت صلعم تقریر فرماتے اُس کا ایک دفعہ میں سنکر بلفظہٖ یاد کر لینا تو کسی طرح قیاس میں نہیں آتا اور نہ شاید کوئی شخص کسی بشر کی نسبت ایسا خیال کر سکتا ہے اور پھر جبکہ یہ خیال کیا جاوے کہ سننے والے صرف وہی لوگ نہ تھے جو ذہن اور حافظہ اور علم اور سمجھ میں کامل تھے اور جو روایت اور فقہ میں معروف تھے بلکہ ایسے بھی تھے کہ جو روایت اور فقہ میں مشہور نہ تھے۔ اور جنہوں نے بات کے سمجھنے میں بھی خطا کی ہے [1] پس کیا کوئی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ لاکھوں آدمی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع رہتے تھے سب کے سب

---

[1] ماہرین کتب حدیث پر روشن ہے کہ طبقۂ اولے کے لوگوں سے بھی ایسی غلطیاں ہوئی ہیں چنانچہ میں چند حدیثوں کو بطور تمثیل کے بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم چلے جاتے تھے کہ ایک یہودیہ مرگئی تھی اور لوگ اُس کے رو رہے تھے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ وہ تو قبر میں مبتلائے عذاب ہے اور یہ لوگ رو رہے ہیں مگر عبداللہ بن عمر کا یہ قول تھا کہ مردہ کو بہ سبب رونے زندوں کے عذاب ہوتا ہے جب حضرت عائشہ نے یہ سُنا تو یہ فرمایا کہ یغفر اللہ لابی عبد الرحمٰن اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطاء انما مر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی یہودیۃ یبکی علیہا فقال انہم یبکون علیہا وانہا لتعذب فی قبرہا۔ کہ خدا ابن عمر کو بخشے وہ جھوٹ نہیں کہتے مگر وہ بھول گئے یا اُن سے چوک ہو گئی (حاشیہ بر صفحہ ۲۵۱)۔

ایسے قوی الحافظہ تھے کہ ایک دفعہ جو بات سُنتے اُسے اُسی نظم و ترتیب سے بلفظہٖ یاد کر لیتے اور کبھی بھول چوک اُن سے نہ ہوتی۔ ایسا دعوےٰ سوائے ان لوگوں کے کہ جن کو عوام اہل الجنت کہتے ہیں کوئی نہیں کر سکتا۔ ہمارے مذہب کے محققین نے کیا ہے اور پھر اگر اس طبقہ کے لوگ

(بقیہ حاشیہ نمبر ۲۵۰) اصل حال اس کا یہ ہے پھر انہوں نے اصل حال اُس کا بتلا دیا (بخاری و مسلم)۔

(۲) موسیٰ بن طلحہ سے روایت ہے کہ کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ابن عمر کہتے ہیں کہ "موت الفجاءۃ سخطۃ علی المومنین فقالت یغفر اللہ لابن عمر انما قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم موت الفجاءۃ تخفیف علی المومنین وسخطۃ علی الکافرین" کہ مرگ مفاجات سختی ہے اوپر مومنوں کے تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ خدا بخشے ابن عمر کو پیغمبر خدا نے تو فرمایا ہے کہ مرگ مفاجات تخفیف ہے مومنین پر اور سختی ہے کافروں پر۔

(۳) جلال الدین سیوطی نے رسالہ عین الاصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ جس نے مردہ کو غسل دیا اُس پر غسل لازم ہے تب حضرت عائشہؓ نے سنا تو فرمایا "او نجس موتی المسلمین" کہ کیا کہیں مردے مسلمانوں کے بھی نجس ہو جاتے ہیں۔

(۴) طبرانی نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے کہا کہ "من لم یوتر فلا صلوٰۃ لہ" کہ بے وتر کی نماز نہیں ہوتی جب حضرت عائشہ نے یہ سُنا تو فرمایا کہ کس نے آنحضرتؐ سے ایسا سُنا ہے ابھی تو کچھ زمانہ نہیں گذرا کہ ہم بات پیغمبر خدا کی بھول گئے۔ آپ نے تو یہ فرمایا تھا کہ "من جاء بصلوٰۃ الخمس یوم القیامۃ حافظ علی وضوئھا ومواقیتھا ورکوعھا وسجودھا ولم ینقص منہ شیئا کان لہ عند اللہ عھد ان لا یعذبہ الخ" اب دیکھنا چاہیے کہ کس قدر فرق سمجھ میں ابو ہریرہ کے ہوا اور کیا کا کیا سمجھے۔

(۵) ابو سلمہ بن عبد الرحمن سے عین الاصابہ میں یہ روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ "ان جابر بن عبد اللہ یقول الماء بالماء فقالت اخطا جابر ان رسول اللہ قال اذا جاوز الختان فقد وجب الغسل" یعنی جابر کا یہ قول تھا کہ جب پانی نکلے تب پانی واجب ہوتا ہے یعنی غسل بعد منی نکلنے کے واجب ہوتا ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جابر نے اس میں خطا کی ہے پیغمبر خدا نے فرمایا ہے کہ بعد ادخال کے غسل واجب ہوتا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اصل بات کے سمجھنے میں کس قدر فرق ہوا۔

(۶) بخاری میں حضرت ابن عمر سے منقول ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کی لڑائی فتح ہونے کے بعد کافران مقتول کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ "ھل وجدتم ما وعد لکم حقا ثم قال انھم الان یسمعون ما اقول فذکر ذالک لعائشۃ فقالت انما قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم انھم لیعلمون الان ما کنت اقول لھم حق" کیا تم نے پایا جو کچھ خدا نے تم سے وعدہ کیا تھا اور پھر فرمایا کہ اب وہ میری باتوں کو سنتے ہیں مگر جب حضرت عائشہؓ نے یہ سُنا تو آپ نے کہا کہ نہیں پیغمبر خدا نے یہ فرمایا تھا کہ اب ان کو معلوم ہوا کہ جو کچھ میں ان سے کہتا تھا وہ سچ ہے تو اب دیکھنا چاہیے کہ دونوں باتوں میں کس قدر فرق ہے۔

(۷) مکحول سے روایت ہے کہ کسی نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ تین چیزوں کی نحوسی لا علاج ہے گھر میں، عورت میں، گھوڑے میں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ابو ہریرہؓ کو یاد نہیں رہا۔ وہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آنحضرت صلعم یہ فرما رہے تھے کہ "قاتل اللہ الیھود یقولون الشوم فی ثلاثۃ فی الدار والمراۃ والفرس" کہ خدا یہودیوں کو مارے وہ کہتے ہیں کہ نحوسی تین چیزوں میں (حاشیہ برصفحہ ۲۵۱)

اپنی سُنی سنائی باتوں کو لکھ لیتے اور کتابوں میں جمع کر دیتے تو بھی الفاظ کی صحت کا ظن ہو سکتا تھا۔ مگر جبکہ اُس طبقہ نے ایسا نہیں کیا اور حدیثوں کو نہیں لکھا اور اگر کسی نے پہلے طبقہ سے حدیثوں کو زبانی سُن کر ان کے الفاظ کو یاد کر لیا ہو اور اسی طرح سے دوسرے سے تیسرے نے اور تیسرے سے چوتھے نے جو کچھ سُنا بلفظہٖ یاد رکھا۔ اور پھر جب یہ خیال کیا جاوے کہ احادیث کی نقل میں بہت سے واسطے ہو گئے اور آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں سے بھی زیادہ راویوں کے سلسلے بیچ میں آ گئے اور ڈیڑھ سو برس تک وہ جمع نہیں کی گئیں۔ تو کیونکر یہ بات مانی جاوے کہ جو لفظ آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے نکلے تھے وہی لفظ باوجود ان واسطوں کے اور باوصف اس تسلسل کے بجنسہٖ باقی رہے۔ ہاں یہ بات وہی آدمی تسلیم کر سکتا ہے جو کہ تمام راویوں کو اور سب ناقلینِ احادیث کو مثل جبرئیل امین کے نقل اور روایت میں غلطی سے معصوم جانے اور سب کی نسبت اعجاز و کرامات کا معتقد ہووے۔

لیکن ہم ایسا اعتقاد بھی رکھتے اگر حدیثوں کے الفاظ خود ہمارے اس اعتقاد کو غلط اور باطل نہ کر دیتے مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کی حدیث جو کئی راویوں سے منقول ہے اُس کے الفاظ اور عبارت میں اختلاف ہے تو کیونکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایت حدیث کی بالالفاظ ہے۔ پھر اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے عالموں نے احادیث کی روایت کو بالالفاظ مانا ہے تو بھی اجماع کے خوف سے روایت بالالفاظ کا اقرار کرتے اور جو بات عقلاً محال ہے اُسے بے سمجھے بوجھے مان لیتے مگر ہمارے عالموں میں سے جتنے محققین گذرے ہیں انہوں نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا بلکہ نہایت دانشمندی اور عقل سے اصول دین کی تنقیح کر کے یہ قاعدہ ٹھہرایا ہے کہ احادیث کی روایت بالالفاظ جائز ہے۔ اور بعضوں نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ احادیث کی روایت بالالفاظ پر کسی طرح یقین نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۱) ہی جاتی ہے گھر اور عورت اور گھوڑے میں مگر ابوہریرہ نے اخیر کے لفظ سے اول کے لفظ نہیں سنے۔

(۸) شیخ جلال الدین سیوطی نے رسالہ عین الاصابہ میں لکھا ہے کہ ابوہریرہ نے کہا پیغمبر خدا نے فرمایا کہ ایک عورت ایک بلی کو نہ پانی دیا نہ کھانا اُسے چھوڑا کہ وہ مر گئی اس لئے خدا نے اُسے عذاب دوزخ کا دیا۔ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک مومن کی ایسی عزت نہیں ہے کہ ایک بلی کے پیچھے اُسے دوزخ میں ڈالے وہ عورت کافرہ تھی اور یہ کہہ کر کہا کہ ابوہریرہ ذرا سمجھ کر پیغمبر خدا کی حدیث کی روایت کیا کرو۔

(۹) اور پھر اسی کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے کہا کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کسی کے پیٹ میں پیپ اور خون بھر جاوے تو بہتر ہے شعر سے حضرت عائشہؓ نے سنکر کہا کہ ابوہریرہ کو یاد نہیں رہا۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ بہتر ہے اُس شعر سے جو ہجو میں کسی کے کہا جاوے تفا خیال کرنا چاہئے کہ کس قدر دونوں میں فرق ہے۔

چنانچہ میں اس مقام پر چند اقوال محدثین اور علمائے محققین کے اپنے کلام کی تائید میں پیش کرتا ہوں ۔

شرح مشکوٰۃ میں بعد ایک بڑی بحث کے بہ نسبت روایت بالالفاظ اور بالمعنی کے لکھے ہیں کہ والنقل بالمعنی واقع فی الکتب الستۃ وغیرھا صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث میں نقل حدیث بالمعنی واقع ہے ۔

شرح صحیح مسلم میں امام نووی اسی بحث میں لکھتے ہیں کہ قال جمھور السلف والخلف من الطوائف المذکورۃ یجوز فی الجمیع اذا جزم بانہ ادی المعانی وھذا ھو الصواب تقتضیہ احوال الصحابۃ ومن بعدھم رضی اللہ عنھم فی روایتھم القضیۃ الواحدۃ بالفاظ مختلفۃ ثم ھذا انما ہو فی الذی یسمعہ فی غیر المصنفات اما المصنفات فلا یجوز تغییرھا وان کان بالمعنی کہ سب اگلے پچھلوں نے روایت بالالفاظ جائز رکھی ہے ۔ احادیث میں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی اور اقوال ہیں اوروں کے بشرطیکہ یقین معانی کی صحت پر ہووے اور یہی صحیح اور درست ہے اور حالات صحابہ اور ان کے مابعد کے لوگوں سے بھی ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک بات کو مختلف لفظوں میں انہوں نے روایت کیا ہے ۔

علامہ اثیر الدین ابی حیان محمد بن یوسف بن حیان اندلسی کتاب تذئیل وتکمیل میں جو شرح تسہیل الفوائد وتکمیل المقاصد کی ہے لکھا ہے کہ مصنف نے قواعد کلیہ کے اثبات میں استدلال حدیث کے لفظوں سے کیا ہے ۔ حالانکہ یہ اُس کی غلطی ہے ۔ آج تک میں نے ایک کو بھی اگلے پچھلے میں سے ایسا کرتے نہیں دیکھا اور کسی نے الفاظ حدیث سے ایسا استدلال نہیں کیا کیونکہ ان کو وثوق اس پر نہیں ہوا کہ یہ الفاظ وہی ہیں جو پیغمبر خدا نے فرمائے تھے اور اگر ایسا وثوق ہو جاتا تو وہ الفاظ مثل الفاظ قرآن کے قواعد کلیہ کے استخراج میں مانے جاتے اور عدم وثوق کے دو سبب ہیں ۔ اول یہ کہ راویوں نے نقل بالمعنی کرنا جائز سمجھا تھا دوسرے بہت سی حدیثوں میں موافق کلام عرب کے لفظی غلطیاں ہیں کیونکہ اکثر راوی غیر عرب تھے ۔

چوتھی بحث بہ نسبت اس کے کہ کل احادیث صحیحہ مفید یقین ہیں یا نہیں

ہمارے محققین نے لکھا ہے کہ احادیث متواتر مفید یقین ہیں اور احادیث احاد مفید

یقین نہیں ہیں جیسا کہ تلویح میں لکھا ہے کہ والاوّل ای المتواتر یوجب علم الیقین والثانی ای المشہور یفید علم طمانیۃ والثالث وھو خبر الواحد یوجب العمل دون علم الیقین وقیل لا یوجب شیئًا منہا اور نیز اخبار احاد کی نسبت لکھا ہے کہ ان خبر الواحد یحتمل الصدق والکذب وبالعدالۃ یترجح جانب الصدق بحیث لا یبقی احتمال الکذب وھو معنی العلم وجوابہ انا لا نسلم یترجح جانب الصدق الی حیث لا یحتمل الکذب اصلاً بل العقل شاھد بان خبر الواحد العدل لا یوجب الیقین وان احتمال الکذب قائم وان کان مرجوحا والا لزم القطع بالنقیضین عند اخبار العدلین یعنی خبر متواتر تو مفید یقین ہے اور خبر مشہور سے علم اطمینانی حاصل ہوتا ہے نہ یقینی۔ اور خبر احاد عمل کے لئے کافی ہے نہ یقین کے لئے اور بعضوں نے کہا ہے کہ اخبار احاد مفید علم ہے نہ واجب العمل۔ اور خبر احاد کی نسبت اگر کوئی کہے کہ بلاشبہ خبر احاد میں احتمال صدق وکذب کا ہے لیکن جب عدالت راوی سے جانب صدق غالب ہوگی بایں حیثیت کہ احتمال کذب نہ رہا تو یہی معنی علم کے ہیں اس لئے خبر احاد بھی مفید یقین ہوگی جواب اس کا یہ ہے کہ ہم نہیں مانتے کہ جانب صدق احاد میں ایسا غالب ہے کہ احتمال کذب کا باقی ہی نہیں رہا۔ بلکہ عقل اس پر شاہد ہے کہ خبر ایک آدمی کی کہ وہ عادل ہے مفید یقین نہیں اور احتمال کذب اُس پر قائم ہے گو وہ احتمال ضعیف ہی ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو یقین کرنا دونقیض پر لازم ہو جاوے۔ اُن اخبار میں جو دو عادل راویوں سے منقول ہیں اور باہم متناقض ہیں اور شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ جتنی حدیثیں غیر متواتر صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ہیں ان کی نسبت محققین کا یہ قول ہے کہ وہ صرف مفید ظن ہیں نہ مفید یقین کیونکہ وہ احاد ہیں اور احاد سے صرف علم ظنی ہوتا ہے نہ علم یقینی اور جبکہ یہ قاعدہ بہ نسبت اخبار احاد کے ٹھہر چکا تو کچھ فرق بخاری اور مسلم اور غیر بخاری اور مسلم میں نہیں ہے اور اس بات سے کہ عمل کرنا ان حدیثوں پر اجماعاً ثابت ہے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس پر بھی اجماع ہے کہ احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی یقینی پیغمبر خدا کا کلام ہے۔ صلے اللہ علیہ وسلم پس فقط کسی کتاب میں لکھے ہونے سے یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی کہ یقینی وہ کلام کلام رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ جب تک کہ تواتر منقول ہونا اُس کا ثابت نہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے قاضی ابوبکر باقلانی نے کتاب الانتصار میں کہ اگر کوئی مسئلہ ایک کتاب میں کیا ہزار کتاب میں بھی پایا جاوے اور کسی امام کی طرف منسوب ہو تو اُس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یقینی وہ مسئلہ اس امام نے فرمایا ہے۔ جب تک کہ تواتر اُس کا منقول ہونا اُس امام سے ثابت نہ ہو حالانکہ یہ بہت ہی مشکل ہے فقط۔ پس ایسا ہی

خیال کرنا چاہئے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک قولوں کی نسبت کہ جب تک تواتر اُن کا منقول ہونا ثابت نہ ہو جاوے تب تک اُس پر کامل یقین نہیں ہو سکتا ۔

فواتح شرح مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ ابن صلاح اور چند اہل حدیث نے یہ گمان کیا ہے کہ روایت بخاری اور مسلم کی مفید یقین ہیں حالانکہ یہ بڑا دعوے کا ہے کیونکہ جو شخص اپنے دل میں سوچیگا وہ اس بات کو بالبداہت مانے گا کہ فقط ان کا روایت کرنا یقین کے لئے کافی نہیں اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اُن میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو ایک دوسرے کی نقیض ہیں اور اگر ان سب پر یقین کیا جاوے تو تناقض باتوں کا ماننا لازم آوے ۔ پھر ان روایات کو مانی جاوے کہ ان کے راوی جامع شرائط تھے تو اس سے صرف زیادہ ظن ہو سکتا ہے لیکن یہ بات کہ ان کی روایت پیغمبر خدا صلعم سے یقینی ہے اس پر ہرگز اجماع نہیں ہے اور کیونکر اُس کا اجماع ہو حالانکہ اس پر بھی اجماع نہیں ہے کہ جو کچھ ان دونوں کتابوں میں ہے وہ سب صحیح ہے کیونکہ بعض راوی اُن کے قدری تھے بعض اہل بدعت تھے اور اہل بدعت کی روایت کا قبول کرنا مختلف فیہ ہے ۔ تو اجماع کا دعوےٰ ان کی مرویات کی صحت پر کہاں باقی رہا ۔ غایۃ مافی الباب یہ ہے کہ حدیثیں بخاری و مسلم کی ان کی شرط پر صحیح ہوں اور اس سے سوائے ظن کے یقین کا فائدہ نہیں ہوتا ۔

پانچویں بحث بہ نسبت اس کے کہ کتب صحاح کی احادیث کی صحت بمرتبہ یقین ثابت ہے یا نہیں

یہ بات مسلمات سے ہے کہ منجملہ کتب احادیث کے ستہ اور موطاے امام مالک ؒ اعلے درجہ کی ہیں اور ان کے جامعین نے نہایت احتیاط اور کمال محنت سے احادیث کی تصحیح کی ہے پھر ان میں سے صحیحین یعنی صحیح بخاری و مسلم اعلے درجہ پر ہیں اور ان کی تحقیق بہت بڑھی ہوئی ہے ۔ مگر یہ کہنا کہ کل احادیث اُن کی ایسی صحیح کہ جن کی صحت بمرتبہ یقین کا ہو صحیح نہیں ہے ۔ چند وجوہ سے ۔ اولاً جو احادیث متواتر نہیں ہیں اُن کی صحت کا بمرتبہ یقین ہونا ایسا امر ہے ۔ جس کا کسی محقق نے دعوے نہیں کیا ۔ ثانیاً ان کتابوں میں بعض حدیثیں ایسی بھی ہیں ۔ جن کی عدم صحت بالبداہت ظاہر ہے اور جسے شارحین اور محققین نے صاف صاف لکھ دیا ہے اور پھر بعض راوی ایسے بھی ہیں کہ جن کی جرح اور محدثین نے کی ہے تو کیونکر یہ دعوے کیا جاوے کہ مثل آیات قرآن کے ہر حدیث قطعی اور یقینی ہے ۔ چنانچہ میں بطور تمثیل کے چند اقوال اور چند احادیث کو نقل کرتا

ہوں ؛

شرح اصول بزدوی میں لکھا ہے کہ ابو عمرو دمشقی نے لکھا ہے کہ بخاری نے ایسی جماعت سے استناد کیا ہے جس کی نسبت اُ متقدمین نے جرح کی ہے مثل عکرمہ اور اسمٰعیل اور عاصم اور عمرو بن مرزوق وغیرہم۔ اور مسلم نے بھی سوید بن سعید وغیرہ سے استناد کیا ہے جس پر اوروں نے طعنہ کیا ہے ؛

جامع الاصول میں لکھا ہے کہ حدیثیں جو ہمارے اماموں نے روایت کی ہیں بعض ان میں سے صحیح ہیں بعض سقیم۔ اور اس کا سبب اختلاف جرح و تعدیل روایت ہے ؛

دارقطنی نے کہا ہے کہ دو سو دس حدیثیں صحیحین کی ضعیف ہیں جن میں اسّی مخصوص بہ بخاری اور تیس مخصوص بہ مسلم اور سو مشترک دونوں میں ہیں ؛

منجملہ اُن احادیث کے جن کی عدم صحت کا اقرار محدثین اور شارحین نے کیا ہے چند حدیثیں لکھی جاتی ہیں ؛

اوّل ۔ صحیح بخاری میں لکھا ہے عن عروۃ ان النبیؐ خطب عائشۃ فقال لہ ابو بکر انما انا اخوک فقال انت اخی فی دین اللہ ۔ فتح الباری میں اس حدیث کو غیر صحیح لکھا ہے کما قیل فی صحۃ ھذا الحدیث نظر لان الخلۃ لابی بکر انما کانت بالمدینۃ وخطبۃ عائشۃ کانت بمکۃ فکیف یلتئم قولہ انما انا اخوک اس حدیث کی صحت میں صرف ایک تاریخی واقعہ کے مخالف ہونے سے کلام کیا گیا۔ کیونکہ خلۃ ابو بکر صدیقؓ مدینہ میں ہوئی اور خطبہ عائشہ صدیقہؓ مکہ میں قبل اُس کے تو قبل از خلت آنحضرت ابو بکر صدیق رضؓ کا کہنا انما انا اخوک صحیح نہیں ہوسکتا ؛

دوسرے ۔ صحیح بخاری میں لکھا ہے عن ابی ھریرۃ عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم قال یلقی ابراھیم اباہ فیقول یارب انک وعدتنی الا تخزنی یوم یبعثون فیقول اللہ انی حرمت الجنۃ علی الکافرین ۔ اس حدیث کی عدم صحت کا بھی اقرار محققین نے کیا ہے کما قیل وقد استشکل الاسماعیلی ھذا الحدیث من اصلہ وطعن فی صحتہ فقال ھذا حدیث فی صحتہ نظر اور اس حدیث کی صحت میں اس لئے کلام کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شان سے خلاف ہے کہ جب خدائے عزوجل نے اُن کو شفاعت سے اپنے باپ کی دنیا میں منع کر دیا تو وہ کیونکر پھر قیامت میں خلاف حکم خدا کے شفاعت کریں گے ؛

تیسرے ۔ روایت نماز پڑھنے پیغمبر خدا کے جنازہ پر ابن ابی سلول کے جو بخاری میں ہے محققین نے کلام کیا ہے اور باقلانی نے صاف اس حدیث کا انکار کیا ہے ؛

چوتھی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے یہ حدیث منقول ہے۔ کہ ان ابا سفیان قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسالک ثلاثا فاعطاہ ایاھن منھن عندی احسن العرب ام حبیبۃ ازوجک ایاھا۔ فی ہدی خیر العباد میں لکھا ہے۔ کہ فھذا الحدیث غلط ظاھر لاخفاء بہ کہ اس حدیث کی غلطی ایسی ظاہر ہوئی ہے کہ ذرا بھی اس کی غلطی پر شبہہ نہیں اور اس کی غلطی بھی اسی وجہ سے مانی گئی کہ وہ تاریخی واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ حضرت ام حبیبہ عبداللہ بن جحش کی منکوحہ تھیں اور حبیبہ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت کو گئی تھیں جب وہ وہاں جاکر عیسائی ہوگیا اور ام حبیبہ اپنے دین پر قائم رہیں تب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے ذریعہ سے ان سے نکاح کیا۔ اور یہ امر قبل از فتح مکہ کے ہوا۔ اور ابوسفیان فتح مکہ کے دن ایمان لایا اور پیغمبر صاحب کے سامنے آیا۔ اسی واسطے اس حدیث کی غلطی ثابت ہوئی وقال ابو محمد بن حزم وھو موضوع بلا شک کذبہ عکرمۃ بن عمار وقال ابن الجوزی فی ھذا الحدیث ھو وھم من بعض الرواۃ لاشک فیہ ولا تردد۔

پانچویں۔ ملا علی قاری کتاب رجال میں لکھتے ہیں کہ روایت مسلم کی جابر سے قصہ حجۃ الوداع میں ایسی مختلف ہے کہ ان میں ایک ضرور رجوع ہے کیونکہ ایک میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے طواف کرا کے نماز ظہر کی مکہ میں پڑھی۔ دوسری میں لکھا ہے کہ نماز ظہر کی منیٰ میں ادا کی ولھذا قال ابن حزم فی ھاتین الروایتین احدھما کذب بلاشک۔

اور اسی طرح حدیث اسرافیل الوحی اور حدیث خلق تربت یوم السبت اور حدیث اول ما نزل من القرآن اور حدیث صلوۃ الکسوف بثلاث رکعات کی غلطی اور ضعف کا محققین نے اظہار کیا ہے اور اسی طرح حدیث فدک کی موضوعیت کا جو صحیح بخاری میں ہے صاف اقرار محققین نے کیا ہے پس باوجود اس کے ہر حدیث کی صحت کو قطعی اور یقینی سمجھنا خلاف تحقیق محققین سابق کے ہے۔

اگر مستفتی کو اس تقریر پر یہ شبہ ہو کہ میرے نزدیک کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور نہ کسی پر عمل کرنا جائز ہے اور بخاری اور مسلم پر بھی اعتبار صحت کا نہیں تو یہ اس کی سمجھ کی غلطی ہے۔ کیونکہ میں نے اپنے اس جواب میں صرف اصولی مسائل کو بیان کیا اور محققین کے اقوال کو نقل کیا۔ اور چونکہ ہمارے ابنائے جنس اصل بات کو تو دیکھتے نہیں اور مطلب پر غور نہیں فرماتے۔ سرسری طور سے عامیانہ اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے حقیقت میں مطلب اور کا اور ہو جاتا ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جن محدثین نے صحاح ستہ کو جمع کیا

وہ بڑے محقق اور متورع اور امام اور دین کے پیشوا تھے اُن کی نیت نیک تھی ۔ اُن کی صداقت اور سچائی اعلےٰ درجہ پر تھی ۔ اور انہوں نے احادیث کو جہاں تک ممکن تھا نہایت احتیاط سے جمع کیا اور راویوں کے الفاظ اور کلمات کو بہت محنت سے یاد کیا ۔ اور اپنے نزدیک انہوں نے کوئی دقیقہ تصحیح کا باقی نہیں رکھا ۔ اور ان کتابوں میں حدیث کی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درجہ بڑھا ہوا ہے اور ان کی احتیاط اور تحقیق بہت زیادہ ہے ۔ مگر جو کچھ ان محدثین نے لکھا اور جمع کیا اس کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ اس کے راوی اس کثرت سے ہوں کہ جن پر عقلاً احتمال غلطی کا ہو ہی نہ سکے اُسے متواتر کہتے ہیں اور اس کی صحت پر کامل یقین ہے ۔ دوسری احاد ہیں جو اُس درجہ پر نہیں پہنچیں اس لئے ایسا یقین صحت کا اس پر نہیں ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال نہ ہو مگر اُس پر عمل کرنا جائز ہے جب تک کہ اُس کا تعارض اور مخالفت ان اصول صحیحہ عقلیہ سے ثابت نہ ہووے ۔ جو واسطے تصحیح احادیث کے قرار دیئے گئے ہیں ۔ اور پھر ان اخبار احاد کی نقل میں محدثین نے نہایت احتیاط کی مگر پھر بھی وہ غلطی اور خطا سے نہیں بچے اور بعض بعض احادیث کی روایت میں ان کو دھوکا ہو گیا پس ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ہم ان حدیثوں کو جو صحاح میں خصوصاً بخاری اور مسلم میں مذکور ہیں صحیح جانینگے اور اس پر عمل کریں گے لیکن جب اس کی مخالفت کسی اصل صحیح سے منجملہ اُن اصول کے ثابت ہوگی تب ہم اُس کو صرف اس وجہ سے کہ یہ حدیث صحاح ستہ میں لکھی ہے واجب القبول نہ جانینگے کیونکہ کسی محقق نے ایسا نہیں کیا نہ کوئی ایسا کر سکتا ہے اور جو ایسا دعوےٰ کرے وہ کبھی اپنے دعوے پر قائم نہیں رہ سکتا ۔ اور آخر کار اُسے بھی اُس راہ پر آنا ہوگا جس پر ہم چلتے ہیں پس بڑا فرق ہے درمیان اس کے کہ احادیث مفید یقین نہیں ہیں اور درمیان اس کے کہ وہ واجب العمل نہیں ہیں باوجود تعارض اور مخالفت کے اور درمیان اس کے کہ جائز العمل ہیں جب تک ان کا تعارض ثابت نہ ہو ۔ اور درمیان اس کے کہ محدثین معصوم اور محفوظ نہ تھے اور اُن سے غلطی ہونا ممکن تھی اور باوجود احتیاط کے ان سے براہ بشریت غلطی ہوئی اور درمیان اس کے کہ وہ جھوٹے تھے اور جھوٹی باتیں انہوں نے جمع کیں پس جو کوئی دوسری بات کو ہماری طرف منسوب کرے اُس کا الزام اُس پر ہے نہ ہم پر ۔ وھا انا بریٌ مما یقولون ؁

استفتاء

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کہ اگر زید معتقد یا قائل اُن امور کا ہو جو کہ نیچے بیان کئے جاتے ہیں اور پھر عمرو اُسے امام و پیشوا و مقتدائے دین سمجھے تو عمرو کی نسبت شرعاً کیا حکم ہے ٭

(۱) اوّلاً اللہ جل شانہ جہت اور حیز اور صورت اور جسم اور مکان سے منزہ نہیں ہے ٭

(۲) قرآن مجید نہ جامع ہے نہ مانع یعنی جس قدر نازل ہوا تھا وہ سب محفوظ نہیں رہا اور جو قرآن نہیں تھا وہ قرآن میں داخل ہو گیا ٭

(۳) قرآن موجودہ غلطیوں اور کاتب کی بھولوں سے بھرا ہوا ہے ٭

(۴) پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی کبھی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ کہنا کچھ چاہتے اور زبان مبارک سے اور کچھ نکل جاتا اور بسبب مسحور ہونے کے خود نہ جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں ٭

(۵) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی تعریف قرآن پڑھنے کی حالت میں مشرکین کے سامنے کی ٭

(۶) خدا کو بعض آیتوں میں بندوں پر توارد ہوا یعنی جو کچھ پہلے کسی بندے کی زبان سے نکلا اُسی کو پھر خدا نے بذریعہ جبرئیل امین کے نازل کیا ٭

(۷) باوجود نہ لئے جانے نام خدا کے وقت ذبح کے اور عمداً ترک کرنے تسمیہ کے ذبیحہ حلال ہے ٭

(۸) سوائے عربی زبان کے ترجمۂ قرآن کا نماز میں پڑھنا جائز ہے ٭

(۹) صحیح بخاری اور مسلم میں بھی موضوع حدیثیں ہیں ٭

(۱۰) صحابہ کے اقوال واجب العمل نہیں ہیں۔ وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں ٭

مُراسلات

مکرمی مولوی مہدی علی صاحب سلمہٗ

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دلِ من
دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

آپ کی فصیح بلیغ تحریروں کو میں نے دیکھا۔ آپ کی استعداد کی کیا تعریف ہو سکے۔ آپ کی لیاقت کا اظہار کون کر سکے۔ مگر نہایت بہتر ہوتا کہ آپ کی تحریریں معقولات اور دنیاوی تہذیب ہی پر ختم ہوتیں اور مذہبی عقائد پر آپ توجہ نہ کرتے۔ بھائی میرے یہ راہ باریک ہے اور راست تاریک۔ ایسی تیزی سے چلنا دانشمندی کے خلاف ہے ؎

مہدی شتاب ایں رہِ دیں است نہ صحراست
ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

بارہ سو برس کی عمارت کو گرانا اور نئی بنیاد ڈالنا اور اسلام کی تصویر مٹانا عقل کے بھی خلاف ہے اگر بے پابندی اسلام کے آپ نیا دین قائم کریں ہم کو کچھ عذر نہیں مگر اسلام اسلام اسلام کی ہمدردی کا جب آپ نام لیتے ہیں تب ہمارے بدن پر لرزہ ہوتا ہے! ور تعجب کرتے ہیں کہ کیا اس ہزار برس کے عرصہ میں کوئی بھی اسلام سے واقف نہ ہوا کسی کو حقیقت اسلام کی معلوم نہ ہوئی کہ آپ اس کی اصلاح پر مستعد ہیں۔ پھر اگر بقول آپ کے جو اپنے دوست کو خط میں لکھا ہے۔ عربی عمامہ سر پہ ہونا اور اونچے ٹخنہ کا پائجامہ تو بھی کوئی آپ کی بات سنتا۔ وضع کرسٹانی و دعویٰ مسلمانی۔ ہیہات ہیہات شیطان کے وجود سے انکار کرنا شق القمر کا منکر ہونا۔ اجماع کو نہ ماننا۔ کتے کی طرح کھڑے ہو کر موتنا۔ اصحاب کو بُرا کہنا۔ سلف صالح کو اچھا نہ جاننا مسلمانوں کو پاجی نالائق کہنا اماموں کو صنم و بت بنانا۔ علماء کو مکار و دغاباز کہنا ہی اگر نشانیاں اسلام کی ہیں تو سلام ایسے اسلام کو ؏

گر ولی ایں است لعنت بر ولی

حضرت نہ محتسب ہے جس کے دُرّہ کا خوف ہو۔ نہ قاضی ہے جس کے فتوے سے دار کا ڈر ہو۔ آزاد گورنمنٹ کی حکومت ہے۔ ورنہ اس آزادی سے بک بک کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی۔ اب تک کب کی آزادی دنیا سے آپ کو حاصل ہو گئی ہوتی۔ آپ کو بڑا ناز مدرسۃ العلوم پر تھا مگر اخبار الاخبار لکھنؤ نے آپ لوگوں کی فریب دہی جو مسلمانوں کو کر رہے تھے

ثابت کر دکھایا اور مدرسۂ یمانیہ جاری کر دیا۔ آگرہ اخبار میں بھی آپ لوگوں کی خوب خبر لی کلکتہ کے مشہور دیندار عالم کے نام سے تو آپ کے بدن پر لرزہ پڑتا ہوگا۔ جبکہ یہاں تک آپ لوگوں کی ذلت کی نوبت پہنچ چکی تو باز نہ رہنا دہی آزادی ہے جس کو سب بے حیائی کہتے ہیں۔ اگر آپ مسلمان نہ ہوں تو آپ اشتہار دیدیں یا مسلمانوں کے سے عقیدے رکھو ورنہ قیامت کے دن سب حال کھل جاویگا اور اپنے کئے کو رو وگے خوب آپ یقین کرلیں نہ اب آپ کا مدرستہ العلوم چلیگا نہ فریب ہی مسلمانوں کی۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ مذہبی تحریروں سے باز رہیئے۔ بدعت کے موجد نہ ہوجیئے ورنہ ناحق کوئی جلا ہوا مسلمان کچھ کر بیٹھے تو سب خیر خواہی اسلام کی معلوم ہو۔ جلے ہوئے بُرے ہوتے ہیں۔ یہ تو بتاؤ کہ تم کو ان باتوں میں کیا لطف ہے اگر تمہارے خیال دین کی نسبت اچھے رہتے تو تم حقیقت میں بڑے کام کے آدمی تھے لیکن ہم لوگوں کی بدنصیبی ہے کہ تم سے لوگ یوں بگڑے جاتے ہیں۔ والسلام علے من اتبع الھدیٰ۔ فقط

اگر آپ تہذیب الاخلاق میں اس خط کا جواب چھپوادینگے تو میری نظر سے گذر جاویگا ۔

راقم
مظہر الحق

مخدومی مدظلہم

سلامے چو الفاظ تو درفشاں
سلامے چو اخلاق تو مشکبو

عرض کرتا ہوں قبول ہو۔ میں نے آپ کا خط پایا۔ مشکور ہوا۔ آپ کا شکر کیا۔ سبحان اللہ کیا خوب خط لکھا ہے جس کے ہر فقرہ پر دل قربان ہوا جاتا ہے ۔

خلعت ے بینم وگرد سوادِ نامہ سے گردم
فدائے جنبش آن دست وطرز خامہ سے گردم

آپ نے جو نصیحت مذہبی تحریروں سے باز رکھنے کی فرمائی سب سے دل میں اُس کا شکر کرتا ہوں مگر افسوس ہے کہ آپ کی اس آرزو کو پوری نہیں کر سکتا میں نے قرآن مجید میں پڑھا ہے « تطع الملکن بلین و دوالوتدھن فیدھنون۔ اس لئے عزت کی خواہش اور مسلمانوں کی دلجوئی اور طعن و ملامت سے بچانے کی آرزو مجھے سچ کہنے اور حق لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ نہ مداہنت کرکے جھوٹی تعریف کی تمنا میرے دل میں پیدا ہوسکتی ہے ۔

بر و بکارِ خود اے واعظ ایں چہ فریاد است
مرا فتاد دل از رہ ترا چہ افتاد است
بکام تا نرساند مرا لبش چوں نے
نصیحت ہمہ عالم بگوش من باد است

آپ لکھتے ہیں کہ رات تاریک اور راہ باریک تیزی سے چلنا اچھا نہیں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ رات تاریک ہے اور راہ باریک۔ لوگوں کو ٹھوکریں کھاتا اور منہ کے بل گرتا بھی دیکھتا ہوں اسی واسطے روشنی دکھانے کے لئے جلدی کرتا ہوں تاکہ خدا کے کلام کی روشنی پھیلے اور تاریکی جاتی رہے۔ ڈر تو اس وقت ہوتا کہ بے روشنی کے چلتا۔ پس بھائی میرے۔ اندھاری رات اور تنگ راہ میں بے روشنی کے چلنا دانشمندی سے بعید ہے نہ روشنی دکھانے کے لئے تیزی کرنا۔

آپ لکھتے ہیں کہ تم بارہ سو برس کی عمارت کو گرانا اور اسلام کی تصویر کو مٹانا چاہتے ہو۔ یہ آپ کی لطیفہ گوئی ہے جس کو سُنکر آپ کی سی طبیعت والے چند لحظہ قاہ قاہ ہنسینگے۔ مگر نہ میں بارہ سو برس کی عمارت کو گراتا ہوں نہ اسلام کی تصویر کو مٹاتا بلکہ ان بوسیدہ دیواروں اور بدنما جھونپڑیوں کو جو خدا کے گھر کے ارد گرد لوگوں نے ڈال رکھے ہیں اور جس کے سبب سے خدائی بنائی عمارت کی خوبی چھپ گئی ہے گرانے کی آرزو رکھتا ہوں اور ان تصویروں کو جو لوگوں نے بنا رکھی ہیں مٹانا چاہتا ہوں۔ آپ ہی فرماویں کہ یہ تصویریں جن کی آپ پرستش کر رہے ہیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں یا آپ کو خدا تک پہنچا سکتی ہیں۔ آخر بتائیے تو یہ کیا ہیں ماھذہ التماثیل التی انتم لہا عاکفون۔ اگر یہ تصویریں خدا کی بنائی ہوئی نہیں ہیں تو آپ کیوں اُن کو بغل میں لئے پھرتے ہو اور کیوں اسلام کی اصلی تصویر کو مٹاتے ہو کیوں ان بدنما مورتوں سے اپنے دل کے کعبہ کو بتکدہ بنا رکھا ہے۔ مالکم کیف تصنعون۔

پھر آپ لکھتے ہیں کہ میں کسی کو متقدمین میں سے اسلام سے واقف نہیں جانتا۔ یہ آپ کی غلطی ہے میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں اسلام کی خوبیوں کے ظاہر کرنے والے نہ گذرے ہوں اور جنہوں نے تقلیدی اسلام کو بُرا نہ کہا ہو۔ اسی واسطے میں اس بات پر آمادہ ہوا ہوں کہ آپ لوگوں کو دکھاؤں کہ کتنے لوگ اسلام کی حقیقت جاننے والے گذرے ہیں اور تقلیدی علماء نے اُن کی باتوں کو ویسا ہی چھپا رکھا ہے جیسا کہ ابر آفتاب کو چھپا دیتا ہے۔

آپ کا یہ خیال کہ عربی عمامہ اور اونچے ٹخنے کا پائجامہ خلایق سے مطلب نکلنے کا وسیلہ

ہے سچ ہے مگر فریب و دغا سے دنیا کمانے کے لئے نہ سچائی وصفائی سے دین کی باتوں کو پھیلانے کے واسطے خیال شیطانی و دعوئے مسلمانی - افسوس برین مسلمانی ۔

آپ نے ایک ظرافت کے ساتھ اصحاب کے بُرا کہتے سلف صالح کو اچھا نہ جاننے وغیرہ باتوں کو میری طرف منسوب کیا ہے اس لئے مجھے بہ مجبوری کہنا پڑا کہ انا بریٔ مما تقولون حاشا وکلا - کہ میں اصحاب کو بُرا کہتا ہوں یا سلف صالح کو اچھا نہ جانتا ہوں ۔ میں ان کو بزرگان دین اور پیشوایان اسلام سمجھتا ہوں - ہاں تمہاری طرح ان کو معصوم و رسول نہیں سمجھتا ہوں - سوائے اس بات کے کہ باقی ان کی بزرگی اور پاکی کا ویسا ہی مجھے اقرار ہے جیسا کہ تھا ؎

گوہر مخزن اسرار ہماں است کہ بود !

حقۂ مہر بداں مُہر و نشاں است کہ بود !

از صبا پُرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح

بوئے زلف تو ہماں مونس جاں است کہ بود !

شیطان کے وجود کی نسبت جو آپ نے لکھا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے میں تو اس کے وجود خارج عن الانسان ہونے سے منکر نہیں سید صاحب گو اس سے منکر ہیں مگر اس کے وجود حقیقی و اصل ہونے سے اور اس کی شیطنت اور اغوا کی تاثیرات سے منکر نہیں پھر ایسی تاویل کرنے والے کو کیا کوئی کافر کہہ سکتا ہے - اگر آپ رسالہ تسویہ[۱] جو عربی میں ہے اور اس کی شرح جو ملا عبدالحلیم نے لکھی ہے ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اور لوگ بھی وجود خارجی شیطان سے منکر ہو چکے ہیں جن کو نہ کسی نے کافر ٹھہرایا نہ مرتد ۔

شق القمر کے انکار پر کفر کا اطلاق کرنا اُس وقت زیبا ہے جبکہ آپ اُس معجزے کو متفق علیہ قرار دیں حالانکہ جب بعض مفسرین اُس سے منکر ہیں اور بعض محققین بہ دلائل اس کا انکار کرتے ہیں تو شاید آپ کو اس تیزی سے کفر کا کلمہ زبان پر لانا مناسب نہ ہوگا تفہیمات الٰہیہ میں مولوی شاہ عبدالعزیز رح کے والد نے صاف انکار کیا ہے اور لکھدیا ہے کہ عندی تالیست من المعجزات حدیثیں جو حضرت ابن عباس سے اس بات میں ہیں اُس پر بھی جرح ہو چکی ہے کہ وہ اس وقت تک پیدا ہی نہ ہوئے تھے - حضرت انس رض کی حدیثوں پر بھی یہی قدح ہو چکی ہے کہ وہ مدینہ میں چار برس کے تھے پس جبکہ علما میں بحث اس کے منصوص و متواتر ہونے پر ہو رہی ہے تو کفر کا اطلاق کرنا اس کے انکار پر تحقیق سے بے خبری پر دلیل ہے اجماع کو نہ ماننے کو کفر جاننا

---

[۱] اگر نواب صاحب اس رسالہ کی کچھ عبارت جسقدر کہ مناسب تھی نقل کر دیتے تو خالی از لطف نہ ہوتا - احمد مخدوم -

نادانی ہے۔ ذرا آپ امام احمدؒ کا یہ قول تو مسلم الثبوت میں ملاحظہ فرمایئے کہ من ادعی الاجماع فھو کاذب کہ جس نے اجماع کا دعوےٰ کیا وہ جھوٹا ہے اور کسی غیر منصوص مسئلہ میں اجماع اصطلاحی کا دعوےٰ تو ثابت کر دکھایئے وانیٰ لکم ھذا۔ افسوس ان کی سمجھ پر جو چند آدمیوں کی سمجھ کو ایسا قوی جانیں کہ اُس کے نہ ماننے کو کفر سمجھیں ؎

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی نسبت جو آپ نے ایک نامناسب لفظ لکھا ہے۔ غالباً آپ کو افسوس ہوگا جبکہ آپ ترمذی شریف کو ملاحظہ کرینگے کیونکہ اُس کے دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ خود پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے ثبوت اس کا ہے چنانچہ بال قائماً صاف موجود ہے اور پھر محدث موصوف نے اس کی اباحت اکثر محدثین اور عالموں سے منسوب کی ہے یقیناً آپ کو بڑی شرم ہوگی جبکہ آپ کو ان باتوں کا علم ہوگا اور آپ خیال کرینگے کہ جو کلمہ آپ نے لکھا ہے اُس کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے اسی لئے عاقل کو چاہیئے کہ بعد تحقیقات اور علم حاصل کرنے کے زبان سے کوئی بات نکالے تاکہ افسوس و ندامت نہ ہو۔ آپ نے مجھے یہ بھی نصیحت کی ہے کہ یا تو مسلمانوں کے سے عقیدے رکھو یا اسلام چھوڑ دینے کا اشتہار دو۔ سو میں اگر اسلام کو ویسا ہی سمجھتا جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں تو ضرور اُس کے چھوڑنے کا اشتہار دیتا مگر جبکہ اصلی اسلام کی سچائی سے میرا دل بھرا ہوا ہے تو اس کے اظہار کا اشتہار دیتا ہوں اور وہی اسلام کا چھوڑنا چاہتا ہوں ؎

میں نے مانا کہ آپ مجھے فاسد الاعتقاد جانتے ہیں اور تسلیم کیا کہ اور لوگ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر مجھے تو یقین ہے کہ میں سچا اور پکا مسلمان ہوں علےٰ بصیرۃ من ربی جس دن دلوں کے بھید کھلینگے جو کچھ ہمارے تمہارے دل میں ہے سب کھل جائیگا اگر آپ کا اسلام آپ کو حوروں کے بوس و کنار کا مزہ دیگا جس کی تمنا میں بدن توڑتے اور بھوکے رہتے ہو تو خیر ہم کو بھی امید ہے کہ ہمارا الحاد ہم کو خدا تک پہنچا دیگا جس کے لئے ہم گالیاں کھاتے ہیں طعنے سنتے ہیں اور کافر و ملحد بنے ہیں اور جس کے شوق میں نہ موتیوں کے مکان کی آرزو ہے نہ شہد دودھ کی نہروں کی تمنا نہ حوران ماہوش کے وصال کا خیال ہے نہ سہی قدان پری پیکر کے آغوش میں لینے کی خواہش ؎

بسوزِ سینہ جنت را بسوزم
بآبِ دیدہ آتش را دہم نم

آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ نہ محتسب ہے جس کے درہ کا خوف ہو۔ نہ قاضی جس کے فتوے سے دار کا ڈر ہو بلاشک سچ لکھا ہے لیکن کیا آپ کے جگر خراش طعنے محتسب کے درہ سے اور آپ کی دلسوز ملامتیں دار کے کھینچنے سے کم ہیں ؎

آنچہ زخم زباں کند با مرد
زخم شمشیر جانستاں نکند

پس جبکہ ہمارا جوش وولولہ اس خوف سے کم نہ ہوا اور ہمارے دل کی شعلہ زن آگ آپ کی ملامت نہ بجھا سکی تو محتسب کا دُرّہ کیا کرتا اور قاضی کے فتوے سے کیا ہوتا اگر دار پر بھی کھینچے جاتے تو یہی کہتے کہ ؎

بجرم عشق توام مے کشند غوغائیست
تو نیز برسر بام آکہ خوش تماشائیست

آپ نے مدرسۃ العلوم کی نسبت جو لکھا اُس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی بلاشبہ لکھنؤ کے اخبار الاخیار نے ہماری فریب دہی ثابت کردی۔ اگرچہ اخبار نے بھی ہم کو ملحد ٹھہرایا۔ اور مدرسۃ العلوم کا چندہ بند ہوگیا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ یہ سُنکر مر نہ جاویں کہ قریب اسی ہزار کے چندہ ہوچکا ہے اور ابتدائی مدرسوں کے تقرر کے لئے جابجا سے درخواستیں چلی آتی ہیں اور اب چند روز میں شاخیں اُن مدارس ابتدائی کی جو رشتہ مدرسۃ العلوم کی ہیں جابجا قائم ہوا چاہتی ہیں۔ ہاں ایک بات کا مجھے بھی افسوس ہے کہ مدرسۂ یانیہ کی سی تعلیم ان الحادی مدرسوں میں نہ ہوگی۔ وہ عاقلانہ خیالات جو اس تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں اِن مدرسوں کے تعلیم یافتہ آدمیوں کو نہ ہونگے۔ ہیں نے ابھی تھوڑے دن ہوئے مدرسہ ایانیہ کے اخبار میں ایک بڑے مفتی و مجتہد علامی فہامی کا محققانہ قول دیکھا تھا کہ اُنھوں نے بُوم یعنی اُلّو کی نسبت لکھا تھا کہ اخبار صحیحہ سے ثابت ہے کہ بُوم اول بستی میں رہتا تھا جب سے امام علیہ السلام شہید ہوئے اُس نے ویرانہ میں رہنا اختیار کیا۔ دن کو روزہ رکھتا ہے شام کو قوت مالا یموت پر افطار کرتا ہے رات بھر امام کے غم میں مرثیہ پڑھتا ہے نعوذ باللہ من ھذہ الھفوات ؛

پس ایسے عالی دماغوں کے دلوں پر ہمارے مدرسۃ العلوم کے مقرر ہونے کا داغ کیوں نہ ہو اس لئے کہ ایسے نازک خیال والے اس تعلیم کے بعد کہاں دکھائی دینگے۔ اور ایسے اُلّو کی حقیقت بتانے والے کہاں باقی رہینگے۔ اگرچہ اخبار نے بھی اپنی محبت اسلامی کے ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا ایسے لوگوں کے حق میں سوائے یالیت قومی یعلمون کے اور کیا کہا جاوے افسوس ان مسلمانوں پر کہ آنکھ رکھتے ہوں اور نہ دیکھیں۔ کان بھی ہوں مگر کچھ نہ سنیں دل بھی پہلو میں ہو مگر کچھ نہ سوچیں ؎

چشم بازو گوش باز ایں ذکا
خیرہ ام در چشم بندئ خدا

مسجد میں جوتا پہنے نماز پڑھنا

چند روز ہوئے کہ تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون تہذیب الایمان سے چھاپا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ جوتا پہنے ہوئے مسجد میں جانا اور جوتا پہنے ہوئے نماز پڑھنا صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو ابھی تشفی نہیں ہوئی! اور وہ بدستور اُن لوگوں پر طعنہ کرتے ہیں جو کبھی کبھی جوتا پہنے ہوئے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اور جوتا پہنے ہوئے مسجد میں جانے کو تو ایک قیامت جانتے ہیں اس لئے ہم ان کی تشفی کے لئے متعدد روائتیں اہل سنت و جماعت کی معتبر کتابوں سے لکھتے ہیں جس سے بخوبی ثابت ہے کہ جوتا پہنے مسجد میں جانا اور جوتا پہنے نماز پڑھنا سنت ہے۔ اور جو شخص اُن لوگوں پر طعنہ کرتا ہے جو جوتا پہنے نماز پڑھ لیتے ہیں وہ گنہگار ہوتا ہے۔ کیونکہ عادت جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے جوتا پہنے نماز پڑھنا اور مسجد میں جانا ثابت ہے۔

ابن عدی اور ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے جوتا کو زینت نماز فرمایا ہے اور اُسے پہن کر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے کما مرّ ی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خذوا زینۃ الصلوٰۃ قالوا وما زینۃ الصلوٰۃ؟ قال البسوا نعالکم فصلوا فیہا عقیلی اور ابو الشیخ اور ابن مردویہ اور ابن عساکر نے حضرت انس سے روایت کی ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قول اللہ عز وجل خذوا زینتکم عند کل مسجد ای صلوا فی نعالکم یعنی پیغمبر خدا کے اس قول میں کہ زینت سے ہر مسجد میں جایا کرو یہ فرمایا ہے کہ جوتا پہن کر نماز پڑھا کرو۔ ابن مردویہ نے مرفوعًا یہ روایت کی ہے کہ مما اکرم اللہ بہ ھذہ الامۃ لبس نعالھم فی صلواتھم کہ منجملہ ان باتوں کے جو خدا نے اِس امت کی بزرگی کے لئے دی ہیں جوتا پہنکر نماز پڑھنا ہے ابو داؤد اور حاکم نے شداد ابن اوس سے یہ حدیث روایت کی کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خالفوا الیھود فانھم لا یصلون فی خفافھم ولا فی نعالھم کہ مخالفت کرو یہود کی کہ وہ موزہ اور جوتا پہنکر نماز نہیں پڑھتے۔ اور بیہقی اور ابن حبان اور طبرانی۔ نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے بخاری نے انس سے روایت کی ہے۔ کہ اُن سے کسی نے پوچھا کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم جوتا پہنکر نماز پڑھتے تھے انہوں نے کہا ہاں۔

اور مسلم اور نسائی اور ترمذی نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے
بعض علمار نے ان احادیث سے ثابت کیا ہے کہ جوتا پہن کر نماز پڑھنے کی عادت معمولی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تھی جیسا کہ فتح المتعال میں لکھا ہے واما صلواتہ علیہ الصلواۃ والسلام فی نعلیہ فالظاھر انہ کان فی المسجد فان فی الصحیحین وغیرھما عن سعید بن یزید قال سالت انس بن مالک کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی نعلیہ فقال نعم وظاھر ان ھذا کان شانہ وعادتہ المستمرۃ دائما۔ کہ مسجد میں جوتا پہن کر نماز پڑھنے کی آپ کو مدامی عادت تھی ؛
حنبلی اسی وجہ سے جوتا پہن کر نماز پڑھنے کو سنت کہتے ہیں جیسا کہ ردالمختار میں لکھا ہے کہ واخذ جمع من الحنابلۃ انہ سنۃ ؛
بعض لوگ یہ فرماتے ہیں کہ جو جوتا پہن کر سڑکوں اور گلی کوچوں میں پھرتے ہیں اس کو مسجد میں لیجانا اور نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ وہ جوتا مسجد میں لیجانا جائز ہے جس کے اوپر ایک اور جوتا یا موزہ یا کوئی چیز ہوتا کہ جوتا نجاست سے محفوظ رہے۔ مگر یہ غلطی ہے جیسا کہ رد المختار میں لکھا ہے ولو کان یمشی بھا فی الشوارع لان النبی صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ کانوا یمشون بھا فی طرق المدینۃ ثم یصلون فیھا یعنی اسی جوتا کو جسے پہنکر سڑکوں اور راہوں پر چلتے ہیں نماز پڑھنا جائز ہے اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ کی گلیوں میں جوتا پہنے پھرتے تھے اور اسی سے نماز پڑھتے تھے ؛
ابو داؤد و ابن حبان اور حاکم اور عبد بن حمید اور اسحاق ابن راہویہ اور ابو یعلی موصلی نے ابن سعید جزری سے روایت کی ہے کہ حضرت نے نماز میں جوتا اتار ڈالا تو صحابہ نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے حضرت نے بعد نماز کے صحابہ سے پوچھا کہ جوتے کیوں اتار ڈالے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپ کی تقلید کی تب فرمایا کہ مجھے جبرئیل نے خبر دی کہ میرے جوتوں میں نجاست لگی ہوئی ہے اس لئے میں نے اتار ڈالے اور یہ فرمایا کہ تم مسجد میں آنے وقت اپنے جوتوں کو دیکھ لو۔ اگر کچھ نجاست لگی ہو تو پونچھ ڈالو اور جوتا پہن کر نماز پڑھو الفاظ ابو داؤد کے یہ ہیں۔ ثم قال اذا جاء احدکم المسجد فلینظر فان رای فی نعلیہ قذرا او اذی فلیمسحہ ولیصل فیھا ؛
اگلوں میں سے بھی بعض خیالی ادب کرنے والے ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اس فعل کو مکروہ جانا۔ مگر علمار نے اُن کے قول کو رد کیا جیسا کہ علامہ مصری نے فتح المتعال میں لکھا ہے الذی یترجح ھو انہ لا وجہ للکراھۃ الصلوۃ فیھا المثبوت نعل ذالک من اصحاب

الشرح واما الافضلیۃ فان اراد بہ اقتداء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فنعم والا فھو فعل مباح من الرخص الشرعیۃ ھذا ھو الذی علیہ المحققون من الفقہاء والمحدثین۔ کہ قول راجح یہ ہے کہ کوئی وجہ جوتا پہن کر نماز پڑھنے میں کراہت کی نہیں ہے اس لئے کہ صاحب شرع سے یہ فعل ثابت ہے۔ باقی رہی افضلیت پس اگر جوتا پہنکر نماز پڑھنے سے مقصود پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا اقتدا ہے تو بلاشبہ جوتا پہنکر نماز پڑھنا افضل ہے ورنہ یہ فعل مباح ہے منجملہ مباحات شرعیہ کے اور یہی قول منصوص ہے محققین فقہا اور محدثین کا۔

لوگ تعجب کرینگے کہ جوتا میں نجاست لگی رہتی ہے تو نجس چیز کو مسجد میں لیجانا یا اُس سے نماز پڑھنا کیونکر جائز ہوگا۔ مگر اُن کو چاہیئے کہ اپنے ہی محدثین کی روایت کی ہوئی حدیثوں کو دیکھیں اور ہم سے نہ پوچھیں۔ کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ اگر جوتا میں کچھ نجاست بھر جاوے تو رگڑ جانا اور مٹی سے مل دینا ہی اُس کی طہارت ہے۔ جیساکہ ابوداؤد نے روایت کی ہے اذا وطی احدکم بخفیہ فطھورھما التراب اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ اذا وطی احدکم بنعلیہ فان التراب لہ طھور ابوداؤد نے رُوایت کی ہے کہ ایک عورت نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ ہم جس راہ سے مسجد کو آتے ہیں وہ راہ نجس اور غلیظ رہتی ہے۔ تو جب پانی برسے تو ہم کیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا نجاست کے بعد صاف جگہ نہیں ملتی۔ اُس نے کہا کہ کیوں نہیں تو آپ نے فرمایا کہ ھذہ بھذہ یعنی پس جگہ صاف پر قدم رکھنا نجس جگہ کی نجاست دُور کرنے کے لئے کافی ہے۔

حافظ ابوزرعہ عراقی شافعی نے بھی ایسا ہی فتویٰ دیا ہے۔

بعض فقہا نے لکھا ہے کہ جو نجاست ایسی ہو کہ جس کا جرم نہ ہو مثل پیشاب و شراب کے اگر وہ جوتا میں لگ جاوے تو بے دھوئے پاک نہیں ہوتی۔ مگر یہ ان کی خیالی طہارت ہے۔ نہ مطابق حدیث کے۔ کیونکہ مٹی سے رگڑ دینا اُس کی پاکی کے لئے کافی ہے اور یہ مسئلہ فقہا کا خود امام ابوحنیفہ صاحب و قاضی ابویوسف کے فتوے کے خلاف ہے۔ جیساکہ قاضی ابوعلی نسفی نے امام ابوبکر محمد بن فضل سے روایت کی ہے کہ انہ قال اذا اصاب نعلیہ بول وخمر ثم مشی علی التراب او الرمل حتی لزق بہ بعض التراب وجف ثم مسحہ بالارض یطھر عند ابی حنیفۃ وھکذا ذکرہ الفقیہ ابوجعفر عنہ وعن ابی یوسف مثل ذلک الا انہ لم یشترط الجفاف انھوں نے فتویٰ دیا ہے کہ اگر جوتا میں شراب یا پیشاب لگ جاوے پھر مٹی پر چلے یا ریت پر اور کچھ مٹی یا ریت جوتا میں لگ جاوے اور خشک ہو جاوے اور پھر پونچھ ڈالی جاوے تو پس جوتا پاک ہو گیا۔ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک

اور ابو جعفرؒ نے بھی امام ابو حنیفہؒ سے اس مسئلہ کو منقول کیا ہے اور قاضی ابو یوسفؒ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے مگر انہوں نے خشک ہو جانے کی شرط نہیں کی ۔

بعضے آدمی فاخلع نعلیک کے حوالہ سے جوتا اُتارنے کو ادب تصور کرتے ہیں اور اگلے لوگوں میں سے بھی بعض نے ایسا شبہ کیا تھا مگر شکر خدا کا ہے کہ اگلے ہی عالموں نے اُس کی سخافت ظاہر کر دی جیسا کہ فتح المتعال میں ہے ان امر خلع النعل لموسیٰ لا دلالۃ له علی کراھۃ دخول المسجد متنعلا ولو دل علیه بالفرض فلا یصح لنا لوجود ما ینسخه فی شریعتنا ومن ھنا ظھر سخافۃ ما فی منیۃ المصلی ۔

یہ سب حدیثیں اور روایتیں جن کو ماننا مقلدین پر فرض ہے کیونکہ اُنہیں کے معبود عالموں نے نہ صرف روایت کی ہیں بلکہ اُن پر فتوے دیا ہے ایک طرف رہیں گی اور ہمارے ہندوستان کے مسلمان تو یہ تو بہت کم مسلمان اپنی ہی رسم پر چلیں گے نہ خدا کی سنیں گے نہ رسولؐ کی۔ اس لئے اُن کا دین اور دین کا ادب خیالی ہے اور رسمی۔ نہ حقیقی ہے اور نہ شرعی ۔

التماس

بخدمت حضرت کاشف الغطا و کشاف حقیقت

چند پرچے اخبار نور الانوار کے جن میں میرا حال یا میری بعض تحریروں کا جواب تھا۔ میرے پاس پہنچے معلوم نہیں کہ یہ عنایت اڈیٹر صاحب کی ہے یا مہربانی ان کے کارسپانڈنٹ کی بہرحال میں دونوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں خصوصاً اُن تہذیب بھرے فقروں کا جن سے اُن کی طینت کی پاکی ایسی ہی ظاہر ہوتی ہے جیسے آئینہ سے عکس۔ غالباً اُن کے بھیجنے سے ہمارا آگاہ کرنا ہے کہ تمام مسلمانوں کو ہماری تحریروں پر توجہ اور ہمارے حال پر مہربانی کی نگاہ ہے اور یقیناً یہ بھی مقصود ہوگا کہ اُس کا کچھ جواب دیا جاوے مگر جہاں تک اُن تحریرات کو ہمارے ذاتی خیالات سے تعلق ہے اُس کا جواب شکر ہے کیونکہ جس قدر برائیاں ہم میں ہیں اُن میں سے تو کچھ بھی بیان نہیں کیں۔ باقی جس قدر دارالعلوم اور تہذیب الاخلاق سے متعلق ہیں وہ ہماری دلی خوشی کا سبب ہیں۔ اُن تحریرات سے اندازہ اُس قوت اور

مضبوطی کا ہوتا ہے جو ہماری راویوں کو بہ نسبت مسلمانوں کی موجودہ حالت اور ان کی تعلیم و تربیت کے ہے اور جن کے سبب سے ہم کو اُن میں ایک عظیم تبدیلی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے جس شخص نے ان تحریرات کو دیکھا ہوگا وہ ضرور اُس رائے کو تصدیق کرے گا جو انڈین ایزرور نے نسبت مسلمانوں کے دی ہے ؞

ہم نے وہ فتوے بھی دیکھے جو لکھنو کے مولوی صاحبوں نے نسبت دارالعلوم کے لکھے ہیں مگر افسوس ہے کہ اُس پر اتنے دستخط اب تک نہیں ہوئے جتنے کہ ہندی کے دفتر ہوجانے اور فارسی کے اُٹھ جانے کی نسبت ہوچکے ہیں۔ کیا ان مولوی صاحبوں سے اس سے زیادہ اور کسی فتوے کی امید تھی۔ ہمارا رونا تو اسی موجودہ حالت کے دیکھنے پر ہے۔ اور دارالعلوم کی تجویز ایسے ہی تنگ و تاریک خیالات کے مٹانے کے واسطے ہے کیا کوئی دانشمند منصف آدمی ان فتووں کو بھی دیکھ کر مسلمانوں کے حال پر آٹھ آٹھ آنسو ولسے نہ رووئیگا ؞

ہم نے وہ اشتہار بھی دیکھا جو پرچہ نورالآفاق لرفع اہل النفاق کے جاری کرنے کی غرض سے مشتہر کیا گیا ہے۔ اس اشتہار نے ہم کو خوش کیا اور بہت خوش کیا۔ کیونکہ اُس کا صرف اُس الحاد کے روکنے کے لئے جاری کیا جانا مقصود ہے جو تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے پھیلتا جاتا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اچھے تربیت یافتہ عالم اس کی مدد کرینگے اور اپنے علم کے جوہر دکھا دینگے اور ہمارے الحادی پرچہ کو بھی اُس سے فائدہ ہوگا۔ کیونکہ پھول کی خوبی اُس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی خار اُس کے پہلو میں نہ ہو ؞

اب میں اپنے پرانے دوست کاشف الغطا اور اپنے نئے مہربان کشاف حقیقت سے نہایت دلی درد سے ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے دل کو نرم کرلیں اور چند لحہ کے واسطے منصف بن جاویں ؎

سر کنم شکوہ اگر تاب شنیدن داری
سینۂ تنگ غم اگر طاقت دیدن داری

اے حضرات جامعان فضل و کمال۔ اگر آپ کو اپنی تحریروں سے صرف تھوڑی دیر کے لئے دل خوش کرنا اور چند لحظہ کے لئے مجلس کو گرم کرنا ہے تو خیر ہم منع نہیں کرتے آپ کی خوشی کو روک نہیں سکتے۔ آپ شوق سے ذاتی عیوب لوگوں کے کھولئے اور رشک سودا بنئے لیکن اگر اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی مقصود ہے اور تہذیب الاخلاق یا دارالعلوم سے

مذہبی یا اخلاقی یا اور کسی قسم کی خرابیوں کا خیال ہے تو نہایت خوبی کی بات ہے کہ آپ اس پر بحث فرمایئے مگر قبل مخالفت کے مخالفت کا وہ مضمون جو تہذیب الاخلاق میں چھپا ہے۔ کسی وقت کا وظیفہ چھوڑ کر غور سے پڑھ لیجئے کیونکہ میں نہایت افسوس سے کہتا ہوں کہ ہنوز آپ لوگوں کو مخالفت کرنی بھی نہیں آتی ؛

آپ یقین کیجئے کہ ہم آپ کی مخالفانہ تحریروں کو بہت غور سے پڑھینگے اور نہایت انصاف سے دیکھیں گے۔ اور اور لوگوں کو بھی ہماری رایوں کا آپ کی تحریروں سے مقابلہ کرنے کا عمدہ ذریعہ ملیگا ؛

غالباً آپ اسے تسلیم کرینگے کہ عموماً لوگوں نے مجادلہ اور مکابرہ کو مباحثہ سمجھ رکھا ہے اور بجائے تحقیق حق کے مخالف پر الزام اور تہمت لگانے اور ان کی تمام باتوں کو غلط اور باطل ٹھہرانے کو مایۂ ناز ٹھہرا لیا ہے صدہا کتابیں شیعوں نے سنیوں کے رد میں ہزارہا رسالے سنیوں نے شیعوں کے جواب میں لکھ ڈالے مگر یہی غلط خیال دونوں کو تحقیق حق یا تسلیم حق کا مانع رہا۔ آخر سب و شتم کی وہ نوبت پہنچی کہ مذہب بھی اُن گالی دینے والوں پر لعنت کرتا ہوگا۔ پس جب تک یہ خیال آپ لوگ اپنے دل سے نہ نکال ڈالینگے بجائے فائدہ کے خود اپنی قوم کا آپ نقصان کرینگے ؛

میں تسلیم کرتا ہوں کہ بلاشبہ تہذیب الاخلاق نے بڑی تبدیلی خیالات میں پیدا کی ہے اور ایک ایسا انقلاب پیدا کرنے کا سامان جمع کر دیا ہے جو پہلے سے کبھی کسی کے خیال میں بھی نہ تھا۔ اور دار العلوم کی تجویز بھی ایک نئی دنیا قائم کرنے کی تجویز ہے جس کا نقشہ عموماً مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ مگر دیکھنا چاہئے کہ اُس کا اثر کیا اور کیسا مسلمانوں پر ہوگا ؛

تہذیب الاخلاق کا اثر ظاہر ہے کہ اُس نے اپنی پُر زور فصیح تحریروں سے ایک طرف تو غیر قوموں کو دکھا دیا کہ اسلام اُس پست اور تاریکی کی حالت میں نہیں ہے جو وہ خیال کرتے تھے بلکہ وہ ایک روشن آفتاب ہے جو سیاہ بدلیوں میں چھپا ہوا تھا دوسری طرف مسلمانوں کو ہوشیار کر دیا کہ وہ اُس گہرے عمیق تاریک بے تھاہ گڑھے کے کنارے آگئے ہیں جس میں گرنے سے جان کا اندیشہ ہے ؛

ہاں اُس نے ایک اُن مردہ دلوں میں ایک کھلبلی ڈال دی ہے جن کو لوگ زندہ جانتے تھے اور اُن طبیعتوں میں ایک شور پیدا کر دیا ہے جن میں کسی قسم کی تحریک کی قوت باقی نہ تھی۔ اُس نے رسم تقلید تعصب ساری بُرائیوں کے کھودنے کی بھی جڑ قائم کر دی ہے۔ اُس نے لوگوں کے خیالات میں بھی ایک تبدیلی پیدا کرنے کی راہ نکالی ہے اور جہانتک خیال کیا

جاوے مقصود اُس کا مسلمانوں کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں ؂

اگر آپ کو اُس کے بعض یا کُل مضمون مضر معلوم ہوں اُن سے علمی اخلاقی مذہبی بُرائی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اُس کی غلطیاں بتایئے اور اصلاح کیجئے ؎

دلِ ما شاد و چشمِ ما روشن

اگر آپ کو اُس کے مذہبی مضامین سے رنج ہوتا ہو جیسے ہم بھی جانتے ہیں کہ ضرور رنج ہوتا ہوگا مگر ذرا انصاف کیجئے اور ہم کو بتا دیجئے کہ وہ کونسا مذہبی مضمون لکھا گیا ہے جو کتاب و سنت سے مدلل نہ ہو اور جس کو نہایت مضبوط دلیلوں سے ثابت نہ کیا ہو اور جس میں بڑے بڑے عالموں محققوں کے قول کی سند پیش نہ کی گئی ہو۔اب رہا یہ امر کہ من حیث المجموع کل یا بالبعض مضامین میں غلطی ہی ہوئی ہو تو کیا اس سے اکیلے ہم کافر ہو سکتے ہیں۔بلا شبہ قبل اس کے کہ آپ کا کفر کا فتوے ہم تک پہنچے اُن پر ہم سے پہلے پہنچیگا جو ہم سے پہلے ہمارا ساتھ دے گئے ہیں ؂

آپ یقین فرماویں کہ ہم کو ہرگز منظور نہ تھا اور نہ ہے کہ ہم مذہبی مضامین اس پرچہ میں لکھیں مگر کیا کیجئے ؎

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

ہر امر میں معاشرت کی۔تمدن کی تعلیم کی۔تربیت کی مذہبی مزاحمت ہوتی ہے اور اس لئے اس کی تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے اور مجبوری اُن غلطیوں کا جن سے اصل مذہب پر الزام آتا ہے ظاہر کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی اب نہایت لاچار ہو کر میں یہ لکھتا ہوں کہ موجودہ حالت مذہب کی قوی مانع ہر قسم کی ترقیات کی ہے اور اسے میں ثابت کرتا ہوں ؂

مسلمان خیال کرتے ہیں کہ مذہب کی رو سے کافروں سے محبت کرنا اختلاط رکھنا منع ہے میں خیال کرتا ہوں اگر یہ سچا مسئلہ شریعت کا ہے تو مسلمانوں کو چارہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ یا تو اُن سے جزیرہ انڈمان بھرا جاوے یا وہ شمالی افریقہ کے حصہ کو جا کر آباد کریں کیونکہ وہ کسی ہندو سے صاف نہیں مل سکتے۔وہ کسی انگریز کو اچھا جان نہیں سکتے وہ اُن سے صاف طینتی اور سچائی اور محبت سے اختلاط و ارتباط نہیں رکھ سکتے تو پھر وہ اُن ملکوں میں جہاں غیر قوموں کے اختلاط و ارتباط بغیر ایک دن زندگی کی کوئی ادنے ضرورت بھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکر رہ سکتے ہیں اُس حالت میں وہ اپنے مذہب پر بھی قائم رہیں ؂

اب میں زمانہ گذشتہ اور زمانہ حال پر نظر کرتا ہوں کہ مسلمانوں نے اس کی نسبت کیا خیال کیا اور کیسا برتاو اکیا۔ سو اول میں اپنے ہادی اور ساری دنیا کے ہادی روحی فداہ کا یہ معاملہ دیکھتا ہوں کہ جب نجاشی کے ایلچی آئے جن کا مذہب رومن کیتھلک تھا تو آپ نے خود اُن کی خدمت کی اور صحابہ کی درخواست پر فرمایا کہ انہوں نے میرے یاروں کی خدمت کی تھی میں اسکی تلافی چاہتا ہوں خاص مسجد نبوی میں رومن کیتھلک عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ کیا یہ وہی برتاؤ ہے جو مسلمان نسبت غیر مذہب والوں کے از روئے اپنے مذہب کے خیال کرتے ہیں پھر حال کے زمانہ پر نظر کرتا ہوں تو سلطان روم کو مع علما و فضلا کے پیرس شاہنشاہ نپولین کے ساتھ ایک میز پر بیٹھا ہوا کھانا کھاتے اور مکہ معظمہ اور رعیت سلطنت کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے پاتا ہوں کیا یہ لوگ کافر نہیں ہیں۔ اگر مسلمان ہوتے تو شاہ بخارا یا خان خیوا کی طرح اپنے وحشیانہ برتاؤ سے ساری دنیا میں روسیاہ ہوتے مسلمانوں کو آدمیت اور انسانیت سے کیا علاقہ۔ اُن کو کسی کے اختلاط اور ارتباط سے کیا سروکار۔

ان حالات پر بھی ہم نظر نہیں کرتے کیونکہ اگلی حالتوں کو صدہا برس گذر گئے۔ کون جانے کیا سچ ہے کیا غلط۔ روم میں بھی جو ہزارہا کوس دُور ہے اللہ کو خبر ہے کہ یہ معاملہ صحیح ہے یا جھوٹ۔ ہم خود ہندوستان کے حال پر نظر کرتے ہیں اور نہ اور لوگوں بلکہ خود اپنے کافر کہنے والوں کے حال پر تو کیا پاتے ہیں کوئی کسی بابو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ کی سیر کر رہا ہے کوئی کسی سیٹھ کا پگڑی بدل بھائی ہونے پر ناز کرتا ہے کسی کا ہاتھ اُس کی بغل میں ہے جو ابھی کالی کی پوجا کر کے آیا ہے۔ کسی کی مسند اُس کے قدموں کے واسطے خالی ہو رہی ہے جس کے پانوں کی گرد مندر کے طواف سے بھری ہوئی ہے ہندوؤں کے ساتھ دوستی ہے اختلاط ہے۔ ارتباط ہے۔ تو کیا یہ سب مسلمان مسلمان نہیں ہیں۔ بلا شبہ کافر ہیں۔ کیونکہ اُن کے دل میں وہ بات نہیں ہے جس کا برتاؤ وہ ظاہر میں کرتے ہیں۔ ہندوؤں کو بھی جانے دو۔ انگریزوں ہی کے ساتھ جو برتاؤ ہے اس پر نظر کرو جن کے ساتھ کسی قسم کا اختلاط رکھنا ہی کفر سمجھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے مسلمانوں کی مسلمانی اُس وقت معلوم ہو جاتی ہے جبکہ کسی سٹریل انگریز کے ساتھ کچھ تعلق ہو جاتا ہے ان کی خوشامد۔ چاپلوسی۔ عاجزانہ بات چیت پر اسلام کا نور چمکتا ہے اور کسی سے دوستی ہو گئی تب تو اُس مسلمان کی قدر و قعت کی اور اپنے فخر و ناز کی کوئی حد باقی نہیں رہتی چنانچہ مجھے یاد ہے کہ جب شاہزادہ ایڈنبرا کو کانپور میں ایڈریس دیا گیا تھا۔ تو ہمارے ایک مولنا قبلہ نے اُسے نہایت خوشی سے پیش کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ایسے مہمان کے قدم ہمارے سر پر ہماری آنکھوں پر۔ اُس وقت کہنے پر اسلام نے ضرور اُن کا منہ

جنت کی شکر سے بھر دیا ہوگا۔ باقی رہی عام دوستی انگریزوں سے وہ ظاہر ہے کہ اُس کا سبب
نہ مسلمانوں کا اسلام ہے بلکہ ان کی ذلیل حالت کہ انگریز ان کو دوستی کے لائق ہی نہیں جانتے
ورنہ مسلمان اپنی طرف سے ہر طرح کی خدمت کرنے کو حاضر ہیں چہ جائے دوستی و محبت۔ وُہ
خداوند کہنے پر مستعد ہیں۔ ہاتھ جوڑنے کو موجود ہیں۔ رکوع کرنے اور قدموں کے چومنے تک کو
تیار ہیں ۔

کیوں جناب کاشف لغطا اور کشاف حقیقت۔ ان حالات پر نظر کر کے بینی و بین اللہ یہ
فرما دیجیئے کہ یہی اصلی اسلام ہے اور کیا ایسے ہی لوگ مسلمان ہوتے ہیں اور ایسے ہی اسلام کو آپ
قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں کی عزت کی توقع ہے۔ حاشا ثم حاشا یہ وہ باتیں ہیں
کہ مسلمان نہ ہو دو کافر بنا دو!

پس ہمارے پرچہ تہذیب الاخلاق کا قصور ہے تو یہ ہے کہ وہ سچائی سکھاتا ہے اور دل اور
ظاہر کو یکساں رکھنے کی نصیحت کرتا ہے۔ ہاں کافر مسلمان بننے کو منع کرتا ہے ۔

بڑا بھاری کفر جو آپ سے اُٹھائے بھی نہیں اُٹھتا وہ کیا ہے انگریزوں کے ساتھ کھانا۔
سو اوّل تو آپ اُن اصحاب رسول کو کافر بتائیے جنہوں نے بیت المقدس کے گرجے میں عیسائیوں
کی دعوت کھائی ہے۔ پھر اُن مسلمان فخر اسلام بادشاہوں کی تکفیر کیجیے جنہوں نے صدہا افرنج
کے عیسائی امیروں کو اپنے ساتھ کھلایا تھا پھر اُن تمام مسلمان ترکوں پر لعنت کیجیے جو روزمرہ کباب
چٹ فرماتے ہیں اور ان خلیفۃ اللہ ظل اللہ کو جن کا خطبہ مکہ کے اونچے ممبر پر صبح شام پڑھا
جاتا ہے کرستان بتائیے جو فرانس اور لنڈن اور آسٹریا کے بادشاہوں کے ساتھ
ہمنوالہ اور ہم پیالہ رہتے ہیں جب ان سب کی تکفیر سے کچھ کفر بچے تو خیر بنارس اور مرزاپور
بھی بھیج دیجیے مگر مجھے تو امید نہیں ہے کہ کچھ بچے کیونکہ کیا وہ لوگ محروم رہ جاوینگے۔ جو
بت پرستوں کے پگڑی بدل بھائی بن کر اُن کی جوٹھی پوریاں چٹ اور چار حلوائیوں کے گند
کے لڈو غٹ فرمایا کرتے ہیں اُن کے لیے بھی تو کچھ آخر حصہ چاہیے ۔

اے حضرات ذرا گردن جھکا کیے کچھ تو انصاف کیجیے کہ کیا دل میں ہے اور کیا زبان پر۔
کہتے کیا ہو۔ کرتے کیا ہو۔ حالت کیا ہے اور نصیحت کیا ہے اتامرون الناس بالبر و
تنسون انفسکم و انتم تتلون الکتاب افلا تعقلون ۔

میں اس وقت زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ صرف محبت اور انبساط پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں آئندہ
انشاء اللہ چند عریضے اسی کے متعلق اور لکھونگا ۔

اہل کتاب کے ساتھ کھانا

اہل سنت کے اصول سے اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے جواز میں تو کچھ شبہ ہم کو نہ تھا نہ ہے چنانچہ ہم اسے بتفصیل لکھ چکے ہیں۔ مگر از روئے اصول مذہب امامیہ کے ہم جانتے تھے کہ شاید جائز نہ ہو اس لئے کہ اُن کے نزدیک غیر مسلم نجس ہے مگر آج ہماری نظر سے ایک حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو تہذیب الاحکام میں منقول ہے گذری اس سے معلوم ہوا کہ امام ممدوح نے بھی اُس کے جواز کا فتوے دیا ہے اس لئے ہم اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ حضرات شیعہ بھی اُس کے جواز وا باحت میں کچھ شک نہ کریں گے ۔

شیخ طوسی تہذیب احکام میں حسین بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ زکریا بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کی یا حضرت میں ایک آدمی اہل کتاب میں سے ہوں اور اب مسلمان ہو گیا ہوں۔ مگر سب میرے گھر والے دین نصرانیت پر قائم ہیں اور میں ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا ہوں پس اُن کے کھانے میں سے میں کھاؤں یا نہیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ سُوّر کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں لیکن شراب پیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اُن کے ساتھ کھا اور پی ۔

اصل عبارت یہ ہے عن القاسم بن محمد عن معویۃ بن وھب عن عبد الوحمان بن حمزہ عن ذکریا بن ابراھیم قال دخلت علی ابی عبد اللہ علیہ السلام فقلت انی رجل من اھل الکتاب و انی اسلمت وبقی اھلی کلھم علی النصرانیۃ وانا معھم فی بیت واحد لم افارقھم بعد ناکل من طعامھم فقال لی یاکلون لحم الخنزیر قلت لا ولکنھم یشربون الخمر فقال لی کل معھم واشرب انتھی ۔

مراسلہ مہدی

عزیز من ماجد علی سلمک اللہ تعالےٰ

نامہ تمہارا آیا۔ حال معلوم ہوا میری کیفیت کیا پوچھتے ہو۔ عیاں را چہ بیاں ۔

یک سینہ و صد ہزار شعلہ

یک پارہ و صد ہزار باراں

تم نے لکھا ہے کہ تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنا کیوں ترک کیا۔ سید صاحب سے مخالفت کی یا کفر کے فتووں سے ڈر گئے۔ عزیز من۔ نہ میں سید صاحب سے مخالف ہوا نہ کفر کے فتووں سے ڈرا۔ بلکہ میرے سکوت کا اصلی سبب تم کو معلوم ہے کہ قطع نظر روحانی صدموں کے کئی مہینے سے ایسا بیمار ہوں کہ لکھنا پڑھنا دشوار ہے۔ روزمرہ کا کام بھی بمشکل دوسروں کی مدد سے کرتا ہوں ۔

عزیز من۔ سید صاحب سے مخالفت کا زمانہ گذر گیا اب اس خیال کو جانے دو کہ پھر وہ زمانہ آویگا۔ انا احمد واحمد انا۔ نحن روحان حللنا بدنا ۔

کفر کے فتووں کا ڈر عامیوں کو ہوگا جن کا ایمان برادری کے حقہ پانی پر ہے۔ نہ اُن لوگوں کو جو اسلام کی حقیقت ان کفر کے فتوے دینے والوں سے بھی زیادہ جانتے ہوں وہ تو ان ہوائی کاغذوں پر جو کبھی مشرق سے مغرب کو اور کبھی مغرب سے مشرق کو اڑتے پھرتے ہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور پر مگس کے برابر بھی اُس کی وقعت نہیں سمجھتے اُن کے نزدیک خدا نے اپنی جنت و دوزخ اُن کفر کے فتوے دینے والوں کو ہبہ نہیں کر دی کہ جس کو چاہیں جنت میں بھیجدیں جسے چاہیں کافر بنا کر دوزخ میں ڈال دیں ۔

عزیز من تم تاریخ سے ناواقف ہو۔ اگلے لوگوں کا حال تم نے نہیں پڑھا۔ ورنہ تم ان کفر کے فتووں پر تعجب نہ کرتے۔ یہ تو ایک پرانی رسم ہے کہ ہر مذہب میں اس پر عملدرآمد رہا ہے اور مذہبی سرداروں نے اُسے اپنی وقعت و عزت کا ذریعہ ٹھہرا رکھا ہے تاکہ وہ پوجے جاویں اور خدا کے فرزند ٹھہریں۔ اور جو اُن کے آگے پیچھے سے نکلے۔ وہ روح القدس کی آواز سمجھی جاوے۔ افسوس ان ضعیف القلب اور ضعیف الایمان لوگوں پر جو اپنی دلی تصدیق پر اطمینان نہ رکھیں اور ان کے دل اُن ہوائی کاغذوں سے پتوں کی طرح اُڑتے پھریں ۔

سُنو میاں۔ دنیا میں جتنی نامور قومیں گذری ہیں۔ یا جواب موجود ہیں اُن کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب کسی نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اوسط درجہ کے خیالات سے بڑھ کر کوئی بات زبان سے نکالی۔ یا اُن کی معمولی سمجھ سے کچھ زیادہ کہا تو وہ مجنوں اور دیوانہ ٹھہرا۔ اور اگر منہ سے کوئی ایسی بات نکلی جو مخالف اُس زمانہ کے دینی خیالات اور مذہبی رسوم کے ہوئی گو وہ خیال اور رسم بالکل مذہب کے مخالف ہی ہو یا اُس سے مذہبی سرداروں کی عزت و شان میں کچھ فرق آیا تو وہ لا مذہب اور کافر ہی سمجھا گیا۔ پھر یا جلا وطن کیا گیا یا مارا گیا یا زندہ جلایا گیا۔

دیکھو یونان میں سقراط کو زہر کا پیالہ کیوں پلایا گیا۔ اسی جرم میں کہ اُس نے بت پرستی کی بُرائی کی جسے اُس زمانہ کے لوگ اچھا جانتے تھے۔

جربرٹ جب مسلمانوں کے مدرسہ سے معقولات سیکھ کر اپنے ملک میں گیا تو اپنی قوم کے نزدیک کیوں کافر اور مرتد ٹھہرا۔ اسی قصور میں کہ وہ اُن علموں کو جاری کرنا چاہتا تھا جس کی خوبی سے اُس کی قوم ناواقف تھی۔

کلمبس کیوں پاگل ٹھہرا۔ اسی لئے کہ اُس نے وہ بات کہی جو کہ اُس زمانہ کے لوگوں کی عقل اور سمجھ سے باہر تھی۔

ڈیوکس نے جب بھاپ کے زور سے جہاز اور گاڑی چلانے کی نسبت اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ کیوں پاگل خانہ میں بھیج دیا گیا۔ اسی قصور میں کہ اُس زمانہ کے اوسط درجہ کے خیال سے اُس نے بڑھ کر بات کہی۔

رو جو بیکن کے کفر کا کیوں فتویٰ دیا گیا۔ اسی لئے کہ وہ ان مسائل سے منکر تھا جس کو اُس زمانہ کے عالم حق اور سچ جانتے تھے۔

کوپرنیکس نے کیوں ہیئات کے صحیح مسائل کے اظہار پر جرأت نہ کی۔ اسی لئے کہ وہ پادریوں کی مخالفت سے خائف تھا۔

بیبرو ونون حکیم کو روم کے پوپ نے کیوں زندہ جلا دیا۔ اسی جرم میں کہ اُس نے زمین کی گردش کا اقرار کیا اور آسمان کے وجود جسمانی سے انکار کیا تھا جس کو اُس زمانہ کے پادری ہمارے وقت کے مولویوں کی طرح اپنی نادانی سے مخالف آسمانی کتاب کے جانتے تھے۔

لوتھر کو کیوں شہر بشہر بھاگنا پڑا۔ اسی گناہ میں کہ پوپ کو نجات کے فرمان بیچنے کا مجاز نہ سمجھتا تھا۔

یہ چند نظیریں تو غیر قوموں کے نامور لوگوں کی ہیں۔ اب ہم اپنی ہی قوم اور اپنے ہی مذہب کے نامور شخصوں کا حال بیان کرتے ہیں جن میں سے اب کوئی تفسیر کا اور کوئی حدیث کا۔ کوئی فقہ کا کوئی اصول کا۔ کوئی کلام کا امام سمجھا جاتا ہے اور جن میں سے کسی کا خطاب ہے امام المفسرین اور کسی کا امام الفقہا اور کسی کا حجۃ الاسلام اور کسی کا کبریت احمر اور کسی کا اکسیر اعظم۔ تاکہ معلوم ہو کہ ان بزرگواروں نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے کیسے صدمے اُٹھائے۔

عبداللہ ابن عباس پر لوگوں نے طعنہ کیا کہ یہ بے سمجھے بوجھے قرآن کی تفسیر کیا کرتے ہیں۔

عبداللہ بن زبیر کے زیادہ نماز پڑھنے پر لوگوں نے کہا کہ یہ مکار اور منافق ہیں۔

سعد بن وقاص کا کوفہ کے جاہلوں نے شکوہ خلیفہ تک کیا کہ ان کو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی۔

حضرت علیؑ کو تو خارجیوں نے کافر ہی بنا دیا۔

امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی نسبت لوگوں نے کہا کہ یہ بت پرستوں کی باتیں کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ کی نسبت وہ باتیں لوگوں نے کہیں کہ جن کا نقل کرنا بھی بے ادبی ہے۔ بعضوں نے ان کو جاہل ٹھہرایا۔ بعضوں نے بدعتی بتایا۔ بعضوں نے کفر کی نسبت کی۔

امام شافعیؒ سے پاک امام کو بدذاتوں نے اضرّ من ابلیس کا خطاب دیا اور اُن کے مرنے کی دعائیں کیں۔

علمائے عراق اور مصر نے اُن پر یہاں تک تہمتیں لگائیں کہ یمن سے دار السلام تک ایسی بے حرمتی اور بے عزتی سے قید کر کے بھیجے گئے کہ ہزاروں آدمی ملامت کرتے اور گالیاں دیتے جاتے تھے اور وہ اُن کے حلقہ میں سر جھکائے ہوئے تھے۔

امام مالکؒ کی مصیبت ہمارے دل کی تسلی کے لئے کافی ہے کہ پچیس برس تک جمعہ و جماعت کے لئے باہر نہ نکلے اور ایسی ذلت سے قید کئے گئے کہ جس کے سننے سے بدن پر رعشہ ہوتا ہے۔ اس بے دردی سے اُن کی مشکیں باندھی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اُکھڑ گیا۔ پھر اونٹ پر سوار کرائے گئے اور کہا گیا کہ اس مسئلہ کی صحت کا اقرار کر دیں جسے وہ دل سے غلط جانتے تھے۔ آخر امام نے اونٹ پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہ جانتا ہو وہ جان لے کہ مالک انس کا بیٹا ہوں۔ اور صاف کہتا ہوں طلاق المکرہ

لیس لبثی۔ اس پر ستر کوڑے مارے گئے اور قید رکھے گئے۔

امام احمد حنبلؒ کی مصیبت سنو کہ ۲۸ مہینے تک وہ قید میں رہے اور بھاری بھاری زنجیریں اُن کے پاؤں میں ڈالی گئیں اور یہ ذلت ان کو دی گئی کہ مجلسوں میں بلائے جاتے۔ اور لوگ اُن کو طمانچے مارتے اور منہ پر تھوکتے اور ہر شام کو جیل خانہ سے نکالے جاتے اور کوڑوں کی مار اُن پر پڑتی۔ اور یہ سزا اُس قصور کے بدلے میں تھی کہ وہ ایک غلط مسئلہ میں اتفاق اس زمانہ کے لوگوں کی نہ کرتے تھے۔ امام محمد ابن اسمٰعیل بخاریؒ وطن سے نکالے گئے۔ نسائی مسجد میں شہید کئے گئے۔ بایزید بسطامی پر بھی جلا وطنی کا فتویٰ دیا گیا۔ ذوالنون مصری مصر سے بغداد کو اس مصیبت سے بھیجے گئے کہ پا بدست دگرے دست بدست دگرے اور ایک جماعت مولویوں کی اُن کے کفر و زندقہ پر گواہی دینے کے لئے ہمراہ گئی۔ سہیل بن عبداللہ تستری باایں امامت مرتد ٹھہرے۔ ابو سعید خراز پر بھی کفر کا فتوے دیا ہی گیا۔ جنید بغدادی کو عالموں نے کافر کہکر اس قدر تنگ کیا کہ وہ مسائل توحید علانیہ زبان پر نہ لاسکے۔ محمد بن فضل بلخی باایں جلالت اس طور پر نکالے گئے کہ اُن کے گلے میں رسی تھی اور گلی کوچہ میں تشہیر کئے جاتے۔ امام ابن حسن رازی کو رے کے زاہدوں نے نکلوا ہی دیا۔ ابو عثمان مغربی بھی دربدر مارے پھرے۔ حضرت شبلی پر کفر کا فتوے دیا گیا اور اُن کے پاس کا بیٹھنا بھی ایک گناہ قرار دیا گیا۔ امام ابوبکر نابلسی کی باایں علم و فضیلت مولویوں کے حکم سے کھال کھینچی گئی۔ ابن حبان باایں تجرد امامت زندیق قرار دیئے گئے۔ شیخ ابو مدین بجرم زندقہ جلاوطن کئے گئے۔ شیخ ابو الحسن شاذلی مغرب سے قید کرکے بےگناہ زندقہ مصر کو بھیجے گئے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام بھی کفر کے فتوے سے نہ بچے۔ شیخ تاج الدین سبکی اباحیہ ٹھہرائے گئے۔ شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ ابوالحسن اشعری اور امام حجۃ الاسلام غزالی کا کچھ بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ سب جانتے ہیں کہ شیخ محی الدین وہ شخص ہے جس کو امام الموحدین اور کبریت احمر اور اکسیر اعظم اور شیخ الطائفہ کہتے ہیں اُس کی نسبت نہ فقط کفر کا فتویٰ ہوا۔ بلکہ حضرت عالموں نے یہ فتوے دیا کہ کفرہ اشد من کفر الیہود والنصاریٰ کہ اُس کا کفر یہود اور نصاریٰ کے کفر سے بڑھ کر ہے۔ اور اس پر بھی اُن ظالموں کو صبر نہ آیا بلکہ اُن کے تمام گروہ پر تکفیر کا فتوے جاری کیا۔ اور اس پر بھی اُن کے دلوں کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی بلکہ ان کے کفر میں شک کرنے والوں پر بھی کفر کا فتوے دیدیا اور صاف یہ لکھ دیا کہ من لم یکفر طایفۃ ابن عربی کان لم یکفر الیہود والنصاریٰ ومن شک فی کفرہ من ھو مثلہ فھو کافر ومن شک فی کفر من شک فی کفرہ فھو کافر۔ شیخ ابوالحسن اشعری کی کیفیت ظاہر ہے کہ وہ سنیوں کے امام ہیں

مگر اُن کو بھی یاروں نے الحاد کے الزام سے نہیں چھوڑا۔ اور کفر کی نسبت انکی طرف کر دی۔

امام غزالی کا حال سب جانتے ہیں کہ آج لقب اُن کا حجۃ الاسلام ہے مگر یہ حضرت بھی اپنے زمانہ میں کافر ٹھہرائے گئے اور ان کی کتابوں کا جلا دینا بلکہ اُن پر لعنت کرنا ثواب سمجھا گیا تھا۔ اس نامور امام کو کسی اُن کے دوست نے لکھا کہ تمہاری کتابوں پر لوگ طعنہ کرتے ہیں اور خلاف سلف صالح کے عقاید کے جانتے ہیں۔ اُس کا اُنھوں نے ایک نہایت عمدہ جواب لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے یار عزیز۔ ان حاسدوں کی باتوں پر نیاں نہ کر۔ اور اُن جاہلوں کی طعن لعن سے کچھ رنجیدہ نہ ہو۔ ان کی باتوں پر صبر کر اور اُن کو کہنے دے استحقر من لا یحسد ولا یقذف واستصغر من بالکفر والضلال لا یعرف ذلیل جان اُس آدمی کو جس کا لوگ حسد نہ کریں اور حقیر سمجھ اُس شخص کو جس کی طرف کفر اور گمراہی کی نسبت نہ کی جاوے ایسے لوگوں کی اصلاح کی امید نہ کر جو صرف حسد سے بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اور ایسے جاہلوں کی بات نہ سُن جو تھوڑی سی مخالفت کو بھی اگلوں کی کفر جانتے ہیں۔ اور اُن عقبیوں اور مولویوں کی باتوں پر کچھ خیال نہ کر کہ جو ذری ذری بات پر قد تفر قد تفو کہنے لگتے ہیں۔ کیا وہ فقہ کے پڑھ لینے اور نجاست کے ازالہ اور زعفران کے طلا کے مسئلے جان لینے سے عزو ایمان کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی طرف توجہ نہ کر اور اُن کی باتوں کے سُننے میں اپنی وقت ضائع نہ کر اور اپنے دھندے کو نہ چھوڑ۔

ان بزرگوں کو جانے دو۔ ہندوستان کے بعض نامور شخصوں کو خیال کرو کہ اُن کو بھی یاروں نے نہ چھوڑا۔ حضرت شیخ احمد فاروقی نقشبندی کے کفر کا فتوےٰ دے دیا۔ مولانا ولی اللہ پر بھی بدعت و گمراہی کا الزام لگایا گیا۔ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید فی سبیل اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تکفیر کا فتویٰ مکہ کے مفتیوں سے یار لوگ لکھوا ہی لائے اور ایسے پاک شخص کے کافر ٹھہرانے میں دریغ نہ کیا۔ غرض کہ کوئی زمانہ ایسا نظر نہیں آتا کہ جس میں کوئی نامور اور مصلح ایسا گذرا ہو جس کی مخالفت لوگوں نے نہ کی ہو بلکہ ہم تو ہر ایک نامور کو ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ یاروں نے اُس کا حسد کیا۔ دشمنوں نے اُس پر طعن کئے جاہلوں نے اُس کی ہنسی اُڑائی۔ حضرات مولویوں نے اُس کے کفر کے فتوے دیئے۔ ایک بھی تو اُن کے پنجۂ ظلم سے نہیں بچا اور کوئی بھی تو تکفیر کے فتوے سے محفوظ نہیں رہا۔ پھر اس زمانہ کے مولوں کے کافر کہنے کی اگر کوئی شکایت کرے۔ تو وہ نادان ہے یہ تو اُن کی معمولی عادت اور پرانی سنت ہے ولا تجد لسنتهم تبدیلا۔

ایک زمانہ میں حضرات فقہا نے تکفیر کی یہ کثرت کر دی کہ ذری ذری بات پر کفر کے فتوے دیئے اور ایک ادنیٰ فروعی مسئلہ کی مخالفت پر مسلمانوں کو قتل کرایا۔ صدہا مسلمان ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے پر کافر ٹھہرے اور بہت سے ایماندار گردن اور کان کے مسح نہ کرنے پر مارے گئے۔ خلق قرآن کے مسئلہ نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ خلافت امامت کی بحث میں شہر کے شہر ویران کر دیئے پس ہمارے زمانہ میں شیطان کے وجود خارجی اور آسمان کے وجود فرضی کے انکار پر اگر کفر کے فتوے ہوئے۔ تو کوئی نئی بات نہیں ہے ؎

گھائل تیری نظر کا بنوع دگر ہر یک
زخمی کچھ ایک بندۂ درگاہ نہیں!

عزیز من سنو ایمان ایک نور ہے۔ جو خدا دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ نور خود آدمی کو اپنے ایمان کی حقیقت سے واقف کر دیتا ہے۔ اس کی تصدیق قلبی دوسروں کی شہادت کی محتاج نہیں رہتی۔ نہ کسی کی تکفیر سے اس میں خلل و زلل ہوتا ہے۔

ومن يك وجده وجداً صحيحاً　　فلم يحتج الى قول المغني
له من ذاته طرب قديم　　وسكر دائم من غير دن

امام ابو حنیفہؒ سے یوسف بن خالد نے وتر کا مسئلہ پوچھا۔ امام نے کہا کہ واجب ہے اس فقیہ نے کہا کہ کفرت یا ابا حنیفہ کہ اے ابو حنیفہؒ تم کافر ہو گئے۔ بجواب اس کے امام نے فرمایا کہ ایھولنی اکفارک ایای وانا اعرف الفرق بین الواجب والفرض کہ کیا تیرے کافر کہنے نے مجھے ڈرا دیا حالانکہ میں واجب و فرض کا فرق جانتا ہوں پس کیا کافر کہنا ہمارے زمانہ کے لوگوں کا ان کو ڈرا دیگا جو کفر و ایمان کی حقیقت جانتے اور حق و باطل میں تمیز کر سکتے ہیں۔

عزیز من میں آج تک کفر کے فتوے کو نہیں سمجھتا کہ یہ کیا ہے۔ آیا کوئی نوشتہ خدا کا ہے جو جبریل امین لائے ہیں یا جہنم کے داروغہ کے نام کا وارنٹ ہے جو مولوی صاحبوں نے فرمایا ہے آخر یہ کیا بلا ہے غایتہ ما فی الباب وہ ایک عالم یا چند عالموں کی رائے ہے۔ اس کی ہمارے نزدیک اسی قدر وقعت ہے جس قدر کہ حدیث موضوع اور بے سند کی شاہ عبدالعزیز صاحب کے نزدیک تھی یعنی گوز شتر۔ میں نہیں خیال کر سکتا کہ کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ کسی آدمی کے کہہ دینے سے گو وہ مکہ کا مفتی ہی ہو کوئی مسلمان کافر ہو جاویگا یا خدا اس کے فتوے پر دوزخ میں بھیجدیگا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تقلیدی مسلمان جن کو انسان کہنا بھی زیبا نہیں اور جن کی شان کالانعام بل ہم اضل ہے وہ ان خوفناک کاغذوں کو دیکھ کر ڈر جاوینگے اور ایک کالے کاغذوں کو وحی آسمانی سمجھ کر کافر کہنے لگیں گے۔ اس سے زیادہ کوئی اور

نتیجہ ان فتووں کا نہیں ہے ٭

لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْن

اخبار نورالانوار میں میری نسبت ایک بزرگ نے یہ مشتہر فرمایا ہے کہ وقت آنے حیدرآباد کے میں اُن سے ملنے گیا اور انہوں نے پوچھا کہ حیدرآباد سے بھی شغل تحریر تہذیب کا رہیگا بجواب اُس کے میں نے کہا کہ برس روز سے زیادہ ہُوا کہ میں نے اُس تحریر کو ترک کردیا ہے اور یہ تحریر میری حسب اسباب ظاہر کے تھی ورنہ باطن میرا وہ ہے جو اہل اسلام کا ہے" یہ تحریر حضرت کی سراسر جھوٹ اور محض تہمت ہے سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ چند روز پیشتر لوگوں نے ایسی ہی بیہودہ خبریں اُڑائی تھیں اور میرے خاص دوستوں نے بھی مجھ سے استفسار کیا تھا میں نے بجواب خط عزیزی ماجد علی کے اصلی کیفیت مشتہر کردی تھی اب حیدرآباد آنے سے پھر منافق مسلمانوں کو یہ خیال شاید ہُوا ہو اور اُن کو اپنے غلط خیال کے موافق گمان تبدیلی خیالات اور وضع کا میری نسبت پیدا ہوا ہو مگر میرے مذہبی خیالات اور دلی ولولوں میں کچھ فرق نہیں ہُوا مسلمانوں کے مذہبی اوہام کی غلطیاں ظاہر کرنے اور اُن میں تہذیب و شائستگی پھیلانے کا خیال جیسا تھا۔ ویسا ہی ہے ؎

اُنہیں جھڑے دل آزاری جو آگے تھی وہ اب بھی ہے
وفا کی ہم کو بیماری جو آگے تھی وہ اب بھی ہے

میں نے نہ اپنے اعتقاد کو بدلا۔ نہ اپنے خیال کو نہ اپنی وضع کو نہ اپنے لباس کو نہ اپنی طرز معاشرت کو اور انشاء اللہ العزیز ؎

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود سر ما خاک رہِ پیر مغاں خواہد بود
حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

مولوی محمد علی صاحب کی تحریروں کی تاثیر بھی میری توبہ کی ایک خیالی وجہ قرار دی گئی ہے مگر میں سچ کہتا ہوں اور سراسر سچ کہتا ہوں کہ اُن کی اکثر تحریرات کا اثر اگر کسی کے دل پر ہو سکتا ہے تو آتنا ہے کہ اسلام شہوت رانی اور ظلم و فساد اور بداخلاقیوں کا ذریعہ اور جھوٹی کہانیوں اور بیہودہ خیالات اور عقل و حقیقت کی مخالف باتوں کا ایک مجموعہ ہے نہ اسلام سے دنیوی برکتیں ہوئیں نہ بنی نوع انسان کی معاشرت اور اخلاق میں اس سے اصلاح ہوئی۔ حق یہ ہے کہ مولانا صاحب پادریوں پر احسان کر رہے

ہیں اور اُن کو اسلام کی غلط بُرائیوں کے ظاہر کرنے اور اُس کی اصلی خوبیوں کے چھپانے میں دے رہے ہیں۔ جو سیاہی موجودہ اسلام کے چہرہ سے دُور کی جاتی ہے مولوی صاحب اُسے پھر لگا دیتے ہیں اور جو الزام مسلمانی مذہب سے دُور کیا جاتا ہے مولانا صاحب اُسی کو پھر جما دیتے ہیں۔ پس جبکہ میرے نزدیک مولانا صاحب کا دل و دماغ ایسا ہو اور میرے دل پر ان کی تحریرات کا ایسا اثر ہوتا ہو تو اُس سے مجھے کیا ہدایت ہو سکتی ہے ہاں اُن کی تحریرات سے کبھی کبھی طالب علموں کی کج بحثیوں کا مزہ آجاتا ہے۔ باضربری مصباح پڑھنے والوں کے لفظی مباحثوں کی تفسیر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے دگر ہیچ۔ اس وقت مجھے ایک حکایت منظوم یاد آئی ہے کہ شائقین کے نذر کرتا ہوں سُننے والے اُسے میری زبان سے سُنیں اور داد دیں ~

عارفے از کوہ بصحرا گذشت — دید عزازیل بدامان دشت
دل زغم و وسوسہ پرداختہ — دیدہ ز نیرنگ تہی ساختہ
گفت بدو عارف صحرا نورد — کز چہ دریں بادیہ ہرزہ گرد؟
طبع تو آسودہ ز وسواس چیست — ایں فترت کندئ الماس چیست
کار تو در صومعہ و خانقاہ — باز چرا ماندہ از کارگاہ؟
تفرقہ بخش صف طاعت نہ — رخنہ گر سلک جماعت نہ!
در صف اصحاب نہیب تو کو — جادوے جبریل فریب تو کو
شعبدہ انگیزیے خوبت کجاست — خوے بد عربدہ جویت کجاست
رہزن وراں با دل بدسگال — طنز کناں داد جواب سوال
کز برکات علماے زماں — فارغم از کشمکش این و آں
داشت مرا باز ازیں جد و جہد — حیلہ گریہاے فقیہان عہد
یک تن ازیں طائفہ بوالہوس — از پئے گمراہیٔ کونین بس!

اب میں اپنے دوستوں اور یاروں کی خدمت میں صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی میری نسبت ایسی لغو اور بیہودہ اور جھوٹی خبریں اُڑا دے اُسے غلط اور تہمت سمجھیں۔ اور ناصحین دل سوز کی حضور میں بھی یہ التماس ہے کہ آئندہ نصیحت سے معاف فرما دیں اور اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں ~

من ترک عشقبازی و ساغر نمیکنم — صد بار توبہ کردم و دیگر نمیکنم
شیخم بطنز گفت حرام است مے مخور — گفتم مگو کہ گوش بہ ہر خر نمیکنم
تقویم ایں بس است کہ چوں زاہدان شہر — ناز و کرشمہ بر سر منبر نمیکنم

کتاب الرحلت

الموسوم

بالواسطۃ الیٰ معرفۃ مالطا

وکشف المخبّا عن فنون اورپّا

یہ کتاب جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے ایک سفرنامہ ہے جس میں جزیرہ مالٹا کا حال اور یورپ کے علوم و فنون کی کیفیت لکھی ہے لکھنے والا اس کا ابوالعباس شیخ احمد افندی ہے۔ جس کا گھر غالباً تونس میں ہے وہ مصاحب سید حسین امیرالامرا پریسیڈنٹ مجلس انتظامیہ تونس کا تھا جب یہ امیرالامرا فرانس کی سیر کو گیا اور پیرس دارالسلطنت فرانس میں وہاں کے حالات دریافت کرنے کیلئے ٹھہرا تب یہ شیخ بھی سفر کو نکلا اور مالٹا اور لنڈن اور پیرس وغیرہ یورپ کے شہروں میں بیس برس تک سیاحت کرتا رہا اور توریت کے ترجمہ کرنے کی خواہش سے بہت دنوں تک ڈاکٹر لی کے ساتھ کیمبرج میں رہا۔ اس شیخ نے اپنے زمانہ سیاحت میں یورپ کے حالات اور وہاں کے علوم و فنون اور لوگوں کے چال چلن اور امیروں کے گذر کرنے کے طور و طریقوں کی ایسی تحقیقات کی جیسا کہ کوئی طالب علم علوم کی تحقیقات کرتا ہو اور بوجہ اپنی عزت اور رفعت کے اُسے ایسا موقع بھی ملا کہ وہ یورپ کے امیروں کا بلکہ نوابوں کا مہمان ہوا اور ان کے عام اور خاص سرکاری جلسوں میں شریک ہو سکا اور ان کے اخلاق اور عادات اور خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کی۔ پھر یورپ کے مدرسوں اور بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور دیگر کارخانوں میں بھی اُن کے حالات تحقیق کرنے کے لئے گیا اور وہاں مدتوں رہ کر اُن کے اصول و فروع سے واقف ہوا۔ بعد اس کامل تجربہ کے اور اعلےٰ درجہ کی تحقیقات کے اُس نامور عالم نے یہ کتاب لکھی ہے اس کتاب کے دیکھنے سے ہم کو رنج بھی ہوا اور خوشی بھی۔ رنج تو اس بات کا ہوا کہ جو عادتیں اور خراب خصلتیں ہم ہندوستان کے مسلمانوں میں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہو بہو اُن ملکوں کے مسلمانوں میں بھی ہیں جہاں اُس وقت اُن کی سلطنت قائم و برقرار ہے۔ اور خوشی اس خیال سے ہوئی کہ اُن ملکوں کے رہنے والے مسلمان بھی خواب غفلت سے جاگنے لگے ہیں اور بعض شخص اپنی قوم کی بھلائی پر آمادہ ہوئے ہیں اور ایک تربیت یافتہ قوم سے اپنی

جہالت کو مقابلہ کر کے اُس کے دُور کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ استنبول اور مصر کے حالات تو اخباروں اور سیاحوں کی زبانی ہم سُنا کرتے ہیں اور جو ترقیاں وہاں کے مسلمان کر رہے ہیں اُس کی کچھ کچھ کیفیت بھی معلوم ہوتی رہتی ہے مگر تونس کے نام سے بہت کم مسلمان واقف تھے۔ اب دو کتابوں کی بدولت جو ہم نے پائیں ہم کو نہ صرف تونس کے نام سے واقفیت ہوئی بلکہ وہاں کے وزیر اور امیروں کے عمدہ حالات بھی ہم کو معلوم ہو گئے اور جو اسباب مسلمانوں کے تنزل اور ادبار کے ہمارے ذہن میں تھے اُس کی تائید ہوئی اور جو غلط خیال اور بیہودہ اوہام مسلمانوں کے دلوں میں سمارہے ہیں اور جن کو ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں سے نکلیں اُس میں ہم کو اُن سے مدد ملی۔ اُن دو کتابوں میں سے ایک کتاب اقوام المسالک ہے جو امیر الامرا سیّد خیر الدین وزیر تونس نے لکھی ہے اور جو جناب خلیفہ سیّد محمد حسن صاحب وزیر اعظم پٹیالہ کی عالی ہمتی سے اُردو میں ترجمہ ہو کر چھپ رہی ہے اور دوسری یہ کتاب ہے جس کا اب ہم کچھ انتخاب لکھتے ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی ہے جس کی عبارت نہایت فصیح اور مسجع ہے اور جس سے قابلیت اور اعلیٰ درجہ کی استعداد علم معانی و بیان میں اُس کے لکھنے والے کی ظاہر ہوتی ہے۔ الفاظ قلیل مطلب کثیر اور مبالغہ اور فضول سے معرا۔ بہت کم کتابیں عربی کی مثل اس کے تالیف ہوئی ہونگی۔ اس کتاب کا وہ حصہ نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے جہاں مؤلف نے انگریزوں کے اخلاق اور عادات کا تذکرہ کیا ہے اور اپنے ملک کے لوگوں سے اُس کا مقابلہ کر کے اپنے ملک کی حالت پر افسوس کیا ہے ❊

مؤلف نے اس کتاب کو ۱۲۷۹ھ ہجری میں تمام کیا اور ۱۲۸۳ھ ہجری میں مطبع تونس میں چھاپی گئی اُس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ ۷۶ صفحہ کا ہے جس میں فقط مالٹا کا بیان ہے دوسرا حصہ ۳۲۰ صفحہ میں ہے جس میں یورپ کے علوم و فنون اور وہاں کے مختلف حالات کا ذکر ہے ❊

اس کتاب کو شیخ موصوف نے اس غرض سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو یورپ کے حالات اور اہل یورپ کے خیالات سے واقفیت ہو تاکہ وہ جانیں کہ اُن میں اور اہل یورپ میں کس قدر فرق ہے۔ کیا بلحاظ علوم و فنون کے اور کیا بنظر اخلاق اور عادات کے۔ بعد تالیف کے یہ کتاب امیر الامرا سیّد خیر الدین وزیر تونس کی حضور میں پیش کی گئی۔ وزیر موصوف نے جو کہ ایک نامی عالم اور بڑا مدبر اور منتظم اور مسلمانوں میں ایک مشہور امیر ہے۔ اور جس نے خود ایک عمدہ کتاب اقوام المسالک اسی قسم کی لکھی ہے، جب اس کتاب کو دیکھا تو مؤلف کی بڑی قدر کی اور ایک عمدہ خلعت سے اُس کا دل خوش کیا جس میں ایک بیش قیمتی ہیرے کی ایسی انگوٹھی تھی جو بادشاہوں کے لایق ہو۔ اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اپنی

نہایت سچی رائے بہ نسبت یورپ اور وہاں کے علوم و فنون اور طریق تمدن کے ظاہر کی ہے اور جو خیال اُس کا بہ نسبت کسی چیز کے بُرائی بھلائی کے گذرا اُسے ویسا ہی ٹھیک ٹھیک بیان کردیا ہے۔ بناوٹ یا تکلف کو ذرا بھی دخل نہیں دیا۔ شیخ موصوف اپنی کتاب کے صفحہ ۳ میں لکھتا ہے کہ خدا جانتا ہے کہ باوجودیکہ میں نے یورپ کے شہروں میں کثرت سے عجیب و غریب چیزیں دیکھیں اور بہت سے دل کے بہلانے والے اور جی کے خوش کرنے والے مشغلے پائے مگر میں ہمیشہ غمگین اور منغّص رہا۔ کوئی جلسہ خوشی کا میں نے نہ دیکھا جس میں مجھے رنج نہ ہوا ہو اور کوئی خوبی اور عمدگی میری نظر کے سامنے نہ آئی جس نے میرے دل کو نہ دکھایا ہو کیونکہ جب میں وہاں ایسی نعمتیں دیکھتا اور ایسی عزت اور خوشی کے سامانوں پر نظر کرتا اور وہاں کے طرز معاشرت اور طریق تمدن پر خیال کرتا تو رنج اس بات کا ہوتا کہ ہائے ہم مسلمانوں کے شہر ان باتوں سے خالی ہیں نہ ہمارے شہروں میں یہ سامان ہیں نہ ہم لوگوں کے ایسے عمدہ چال و چلن ہیں۔ نہ کسی علم و فن میں ہماری شہرت[1] ہے۔ مگر ہاں ایک بات سے کچھ دل کو تسلی ہوئی کہ ہمارے ملک کے لوگ خوش اخلاقی اور سخی ہیں خصوصاً اپنی عورتوں کی نسبت بڑی غیرت رکھتے ہیں۔ مگر جب پھر میں یورپ کے شہروں کے انتظام اور وہاں کے رہنے والوں کی زندگی بسر کرنے کے سامان اور اُن کی عزت اور شہرت اور صنعتوں اور مفید کاموں پر خیال کرتا تو پھر مجھے پریشانی ہوتی اور حسرت میرے دل کو گھیر لیتی اور یہی حال میرے دوست امیر الامرا سید حسین پریسیڈنٹ مجلس انتظامیہ تونس کا تھا۔ مگر شکر خدا کا ہے کہ انہوں نے مدتوں پیرس میں رہ کر واقفیت حاصل کی اور پھر شہر تونس میں جاکر یہاں کے انتظام جاری کئے مگر مجھ سے کیا ہوسکتا ہے سوائے اس کے کہ میں اس کتاب کو لکھتا ہوں تاکہ اور مسلمان برانگیختہ ہوں اور ان کو طریق تمدن و حسن معاشرت میں ترقی کرنے کی فکر ہو ۔

اس کتاب کے پہلے حصہ میں مالطیہ کا بیان ہے اور وہ اس خوبی سے لکھا گیا ہے۔ کہ ایک اچھے جغرافیہ نویس کے شایاں ہو۔ یہ حصہ اس قابل ہے کہ ہم مسلمان اس کو کسی شہر یا کسی ملک کے حالات لکھنے کیلئے نمونہ ٹھہرالیں۔ ہم اس وقت اُس کا انتخاب نہیں لکھ سکتے مگر دوسرے حصہ سے کچھ باتیں منتخب کرتے ہیں ۔

دوسرے حصہ میں مؤلف نے اپنے سفر کا حال لکھا ہے جو کہ ۱۸۴۸ء میں اس نے مالٹا سے کیا۔ مالٹا سے لنڈن میں پہنچنے تک جو سیر اُس نے دیکھی اور جو واقعات اُس کی آنکھ سے گذرے اُن سب کو لکھا ہے اور جن شہروں اور قلعوں اور نہروں اور دریاؤں کا ذکر کیا ہے ان کی مختصر

[1] یہ شخص تو کوئی دوسرا سید احمد ہے ۔

تاریخ بھی نہایت خوبی سے بیان کی ہے۔ بعد اس کے چند صفحوں میں اس کتاب کے لنڈن کے حالات اور اُس کی پُرانی تاریخ اور حال کی آبادی اور ترقی کا ذکر ہے پھر انگلستان کے چند دیہات کی کیفیت لکھی ہے جہاں اُس شیخ کو جانے کا اتفاق ہوا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ان دیہات میں کوئی عمدگی اور خوبی نہیں پائی کیونکہ بلاد شام کے دیہات سے اُن کو کچھ فوقیت نہیں دی۔ بلکہ اپنی تکلیف کا جو کھانا نہ ملنے سے ہوئی ان دیہات کی نسبت بُری رائے دی ہے ؂

دیہات کی پیداوار اور بونے جوتنے کے طریقوں اور غلّا و ترکاری اور میوہ کی قسموں کو جو وہاں پیدا ہوتی ہیں اچھی طرح بیان کیا ہے اور نیز تعجب ظاہر کیا ہے کہ وہ جسم اور وزن میں ہمارے ملک سے زیادہ ہوتے ہیں اور وہاں کے پالتو جانوروں اور ان کی فربہی اور جسامت کی بھی بہت تعریف کی ہے پھر لنڈن کے سواد اور چراگاہوں اور شکارگاہوں کا بیان کیا ہے اور فرانس کے سواد اور چراگاہوں سے اُن کو اچھا خیال کیا ہے اور اُس کے ساتھ ان کے محاصل اور آمدنی اور اخراجات اور مصارف کا بھی ذکر لکھا ہے لنڈن اور اُس کے مقامات اور قریات کی خوبیوں میں سب سے زیادہ یہ خوبی بیان کی گئی ہے کہ وہاں سانپ ہے نہ بچھو۔ نہ گوہ نہ گیدڑ۔ نہ مچھر نہ پسو۔ اور اگر کہیں ہیں تو نہایت کم۔ پھر لنڈن کے مکانات اور عمارات اور اُس کی خوبیوں کا بیان کیا ہے لکڑی کی صفائی اور شیشوں کی چمک اور فرش فروش سے آراستگی کی خوبی کی زیادہ تعریف کی ہے۔ بلکہ ایک مقام پر لکھا ہے کہ میں ایک میر کے ہاں مہمان ہوا۔ وہاں رفع ضرورت کے لئے مجھے ایک مکان بتا دیا گیا۔ اس کی زرنگار دیواروں اور آراستگی نے مجھے ایسا متحیر کیا کہ میں سمجھا کہ یہ میر شاید مجھ سے ہنسی کرتا ہے اور وہ اس طرز سے بنایا گیا تھا کہ میں اُس کے کھولنے اور اندر جانے سے عاجز رہا۔ اس مقام پر لنڈن کی تعمیرات کی قدیمی تاریخ اور حال کی نئی نئی ایجادوں کا حال بھی نہایت خوبی سے لکھا ہے۔ صفحہ ۸۶ میں مؤلف نے بڑی تعریف لنڈن کے رہنے والوں کی اس باب میں کی ہے کہ وہ اپنے مکانات کو نہایت خوبی سے آراستہ کرتے ہیں یعنی اوّل تو جو ضروری چیزیں انسان کو چاہئیں وہ سب ان کے مکان میں ہوتی ہیں۔ دوسرے اس ترتیب اور قرینہ سے سجائی اور لگائی جاتی ہیں۔ کہ اس سے زیادہ اچھا ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ ساری دنیا میں انگریزوں سے بڑھ کر اس کی لیاقت کسی میں نہیں ہے اور یہ ایک عادت ہے جو اُن کے خمیر میں ملی ہوئی ہے دوسرا آدمی اُس کا برتاؤ کر نہیں سکتا نہ اس طرح پر استعمال کر سکتا ہے اور چونکہ وہ اُس کے عادی ہو رہے ہیں اس لئے بے ایسی ترتیب اور سجاوٹ کے وہ خوش نہیں رہ سکتے اگر وہ مسلمانوں کے شہروں میں جاویں تو ایک دن بھی آرام اور خوشی سے نہ رہیں۔ اس کے بعد مؤلف

لنڈن کے دریائوں اور میناروں اور بحری نشانوں کا حال اور ان کی تاریخ اور تعداد اور اُن کے مصارف کا ذکر کرتا ہے اور ایسے موقع پر دنیا کی نہایت عجیب سات عماتوں کی کیفیت لکھتا ہے ٭

صفحہ ۹۰ میں انگریزوں کی جسمانی طاقت اور ان کی عمر کا تذکرہ ہے جس میں مؤلف نے لکھا ہے کہ خاص انگلستان اور ویلز میں تین برس کے اندر ۲۶۶ آدمی ایسے مرے جن کی عمر سَو برس سے زیادہ تھی اور جن کے حواس بخوبی صحیح اور جن کی طاقت اچھی طرح باقی تھی بلکہ ایک آدمی ایک سَو نیرہ برس کی عمر کا ہو کر مرا اور کبھی اپنی زندگی میں ایک دن کو بھی بیمار نہ ہوا تھا اور ستر برس کی عمر تک تو اکثر آدمی انگلستان کے ایسے جوان رہتے ہیں کہ بڑھاپا اُن کی صورت پر معلوم نہیں ہوتا۔ اور سبب اس کا مولف نے یہ بیان کیا ہے کہ بڑے سبب بڑھاپے کے غم اور تکلیف اور خوف ہیں خصوصاً بے اطمینانی جو حاکموں اور عالموں کی طرف سے ہوتی ہو۔ جیسا کہ ہم مسلمانوں کی سلطنتوں میں ہے۔ انگلستان میں اگر کسی کے پاس کروڑ روپیہ ہو تو اُسے نہ ملکہ کا خوف ہے نہ کسی حاکم کا بلکہ ملکہ اور حاکموں کو اُن کی دولت پر اور فخر ہوگا کیونکہ وہ اپنی رعیت کی دولت کو اپنی دولت اور اپنے ملک کی عزت جانتے ہیں سوائے اس کے سامان خوشی کے اور جلسے عیش و طرب کے انگلستان میں اس قدر ہیں کہ ادنے ادنے آدمی دلی خوشی حاصل کرسکتا ہے خلاف ہمارے ملکوں کے کہ کوئی ایسا سامان نہیں اسی واسطے اکثر آدمی رو کھے ترش شبدہ خاطر ہوتے ہیں پھر لنڈن کے بہار کے موسم اور وہاں کے لوگوں کے کھیلوں اور وہاں کے میلوں اور لوگوں کے خوشی کرنے کا بیان کیا ہے اور برف کے گرنے اور دریاؤں کے جم جانے اور اُس پر آدمیوں کے دوڑنے اور طرح طرح سے دل بہلانے والی باتوں کا ذکر ہے ٭

صفحہ ۹۲ میں جہاں برف اور سردی کا بیان اس مؤلف نے کیا ہے وہاں ایک خوش طبعی بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر یہاں کے رہنے والے مسلمان ہوتے تو جنت کی صفات سنکر اُس کی تمنا نہ کرتے کیونکہ جب کوئی انسان برف اور سردی میں مبتلا ہو تو وہ کب اُس مقام کی رز کریگا جہاں پانی بہتا ہو اور گھنے سایہ دار درخت ہوں اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہو۔ وہاں وہ جب خوش ہوتے اگر جنت کی تعریف یوں ہوتی کہ اس میں خوب آگ روشن ہے اچھے اچھے آتشدان بنے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ڈھیر جلنے کی لکڑیوں کے لگے ہوئے ہیں نہ کبھی وہاں کی آگ بجھتی ہے نہ آتش خانے سرد ہوتے ہیں پس تاپو جہاں تک تاپا جائے اور گرم ہو۔ جہانتک گرم ہوا جاوے ٭

پھر چند صفحوں میں انگلستان کی کانوں اور معدنیات کا حال اور ان کی پُرانی تاریخ کو بتفصیل بیان کیا ہے اور لکھتا ہے کہ کوئلہ اور لوہے کی کان اُن کے حق میں چاندی سونے کی کان سے زیادہ مفید ہے اور انگلستان کی دولت کی ترقی کا بڑا ذریعہ ہے چنانچہ صرف کوئلہ کی کان پر کام کرنے والے مزدور بیس ہزار سے زیادہ ہیں ❊

پھر دخانی گاڑیوں اور آہنی سڑکوں کا بیان اور ان کے تاریخی حالات اور اُن کے منافع اور فائدوں کا بیان کیا ہے اور یورپ میں جہاں جہاں یہ آہنی سڑکیں جاری ہیں اُن کی تفصیل لکھی ہے ❊

صفحہ ۱۰۸ سے کچھ بیان عورتوں اور ان کی ظاہری باطنی خوبیوں کا ہے اول تو مؤلف اُن کے حسن و جمال کی صفت کرتا ہے یہانتک کہ وہ لکھتا ہے کہ اگر کوئی ان عورتوں کو دیکھے جو خدمتگاری کرتی ہیں تو یہی خیال کرے کہ کوئی امیرزادی ہے پھر اُن کی سادگی کی تعریف کرتا ہے کہ نہ وہ مہندی لگاتی ہیں نہ مسّی سُرمہ سے اپنے دانتوں اور آنکھوں کو سیاہ کرتی ہیں۔ نہ رنگ برنگ کے نیلے پیلے کپڑے پہنتی ہیں بلکہ جیسا خدا نے بنادیا ہے ویسی ہی صورت رکھتی ہیں سارا تکلف اُن کا بالوں کے گوندھنے اور کپڑوں کی تراش اور وضع میں ہے جو ہزار زیور اور جواہر سے زیادہ خوش نما ہوتا ہے پھر مؤلف اُن عورتوں کی قناعت اور اپنے مردوں کی فرمانبرداری اور خانگی انتظام کی تعریف کرتا ہے خصوصاً اُن کی اس خوش خلاقی کی کہ اگر کوئی ادنےٰ تحفہ بھی دیا جاتا ہے تو بہت خوشی سے قبول کرتی ہیں اور دینے والے کا زبان سے شکر ادا کرتی ہیں اور ایسے مقام پر وہ افسوس کرتا ہے کہ زبان سے شکر کرنے اور تھینک ادا کرنے کی عادت عرب اور مسلمانوں میں نہیں ہے اور ان کا سکوت ایسے موقع پر جب کہ انگلستان کے لوگوں کے تھینک کہنے سے مقابلہ کیا جائے تو نہایت ہی بُرا معلوم ہوتا ہے ❊

انگلستان کی عوام عورتوں کی جہالت اور ان کی فال و نجوم اور رمل اور سحر وغیرہ پر اعتقاد رکھنے کی بڑی بُرائی بیان کرتا ہے اور ایسے جاہلانہ خیالات میں ایک ہزار ہا عوام عورتوں کو پھنسا ہوا بیان کرتا ہے صفحہ ۱۱۳ میں بیان کیا ہے کہ عورتیں قصبات اور دیہات کی اکثر پاکدامن اور صاحب عصمت ہوتی ہیں اور وہ بہ نسبت شہریوں کے زیادہ خوش رہتی ہیں مگر کیا دیہات اور کیا شہر دونوں جگہ عورتوں میں عصمت و عفت کا بڑا خیال ہے اور وہ بہ نسبت فرانس کی عورتوں کے زیادہ باوفا اور صاحب عصمت اور حاضر و غائب یکساں رہتی ہیں ❊

صفحہ ۱۱۴ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ اکثر دیہاتی مرد و عورت جاہل اور بے پڑھے ہوتے ہیں

یہاں تک کہ ۱۸۵۰ء میں اکتیس لاکھ پچاس ہزار چار سو ستر آدمیوں کا نکاح ہوا جس میں سے فی صدی چالیس عورتیں ایسی تھیں کہ وہ اپنا نام لکھنا نہ جانتی تھیں اور جنہوں نے بجائے نام کے جسٹر میں صلیب کا نقش کر دیا! اور فیصدی ۲۹ مرد بھی ایسے ہی تھے اور باقی جنہوں نے اپنے نام لکھے ان میں سے دو تہائی ایسے تھے کہ جن کو پڑھا لکھا کہنا شایاں نہیں[1]۔

پھر صفحہ ۱۱۵ میں مؤلف نے شریف عورتوں کی خوبیوں اور ان کے انتظام خانہ داری کی صفت بیان کی ہے یہاں تک کہ وہ لکھتا ہے کہ حق یہ ہے کہ جس نے کسی انگلستان کی عورت سے شادی کر لی اُس نے سارا عیش پا لیا اور سب رنجوں سے چھوٹ گیا۔ یہ ضرور نہیں کہ وہ زیادہ مالدار اور صاحبِ دولت ہی ہو تب خوش رہے بلکہ تھوڑی سی آمدنی میں عورتیں اپنی لیاقت سے ایسا انتظام کرتی ہیں کہ گھر بھی پاکیزہ اور صاف ستھرا رہتا ہے اور ساری ضروری چیزیں بھی مہیا کر لی جاتی ہیں کفایت شعاری سے خرچ بھی کیا جاتا ہے آمدنی پر بھی ہمیشہ نگاہ رہتی ہے اور اپنی عزت اور غیرت کا تو خیال کسی وقت نہیں جاتا۔ یہ سب عورتوں کی خوش انتظامی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد مؤلف نے انگریزوں کے اخلاق کا ذکر کیا ہے اور وہاں کے لوگوں کو پانچ طبقوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے طبقہ میں ڈیوک اور لارڈ خاندانی امیروں کو داخل کیا ہے۔ دوسرے طبقہ میں اُن رئیسوں کو شمار کیا ہے جو موروثی جائداد رکھتے ہیں نہ صرف اپنی ذاتی تجارت سے بلکہ خاندانی عزت سے ممتاز ہیں تیسرے طبقہ میں ان لوگوں کو داخل کیا ہے جو کہ حیثیت سرکاری یا مذہبی کاموں کے اعلیٰ رتبہ رکھتے ہیں۔ چوتھے میں معزز و ممتاز تاجروں اور نوکری پیشوں وغیرہ کو شمار کیا ہے۔ پانچویں میں باقی عام تجارت کرنے والوں اور اہل حرفہ اور عملوں وغیرہ کو لکھا ہے ۔

مؤلف لکھتا ہے کہ پہلے طبقہ کی عادتیں کسی طبقہ سے کچھ مناسبت نہیں رکھتیں اور عوام کے طبقہ سے تو اس قدر کلی مباینت ہے کہ خیال میں نہیں آسکتا کہ یہ دونوں طبقے ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے ہیں لیکن قومی محبت اور ملکی فخر کا جوش سب کے دلوں میں یکساں ہے ۔

مؤلف نے طبقہ آخر کی بے مروتی اور خود غرضی کی نہایت شکایت کی ہے مگر طبقہ اعلیٰ کے اخلاق و عادات اور عالی دماغی اور بلند نظری اور تواضع کی اس درجہ ثنا و صفت کی ہے۔ کہ انسانوں کے طبقہ سے بھی اُن کو بڑھا دیا ہے ۔

صفحہ ۱۲۵ سے مؤلف نے عام اخلاق اور عادات اور ملنے جلنے کا طریق بیان کرنا شروع

[1] یہ حال اٹھارہ برس پیشتر کا تھا اب اس عام تعلیم میں بہت ترقی ہو گئی ہے ۔

کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ جب کوئی کسی سے بات چیت کرتا ہے تو نہایت نرمی سے کرتا ہے۔ کچھ خشونت اُس کی آواز میں نہیں پائی جاتی اور عورتوں کی آواز میں تو خاص ایک قسم کی نرمی ہوتی ہے اگر غیظ و غضب میں بھی کسی سے بات چیت کریں تب بھی سوائے ‌‌"سر"[1] کے اور کچھ نہیں کہتیں خطوں میں بہت اختصار۔ آداب والقاب میں کرتی ہیں۔ تھوڑے ہی سے فرق سے مغایرت اور مساوات اور محبت اور یکجہتی کے درجہ ظاہر کرتی ہیں مثلاً عام القاب سر ہے اور جس سے کم شناسائی ہو اور لائق عزت کے ہو اُسے ڈیر سر لکھتی ہیں جس سے محبت ہو اُسے مائی ڈیر سر لکھتی ہیں جس سے نہایت ہی یکجہتی ہو اُسے ڈیر سید احمد لکھتی ہیں برخلاف ہم لوگوں کے کہ کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو وہ القاب و آداب لکھتے ہیں کہ جن کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح ملنے کے وقت بھی کچھ زیادہ آؤ بھگت نہیں کرتے اگر کسی سے ملاقات ہوئی تو معمولی باتیں کرکے اور اپنا مطلب ظاہر کرکے ایک دوسرے سے ملتے ہیں کہ گویا دونوں میں نہایت درجہ کی دوستی ہے۔ ملاقات کے وقت یہ امر خلاف آداب اور اخلاق کے سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بے ضرورت کسی کا کام اور نسب اور وطن اور مقصد کا سوال کرے اور یہ سب عمدہ عادتیں انگریزوں نے صرف تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے حاصل کی ہیں ؎

یہ بھی اُن کی عادت ہے کہ اگر کوئی کسی سے ملنے آوے اور اُس کے پاس کوئی عورت بیٹھی ہو تو وہ کبھی نہیں پوچھنے کہ یہ کون ہے۔ برخلاف ہم لوگوں کے کہ اگر ایسا موقع ہو تو پہلا سوال یہی کرینگے کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے تم سے کیونکر شناسائی ہوئی۔ یہ لوگ حاسد بھی نہیں ہوتے اور کسی کی امارت یا علم یا عزت پر حسد نہیں کرتے بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ کوئی شخص ان کی قوم کا عالم یا معزز ہو برخلاف ہمارے شہروں کے کہ ایک آدمی بھی ایسا نہ ملیگا جو حسد کی بیماری سے خالی ہو ؎

یہ بھی عمدہ صفت ان کی ہے کہ کسی کی عزت اور علم کو نہیں چھپاتے بلکہ اُس کے ترقی دینے کی فکر کرتے ہیں اور ہر طرح سے اُس کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی عزت اور علم اور فن کو بڑھاوے اور اور لوگوں کو اُس کی پیروی کرنے کی رغبت ہو برخلاف ہمارے شہروں کے کہ اگر کسی شخص نے تھوڑی سی عزت حاصل کی یا کسی علم و فن میں کمال پیدا کیا تو سب جل جاتے ہیں۔ کوئی اُسے دغاباز۔ کوئی گدھا کوئی خودغرض کہتا ہے۔ یہ بھی اُن کی عادت ہے کہ ایک دوسرے سے وحشیانہ برتاؤ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ کوئی نوکر اپنے آقا پر طعنہ نہیں کرتا نہ اُس کی بُرائیاں پیچھے بیان کرتا ہے گو وہ کیسا ہی اُس سے ناراض ہو۔ برخلاف ہم لوگوں کے شہروں کے کہ کسی نوکر کو کوئی ایسا نہ پاویگا جو اپنے ہی مالک کا شاکی نہ ہو اور اُس کی بُرائیاں

[1] جناب کے موقع پر یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے ؎

نہ بکتا پھرے۔ وہ اپنے نوکروں بلکہ خدمتگاروں سے بھی تہذیب کی گفتگو کرتے ہیں اور (مسٹر) لگا کر بولتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر پانی مانگینگے تو کہینگے (مسٹر) میں امید کرتا ہوں آپ پانی ملنے کی اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ اور وہ بھی نہایت ادب سے سر جھکا کر تعمیل کرتا ہے۔ اور خفگی اور گالی گلوچ کا تو کیا ذکر ہے۔ بلکہ نہ کبھی آقا خدمتگار سے ہنسی کرتا ہے نہ بے ضرورت اُس سے بات کرتا ہے نہ اُسے منہ لگاتا ہے برخلاف ہمارے امیروں کے کہ کبھی تو ایسے خفا ہونگے کہ گالیاں دینگے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اُس کو اپنا یار بنائینگے ؎

ان لوگوں میں عادت غمازی اور غیبت کی بھی نہیں ہے نہ باہم بیہودہ بک بک کرنے کی عادت رکھتے ہیں برخلاف ہم لوگوں کے شہروں کے کہ جہاں چار آدمی بیٹھے ہوں تو ایسی قیل و قال کرینگے کہ معلوم ہوگا کہ جن بول رہے ہیں۔ پاک طینتی بھی ان لوگوں کا خمیر ہے اور یہی سبب ہے کہ ایک دوسرے پر کچھ شک و شبہ نہیں کرتے چنانچہ ملکہ نے اپنی بیٹی یعنی شہزادی کے ہاتھ کا بنا ہوا رومال کسی فوجی افسر کو جبکہ وہ لڑائی میں مصروف تھا بھیجا کسی نے سوائے نیکی کے بُرا خیال نہ کیا اگر ہمارے ملک میں کوئی امیرزادی کسی کو ایسا تحفہ بھیجتی تو طرح طرح کے خیال لوگوں کو پیدا ہوتے اور مہینوں اُس کے چرچے رہتے ؎

عمدہ عادات سے ان لوگوں کی ایک یہ ہے کہ اپنی اوقات کے نہایت پابند ہوتے ہیں ہر کام کے لئے ان کا ایک وقت ہے اور ہر وقت کے لئے ایک خاص کام یہاں تک پابندی رکھتے ہیں کہ اگر کوئی کسی سے بے وقت ملنے جاوے تو وہ نہایت نرمی سے کہہ دیتے ہیں۔ کہ آپ مجھے معاف فرمایئے مجھے اس وقت اور ضرورت ہے اور وہ سننے والا واپس چلا جاتا ہے اور کچھ بُرا بھی نہیں مانتا برخلاف ہم لوگوں کے کہ نہ کسی کام کا کوئی وقت ہے نہ کوئی وقت کسی بات کیلئے مخصوص ہے بیہودہ فضول ملاقاتوں میں تمام عمر گذر جاتی ہے اور ملاقاتی جنازہ تک بھی پیچھا نہیں چھوڑتے ؎

ان لوگوں کی عمدہ عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنی عورتوں سے بدگمانی بھی نہیں رکھتے مثلاً اگر کوئی آدمی باہر سے آئے اور اپنی بی بی کو کسی مرد سے بات چیت کرتا پاوے تو اُس کی خیانت اور فسق پر کچھ شبہ نہ کریگا لیکن اگر خیانت عورتوں کی معلوم ہو جائے تو اُس کے بعد پھر رحم نہیں کرتے اور سوائے چھری یا زہر کے دوسرا بدلا نہیں لیتے بیخوفی بھی جو ایک نتیجہ عمدہ انتظام ملک کا ہے ان لوگوں میں پائی جاتی ہے چھوٹے چھوٹے لڑکے رات دن گلی کوچوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ نہ پولیس کا اُن کو ڈر ہے نہ فوج کا۔ نہ کسی جرنیل کا نہ کسی مجسٹریٹ کا بلکہ بادشاہ تک کی بھی ہیبت اُن پر نہیں ہوتی۔ لڑکیاں جو دس برس تک کی عمر کو نہیں پہنچتیں آدھی

رات کے بعد پولیس اور کوتوالی میں چلی جاتی ہیں اور اس طرح پر سوال و جواب کراتی ہیں۔ کہ گویا اپنے کسی عزیز کے پاس گئی تھیں مگر ہمارے مشرقی شہروں میں جن کو خدا اچھا تا رکھے یہ حال ہے ۔کہ اگر عورت کسی برقنداز یا چوکیدار سے بھی رات کو بولے تو وہ پہلے اُس نیکبخت کا ہاتھ پکڑیگا اور اپنی طرف کھینچ کر اُس کی بےحرمتی کریگا اور پھر کیا مجال ہے کسی کی کہ اُس برقنداز یا چوکیدار سے بول سکے ٭

مؤلف کتاب کا اس بےخوفی کی نسبت اپنی یہ رائے لکھتا ہے کہ ایسی بےخوفی سے وہاں کے لوگوں کے قوائے جسمانی شگفتہ رہتے ہیں اور عقل ترقی جاتی ہے ۔ضعیفی اور بڑھاپا دیر کرکے آتا ہے کیونکہ وہ چھٹپن سے خوف اور دہشت کے عادی نہیں ہوتے اور چھوٹے بچے کے دل میں رُعب اور خوف کا سمانا ایسا ہے جیسا کہ ایک نرم اور نازک پودے پر بادسموم کا تُند جھونکا ۔ہم لوگوں کے شہروں میں اول تو حاکموں کا دوسرے ظالم نوکروں کا تیسرے بددیانت آدمیوں کا خوف چھٹپن ہی سے ہوتا ہے ماورائے اس کے ہم لوگوں کے ہاں بچوں کی مائیں اُن کے دلوں میں بھوت پلید دیو جن کا ایسا خوف ڈال دیتی ہیں کہ جوانی کے زمانہ میں بھی ان کے دل سے نہیں نکلتا ۔اور سچ یہ ہے کہ اگر مشرقی لوگوں خصوصاً مسلمانوں کی طبیعتوں میں مقدر پر اعتماد نہ ہوتا تو کسی ایک پر بھی اُن میں سے مردی اور انسانیت کا اطلاق کرنا زیبا نہ ہوتا ٭

انگریزوں کی عادتوں میں سے یہ بھی ہے کہ بہت مختصر اور ادب کے ساتھ اپنے مخاطب سے کلام کرتے ہیں مثلاً اگر کسی چھوٹے کو اپنے بڑے سے کچھ کہنا ہو تو یوں کہتا ہے کہ میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر میری فلاں حاجت کے برلانے سے احسان کرینگے اور میں آپ کا شکرگزار ہونگا اور اس مختصر با ادب انسانیت کی تقریر سے ان کو فضول اور لمبی چوڑی خوشامد کرنے کی حاجت نہیں ہوتی جس کا رواج ہم لوگوں میں ہے کہ جب کسی سے خطاب کرینگے تو کہینگے کہ یا بدر الکمال یا بحر النوال وغیرہ وغیرہ جس تقریر کا خاتمہ چند ساعت تک بھی نہیں ہوتا پھر وہ بڑا جس سے چھوٹے نے اپنی حاجت عرض کی ہے بجواب اُس کے یوں کہتا ہے کہ میں آپکے کام کرنے میں کوشش کرونگا اور آپ کو جلد خبر دونگا اور اس سے ان کو اس کہنے کی حاجت نہیں رہتی جو ہم لوگ کہتے ہیں کہ بسر و چشم میں آپ کا کام کر دونگا۔ آپ کا نفع تو عین میرا نفع ہے اور آپ کا کام خود میرا ہی کام ہے آپ اطمینان رکھیں ضرور یہ کام کر دیا جاویگا حالانکہ انگریزوں میں سے جو کوئی کوشش کرنے کا بھی اقرار کرتا ہے وہ اس حالت میں جبکہ وہ کر سکے ورنہ صاف کہہ دیتا ہے کہ آپ مجھے معاف کیجئے میں معذور ہوں۔ آپ کا کام مجھ سے نہیں ہوسکتا اور اگر وعدہ کیا تو اس سے زیادہ کوشش کرتا ہے جو اُس سے کہا ہو۔ اور پھر فوراً اُس کے ہست و نیست کا جواب

دیدیتا ہے۔ برخلاف ہمارے شہروں کے کہ اُس چیز کا وعدہ کر دیتے ہیں کہ جس کو وہ خود جانتے ہیں کہ اُن کے اختیار سے خارج ہے اور پھر کبھی خیال نہیں کرتے کہ اُس کے پُورے کرنے میں کوشش کریں یا اُس بیچارہ کو صاف جواب دیں تاکہ وہ اپنی فکر کرے اُس شخص کا کام تمام ہو جاتا ہے مگر اُن کا وعدہ تمام نہیں ہوتا۔ یہانتک کہ ہم لوگوں کے امراء کی یہ عادت ہے کہ اُن سے اگر کوئی نوکری کا طالب ہو تو جواب دینا نہیں جانتے فوراً یہ کہتے ہیں کہ یا حبذا آپ سے بڑھ کر لائق دوسرا شخص کون ہے بلاشبہ مجھے بھی آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا آدمی نہ ملیگا لیکن آپ چند روز صبر کیجیے مجھے ایک ضرورت ہے وہ رفع ہو جاوے تب میں آپ کو نوکر کر لونگا پس اُس عدہ کی رسی میں باندھے رہتا ہے اور جب کبھی وہ متقاضی ہو تو کوئی حیلہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ اخیر کو وہ محروم اپنی قسمت کو روتا ہوا پھر جاتا ہے مگر انگریز کبھی ایسی باتوں کے پاس نہیں پھٹکتے اور اسی لئے اُن کی بے اعتباری نہیں ہوتی ٭

انگریزوں کی دیانت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی چیز کسی کے پاس امانت رکھی جاوے تو وہ اپنی چیز سے زیادہ اُس کی حفاظت کرتا ہے اور یہ دیانت صرف مال و اسباب ہی میں نہیں ہے بلکہ ہر چیز میں اُس کا اثر پایا جاتا ہے مثلاً کوئی کسی کا خط نہیں کھولتا اور اگر کسی کی معرفت خط آوے تو وہ مکتوب الیہ تک پہنچانے میں کوشش کرتا ہے یا ڈاک گھر واپس کر دیتا ہے ٭

یہ ایک عمدہ عادت اُن کی ہے کہ اگر کسی کے ملنے کو کوئی جاوے تو ہرگز اُس کی کسی چیز یا کتاب یا خط یا کاغذ پر ہاتھ نہیں بڑھاتا نہ اُسے دیکھتا ہے برخلاف ہمارے شہروں کے جنکو خدا بچا رکھے کہ جب کسی سے ملنے کو جاوینگے گو ملاقات بھی نہ ہو مگر پہلے ہاتھ اُس کے کاغذ اور کتاب کی طرف بڑھاوینگے اور بے پوچھے دیکھنے لگیں گے یہانتک کہ جتنے اُس مجلس میں بیٹھے ہونگے خدا کی عنایت سے سب کے پاس ہاتھوں ہاتھ وہ پہنچیگا اور ایک دوسرے سے چھینینگے اور اُس کو بڑی بے تکلفی سمجھینگے حالانکہ انگریزوں میں کوئی ایسا کرے تو پھر کبھی اُس سے بات نہ کریں اور احمق سمجھ کر نکال دیں ٭

یہ مؤلف اسی قسم کی اپنے ملک کی بدعادتوں اور انگریزوں کی عمدہ خصلتوں کا مقابلہ کرتے کرتے اخیر کو نہایت درد و حسرت سے لکھتا ہے والی من المشتکی و ابن النصیر فیا لیت شعری متی نصیر نحن ولد آدم بشراً کہولاء البشر ومتی نعرف الحقوق الواجبة لنا و علینا والحال ان التمدن معناه ان یکون الناس فی مدینة وفیہا ذئاب و سباع کلا ثم کلا جیران اجتمع الخروف والذئب فی مرعی واحد لیوجب علی الیہود ان یومنوا بمجی المسیح یعنی کس سے شکایت کی جاوے اور کس سے مدد مانگی جاوے

کہ ہائے افسوس ہم بنی آدم کب انسان ہونگے مثل ان انسانوں کے اور کب ہم پہچانینگے اپنے حقوق کو اور غیروں کے حقوق کو کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ تمدن کے یہ معنی ہیں کہ آدمی ایسے شہر میں رہے جس میں بھیڑیئے اور درندے ہوں۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ حق یہ ہے کہ بکریوں اور بھیڑیوں کا ایک چراگاہ میں جمع ہونا واجب کر دیتا ہے بہود پر کہ وہ بھی مسیح کے آنے پر ایمان لے آویں ٭

بعد اس کے پھر مؤلف نے لڑکوں کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا ہے۔ اور جس کشادہ پیشانی سے وہ لڑکوں کو پالتے ہیں اور ان کو خوش رکھتے ہیں اور ان کے جذبات کی شگفتگی کے کھیل کھلاتے ہیں اور آخر کو ان کو عمدہ تعلیم دیتے ہیں اس کی تعریف کی ہے اور چھوٹے لڑکوں کی پھول کی طرح خوبصورت ہونا اور انکی خوشنما پوشاک کی جو دیکھنے والے کو نہایت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے تعریف کی ہے ٭

صفحہ ۱۵۷ میں مؤلف نے انگریزوں کی وفاداری کا حال لکھا ہے اور اس محبت کا ذکر کیا ہے جو ان کو اپنے ملک سے ہے اور اس عزت اور خودداری کی تعریف کی ہے جو ان کے مزاج میں ہے یہانتک کہ جو لوگ ان کو مغرور کہتے ہیں ان کے کہنے کو غلط ٹھہرایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ان کی خودداری اور وقعت اور عزت جس کا خیال ہر بات میں وہ رکھتے ہیں لوگوں کو غرور معلوم ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ غرور کچھ نہیں رکھتے بلکہ جس کسی کو ان سے محبت اور دوستی کرنا ہو چاہیئے کہ وہ بھی اپنی آپ عزت کرے اور ان کے ساتھ خودداری سے پیش آوے اور ان پر یقین کرا دیوے کہ وہ ان سے کسی ذاتی غرض کے سبب سے نہیں ملتا۔ اور اپنی لیاقت کی نسبت ان کو مطمئن کرا دیوے کہ ایک جنٹلمین کی سی خصلتیں رکھتا ہے تب اسکو ان سے دوستی اور محبت کا خیال کرنا چاہیئے ٭

فضول باتوں کے پوچھنے سے ان کو ایسی نفرت ہے کہ کبھی کوئی دوست کسی دوست کا مذہب اور اعتقاد نہیں پوچھتا برخلاف ہم لوگوں کے کہ پہلا سوال مذہب اور اعتقاد ہی سے ہوتا ہے پھر پرسش آمدنی و خرچ کی پھر خانگی حالات دریافت کئے جاتے ہیں اور دل کے بھید پوچھے جاتے ہیں پھر علم و فضل کی کیفیت دریافت کی جاتی ہے پھر یہانتک سوال کو طول ہوتا ہے کہ یہ پوچھنے لگتے ہیں کہ آپ بدھ کے دن انڈے کھاتے ہیں یا نہیں۔ غرض کہ جو سوال ہوتا ہے وہ دوستی کے خلاف اور انسانیت کے مخالف ہے ٭

پھر مؤلف موصوف صفحہ ۱۵۸ میں انگریزوں کی دیانت اور صفائی قلب کا بیان کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ جب وہ کسی سے دوستی کرتے ہیں اور اس کے چال چلن کو اچھا جان لیتے

ہیں تو وہ یہاں تک بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ اپنی بی بی اور اپنی بیٹیوں کا بھی امین سمجھتے ہیں اور بے روک ٹوک اُس کے ساتھ اُن کو آنے جانے دیتے ہیں۔ ان کو اپنے دوست پر یہاں تک بھروسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی دوست اُن کا کسی شخص کو ملاقات کی چٹھی لکھ دیتا ہے تو وہ اُس پر بھی ویسا ہی بھروسا کرتے ہیں جیسا کہ اپنے دوست پر۔ ہزار کوئی اُس کی طرف سے شکایت کرے وہ کبھی نہیں سُنتے کیونکہ اُن کو بھروسا ہوتا ہے کہ اُن کے دوست نے اُس کی سفارش نہ کی ہوگی جب تک کہ اُس نے اطمینان اُس پر نہ کر لیا ہوگا۔ ایسے شخص کی اس قدر وہ خاطر کرتے ہیں کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا مگر یہ خاطر داری و عزت اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ شخص خود غرضی یا بد چلنی ظاہر نہ کرے اور چونکہ وہ خود صاف باطن ہوتے ہیں اس لئے اپنے ملنے والوں کو بھی ایسی ہی خیال کرتے ہیں۔ یہ نیک نیتی اور دل کی صفائی نہ صرف مردوں میں ہوتی ہے بلکہ اشراف عورتوں میں بھی اس کا پورا پورا اثر پایا جاتا ہے وہ اپنے ملنے والے کو ہر بات میں جو وہ کہے سچا جانتی ہیں اور اگر کوئی ہمدردی سے عورتوں کی بھلائی کی بات کہے تو اُس پر بھی جان سے فدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ہم میں سے ان شریف عورتوں سے یہ کہے کہ سبحان اللہ انگلستان کی عورتیں کیسی ترتیب یافتہ اور خوش اخلاق اور نیک خصلت والیاں ہیں اور افسوس ہے کہ ہماری عورتیں جاہل بے پڑھی لکھی ہوتی ہیں نہ اُن کو خدا کے حقوق کی خبر ہے نہ بندوں کے حقوق کی ہم لوگوں کی صحبت عورتوں کے ساتھ ایسی ہے جیسی دو دشمنوں کی ہوتی ہے اور نہایت دلبستگی اور کشیدگی سے ہم لوگوں کی گذر عورتوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ کاش تم ہماری عورتوں پر رحم کرو اور ان کی تعلیم و تربیت اور تہذیب اخلاق کے لئے مدرسہ بنوا دو اور مثل اس کے جو اور باتیں عورتوں کی بھلائی سے متعلق ہوں کی جاویں۔ تو وہ اشراف زادیاں اُس کہنے والے کو یہ سمجھیں کہ یہ کوئی پیغمبر ہے جو خدا کی طرف سے آیا ہے اور واسطے دور کرنے جہالت اپنی قوم کی عورتوں کے مبعوث ہوا ہے پس اس خیال ہی سے وہ اس کی اپنی خاطر داری کریں گی کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا اور ان کو نہ یقین ہو جاویگا کہ ضرور یہ اپنے وطن میں لوٹ کر عورتوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے گا مگر ان کمبختوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ حضرت مشرقی اپنے دل میں اسی وقت کہتے جاتے ہیں [illegible] ہو کر میرے فریب میں آئی ہو۔ آخر عورتیں ناقصات [illegible] تمہارے کتب خانوں میں ہیں اور صدہا قصے [illegible] تم نے دیکھے ہی ہونگے مگر پھر بھی تم [illegible] تمہارے خوش کرنے کو [illegible] [illegible] اس قدر عزت کرینگی کہ کوئی چند کا پیسہ [illegible]

اپنے ہاتھ سے بڑھا دے گی کوئی رات کے کھانے کی دعوت کریگی ؛

الغرض اس مؤلف نے نہایت تفصیل سے ہر قسم کی باتوں کا اس کتاب میں بیان کیا ہے ۔ کہاں تک اُس کا انتخاب اس چھوٹے سے پرچہ میں کیا جاوے اگر کوئی مسلمان نصیحت کا طالب ہو اُس کیلئے یہی بہت ہے ۔ ورنہ دفتر کے دفتر لکھنا بھی فضول ہے ؛

مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا

ہمارے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے جو احسان اپنی فصیح و بلیغ تقریروں اور پُر زور تحریروں، اور بے نظیر لکچروں، اور علمی اور اخلاقی اور مذہبی تصنیفوں سے قوم پر کیا ہے وہ سب جانتے ہیں ۔ مگر تہذیب الاخلاق کا دوبارہ جاری کرنا بھی انہیں کا حصہ تھا ۔ اُنہوں نے ایک کانفرنس کے جلسہ میں اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو کچھ ایسا دیوانہ کر دیا ، کہ جو ہر شخص تہذیب الاخلاق تہذیب الاخلاق پکارنے لگا ، اور چاروں طرف سے اس کے دوبارہ جاری کرنے کا شور مچ گیا ۔ اُنہوں نے پُرانے جنون کو تازہ کر دیا ، اور سیہ مستان بادۂ محبت کو میکدہ کی یاد دلائی ۔ اس نشہ کے متوالے "اذر کا شاد نا دابا" پکارنے لگے ۔ اور اُس اجڑے ہوئے چمن کی بلبلیں "باز ہوائے چمنم آرزوست" کا غل مچانے لگیں ۔ بادہ خواروں کی یہ چل چل دیکھکر محتسبوں نے بھی درہ سنبھالا ، قمری و بلبل کا شور سُنکر صیاد بھی دام قفس درست کرنے لگے ۔ غرضکہ ہمارے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے فتنۂ خوابیدہ کو پھر بیدار کیا اور میکدہ کا دروازہ کھولکر ایک ہائے ہوئے مچا دی ۔ دیکھئے اس جوش کا انجام کیا ہوتا ہے اور مرحوم تہذیب الاخلاق کے دوبارہ زندہ ہونے سے قوم کی تمدنی اور اخلاقی زندگی پر کیا اثر پہنچتا ہے ۔ قوم اسے کس نظر سے دیکھتی ہے ، اور اُس کا خیر مقدم کس طرح کیا جاتا ہے ؛

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ زمانہ نے جو خیر الموذین ہے مسلمانوں کی حالت ایسی بدل دی ہے ، کہ اب وہ اس قسم کے مضامین کے جن کی اشاعت اس پرچہ کا مقصود ہے محتاج نہیں رہے ؛ نہ انگریزی تعلیم سے اب انہیں نفرت ہے ، نہ مذہبی تعصبات اب تعلیم کے مانع ہیں ، نہ آزادی اور ترقی سے اب انہیں مخالفت ہے ، نہ مغربی تہذیب اور یورپ کی شائستگی بُری نظروں سے دیکھی جاتی ہے ۔ مگر میں اُسے نہیں مانتا اس لئے کہ اس پرچہ کا

لہ یہاں کے مضامین سلسلہ جدید تہذیب الاخلاق کے شروع ہوئے ہیں جو ۱۸۹۴ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور تین سال کے بعد بند ہو گیا تھا

ہیں تو وہ یہاں تک بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ اپنی بی بی اور اپنی بیٹیوں کا بھی امین سمجھتے ہیں اور بے روک ٹوک اُس کے ساتھ اُن کو آنے جانے دیتے ہیں۔ ان کو اپنے دوست پر یہاں تک بھروسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی دوست اُن کا کسی شخص کو ملاقات کی چٹھی لکھ دیتا ہے تو وہ اُس پر بھی ویسا ہی بھروسا کرتے ہیں جیسا کہ اپنے دوست پر۔ ہزار کوئی اُس کی طرف سے شکایت کرے۔ وہ کبھی نہیں سُنتے کیونکہ اُن کو بھروسا ہوتا ہے کہ اُن کے دوست نے اُس کی سفارش نہ کی ہوگی جب تک کہ اُس نے اطمینان اُس پر نہ کر لیا ہوگا۔ ایسے شخص کی اس قدر وہ خاطر کرتے ہیں کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا مگر یہ خاطرداری و عزت اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ شخص خود غرضی یا بدچلنی ظاہر نہ کرے اور چونکہ وہ خود صاف باطن ہوتے ہیں اس لئے اپنے ملنے والوں کو بھی ایسی ہی خیال کرتے ہیں۔ یہ نیک نیتی اور دل کی صفائی نہ صرف مردوں میں ہوتی ہے بلکہ اشراف عورتوں میں بھی اس کا پورا پورا اثر پایا جاتا ہے وہ اپنے ملنے والے کو ہر بات میں جو وہ کہے سچا جانتی ہیں اور اگر کوئی ہمدردی سے عورتوں کی بھلائی کی بات کہے تو اُس پر جی جان سے فدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ہم میں سے ان شریف عورتوں سے یہ کہے کہ سبحان اللہ انگلستان کی عورتیں کیسی تربیت یافتہ اور خوش اخلاق اور نیک خصلت والیاں ہیں اور افسوس ہے کہ ہماری عورتیں جاہل بے پڑھی لکھی ہوتی ہیں نہ اُن کو خدا کے حقوق کی خبر ہے نہ بندوں کے حقوق کی ہم لوگوں کی صحبت عورتوں کے ساتھ ایسی ہے جیسی دو دشمنوں کی ہوتی ہے اور نہایت دلبستگی اور کشیدگی سے ہم لوگوں کی گذر عورتوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ کاش تم ہماری عورتوں پر رحم کرو اور ان کی تعلیم و تربیت اور تہذیب اخلاق کے لئے مدرسہ بنوا دو اور مثل اس کے جو اور باتیں عورتوں کی بھلائی سے متعلق ہوں کی جاویں۔ تو وہ اشراف زادیاں اُس کہنے والے کو یہ سمجھیں کہ یہ کوئی پیغمبر ہے جو خدا کی طرف سے آیا ہے اور واسطے دُور کرنے جہالت اپنی قوم کی عورتوں کے مبعوث ہوا ہے پس اس خیال ہی سے وہ اس کی اپنی خاطرداری کریں گی کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا اور ان کو فوراً یقین ہو جاویگا کہ ضرور یہ اپنے وطن میں لوٹ کر عورتوں کی تعلیم و تربیت کی فکر کرے گا مگر ان کمبختوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ حضرت مشرقی اپنے دل میں اسی وقت کہتے جاتے ہیں کہ تم بڑی بیوقوف عورتیں ہو کہ میرے فریب میں آ گئی ہو۔ آخر عورتیں ناقصات العقل ہوتی ہیں افسوس کہ ہزاروں کتابیں تمہارے کتب خانوں میں ہیں اور صدہا قصے مکر و فریب کے ان میں لکھے ہوئے ہیں اور تم نے دیکھے بھی ہونگے مگر پھر بھی تم میرے دموں میں آ گئیں اور تم نے یہ جانا کہ میں یہ باتیں صرف تمہارے خوش کرنے کو کرتا ہوں۔ مگر بہرحال وہ اشراف زادیاں اُس کے اس کہنے پر اس کی اس قدر عزت کرینگی کہ کوئی چاء کا پیالہ

اپنے ہاتھ سے بڑھا دے گی کوئی رات کے کھانے کی دعوت کریگی ۰

الغرض اس مؤلف نے نہایت تفصیل سے ہر قسم کی باتوں کا اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ کہانتک اُس کا انتخاب اس چھوٹے سے پرچہ میں کیا جائے اگر کوئی مسلمان نصیحت کا طالب ہو اُس کیلئے یہ بھی بہت ہے۔ ورنہ دفتر کے دفتر لکھنا بھی فضول ہے ۰

مرحوم تہذیب الاخلاق[1] کا دوبارہ زندہ ہونا

ہمارے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے جو احسان اپنی فصیح و بلیغ تقریروں، اور پُر زور تحریروں، اور بے نظیر لکچروں، اور علمی اور اخلاقی اور مذہبی تصنیفوں سے قوم پر کیا ہے، وہ سب جانتے ہیں۔ مگر تہذیب الاخلاق کا دوبارہ جاری کرانا بھی انہیں کا حصہ تھا۔ اُنہوں نے ایک کانفرنس کے جلسہ میں اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو کچھ ایسا دیوانہ کر دیا، کہ جو ہر شخص تہذیب الاخلاق تہذیب الاخلاق پکارنے لگا، اور چاروں طرف سے اس کے دوبارہ جاری کرنے کا شور مچ گیا۔ اُنہوں نے پُرانے جنون کو تازہ کر دیا، اور سیہ مستان بادہ محبت کو میکدہ کی یاد دلائی۔ اِس نشہ کے متوالے انکا شا د نا د لہا" پکارنے لگے۔ اور اُس اجڑے ہوئے چمن کی بلبلیں "باز ہوائے چمنم آرزو ست" کا غل مچانے لگیں۔ بادہ خواروں کی یہ ہل چل دیکھکر محتسبوں نے بھی درّہ سنبھالا، قمری و بلبل کا شور سُنکر صیاد بھی دام قفس درست کرنے لگے۔ غرضکہ ہمارے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے فتنۂ خوابیدہ کو پھر بیدار کیا اور میکدہ کا دروازہ کھولکر ایک ہلڑ ہوسے مچادی۔ دیکھئے اس جوش کا انجام کیا ہوتا ہے اور مرحوم تہذیب الاخلاق کے دوبارہ زندہ ہونے سے قوم کی تمدنی اور اخلاقی زندگی پر کیا اثر پہنچتا ہے۔ قوم اُسے کس نظر سے دیکھتی ہے، اور اُس کا خیر مقدم کس طرح کیا جاتا ہے ۰

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ زمانہ نے جو خیر الموذین ہے مسلمانوں کی حالت ایسی بدل دی ہے، کہ اب وہ اس قسم کے مضامین کے جن کی اشاعت اس پرچہ کا مقصود ہے محتاج نہیں رہے؛ نہ انگریزی تعلیم سے اب انہیں نفرت ہے، نہ مذہبی تعصبات اب تعلیم کے مانع ہیں، نہ آزادی اور ترقی سے اب انہیں مخالفت ہے، نہ مغربی تہذیب اور یورپ کی شائستگی بُری نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ مگر میں اُسے نہیں مانتا اس لئے کہ اس پرچہ کا

---

[1] یہاں کے مضامین سلسلہ جدید تہذیب الاخلاق کے شروع ہوئے ہیں جو ۱۳۱۳ھ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور تین سال کے بعد بند ہو گیا تھا ۰

مقصود محدود نہیں ہے بلکہ اُس کے اغراض نہایت عام اور بہت وسیع ہے ۔ تہذیب الاخلاق تمام علمی اور عملی، تمدنی اور اخلاقی، دینی اور دنیاوی، باتوں پر حاوی ہے ۔ ہر نقص کا دُور کرنا، ہر قسم کی اصلاح کرنی، اور ہر طرح کی ترقی کی تدبیر بتانی اس کا مقصود ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں کہ جب تک دنیا میں قوم باقی ہے ۔ اس کی محتاج رہے گی ۔ سوا ۲۵ برس کے اگرچہ مسلمانوں کی حالت زمانہ نے کسی قدر بدل دی ہے، اور اُن کے خیالات اور طبائع میں گو کچھ تغیر پیدا ہو گیا ہے ۔ مگر سچ یہ ہے کہ عام حالت ان کی قریب قریب اُسی کے ہے جو اس وقت تھی جبکہ یہ پرچہ جاری ہوا تھا ۔ اوہام اور رسوم کے مستحکم بندھن میں وہ جکڑے ہوئے تھے بدستور موجود ہیں تعصب کا طوق گردن میں، تقلید کی زنجیر پاؤں میں، اب تک پڑی ہوئی ہے جسمانی اور روحانی، دینی اور دنیاوی، باتیں ایسی باہم ملی جلی اور اُلجھی ہوئی ہیں، کہ اُن کے سلجھانے کی کوششوں کا نتیجہ مایوسی ہے زمانہ کی ترقی پذیر حالتوں کے لحاظ سے کسی قسم کے مفید تغیر کا نشان ان میں پایا نہیں جاتا ۔ تعلیم اور شائستگی خیالات اور حالات میں کسی قسم کی دل خوش کن ترقی معلوم نہیں ہوتی ۔ سوسائٹی کی منجمد حالت جیسی تھی ویسی ہی ہے کسی طرح کی تحریک اس میں دکھائی نہیں دیتی ۔ پولیٹیکل اور سوشل جماعتیں روز بروز ضعیف اور کمزور ہوتی جاتی ہیں ۔ اور صرف سازشوں کے لئے رہ گئی ہیں جسمانی اور دماغی قوتیں ایک دوسرے کے تباہ اور برباد کرنے میں صرف ہو رہی ہیں علم اور مذہب کا جوش سوائے بیہودہ اور خفیف مسائل کے جھگڑوں، اور مفسدانہ اور جاہلانہ خیالات پر لڑنے کے، اور کہیں نظر نہیں آتا تعلیم اور تربیت میں رہنمائی اور پیشوائی بیک طرف کسی سوسائٹی کی رفتار کے ساتھ بھی ہم چلتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے ۔ یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ مساوات کا کیا ذکر، اسی ملک میں ہم اپنی اور ہموطن قوموں کی ترقی اور عروج کے ہم قدم پائے نہیں جاتے ہماری غفلت وہی ہے جو آگے تھی، ہمارا تعصب وہی ہے جو اول تھا ے

ہست محفل براں قرار کہ بود
ہست مطرب ہماں ترانہ سرود

وہی خیالات ہمارے دماغوں میں سمائے ہوئے ہیں جو تعلیم و تربیت کے سیدھے طریقہ پر چلنے کے مانع تھے، وہی کیڑے ہمارے مذہب اور اخلاق اور معاشرت کی بنیاد کو کھا رہے ہیں جو اُن میں لگے ہوئے تھے ۔ ہاں اس میں شبہ نہیں ہے کہ زمانہ یا تہذیب الاخلاق، یا لکچروں اور آرٹیکلوں، یا بعض ذی ہمت مسلمانوں کی مردانہ کوششوں نے، ایک خفیف سی تحریک ترقی کی بعض طبیعتوں میں پیدا کر دی ہے، اور بعض جگہ کچھ غیر مستقل اور

ناپائدار ذریعے تعلیم و تربیت کے قائم ہو گئے ہیں۔ مگر دل و دماغ کی منتشر قوتوں کے یکجا نہ ہونے، اور متفقہ طاقت کو کام میں نہ لانے، اور کسی ایک مرکز پر رجوع نہ ہونے سے، وہ بھی ناتمام اور ناقص حالت میں ہیں۔ ایسی صورت میں یہ خیال نہایت غلط ہے۔ کہ قوم ایسی تحریروں سے مستغنی ہے جو ان مہلک خیالات اور ان دردناک حالات کی اصلاح کریں۔

بلکہ اگر ہم ذرا زیادہ غور، زیادہ انصاف، اور زیادہ ایمانداری سے نظر کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ہم نہ صرف پرانی بیماریوں میں مبتلا ہیں جن پر ہمارے طبیبوں کو توجہ کرنی چاہئے بلکہ بہت سی نئی بیماریاں ہم میں ایسی پیدا ہو گئی ہیں جو نہایت سخت اور مہلک ہیں۔ پرانی بیماریاں تو صرف جسمانی حالتوں پر اپنا اثر کرتی تھیں مگر نئے امراض سے جن کا زہر سارے کرۂ ہوائی میں پھیلا ہوا ہے روحانی زندگی کے تلف ہونے کا خوف ہے اور اس لئے ہم نہ صرف مشرقی امراض کے لئے معالجہ کے محتاج ہیں بلکہ ہم کو ایسے طبیب کی ضرورت ہے جو ہم کو مغربی بیماریوں سے بھی بچائے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زمانہ اور مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم اور انگریزی سوسائٹی نے ہم مسلمانوں میں ایک نئی بیماری پیدا کر دی ہے، جو تعصب اور جہل اور تقلید سے بھی زیادہ مہلک ہے، اور جس کا نام آزادی ہے۔ انگریزی تعلیم، اور مغربی تہذیب، اور یورپین خیالات سے پہلے مسلمانوں کی حالت دنیاوی اعتبار سے گو خراب تھی۔ اور علم و دولت، شائستگی اور عزت، کے لحاظ سے گو وہ بہت ذلیل حالت میں تھے۔ مگر اسلام باقی تھا، اسلامی عقائد دلوں میں جمے ہوئے تھے۔ اور گو ختنہ اور مہذبانہ نظر سے دیکھنے میں کیسے ہی نقص ان میں نکالے جاتے، مگر تاہم وہ اپنے مذہب پر ثابت قدم تھے اسلام کا ایک جوش ان کے سینوں میں موجزن تھا۔ فرائض اور واجبات کی پابندی سے اسلام کی صورت نظر آتی تھی، مگر اب حالت دوسری ہے۔ انگریزی تعلیم نے ہم کو انگریزوں کی عمدہ خصلتوں، اور پاکیزہ خیالوں، مردانہ کوششوں، اور شریفانہ عادتوں کا سبق تو دیا نہیں، ہاں ان کی ناپاک باتوں، وحشیانہ چلن، اور اخلاق کے تباہ کرنے والے طریقوں کا گرویدہ کر کے، وہ افسوسناک حالت پیدا کر دی ہے، جس کے لئے خود یورپ اپنی قوم پر ماتم کر رہا ہے، اور جس کے مٹانے کے لئے اس ملک کے عالی ہمت اور دانشمند اور پاک دل لوگ نہایت سرگرمی سے مصروف ہیں۔ کیا تہذیب الاخلاق قوم کی نظر یا خدا کی نگاہ میں اسلامی صحیفہ اور مسلمانوں کے لئے مفید سمجھا جاویگا اگر مسلمانوں کو تاریک اور گہرے غار میں گرنے سے نہ بچائے اور اسلامی عقائد کے بدلے ملحدانہ خیالات پیدا نہ ہونے کی کوئی تدبیر نہ کرے۔ کیا فائدہ ہوگا مسلمانوں کو اگر انھوں نے

ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کی تقلید چھوڑ دی اور بے سمجھے ڈارون اور بریڈلا کے پیرو ہوگئے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ عقائد اور اخلاق، اُن کے مراسم اور عادات، بہت کچھ خراب اور نہایت اصلاح کے محتاج ہیں، اور اُن کی غفلت اور کاہلی تعصب اور غرور نہایت افسوس کے لائق ہے، اور اُس سے اُن کو نکالنے کی بہت ضرورت ہے مگر جن لوگوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا ہے اُن کا بڑا فرض یہ ہے کہ اُن بیماریوں کے معالجہ میں نہایت احتیاط کریں اور ایک دُور اندیش تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح اپنے بیمار کی حالت دیکھتے رہیں ہم نے ڈاکٹروں سے سُنا ہے کہ کوئی دوا ایسی نہیں ہے جو ایک مرض کے لئے مفید ہو مگر خود اُس سے کوئی دوسری بیماری پیدا نہ ہو۔ اس لئے بڑا کام ایک لائق اور دُور اندیش اور بہی خواہ ڈاکٹر کا یہ ہے کہ صرف اُس بیماری کے دُور ہونے پر قناعت نہ کرے جس کا وہ علاج کرتا ہو بلکہ وہ زہریلا اثر اُس سے پیدا نہ ہونے دے جو بالطبع دواؤں سے پیدا ہوا کرتا ہے اور جو کبھی کبھی اصل بیماری سے بڑھ کر مہلک ہوتا ہے۔ اس لئے اگر تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کو اُن کی پرانی بیماریوں سے اچھا کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ تو یہ نہایت مبارک اور مردانہ کام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا یہ بھی بڑا فرض ہے کہ وہ اُن نئے امراض کے روکنے کی کوشش کرے، جن کو مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم پیدا کر رہی ہے اور جس کی وجہ سے مسلمان اسلام کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ کام اس اسلامی صحیفہ نے کیا۔ بلاشبہ وہ قوم کی نظر میں پسندیدہ ہوگا۔ عمدہ طور سے اُس کا خیر مقدم کیا جاوے گا مسلمانوں کی ترقی کا وہ نہایت اعلےٰ ذریعہ ہوگا۔ آنے والی نسلیں اُسے آنکھ سے لگاوینگی اور شکر کرینگی لیکن اگر اُس نے نئی تعلیم اور نئی تہذیب کی برائیوں سے قوم کو نہ بچایا، تو وہ بجائے برکت کے آفت۔ اور بعوض رحمت کے مصیبت ہوگا۔ اور ایک ایسے گروہ کا پیدا کرنے والا سمجھا جاوے گا، جو اپنے دین اور عقائد سے بےخبر، یورپ کے علوم وفنون میں ناقص، اپنے مذہبی مراسم کے تارک، انگریزی ناپاک رسموں پر چلنے والے ہونگے۔ الاترى

الا ترى ان قوما قد رزقوا من الفهم والتميز قد اخرجوا بذالك من جملة العامة ولم يحصلوا فى جملة الخاصة فهم لا يعرفون الله حق معرفته ولا يعرفون الاخرة علموا استبصارا، ولا يرضون الدين تقليدا وايمانا، فهم مذبذبون بين ذالك لا الى هؤلاء ولا الى هؤلاء يوحى بعضهم الى بعض زخرف القول

---

[۱] فرنگستان کا ایک حکیم جو مسئلہ ارتقا کا بانی ہے یعنی اس کا اعتقاد تھا کہ انسان اپنی حالت سے بتغیرات زمانہ اس شکل وصورت تک پہنچا ہے۔ ابتدا میں بندر تھا۔

غروراً، یعیبون الدین بالنات ویزرون علے اھلھا ویھلکون انفسھم وھم لا یشعرون"
کیا تم نہیں دیکھتے کہ بعض لوگوں کو سمجھ اور تمیز سے کچھ حصہ ملا ہے اور اس وجہ سے وہ عامیوں کے گروہ میں نہیں رہے لیکن خواص کے رتبہ تک بھی نہیں پہنچے۔ سو یہ لوگ خدا کو پہچانتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جو پہچاننے کا حق ہے اور آخر کو مجتہدانہ اور محققانہ طور سے نہیں سمجھتے اور مذہب کو تقلیداً اور محض اعتقاد کے طور پر پسند نہیں کرتے تو یہ لوگ مزخرف باتیں دھوکہ دینے کو لوگوں کو سناتے ہیں۔ سچے مذہب کو عیب لگاتے ہیں اور اس کے معتقدوں کی عیب گیری کرتے ہیں اور اپنی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں اور جانتے تک نہیں ۔

ندوۃ العلما و خیالاتِ اصلاح

جناب مولوی حافظ شاہ محمد حسین صاحب الٰہ آبادی موجودہ تعلیم کے نقصانات میں سے ایک نقصان یہ بتاتے ہیں، کہ "سابق کا علم کلام جو فلسفہ اور معتزلہ کی رو سے مملو ہے" اب نہ وہ معتزلہ رہے نہ وہ فلاسفہ۔ ان کے خیال بدل گئے۔ مگر اب علم کلام میں ابطال فلسفہ حال اور ردِّ نصاریٰ کے داخل کرنے کی ضرورت ہے! اور نیز ایسی کوئی کتاب اس تعلیم میں (یعنی موجودہ تعلیم میں) نہیں رکھی گئی جس سے احکام دین کے اسرار اور ان کی خوبیاں معلوم ہوں، حالانکہ زمانہ حال کے موافق اس کی بڑی ضرورت ہے"۔ صاحبو، یہ وہی خیال ہے جو ہمارے بزرگ سرسید کے پیشِ نظر ہے، اور یہ وہی نقص ہے جو ہماری موجودہ تعلیم میں نہایت بڑا اور بہت بڑا اور قابلِ اصلاح ہے ۔

مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی نے جو کچھ اپنی تقریر میں فرمایا، اُس کا بھی بعض حصہ سنانے کے لائق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ،،بہت سے ترقی خواہانِ اسلام کا یہ حال ہو رہا ہے کہ علوم جدیدہ جو نئی قوم کی حشمت و شوکت کا باعث ہیں پڑھنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں ضرور پڑھنا چاہیئے، مذہب اسلام مانع نہیں۔ مذہب اسلام ایسی ریتی کا گھر نہیں جس پر نئے فلسفہ کا ریلہ کچھ اثر کرے، اور نہ کبھی پچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے فلسفہ بدلتا رہا ہے۔ اور بدلتا رہیگا۔ پر آسمانی مذہب کچھ نہ بدلیگا۔ اسلام کا کوئی دنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیئت و ریاضی ہے

سلہ غالباً جناب مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب جلال الدین سیوطی کا رسالہ موسوم الہیئۃ السنیہ ملاحظہ نہیں فرمایا جس میں اسلامی علم ہیئت قرآن مجید و حدیث کے مطابق لکھا ہے ۔ (مدیر احمد)

وہ تو صرف انسان کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنے والا ہے اس کے ضمن میں بطور اثبات قدرت آسمان و زمین اور دیگر کائنات کا مخلوق الٰہی ہونا بیان فرمایا ہے جس سے اُس قادر مطلق کی بے انتہا قدرتوں کا ثبوت ہوتا ہے۔ اسی طرح تاریخ کا بھی بطرز مورخانہ ذکر نہیں لیا ہے، بلکہ انہیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لئے عبرت و حیرت پیدا کریں۔ اگر بطلیموس کی ہیئت ثابت ہو جائے۔ تو کیا، اور فیثاغورس کی قائم ہو جائے تو کیا، جزو لا یتجزا سے باطل ہوا تو کیا، اور ثابت ہو گیا تو کیا۔ خلا ہر کا بطلان ہوا، تو کیا، اور اثبات ہوا، تو کیا۔ ہمارے بزرگوں نے یونانی فلسفہ کے حملے رد کرنے کے لئے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل کئے تھے جن کو آج کل محض جودت طبع کے لئے ہم لوگ پڑھتے ہیں، نہ وہ ہمارا مذہب تھا، نہ کتاب و سنت اور مشکوٰت نبوت کا فرمودہ تھا۔ سب کچھ بگڑ جائے تو ہماری بلا سے۔"

صاحبو ان دو بزرگ عالموں کی تقریر سے آپ خیال کر سکینگے، کہ ایک رائے تو یہ ہے کہ فلسفہ حال کے ابطال کے لئے نئے علم کلام کی ضرورت ہے اور دوسری رائے یہ ہے، کہ اسلام میں نہ کوئی دنیاوی فلسفہ ہے۔ نہ قرآن میں ہیئت ریاضی اور طبعیات کے مسائل کا بیان ہے اور نہ اُس میں واقعات کا ذکر بطور تاریخ کے مورخانہ طرز پر کیا گیا ہے۔ بلکہ اسلام صرف انسان کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لئے ہے۔ اس کے ضمن میں بطور اثبات قدرت، آسمان و زمین اور دیگر کائنات کا مخلوق ہونا بیان کیا گیا ہے۔ وہ کوئی ہیئت اور طبعیات کی کتاب نہیں۔ ہے جس سے ہم یہ رائے قائم کر سکیں، کہ پرانی ہیئت صحیح تھی یا حال کی، اور نسبت موجودات اور کائنات عالم کے اسلام پرانی تحقیقات کے مطابق ہے، یا اس زمانہ کے۔ اس لئے کہ مطابقت اور مخالفت تو اسی وقت خیال کی جا سکتی ہے، جبکہ دونوں میں ایک ہی چیز کا بیان ہو مثلاً کہہ سکتے ہیں، کہ پرانی ہیئت حال کی تحقیقات کے خلاف ہے، یا عیسائی مذہب کے عقائد قرآن کے مخالف ہیں۔ اس لئے دونوں کا موضوع اور مقصود ایک ہے، مگر جبکہ یہ بات مان لی گئی، کہ قرآن کوئی کتاب علم ہیئت اور طبعیات کی نہیں ہے، نہ اُس میں واقعات کا ذکر مورخانہ طور پر کیا گیا ہے۔ تو پھر کوئی دقت ہی باقی نہیں رہتی، اور نہ مسائل جدیدہ کے ابطال یا تطبیق کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس بڑی بحث کا جو متعلق مذہب اور علوم جدیدہ کے ہے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہونگے جن کو وہ بحث[۵] جو آسمان

۵؎ بیس برس ہوئے جب سر سید احمد خاں بہادر نے تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون بنام تفسیر السموات لکھا تھا اور جس کا ٹکڑا خود نقل ہوا تھا وہ دیکھنے کے لائق ہے اور وہ تبدیلی جو اب ۱۸۹۲ء کے خیالات میں ہوئی ہے غور کے قابل ہے اگر وہ خیالات جو اب ظاہر کرنے میں اُس وقت ہوتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا اور بیچارے سر سید کی تکفیر کی نوبت کیوں آتی (حاشیہ بقیہ بر صفحہ ۳۰۳)

کی نسبت ایک مدت تک ہوتی رہی خوب یاد ہوگی۔ جو ثبوت آسمانوں کے وجود کا قرآن مجید سے پیش کیا گیا جن دلائل سے اُن کا ماننا بطلیموسی ہیئت کے موافق لازم سمجھا گیا، اور جس شدومد سے اُس کے نہ ماننے والوں پر کفر کے فتوے جاری ہوئے، جو غالباً وہ سب آپ کے پیش نظر ہونگے ان تمام مباحثوں کی بنیاد صرف اس بات پر تھی کہ جو کچھ بیان آسمانوں کا قرآن میں ہے، وہ گویا اُسی طور پر ہے جیسا کہ علم ہیئت میں کیا گیا ہے۔ اگر اُس وقت یہ خیال ہوتا کہ قرآن علم ہیئت کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اُس میں آسمان و زمین کا ذکر بطور اثبات قدرت کے کیا گیا ہے۔ تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا، بہت سے مسلمانوں پر کفر کے فتوے کیوں جاری ہوتے، اور یہ دونوں خیال کہ آیا آسمان ایک جسم ہے جو نہایت مضبوط اور سخت ہے اور وہ ایک مکان کو گھیرے ہوئے ہے، اور مثل کرہ کے گول اور اندر سے خالی ہے۔ یا آسمان وہ چیز ہے جو اونچی اور نیلی ہم کو دکھائی دیتی ہے جس میں ہوا چلتی ہے، بادل اٹھتے ہیں، اور اس کی وسعت میں پرندے اُڑتے ہیں کیوں ایسے جدا جدا سمجھے جاتے، کہ ایک تو قرآن کے مطابق کہا جاتا اور دوسرا قرآن کے خلاف۔ پہلے کا ماننے والا تو مسلمان سمجھا جاتا، اور دوسرے خیال کا رکھنے والا منکر قرآن ؛

لیکن گو یہ خیال کہ قرآن علم ہیئت و طبعیات کی کتاب نہیں ہے۔ اور اسلام میں علمی مسائل کا بیان یا تاریخی واقعات کا ذکر مورخانہ طور پر نہیں کیا گیا، صحیح ہو۔ اور گو اس سے بہت سی مشکلات

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۳۰۲) وہی بات جو بیس برس اول انہوں نے کہی تھی اب ہمارے علما فرماتے ہیں ہم سیدھے مضمون تفسیر السموٰت کو یوں شروع کرتے ہیں ہم کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ علمائے اسلام نے کوئی خاص علم ہیئت ایسا مقرر کیا ہے جسکی بنا قرآن مجید یا حدیث پر ہو جہاں تک ہم کو معلوم ہے وہ یہی ہے کہ جو علم ہیئت یونانی حکیموں نے اختیار کیا تھا وہی بعینہ بذریعہ ترجموں کے جو یونانی زبان سے عربی زبان میں ہوئے ہم مسلمانوں میں بھی پھیل گیا۔ جب قرآن مجید کی تفسیریں لکھی گئیں اور قرآن مجید کی کسی آیت میں کوئی ایسا مضمون آیا جو علم ہیئت سے علاقہ رکھتا تھا تو انہوں نے اُس کی تفسیر اُسی یونانی علم ہیئت کے اصول پر کی یا شک کہ قرآن مجید میں سات آسمانوں کا ذکر تھا اور یونانی نو آسمان مانتے تھے تو علمائے اسلام نے اُن سات آسمانوں میں عرش اور کرسی کو ملا کر پورے نو کر دیئے پس ہم سمجھتے ہیں کہ علمائے اسلام نے یونانی علم ہیئت کو تسلیم کیا اور اسی کے اصول کو مذہبی کتابوں اور قرآن مجید کی تفسیروں میں داخل کر دیا یا رفتہ رفتہ وہ مذہب کے ساتھ اور مسائل مذہبی میں ایسا مل گیا کہ یونانی علم ہیئت سے انکار کرنا گویا مسائل ضروریہ مذہب کے انکار کرنا خیال میں سما گیا پس جس قدر کہ ہم کو انکار ہے اُنہی مسائل علم ہیئت یونانیہ سے ہے جن کو علمائے اسلام نے مسائل مذہبی و تفسیر قرآن مجید میں شامل کیا ہے ؛

دُور ہو سکتی ہوں۔ مگر اس میں شبہ نہیں ہے، کہ جب جزئیات پر نظر کی جائے، اور مسائل مذہبی سے تفصیلی بحث ہو، تو یہ اجمالی خیال اس تناقض کے دُور کرنے کے لئے کافی نہ ہو گا جو اسلام اور حال کے علم میں بظاہر پایا جاتا ہے، بلکہ اُس کے لئے جیساکہ مولوی شاہ محمد حسین صاحب نے فرمایا بالضرور نئے علم کلام کی ضرورت ہوگی۔ مگر اس کے لئے لازم ہے کہ علم جدیدہ سے بخوبی واقفیت ہو، اور علمی مسائل کا علم کامل طور پر ہو۔ اور ایسی واقفیت نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ کتابیں نہ دیکھی جاویں جو ان علوم میں تصنیف کی گئی ہیں، اور اُس کے لئے ضرور ہو گا کہ یورپ کی زبانیں سیکھی جاویں۔ اس لئے کہ جس طرح خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں یونان اور فارس کی علمی کتابیں ہماری زبان میں ترجمہ ہوگئی تھیں، اُس طرح اب ترجمہ کی ہوئی کتابیں تو مل نہیں سکتیں، اور اگر کسی نے اردو یا عربی میں کوئی ایک آدھ کتاب کا غلط سلط ترجمہ کر لیا، اُس سے آدمی اصل علم سے واقف نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے اب علوم کی اس قدر ترقی ہے اور اس کی اس قدر شاخیں ہوگئی ہیں، اور اس کثرت سے کتابیں روزانہ تصنیف ہوتی جاتی ہیں۔ کہ بغیر اصل زبان کے جاننے کے ترجمہ سے کبھی کام نکل ہی نہیں سکتا۔ مگر میں اس بات کے دیکھنے سے خوش ہوں، کہ ندوۃ العلماء اس سے بے خبر نہیں ہے! اور وہ اصل زبان میں علوم کے حاصل کرنے کی ضرورت سے واقف ہے۔ مولوی منصور علی خاں صاحب لکھتے ہیں کہ "چند علمائے اہل اسلام جو معقول او منقول اچھی جانتے ہوں، اور استدلالی قوت عمدہ رکھتے ہوں اگر زبان انگریزی میں بھی مہارت پیدا کر کے جوابات مخالفین لکھا کریں، اور انگریزی اخبار تائید اسلام میں جاری کریں، تو اہل اسلام کو بڑی ترقی اور کامیابی حاصل ہوگی"۔ اس تحریر کو دیکھ کر ان لوگوں کو تعجب ہو گا جو کہ مسلمان عالموں پر عموماً تعصب کا الزام لگایا کرتے ہیں، بلکہ اس سے زیادہ ان کو مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی کی تقریر کے بعض مقامات پر حیرت ہوگی، کہ وہ نہ صرف علوم و فنون جدیدہ کے حاصل کرنے کی ضرورت بتاتے ہیں، بلکہ اب تک جو غفلت مسلمانوں نے کی اس پر اس طرح افسوس کرتے ہیں کہ "تخمیناً پچاس برس سے نئے علوم اور جدید فنون جو فاتح اور حکمران قوم کے ساتھ آئے اُن سے بھی ہماری بدنصیبی نے حصہ نہ لینے دیا، ایک تو افلاس تباہی، اس پر نفاق اور جہل نے، اور بھی رہی سہی عزت اور دولت کو برباد کر دیا"۔

اے حضرات، اگر ہم کو یہ بدنصیبی دامنگیر نہ ہوتی او گذشتہ پچاس برس میں بقول مولوی عبدالحق صاحب کے، ہم نئے علوم اور جدید فنون سے ناواقف نہ رہتے۔ تو قطع نظر اس کے کہ ہماری دنیاوی عزت ہاتھ سے نہ جاتی، ہم اب تک بہت سے عالم اپنی قوم میں ایسے دیکھتے،

جو علوم دینی تفسیر اور حدیث کو بھی محققانہ طور پر جانتے ہوتے، اور علوم و فنون جدیدہ سے بھی بخوبی ماہر ہوتے، عربی زبان میں بھی اُستادی کا فخر اُن کو حاصل ہوتا، اور یورپ کی زبانوں میں بھی کامل ہوتے! اور اس علم کلام میں جس کی اب ضرورت بیان کی جاتی ہے اب تک ہم بہت سی کتابیں موجود پاتے۔ کیا خوب فرمایا ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے، کہ کسی مذہب کی تردید کرنا قبل اس کے کہ اُس کو سمجھیں اور اُس کی حقیقت سے مطلع ہوں اندھیرے میں تیر چلانے ہیں، اور بے سمجھے بوجھے محققہ مسائل کو غلط کہہ دینا، اور جو باتیں علم کی دلائل ہندسیہ کی طرح مستحکم دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہیں، ان کو نہ ماننا مذہب کی حمایت نہیں ہے؛ بلکہ ایسی حمایت کرنے والوں کو وہ اسلام کا جاہل دوست سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی ایک کتاب میں فرماتے ہیں[1] کہ "ریاضیات میں ایک آفت اسلام کے جاہل دوستوں سے پیدا ہوئی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ دین کی فتحیابی یہ ہے، کہ جو علم فلاسفہ کی طرف منسوب ہو، اس سے انکار واجب ہے اس لئے انہوں نے جملہ علوم فلاسفہ سے انکار کیا ہے! اور ان کی جہالت نے ان کو یہاں تک آمادہ کیا ہے، کہ جو کچھ فلسفیوں نے کسوف و خسوف کے باب میں لکھا ہے اُس سے بھی انکار کیا، اور یہ سمجھا کہ اُن کے یہ اقوال بھی خلاف شرع ہیں؛ جب یہ بات ایسے شخص کے کان میں پڑتی ہے۔ جس کو یہ امور دلیل قطعی سے معلوم ہو چکے ہیں، تو اُس کو اپنی دلیل میں تو کچھ شک پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام اس دلیل قطعی کے انکار اور جہل پر مبنی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ فلسفہ کی محبت اور اسلام کی طرف سے بغض روز بروز ترقی پاتا ہے پس جس شخص نے یہ گمان کیا۔ کہ ان علوم کے انکار سے اسلام کی نصرت ہو گی، اس نے حقیقت میں دین اسلام پر سخت ظلم کیا۔" دوسرے مقام پر وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ان مسائل محققہ علم ہیئت پر ہندسہ و حساب کی رو سے ایسے دلائل قطعی قائم ہو چکے ہیں کہ ان میں شک کی گنجائش نہیں ہے، جو شخص ان دلائل سے واقف ہو، اور اُس نے ان کی خوب تحقیق کر لی ہو، اور وہ حساب کی رو سے کسوف خسوف کی پہلے سے خبر دیدے، اور یہ بھی بتا دے، کہ کس قدر اور کتنی دیر تک کسوف اور خسوف رہے گا۔ اس کو اگر یہ کہا جائے کہ تمہارا قول خلاف شرع ہے، تو اُس کو اپنے قول کے یقینی ہونے میں تو شک ہونے سے رہا، ہو نہ ہو شرع کی صداقت میں ہی اُس کو شبہ پیدا ہو گا، پس بقول شخصے کہ جاہل دوست سے عاقل دشمن بہتر ہے، جو لوگ شرع پر معقول طریقہ سے طعن کرتے ہیں، اُن سے مذہب اسلام کو اس قدر ضرر نہیں پہنچتا جس قدر ان لوگوں سے پہنچتا ہے جو بے ڈھنگے طور پر شرع کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔" پھر اس کے آگے امام صاحب نے ایک حدیث کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ "اگر کوئی کہے کہ

[1] دیکھو تہافۃ الفلاسفہ اور منقذ من الضلال۔

کسوف و خسوف کا اس طور پر ماننا اُس حدیث کے الفاظ کے خلاف ہے، جس کے یہ الفاظ ہیں۔ کہ جب کسی شے پر اللہ تعالےٰ کی تجلی ہوتی ہے، تو وہ شے اُس کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ اول تو ان زاید الفاظ کی صحت مشتبہ ہے اندریں صورت راوی کی تکذیب واجب ہے، اور اگر یہ روایت صحیح بھی ہو، تو امور قطعیہ کے انکار کی بہ نسبت ایسی روایت کی تاویل کرنا مستحسن ہے۔ بہتیری جگہ بعض ایسے دلائل قطعیہ کی وجہ سے جو وضوح میں اس حد تک نہیں پہنچتے تھے۔ جس قدر دلائل دربارہ کسوف خسوف پہنچتے ہیں ظاہر آیات کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔" غرض کہ یہ امر کہ حال کے علمی مسائل پر غور کیا جائے اور اُس کی تردید یا تطبیق مذہبی مسائل سے کی جائے بلاشبہ نہایت ضروری امر ہے۔ اور اس کے لئے اُن علوم کا سیکھنا لازم ہے اور ہمارے تمام عالموں پر یہ فرض کفایہ ہے۔

مگر حضرات میں اس بات سے انکار نہیں کرتا، کہ ہمارے بعض یا اکثر علماء کو مغربی علوم و فنون سے نفرت نہیں ہے، یا وہ انگریزی تعلیم کو حرمت اور کراہت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بلاشبہ اکثر اُس سے نفرت، اور اُسے بُرا جانتے ہیں لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ ان علوم کو اب تک وہ علوم ہی نہیں سمجھتے، ان کا تو یہ خیال ہے کہ جس طرح نقلی علوم قرآن اور حدیث میں جمع ہیں، اور اُس کی تفسیر اور تفصیل پچھلے علماء پر ختم ہو گئی، اسی طرح فلسفہ اور معقولات کا علم ارسطو پر ختم ہو گیا، اور فارابی اور بوعلی اُس کی تشریح کر چکے اُن کے اقوال و خیالات کے جمع کرنے سے پچھلے مصنفوں نے ہم کو فارغ کر دیا جس طرح علم دین میں اب کوئی نئی بات نہیں نکال سکتا، اور نہ نئی شریعت کوئی لا سکتا ہے اُسی طرح فلسفہ اور حکمت میں اب کوئی بات نہیں کر سکتا، نہ کسی علم و حکمت سے کوئی نئی بات معلوم ہو سکتی ہے جو نئی باتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ چند سودائیوں کے مہمل خیالات ہیں جو دُوربینوں[1] اور نئے آلات سے غلطیوں میں پڑ گئے ہیں۔

مگر حضرات، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اور نہ صرف ہماری ہی یہ حالت ہے۔ بلکہ ہم اگر یورپ کی گذشتہ حالت کو دیکھیں، اور اُس زمانہ کی جو مڈل ایجز (یہ زمانہ چوتھی صدی عیسوی سے چودھویں صدی تک سمجھا جاتا ہے) کے نام سے پکارا جاتا ہے تاریخ پڑھیں، تو ہم کو معلوم ہوگا۔ کہ اُس زمانہ میں یورپ کی حالت ہمارے بدتر سے بدتر زمانہ سے بھی زیادہ ابتر اور خراب تھی اور جن افسوسناک غلطیوں میں ہم پھنسے ہوئے ہیں، اُس سے ہزار درجہ بڑھ کر یورپ کے عالم پھنسے ہوئے تھے۔ اس وقت ان میں بھی دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو صرف منقولی تھے، اور

[1] میں نے لاہور کے ایک مشہور طبیب کو خود یہ بات کہتے ہوئے سنا کہ جس خوردبین سے پانی میں یا نطفے میں کیڑے نظر آتے ہیں یہ اُس کی بناوٹ کا نقص ہے ورنہ پانی میں نطفے میں کیڑے کہاں۔ ۱۲ از منہ وسطےٰ

علم کی جانچ مذہبی روایت سے کرتے تھے جس بات کو وہ اپنے مانے ہوئے مسائل کے خلاف پاتے، اُسے صرف اسی بنیاد پر کہ وہ مذہب کے خلاف ہے باطل سمجھتے، اور اُس کے ماننے والے کو کافر ٹھیراتے۔ دوسرے جو معقولی تھے، مگر فلسفہ اور علم میں بھی کسی جدید بات کو نہ مانتے، بلکہ ہر علمی مسئلہ کے لئے بھی کسی اگلے حکیم یا عالم کی رائے کی سند چاہتے تھے۔ ایک نامی مؤرخ یورپ کا لکھتا ہے۔ "تیسری صدی عیسوی کے ختم پر جبکہ عیسائیت کا غلبہ ہونے لگا یونانی فلسفہ کا زوال برابر ہوتا چلا گیا۔ ایجاد و تحقیق کی قوت دماغوں سے جاتی رہی، بجائے موجد اور محقق عالموں کے صرف ان کے اقوال کی شرح کرنے والے رہ گئے، اور بجائے اس کے کہ خود حق کی تحقیق کریں اور اپنی دماغی قوت کو کام میں لاویں۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو بڑا معقولی اور فلسفی سمجھتے، اپنی رائے کی تائید قدما کے اقوال اور آثار سے کرتے، اور افلاطون اور ارسطو کی اصلی یا منسوب الیہم آراء کو حق کا معیار سمجھنے لگے۔ اُس زمانہ میں علماء اس طرح عمل کرتے تھے، گویا نسل انسانی میں اصلی تحقیقات اور دریافت کرنے کا کبھی رواج ہی نہیں ہوا۔ اور گویا وہ حقائق جو دنیا کو معلوم ہیں غور اور فکر اور تحقیق اور تجسس کے نتیجے نہیں ہیں۔ بلکہ قدیم زمانہ میں بطور وحی کے آسمان سے نازل ہوئے ہیں"۔ یہ خیال جو اُس زمانہ کے لوگوں میں پیدا ہوا، اور یہ طرز جو اُنہوں نے علم میں اختیار کیا، وہ نتیجہ تحقیق کے چھوڑنے اور تقلید کے اختیار کرنے کا تھا۔ جب یورپ مذہبی باتوں میں تقلید پر مجبور کیا گیا، اور بحث اور تحقیق کی راہ سے روک دیا گیا۔ تو اُس کا اثر لازمی یہ تھا، کہ آہستہ آہستہ دماغوں سے ایجاد کی قوت اور تحقیق کا خیال جاتا رہے، اور ان لوگوں کی رایوں اور خیال کا جاننا ہی علم سمجھا جائے جو لوگ علم کے موجد اور محقق تھے۔ جب آزادی کے ممتاز خیالات حکومت یا مذہب کے حکم سے بند کر دیئے جاتے ہیں، تو بتدریج تحقیق کی قوت ہی زائل یا ضائع ہو جاتی ہے، اور علوم اپنی جگہ پر قائم اور شست ہو کر پیچھے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ جب آدمی صرف علمی اصطلاحات کو بغیر اِس کے کہ اُس کے ساتھ علم کی اصلی حقیقت کا خیال رکھے یاد کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔ اور جب کہ علمی اصول اور فلسفی مسائل اس طرح مانے جاتے ہیں۔ گویا وہ بھی ایک قسم کی روائتیں ہیں، نہ کہ امور یقینی اور جبکہ بجائے دیکھنے کے صرف کہنے پر ایمان رہ جاتا ہے۔ اور جب کہ علم سمجھا جاتا ہے کہ وہ پچھلے دانشمند لوگوں کی محض رایوں کا ایک مجموعہ ہے، نہ یہ کہ علم ان زندہ قوانین کا بیان ہے جو ہماری دنیا پر حکمران ہیں۔ تب لامحالہ یہ صورت پیدا ہوگی، کہ آدمیوں کے ہاتھ سے علم کی گرفت نکل جائے گی۔ اور وہ علم جس کو زمانہ سلف کے بڑے بڑے محققین نے تاریکی سے روشنی کی طرف نکالا تھا پھر تاریکی کی طرف جانے لگے گا۔ ایسی حالت میں یہ قابلیت باقی نہیں رہتی، کہ ان علمی حقائق اور فلسفی مسائل کو جن کو پر زور دماغوں نے نکالا تھا، یہ بوڑھے اور کمزور دماغ

آگے بڑھائیں اور ترقی دیں۔ بلکہ اُس میں اتنی بھی قوت باقی نہیں رہتی، کہ جس تاریکی سے علم نکل کر آیا تھا، پھر اُس تاریکی میں واپس جانے سے اُسے روکیں۔ اسی وجہ سے یورپ کی اُس زمانہ میں یہ حالت ہوگئی، کہ بجائے نئی باتوں کے ایجاد کرنے کے پرانے حکیموں کی رایوں کا جمع کرنا ہی لٹریچر میں ایک باوقعت جگہ پانے لگا، اور بجائے خود دلیل لانے کے ارسطو اور افلاطون وغیرہ حکیموں کے اقوال کو سند میں پیش کرنے لگے، اور جس طرح یہ کہنا کہ بائبل میں یہ لکھا ہوا ہے، ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کا حوالہ دینے لگے۔ اس زمانہ کے عالم حکیموں کے اقوال کو اس طرح جمع کرتے جس طرح محدث روایتوں کو جمع کرتے ہیں۔ نہ اپنی عقل کو کام میں لاتے، نہ اُس کی تنقید کرتے مگر ایسے اقوال کو اس طرح پر بیان کرنا، کہ گویا یہ اقوال مسائل طبعیات کے ثبوت کے لئے بڑے مستحکم دلائل ہیں۔ اس بات کی شہادت ہے، کہ وہ علم کو بہت سرسری نظر سے دیکھتے تھے۔ اور بہت ہی سطحی طور پر سمجھتے تھے۔ نہ اُس کے سمجھنے کی فکر کرتے، اور نہ اُس کی قوت رکھتے فقط کسی بڑے کی رائے سمجھ کر اُسے مان لیتے، مگر علمی مسائل میں فقط سند کافی نہیں ہوتی ہے۔ ایسی سندیں اور بڑے بڑے آدمیوں کی رایوں کے حوالے، مذہبی باتوں میں بلاشبہ قابل وقعت ہیں، مگر علم میں اُس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ علمی کتابیں جو اُس زمانہ میں تصنیف ہوئیں، اس بات پر شاہد ہیں کہ فلسفیانہ دماغ باقی نہ رہے تھے۔ اور سوائے رایوں اور قولوں کے خلاصوں کے، فلسفہ کی جان کسی کتاب میں پائی نہیں جاتی۔ درحقیقت ایسی کتابوں کی غذا علم کا خون چوس کر ہوتی ہے۔ اور ان کی مثال ان کیڑوں کی سی ہے جو کسی جاندار کی لاش کے سڑنے سے پیدا ہوتے ہیں ؎

حضرات یہ نہ سمجھنا کہ علم وفلسفہ کے تنزل اور مصیبت کا خاتمہ اسی پر ہوگیا، کہ بجائے تحقیق کرنے والوں کے تشریح کرنے والے پیدا ہوتے، اور تصنیف کی قوت جاتی رہنے سے فقط شرح لکھنا رہ گیا۔ بلکہ یہ حالت بھی غنیمت تھی۔ اس لئے کہ یہ شارحین اگرچہ غلامانہ اطاعت ارسطو اور افلاطون کی کرتے تھے، مگر ان میں جودت اور ذہانت کی جو ملک پائی جاتی تھی، وہ حکماء سلف کے خیالات ثابت کرنے کے لئے اپنی ذکاوت اور تیزیٔ طبیعت سے کوئی نہ کوئی وجہ نکال لیتے تھے، اور اگرچہ حقائق کے ادراک اور نئی چیزوں کی ایجاد کی قوت نہ رکھتے تھے تاہم وہ کسی حکیم یا فلسفی کی رائے اور قول سے مخالفت کو اگر کر سکتے بُرا نہ جانتے تھے لیکن کچھ زمانہ کے بعد اُس حالت میں بھی تبدیلی ہوگئی، اور جن غلاموں نے اپنے تئیں پرانے جوئے میں لگا دیا تھا، وہ یہ جوا زبردستی اوروں کے گلے میں ڈالنے لگے۔ ذہن کی جس تیزی نے بعض مسلم تصانیف میں جو کچھ حقائق دریافت اور درج کئے تھے، چاہا کہ کسی آدمی کو اُن حقائق کے سوا اور

کچھ نہ ملے، اور ان تصنیفات کے باہر کسی چیز کو وہ نہ دیکھ سکیں اور اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء اور حکماء بغیر اس کے کہ خود اپنے آپ کو غلامی سے آزاد کریں مطلق العنان اور جابر بادشاہ ہو گئے۔ اور شارحین کی حیثیت میں اُنہوں نے مذہبی تحکم کی حیثیت اور زیادہ کی جب حکومت نے آزادی کو معدوم کر دیا اور قومی عزت اور عظمت جو ہمیشہ آزادی سے پیدا ہوتی ہے جاتی رہی اور بجائے شگفتگی اور جوش کے لوگوں پر افسردگی چھا گئی۔ اُس نے اس دماغی ضعف کو جو مذہب کے غلبہ سے پیدا ہونے لگا تھا اور بڑھا دیا۔ اور رفتہ رفتہ اُسے ایسا منجمد کر دیا، کہ تحریک کی قوت بالکل جاتی رہی آدمی تجربے سے مشورہ کرنا بھول گئے، نئے حقائق کے دریافت کرنے سے جی چرانے لگے، اور نہ صرف جی چرانے لگے بلکہ اُسے ممنوع اور مکروہ اور ناجائز سمجھنے لگے۔ اس لئے کہ جب منطق اور فلسفہ مذہب میں داخل ہو گیا، اور استدلال کا طریقہ مذہبی عقائد میں شروع ہوا، اور تردید یا تطبیق کے لئے حکمت و فلسفہ کے اصول اور مسائل، دینی کتابوں میں داخل ہوئے، اور ان میں ایسا خلط ملط ہو گیا، کہ ایک کا دوسرے سے پہچاننا اور تمیز کرنا مشکل ہوتا۔ ایسی حالت میں لازمی نتیجہ تھا، کہ یہ علمی مسائل بھی مذہبی مسائل سمجھے جاتے۔ اور پھر آئندہ اُس میں بھی تحقیق بدعت اور اُس کا انکار کفر خیال کیا جاتا چنانچہ یہی ہوا۔ مذہب نے اپنی حکومت نہ صرف مذہبی مسائل پر محدود رکھی، بلکہ تمام علوم کو اپنا ماتحت اور تمام حقائق کو مذہب کا جزو قرار دیا جس طرح کہ مذہب نے اپنے دائرہ کے اندر نہایت زبردست اور اعلیٰ حاکم کی طرف سے سند حاصل کی تھی، اور تمام چیزوں کو احکم الحاکمین کی طرف سے سمجھتے، اسی طرح فلسفہ کو بھی مذہب کی شاہنشاہانہ قوت کو شریک کر لیا اور اُس کے مسائل سے انحراف کرنا بھی جائز اور قابل الزام قرار دیا گیا غلطی کا خیال نشان خیانت، اور تحقیق کا ارادہ بدعت سمجھا گیا مسلم شدہ انسانی اصول سے انحراف اور بدعقیدگی ویسی ہی معیوب ہو گئی، جیسے قول ربانی سے انحراف، غرضیکہ جس علم کو معقولات سمجھتے وہ بھی منقولات میں داخل ہو گیا۔

الحاصل اُس فرقے کی جو اپنے آپ کو معقولی سمجھتا معقولات میں یہ کیفیت تھی۔ اس سے اندازہ کرنا چاہئے، کہ وہ فرقہ جو اپنے آپ کو منقولی اور مذہبی سمجھتا اُس کی کیا حالت ہوگی۔ صاحبو۔ نہ اب اتنا وقت ہے اور نہ اُس کا موقع، کہ میں اس کا کچھ مفصل حال بیان کر دوں۔ مگر مختصراً اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ فرقہ پہلے فرقہ کا بھی دشمن اور اُس کا مخالف۔ اور سوائے مذہبی روایت کے عقل اور علم کے نام سے متنفر تھا۔ اُنہوں نے نہ صرف اخلاقی باتوں میں بلکہ تمام چیزوں میں مذہب کو معیار صدق ٹھرایا اور اس بات کا دعویٰ کیا، کہ جو کچھ خدا اپنے بندوں کو سکھانا چاہتا تھا وہ بذریعہ وحی کے سکھا چکا، اور جتنا علم انسان کو حاصل ہونا ممکن تھا، وہ بذریعہ ربانی الہام کے اُن کو بتا دیا گیا۔ اُنہوں نے اشتہار دیا کہ اُن کی مقدس کتابیں گویا علم کی حدود ہیں، اور اس علمی اجارہ میں اُن کے

پادری سلطنت کی حمایت سے کسی حریف کی رقابت گوارا نہ کرینگے پس اس طور پر علم مکروہ اور حرام اور ممنوع قرار دیا گیا۔ اور بحکم مذہب حکمت اور فلسفہ کی تعلیم بند کر دی گئی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مذہب جو آج اپنے آپ کو علم کا حامی کہتا ہے، ہزار برس تک علم کا مخالف اور اس کا دشمن اور ان کی ترقیوں کا مانع اور مزاحم رہا، ظلمت کو ترقی ہوتی رہی۔ اور جو آفتیں اس کے سبب سے علم پر آئیں، اور جو ہولناک سزائیں عالموں اور حکیموں اور فلسفیوں اور ان لوگوں کو جو نئی تحقیقات کرتے یا کچھ بھی اُن کے اعتقادات کے خلاف زبان سے نکالتے، دیجاتیں۔ اس وقت اُن کے خیال کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں علم کے ساتھ اس مذہب کو ایسی عداوت ہو گئی، کہ اُس نے نہ صرف آئندہ کے لئے علم کی ترقی روکی، بلکہ پرانی علمی یادگاروں کا باقی رہنا بھی گوارا نہ کیا، اور جب تک سارے علمی خزانے برباد نہ کر لئے اور تمام علمی یادگاروں کو مٹا نہ دیا، تب تک چین نہ آیا۔ چنانچہ اسکندریہ کے بشپ نے اسکندریہ کو اس مضمون کا فرمان شاہی بھجوایا، کہ سریپین جو مشہور کتبخانہ تھا منہدم کر دیا جاوے، اور اُس عظیم اور قدیم کتبخانہ کو جسکو بطلیموس کے خاندان نے جمع کیا تھا، اور سیزر کی آگ سے بچ رہا تھا اس جاہل متعصب پادری نے نیست نابود کر دیا۔ اس مذہبی جوش نے جس کو علم پر اور تعصب کو عقل پر اتنا غالب کر دیا تھا کہ جو دردناک واقعات اُسوقت اُس سے پیدا ہوئے آج اُس پر یقین کرنا کیسا، کوئی اس کو حکایت و افسانہ سے بڑھکر تاریخی واقعات بھی نہیں مان سکتا۔ چنانچہ سینٹ سِرل جس نے حضرت مریم کی پرستش کو رواج دیا، ایک عورت ہپاشا نامی کو جو حکمت کی عالم متبحر اتھی، اور جو علمی مضامین پر لکچر دیتی، اور کتابیں تصنیف کرتی تھی، اور جس کے سبب سے اس متعصب پادری کو صدمہ پہنچتا تھا۔ ایک دن جبکہ وہ مدرسہ کو جا رہی تھی اپنے پادریوں سے پکڑوایا۔ جنھوں نے اُس کو بیچ بازار میں مادرزاد ننگا کیا اور گرجے میں لے جا کر پیٹر کی لٹھ سے اُس کا سر تڑوایا۔ اور اُس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُس کے گوشت و پوست کو چھیل کر اُس کی ہڈیوں کو آگ میں جھونک دیا۔ اس واقعہ کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ کا اسکندریہ سے چرچا اُٹھ گیا، اور اُس علم کا جس کی اشاعت کے لئے بطلیموس اور اُس کے خاندان نے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، اس طور پر خاتمہ ہوا۔ سریپین ... ... کا کتب خانہ تو برباد ہو ہی چکا تھا، جو کچھ اُمنگیں فلسفہ اور حکمت کی تحصیل کی باقی تھیں، ان کو ہپاشیا ... ... کے عبرت انگیز واقعہ نے ٹھنڈا کر دیا، اور انسانی خیال کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ ایتھینس ... ... پر یہی آفت آئی اور فلسفہ کا بھی یہی حال ہوا۔ اُس شہر کے تمام مدارس توڑ دئے گئے، اور فلسفہ کی تعلیم کی قطعی ممانعت کی گئی۔ اور تمام علم و حکمت کا مدار مقدس

کتابوں پر رکھا گیا، اور وہی تمام فلسفہ اور علوم کی کسوٹی قرار دی گئیں، اور تمام علوم یہاں تک کہ تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، طبقات ارض، اور دیگر علوم کی شاخیں اس میں چسپاں کر دی گئیں، اور دلائل کا نیا ڈھنگ نکالا گیا یعنی بجائے اُس کے کہ عقلی دلیل پیش کی جاوے علم کو مذہبی دلیل سے باطل کرنے لگے ہیں صرف نمونہ کے طور پر آپ کو ایک دلیل سُناتا ہوں، جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کیسی عمدہ اور قوی دلیلیں، علم کے مقابلہ میں یہ بزرگوار پیش کیا کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں زمین کے گول ہونے کی بحث پیش ہوئی۔ اُس کی کرویت کے بطلان پر یہ دلیل پیش کی گئی، کہ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان ایسا بڑا بیوقوف ہے، کہ یہ بات باور کرے کہ درخت اور پودے زمین کی دوسری طرف نیچے کو لٹک رہے ہیں، یا وہاں کے باشندوں کے پاؤں اوپر ہیں اور سر نیچے۔ اگر ان لوگوں سے پوچھو، کہ ان بیہودگیوں کا کیا جواب دیتے ہو، اور کیوں یہ چیزیں زمین پر سے گر نہیں جاتیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اشیاء کی بالطبع یہ خاصیت ہے، کہ بھاری چیزیں مرکز کی طرف اور ہلکی چیزیں مثلاً بادل دھواں اور آگ، باہر کی طرف رجوع ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو کیا کہوں۔ جب ایک بار غلطی کرتے ہیں تو اُس پر اس قدر قائم ہو جاتے ہیں، کہ ایک احمقانہ رائے کی دوسری احمقانہ رائے سے تائید کرتے ہیں۔ اسی مسئلہ پر مشہور پیشوا دین عیسوی کے سینٹ آگسٹس بڑے دعوے سے کہتے ہیں۔ کہ زمین کے اُس طرف آبادی کا ہونا محال ہے، اس واسطے کہ کتاب مقدس میں حضرت آدم کی اولاد میں کوئی قوم اس قسم کی بیان ہی نہیں کی گئی مگر اس مسئلہ کے خلاف میں کہ زمین کی شکل کروی ہے[1]، سب سے اہم اور لاجواب دلیل یہ سمجھی جاتی ہے، کہ "اس طرف کے باشندوں کو حشر کے دن ہمارے خداوند کا آسمان سے زمین پر اُترنا کیونکر نظر آوے گا"۔ اس لئے کہ جب زمین گول ہے تو اس کے ایک ہی طرف کے لوگ دیکھ سکیں گے حالانکہ ہمارا خداوند مسیح جب آسمان سے اُترے گا۔ تو وہ تمام لوگوں کو اترتا ہوا دکھائی دیگا۔ اس زمانہ میں جبکہ تمام علوم کا دار و مدار مذہب پر تھا اور حقائق اشیا کا بیان بھی مذہب کرتا تھا، اور ہیئت، جغرافیہ، اور طبقات ارض، غرضکہ کل عالم کی حقیقت کا بتانا بھی مذہب کے ذمہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک کتاب تصنیف ہوئی جس کا مختصر

---

[1] میں نے اپنے زمانہ کے ایک نہایت بزرگ اور مقدس عالم فقیہ و محدث کی نسبت سنا کہ وہ یہ فرماتے تھے کہ اگر ہزار معقول دلیلیں زمین کے کرویت کی ہوں تو بھی ایک کو نہ مانو اور اگر اپنی آنکھ سے زمین کو کروی دیکھ لو تو بھی اس کو چپکا ہی کئے چلے جاؤ۔ خدا نے زمین کی نسبت کہا ہے کیف سطحت (سید احمد)

بیان سُننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اور آپ کو تعجب ہوگا کہ وہ عیسائی جو آج ہم پر ہنستے، اور ہم کو علم کا دشمن سمجھتے، اور جو اس وقت حقیقت میں علم کے بڑے حامی اور مربی ہیں وہ کیسے خیالات رکھتے تھے، اور اُن کے مذہبی عالم کیسی عجیب تصنیفیں کیا کرتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ اصول جغرافیہ کا یہ ہے کہ زمین ایک سطح ہے جس میں چار گوشے ہیں مشرق سے مغرب تک چار سو دن کی مسافت ہے، اور شمال سے جنوب تک اُس سے ڈیوڑھی۔ اس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں جس پر آسمان قائم ہے شمال کی جانب میں ایک بہت بڑا پہاڑ ہے، اُس کے پیچھے جب آفتاب جاتا ہے تو دنیا پر تاریکی چھا جاتی ہے، جسے رات کہتے ہیں۔ زمین کچھ جنوب کی جانب جھکی ہوئی ہے، اس وجہ سے دریائے فرات وغیرہ جن کا بہاؤ جنوب کی جانب ہے بہت تیزی سے بہتے ہیں"۔ ایک دوسرے صاحب علم ہیئت کے متعلق فرماتے ہیں کہ آسمان آتشی اور رقیق شے ہے اور برف کی ٹھنڈک سے اُس کی حرارت بڑھنے نہیں پاتی ورنہ ساری دنیا جل جائے۔

غرضکہ یہ حقیقت تھی اُس علم کی جس کی نسبت کہا جاتا تھا، کہ یہ زبانی الہام کے ذریعے سے حاصل ہوا ہے، اور جس پر بزرگان دین نے انسانی علم کو حصر کر دیا تھا۔ کتاب مقدس کو جس کی اصلی غرض یہ تھی کہ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرے اس غرض سے نکال کر انسانی علوم کا معیار بنا دیا، اور لوگوں کے قوائے عقلی پر جابرانہ حکومت قائم کر دی بائبل تو موجود رہی تھی، پیرو بہت سے پیدا ہو گئے، یونان کی اعلے اور بڑی تصنیفات فلسفہ پر گمراہی کا فتوے صادر کیا گیا۔ اسکندریہ کے عجائب خانہ کے بے بہا اور نادر خزانہ پر جہل اور اغلاق کا پردہ ڈال دیا گیا۔ اور نقل میں عقل کو دخل دینے اور مذہب کو علم سے ملانے کی ہوس سے وہ مجذوبانہ بڑا اختیار کی گئی، جسے نہ کوئی سمجھ سکتا تھا نہ اُس سے کچھ فائدہ تھا۔ بہرحال اُس زمانہ میں انہیں علوم کی تعلیم ہوتی جنکو پادریوں نے اپنے تعصب یا نادانی یا فائدہ کی غرض سے جاری کر رکھا تھا اور اُس میں تغیر یا تبدیل یا ترقی نہ فضول سمجھی جاتی، بلکہ بے ادبی، اور الہام ربانی کی مخالفت خیال کی جاتی، اور صاف صاف کہا جاتا کہ ؎

وکل العلم فی البائبل ولکن
تقاصر عنہ افہام الرجال

جو کچھ خدا کو بتانا تھا، وہ بذریعہ کتب مقدسہ کے بتا دیا گیا، اُن کے سوائے اور کسی قسم کے دریافت کی کوشش، گویا خدا کی کنہ اور ماہیئت کی تلاش کرنی ہے۔

صاحبو۔ ان خیالات پر جس کی اصلی بنیاد سینٹ اگسٹس .. .. نے ڈالی، اور جو اُس کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں، اور جس کو اہل مذہب پندرہ سو برس سے مستند مانتے چلے آتے ہیں، غور کرنے سے کبھی یہ امید نہیں ہو سکتی کہ ان میں تبدیلی ہو سکے گی اور نہ یہ یقین آسکتا ہے کہ وہ زنجیریں جن میں ہزار برس تک تمام یورپ قید رہا کبھی ٹوٹ سکینگی۔ مگر آخر وہ زمانہ آیا جس میں ان قیدیوں سے لوگوں نے نکلنا شروع کیا۔ اور وہ پادریوں کے ڈالے ہوئے طوق اور سلاسل کو توڑنے لگے چونکہ پادریوں نے اس کا نام مذہبی قید رکھ دیا تھا۔ اس لئے آغاز اس کا اسی کے توڑنے سے ہوا مگر تقلید کی قید سے رہائی آسان نہ تھی اس لئے بہت بڑی جنگ کرنی پڑی، بہت سی عزیز اور قیمتی جانیں ضائع ہوئیں، اور بہت دن اس کام میں لگے۔ مگر آخر وہ آزادی حاصل ہوئی، اور اچھی طرح حاصل ہوئی۔ جب ایک مرتبہ تحقیق کا پھر شوق تازہ ہوا، اور لوگوں نے اپنی آنکھیں کھولیں، تو اس آزادی نے مذہب ہی کو آمیزش سے پاک نہیں کیا، اور نہ انسانی کتابیں چھوڑ کر لوگ خدائی کتابوں پر غور کرنے لگے، بلکہ اس کا اثر تمام عقلی علوم پر بھی ہونے لگا۔ انہوں نے تجربے سے پیدا ہوئے خیالات روشن ہونے لگے۔ اور حقائق کے دریافت کرنے پر لوگ متوجہ ہوئے، اور جب اس طور سے ایک دفعہ بت توڑ دیا گیا، جو علم کے صاف اور پاک چشمہ پر بنایا گیا تھا۔ تو حکمت اور فلسفہ کا چشمہ بہنے، اور خدا کی زمین کو جو صدیوں سے بنجر پڑی ہوئی تھی تر و تازہ کرنے لگا علم میں غلامانہ اطاعت کے بدلے صداقت کی تحقیق ہونے لگی۔ لوگ راہبوں کے اور بر مناظرہ اور مناظرہ چھوڑنے لگے اور بجائے اس کے کہ عقلوں نے کیا کہا ہے، خود دیکھنا شروع کیا شرح اور اقوال کے بیان کا عمل ختم ہوا، اور سائنس یعنی علم کا آفتاب افق میں نظر آنے لگا۔ لوگوں نے جب خود سوچنا اور غور کرنا شروع کیا۔ تو بہت جلد پادریوں کی اُس حکومت سے جو علم پر قائم کی گئی تھی بغاوت کرنے اور یہ کہنے لگے، کہ دوسروں کو کیا حق ہے کہ زبردستی اپنی رائیں ہم سے منوائیں، اور ہم کیوں اندھوں کی طرح دوسروں کے پیچھے چلیں۔ آخر انہوں نے پرانے فلسفی خیالات اور قدیم نظاموں کے پرانے لباس اونا کر پھینک دیئے، اور مسائل مسلمہ اور کتب دری کے عقائد کے ماننے سے بھی منکر ہو گئے جب ایک دفعہ اُن کو یہ بات معلوم ہو گئی، کہ ہم خود حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں، تو حق کی طرف ان کا میلان بڑھنے لگا، روز بروز انہوں نے حقائق اشیاء کی تحقیق پر آمادگی ظاہر کی تقلید کی اس بغاوت اور خیالات کی اس صفائی اور امتیاز نے سب سے اول علم ہیئت میں اپنا ظہور دکھایا، اور یہ صفائی اور صحت خیال کوپرنیکس کے نظام میں متشکل ہوئی، اور ایک عدی کے سخت جنگ اور معارضہ

کے بعد گیلیلیو اور اُس کے پیروؤں نے اُن مسائل کو ثابت کیا؛ اس کے بعد بتدریج نہ صرف اسی علم میں ترقی ہوئی، بلکہ تمام علوم میں، خیال کے بدلے مشاہدہ سے کام لینا شروع ہوا، اور ہر علم میں روزانہ ترقی ہونے لگی۔ اور نہ فقط پرانے علوم میں غلطیوں کی اصلاح ہوئی، بلکہ بہت سے نئے علوم ایجاد ہوئے۔ نئی نئی باتیں دریافت کی گئیں اور وہ حیرت انگیز نتیجے ظاہر ہوئے جن کو نہ ہم فقط اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، بلکہ اُس سے ہم مستفید اور متمتع ہو رہے ہیں۔

حضرات! میں نے جو شبیہ یورپ کی علمی حالت کے متعلق چھوٹی اسکیل میں اس وقت آپ کو دکھائی۔ وہ کوئی خیالی تصویر نہیں ہے، بلکہ اصلی اور سچی صورت یورپ کے تنزل اور ترقی کی ہے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے جو میں نے آپ کو سنایا ہو۔ بلکہ یہ واقعات ہیں جو یورپ پر گزرے اور جس پر ہم کو نہایت غور کرنا چاہیئے تاکہ ہم اپنی موجودہ حالت کو تعلیم کی ابتر اور غیر مفید حالت میں دیکھ کر مایوس نہ ہوں، اور اپنی قوم میں خیالات کی تبدیلی اور اُس سے ترقی حاصل کرنے سے شکستہ دل نہ ہوں۔ ما جو چیز دنیا میں ایک مرتبہ کسی قوم یا کسی ملک میں ہوئی ہے۔ کیا سبب ہے کہ دوسری قوم اور دوسرے ملک میں وہ نہ ہو سکے اور جو نظیر ایک قوم کی ہمارے سامنے ہے، اُسے دیکھ کر ہماری ہمتیں کیوں نہ بڑھیں، اور ہمارے دلوں میں جوش کیوں نہ پیدا ہوا۔ اور ہم اپنے علماء سے جن میں خدا کی مہربانی سے بہت سے عالی دماغ اور روشن خیال ابتک موجود ہیں، اپنی حالت کی اصلاح کی توقع کیوں نہ کریں۔

خصوصاً ایسی حالت میں کہ نہ یورپ کے اُس زمانہ کی طرح جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہم باطل خیالات اور غلط اوہام میں گرفتار ہوں، نہ ہماری تعلیم کی حالت اُس درجہ ابتر اور خراب ہو، نہ ہمارے علماء، اُس زمانہ کے پادریوں کی طرح حکمت و فلسفہ کے دشمن ہوں، کیا وجہ ہے کہ ہم ترقی سے ناامید ہوں۔ اور جب کہ خود ہمارے علماء نے تعلیم کی اصلاح پر توجہ شروع کی ہو، ہم کیوں بیہودہ خیالات دل میں پکاتے رہیں۔ سوائے اس کے یہ بات بھی غور کے لائق ہے کہ ہم کو وہ مشکلات بھی درپیش نہیں ہیں، جو یورپ کو اپنی حالت کی اصلاح میں پیش آتیں، اس لئے کہ وہاں چرچ یعنی پادریوں کا فرقہ دینی اور دنیاوی دونوں حکومت رکھتا تھا۔ کوئی شخص اُن کے مقرر کئے ہوئے اصول اور قواعد اور احکام اور اُن بتائے اور بنائے ہوئے مسائل سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتا تھا، اور اُن میں تعصب اور خیالات کا وہ زور تھا، کہ اختلاف اور آزادی کو گو نہایت ہی خفیف ہوتی جائز نہ رکھتے تھے، اور ذرا سی مخالفت پر جلاوطن اور قتل کی سزا دیتے تھے۔ اس لئے وہاں اُس مذہبی بغاوت کی ضرورت ہوئی جس کا مختصر بیان میں نے کیا۔ مگر ہماری حالت دوسری ہے، نہ ہمارے علماء کو وہ حکومت

کلی دینی اور دنیوی حاصل ہے نہ وہ اپنی عصمت اور بے گناہی کے مدعی ہیں۔ نہ اُن کا کوئی ایک فرقہ ہے جو سب پر اقتدار اور اختیار رکھتا ہو، نہ اُن میں وہ تعصب اور جہالت ہے کہ اصلاح کو کفر سمجھتے ہوں۔ ہاں اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ بعض لوگ جو فلسفہ و حکمت کے ذائقہ سے آگاہ نہیں ہیں۔ اور وہ فقیہ اور ملّا جن کو تحقیق کے وسیع میدان میں سیر کرنے کی عادت نہیں ہے اور وہ حضرات جو زمانہ کی ضرورت اور حالت سے واقف نہیں ہیں، البتہ کسی قسم کی تبدیلی اور اصلاح کو پسند نہ کرینگے۔ مگر جبکہ خود ایک بڑا گروہ علماء کا اصلاح پر آمادہ ہوا ہے اُس نے زمانہ کی ضرورت پر نظر کی ہے، وہ غیر مفید تعلیم کو تضیع اوقات سمجھ رہا ہے اور اسی گروہ میں میں دیکھتا ہوں، کہ وہ نامور عالم داخل ہیں جن کو لوگ مقتدا اور پیشوا سمجھتے ہیں، اور جو اپنے علم و فضیلت کے سبب سے اُس کے اہل بھی ہیں۔ تو چند متعصب اور بے خبر لوگوں کے اختلاف سے کیا خلل ہو سکتا ہے، اور جس اصلاح کا ارادہ ہمارے علماء نے کیا ہے وہ کیوں رُک سکتی ہے، اور یہ اصلاح بھی تو ایسی نہیں ہے، جس میں کوئی مذہبی اعتراض ہو سکے یا یورپ کی طرح اس کے لئے مذہبی بغاوت اور مذہبی مسائل میں تبدیلی کی ضرورت ہو۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں دو قسم کی تعلیم ہے۔ مذہبی اور دنیادی جسے منقول اور معقول کہتے ہیں۔ مذہبی تعلیم میں کسی بڑی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہم اس میں کسی اہم تبدیلی کی ضرورت دیکھتے ہیں نہ اس حصۂ تعلیم کے، ہم سوائے علماء کے دوسرے کی مداخلت پسند کرتے یا جائز رکھتے ہیں۔ سُنّی اور شیعہ مقلد اور اہل حدیث سب مختار اور آزاد ہیں، اور آزاد رہنے چاہئیں کہ جن مذہبی کتابوں کو اپنے معتقدات کے موافق سمجھیں اُسے درس میں داخل رکھیں۔ کسی دوسرے کو نہ حق ہے نہ اجازت، کہ اُس میں مداخلت کرے۔ اب جو کچھ اصلاح کی ضرورت ہے وہ دنیاوی تعلیم میں ہے۔ اور اُس میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ موجودہ تعلیم جو غیر مفید اور فضول ہے وہ ترک کی جائے۔ دوسرے مغربی علوم و فنون کے سکھلانے کی کوشش ہو۔ اور یہ دونوں وہ باتیں ہیں جس پر اب تک ہمارے علما کو توجہ نہ تھی، اور اگر تھی تو اس کا ہمیں علم نہ تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اب وہ اس طرف متوجہ ہوئے ہیں وہ معقول کی تعلیم کو بھی محتاج اصلاح سمجھتے ہیں اور مغربی علوم کی تعلیم کی بھی ضرورت بتاتے ہیں وھذا ماکنا نبغی فقط۔

مذہب و علم

اکثر مسلمان مذہبی باتوں میں عقل کو دخل دینے یا مذہبی مسائل کو علم اور فطرت سے مطابق کرنے میں تعجب کرتے ہیں، اور جو لوگ معقول و منقول یا مذہب و فطرت کی تطبیق میں کوشش کرتے ہیں، اُن کو مذہب کا حامی سمجھنے کے بدلے مذہب کا دشمن جانتے ہیں اور ایسے لوگوں کی کوششوں پر حیرت زدہ ہوکر پوچھتے ہیں کہ، کیا خدا اور رسول کے فرمانے کے بعد حقیقت اور سچائی کے دریافت کرنے کی کچھ ضرورت باقی رہتی ہے۔ یا خدا اور رسول کے کلام کی تصدیق کے لئے کسی علم اور فطرت کی ضرورت ہے ایسی ضرورت کا خیال کرنا خود دین میں شک کرنا ہے، اور شک بیدینی اور کفر کا پہلا زینہ ہے۔ اس زمانہ میں یہ اعتراض زیادہ تر سیّد صاحب پر کیا جاتا ہے جنہوں نے مذہب کو فطرت سے ملانے کا مشکل کام اپنے ذمہ لیا ہے اور ان کی تفسیر اور دیگر مذہبی مضامین بہت تعجب اور افسوس بلکہ نفرت سے دیکھے جاتے ہیں اور مجھے حسب سے کہ میں نے اُن کی تفسیر کے متعلق لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ لوگ اُن کا مخالف سمجھتے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چند لفظوں میں مذہب کو علم سے مطابق کرنے کی ضرورت اور جو فرق میرے اور سیّد صاحب کے خیالات میں ہے اُس کی کیفیت بیان کروں ؎

جو لوگ مذہب کو صرف مذہبی دلائل اور مذہبی اسناد سے جانچتے ہیں، بلکہ وہ لوگ جو مذہبی مسائل میں دلیل اور سند کا خیال تک نہیں کرتے بلاشبہ اُن کے عقائد نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں اور جہالت اُن کے دین کی بڑی محافظ ہوتی ہے۔ مگر ایسے عقائد درحقیقت رسمی اور تقلیدی ہوتے ہیں، اور گو ایک جاہل شخص کے لئے درصورت سچ ہونے اُس مذہب کے جس کو وہ مانتا ہے بلحاظ نتیجہ کے مفید ہوں، مگر ایسا شخص نہ اپنے مذہب کی اشاعت کر سکتا، نہ دوسروں کو اپنے مذہب کی دعوت دے سکتا، نہ مخالفین کے اعتراضات کو دور کر سکتا ہے، ایسا شخص غالباً ناجی ہو مگر ہادی، اور حامیٔ دین نہیں بن سکتا۔ اور مذہب اسلام چونکہ تمام دنیا کے لئے ہے اور ہر قسم اور ہر درجہ اور ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی ہم مسلمانوں پر فرض ہے، اس لئے اسلام کی اشاعت کی خواہش رکھنے والے مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مختلف خیالات کے لوگوں کے موافق اُن کو اسلام کی دعوت دے، اور موجودہ زمانہ کی حالت دیکھکر اسلام کی حقیقت ثابت کرے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

جب خدا نے ہدایت کیلئے مامور فرمایا، تو صرف ایک ہی طریقہ پر اسلام کی طرف بلانے کا حکم نہیں دیا بلکہ ہر شخص کے خیال اور حالت کے موافق جدے جدے طور سے دعوت کرنے کے طریقے بتائے، اور ایک آیت میں اس کو بیان کر دیا وہ آیت یہ ہے۔ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلہم بالتی ہی احسن یعنی اپنے پروردگار کی راہ پر لوگوں کو حکمت سے یا اچھی نصیحت سے بلانا چاہیئے، اور جو لوگ کہ جھگڑالو ہیں اُن کو انہیں کے طور پر اچھی طرح سمجھانا چاہیئے پس خدا کے اس ارشاد کے موافق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکمت اور موعظت اور مجادلہ تینوں طریقوں سے دعوت اسلام کے اصول قائم کیئے۔ اور ان تینوں قسم کے آدمیوں کی سمجھ کے موافق خدا نے اپنا کلام نازل فرمایا، اور اپنے کلام معجز نظام کی ہر چیز کو اس طور پر بیان کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے خیال و مذاق کے موافق اُس سے مستفید ہو سکے اسی اصول کو حامیان دین اور حامیان ملت نے ہمیشہ پیش نظر رکھا، اور ہر زمانہ کے خیالات کے موافق قرآن کے معنی بیان کئے جس زمانہ میں علم کا چرچا تھا، اور لوگوں کے دل علمی خیالات سے صاف تھے۔ اُن کو انہی کے خیال کے موافق ظاہری باتوں سے سمجھانے پر قناعت کی۔ جبکہ وہ زمانہ آیا جس میں حکمت و فلسفہ کا چرچا ہوا، یونانی علوم شائع ہوئے، اُس وقت حکمائے اسلام نے خدا کی تعلیم کے موافق علم و حکمت سے کام لیا۔ اور عالموں اور حکیموں کو علم و حکمت سے سمجھانا شروع کیا اور خدا کے کلام کے دقائق و حقائق اور نکات و اسرار بیان کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا، اور مذہب اسلام کو علم و حکمت کے مطابق ہونا ثابت کیا۔ اگر بزرگان دین پہلے ہی طریقہ پر قائم رہتے، اور فلسفہ جاننے والوں کو عرب و حجاز کے بدویوں اور عامیوں کی طرح ظاہری باتوں کے سمجھانے پر کفایت کرتے، تو غالباً بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا، اور اسلام اُن کی نگاہوں میں جہالت کا مجموعہ سمجھا جاتا۔ اس زمانہ میں جو ترقی علم و سائنس نے کی ہے اور جو خوفناک اثر اُس کا مذہب پر ہو رہا ہے وہ گذشتہ زمانہ سے بہت زیادہ ہے، اور اس زمانہ میں مذہب و علم کی تطبیق کی ضرورت اُس زمانہ سے بہت بڑھ کر ہے۔ جو لوگ اُس زمانہ کی علمی ترقیوں سے بے خبر ہیں اُن کو اُس کی ضرورت اور جو مشکلات اس کام میں اس وقت درپیش ہیں اُس کا سمجھانا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت صرف اسی ایک بات پر منحصر ہے کہ اُس کا سائنس و فطرت کے مطابق ہونا ثابت کیا جاوے۔ مگر اس زمانہ میں اس طرح پر حمایت اسلام کی بہ نسبت گذشتہ زمانہ کے نہایت مشکل ہے۔ اگلے زمانہ میں گو فلسفہ و حکمت نے ترقی کی تھی مگر اس وقت علم محدود اور نظری تھا، مسائل اُس کے مشتبہ اور موہوم تھے۔ اُس زمانہ کی فلسفہ کا رجحان روحانیت کی طرف

تھا جس کو مذہب سے ایک نوع کی مناسبت تھی علاوہ بریں مذہب کی حمایت کے لئے حکومت موجود تھی۔ اس لئے مذہبی عقائد کو علم کا چنداں خوف نہ تھا، اور نہ ان کی حفاظت زیادہ مشکل تھی۔ اسلام کا بہت بڑا وسیع دائرہ علم کے صدمہ سے اس لئے محفوظ رہتا تھا، کہ علم کی رسائی وہاں تک ہو ہی نہ سکتی تھی، اور وہ چھوٹا حلقہ جہاں حکمت وفلسفہ کا گذر ہوتا خود علمی مسائل کے غیر محقق ہونے سے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کر لیتا تھا۔ اس پر بھی اگر مذہب وعلم میں جھگڑا ہوتا تو مذہب کی حمایت کے لئے ایسے سامان اور ذریعے تھے کہ علم کو پیچھے ہٹنے کے سوا دوسرا چارہ نہ تھا علم مذہب کے مقابلہ سے کبھی یہ کہکر روک دیا جاتا، کہ یہ امر مکاشفہ سے متعلق ہے ایسا سوال ہی کرنا ناجائز ہے اور کبھی یہ کہکر چپ کر دیا جاتا کہ یہ خدا کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے اس کا فاش کرنا ممنوع ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی نہ مانتا تو خدا کی زمین ایسے ملحد کے وجود سے پاک کر دی جاتی۔ مگر اس زمانہ میں نہ علم محدود ہے، اور نہ وہ نظری وخیالی ہے اور نہ حکومت اُس کی مدد کے لئے موجود ہے۔ بلکہ اُس کی صدود روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہیں۔ اُس کی بنا مشاہدہ پر قائم ہو رہی ہے، نہ مذہبی عقائد پر بحث کرنے والے کی تسلی مکاشفہ سے ہوسکتی ہے، نہ ھذا امر من اسرار الربوبیۃ کہہ کر کوئی روکا جاسکتا ہے اور نہ خدا کی پاک زمین شک کرنے والے کے نجس وجود سے پاک کی جاسکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یا تو ہر مذہبی عقیدہ کی بنیاد علمی مسائل کی طرح تحقیق پر قائم کی جائے یا مذہب کو جس کی عمر طبعی غالباً قریب آگئی ہے اپنی حالت پر مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ سائینس یعنی علم اب چند خانگی مدرسوں میں بند نہیں ہے جہاں خاص لوگوں کے سوا ئے علم کو پہنچنا مشکل ہو۔ نہ وہ چند پاک کتابوں میں مقفل ہے جس کا کھولنا بجز مقدس ہاتوں کے اوروں کو منع ہو، نہ وہ استعارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کا سمجھنا مشکل ہو، نہ وہ اُن اسرار الٰہی میں سے ہے جس کے لئے اب الہام اور کشف صدور کی ضرورت ہو۔ بلکہ سائینس اب ان تمام چیزوں سے آزاد ہے، اُس نے اپنے سارے طوق وسلاسل توڑ دیئے ہیں۔ جو اصول فلسفیوں کے سینہ میں بند تھے وہ اب بچوں کی زبان پر ہیں، اور وہ باتیں جن کا زبان پر لانا مشکل اور منع تھا ان دنوں نقل مجلس ہو رہی ہیں علم اب نظری نہیں رہا کہ منطق کی بھول بھلیوں میں گھومتا رہے۔ بلکہ وہ اب آسان، دل پسند، ہر دل عزیز اور زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ لیڈیاں علم پر کتابیں لکھتی ہیں، مدرسہ کے لڑکے ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ پر بحثیں کرتے ہیں۔ اخباروں میں علمی مباحثے چھپتے ہیں۔ قلی اور مزدور تک علمی باتیں سمجھتے ہیں ہر روز ایک نئی تحقیق اور جدید انکشاف کی خبر آتی ہے، ہر رسالہ اور ہر پرچہ اور ہر خبر کے

کاغذ میں کوئی نہ کوئی نئی بات نظر پڑتی ہے۔ غرضکہ ان دنوں دلوں میں ایک نئی تحریک پیدا ہو رہی ہے الہامی باتوں پر اعتقاد دن بدن کم ہوتا جاتا ہے تحکمانہ اور تقلیدی مذہب کا زور روز بروز گھٹ رہا ہے۔ مذہبی مسائل کے لئے علم کی سند مانگی جاتی ہے کوئی چیز بغیر تحقیق کے مقدس اور پاک نہیں مانی جاتی۔ یا دلیل اور ثبوت کے بغیر کسی بات کی سچائی دل میں نہیں بیٹھتی ہے اب کوئی اُسے بُرا سمجھے یا اُس پر افسوس کرے، یا چند قطرے آنسو کے بہا دے۔ مگر زمانہ تحقیق اور علم کا ہے اور اُس کا اثر روز بروز مذہب پر پڑتا جاتا ہے یورپ اور امریکہ کے حالات سے جن کو واقفیت ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مذہبی عقائد سے بہت کچھ انحراف ہوگیا ہے دہریت اور لاادریت وبا کی طرح پھیل رہی ہے مذہبی باتوں میں نہ صرف شک اور شبہے کئے جاتے ہیں بلکہ بغیر کسی خوف یا شرم کے ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے دہریت کے شعلے ہر مقام پر بلند ہو رہے ہیں۔ چرچ اور گرجے ہر جگہ جلتے نظر آتے ہیں ایسے نازک زمانہ میں جو مذہب کے نادان دوست ہیں وہ صرف افسوس کرنے پر قانع ہیں، مگر جو لوگ مذہب کی عاقلانہ حمایت کرنے والے ہیں، وہ مذہب کی بنیاد علمی اور فطرت پر قائم اور دینی عقائد کو علم و فطرۃ کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کرتے ہیں اسلامی دنیا میں عموماً اور ہمارے ہندوستان میں خصوصاً نہ صرف الحاد اور دہریت کے پھیلنے کی مصیبت ہے بلکہ اب تک مذہب کی حمایت کا جیسی کہ اس زمانہ میں درکار ہے کسی کو خیال بھی نہیں ہے۔ ان ملکوں میں جہاں اسلامی سلطنت اب تک قائم ہے۔ شاید دُرّوں اور فتوؤں سے کسی قدر مذہب کی حفاظت کی جاتی ہو۔ مگر دلوں کے شک اس سے دُور نہیں ہو سکتے، اور مذہب جس کی بنیاد یقین پر ہے وہ ان تدبیروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور ہمارے یہاں تو یہ کا مٹھ کے ہتیار بھی نہیں ہیں، نہ سوائے کفر کے فتوؤں کے مذہب کے بچانے کا کسی کے پاس کوئی اور ہتیار ہے اور کفر کے فتوؤں کا یہ حال ہے کہ پنساریوں کی پڑیوں میں کام آتے ہیں، یا اس سے پہلے کہ اُن کی سیاہی خشک ہوا نہیں دیمک کھا لیتی ہے۔ ایسے زمانہ میں جو شخص مذہب کی حمایت عاقلانہ طور پر کرے، اور مذہبی عقائد کو قوانین قدرت سے ملانے میں ساعی ہو۔ وہ درحقیقت نہ صرف سچا مومن اور پکا دیندار ہے، بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ اور جہاد اکبر کے ثواب اور تمام مسلمانوں کی شکر گزاری کا مستحق ہے اور چونکہ سید صاحب نے یہ بڑا کام اپنے ذمہ لیا ہے، اور اس جہاد اکبر کا جھنڈا اُٹھایا ہے، اس لئے اسلام ان کا شکر گذار ہے، اور تمام مسلمانوں پر ان کا احسان ہے۔ رہا یہ امر کہ کہاں تک وہ اس میں کامیاب ہوئے اور ہو سکتے ہیں، اس کا ہر شخص فیصلہ

کرسکتا ہے اگر اُنہوں نے جہاد کے لئے بھی اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے، اور ایک آدمی گو کیسا ہی بہادر اور تجربہ کار ہو تن تنہا کامیاب نہیں ہوسکتا، اکیلے اُن سے ایسے بڑے جہاد میں کامیاب ہونے کی کون امید کرسکتا ہے۔ اُن سے غلطیاں بھی ہونگی، اُن کی رائیں خطائیں بھی کریں گی، مگر چونکہ نیت اُن کی نیک اور خالصاً للہ ہے اس لئے ان کی غلطی بھی دوسروں کے صواب سے بہتر ہے میں تو اُن کے اس ارادہ ہی کی تعریف کرتا، اور اپنے آپ کو اُن کے انصار اور اعوان میں سمجھتا ہوں۔ میں نے اُن کی تفسیر کی نسبت جو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ درحقیقت ایک طرح پر اُن کی مدد اور متابعت ہے۔ نہ مخالفت ۔

میں اس امر میں بالکل ان سے متفق ہوں کہ مذہبی مسائل علمی نظر سے دیکھے جائیں، اور جس طرح علمی مسائل کی نکتہ چینی کی جاتی ہے مذہبی مسائل کی بھی اسی طرح تحقیق کی جاوے اور مذہب کا فطرت کے مطابق ہونا جیسا کہ درحقیقت وہ ہے ثابت کیا جاوے۔ یہی سچی حمایت اسلام کی ہے، اور یہی اصلی طریقہ اسلام کی حفاظت کا ہے۔ جو لوگ مذہب کی صرف مذہبی دلائل سے تائید کرتے ہیں، اور سائنس کے محققہ مسائل کو بیہودہ اور خیالی دلیلوں سے غلط کہتے ہیں، وہ میرے نزدیک اسلام کے حامی نہیں ہیں بلکہ اُس کے نادان دوست اور درحقیقت دشمن ہیں میری مخالفت سید صاحب سے اس لئے نہیں ہے کہ جو اصول مذہب کی تطبیق کا فطرت سے اُنہوں نے اختیار کیا ہے اُسے میں غلط جانتا ہوں یا قوانین فطرت کو قابل تبدیل سمجھتا ہوں۔ بلکہ میرا اختلاف صرف اس میں ہے کہ جن باتوں کو وہ قانون قدرت سے خارج سمجھتے ہیں میرے نزدیک وہ قانون قدرت میں داخل ہیں، اور اسی امر کو میں اپنی آئندہ تحریروں میں دکھانا چاہتا ہوں ۔ فقط

مکاتبات دلچسپ

نواب محسن الملک مولوی سیّد مہدی علی کی تحریر ایک دوست کی تحریر کے جواب میں

جناب سر سید احمد خاں بہادر کی تفسیر کے متعلق جن مکاتبات دلچسپ کے شایع کرنے کا وعدہ تہذیب الاخلاق میں کیا گیا تھا، اور جو میری بیماری کی وجہ سے اب تک پورا نہ ہوا، اُسے اب میں شروع کرتا ہوں۔ مگر قبل اس کے مجھے اپنے ایک دوست کے ان شبہات کی نسبت کچھ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اُن کو میری ان تحریرات سے پیدا ہوئے ہیں، اور جن کو انہوں نے نہایت محبت اور مہربانی سے مجھ پر ظاہر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سید صاحب سے تعلق رکھنے والے دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو اُن کو دنیاوی امور میں مسلمانوں کا بہی خواہ اور تعلیم و معاشرت اور تمدن میں ناصر اور مصلح سمجھتے ہیں، مگر بلحاظ مذہبی عقائد کے اُن کو دائرہ اسلام سے خارج جانتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں، جو مذہبی امور میں بھی ان کو ہادی اور پیشوا مانتے ہیں۔ یہ دونوں فرقے اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک اصول رکھتے ہیں۔ مگر آپکے اصول میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی تو آپ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے، کہ آپ سید صاحب کو مجتہد سمجھتے ہیں، اور کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود اُن کو مخرب دین جانتے، اور اُن کی تفسیر کو تفسیر بالرائے خیال کرتے ہیں۔ اس لئے براہ مہربانی ذرا صاف صاف فرما دیجئے کہ آپکا اصل خیال سید صاحب کی نسبت کیا ہے۔ کہ آپکے نزدیک خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرنا، ملائکہ و شیاطین کے وجود کو نہ ماننا، دوزخ و جنت سے انکار کرنا، آدم و حوا کے قصہ کو افسانہ سمجھنا، معجزات کی ہنسی اُڑانی، کفر نہیں ہے اور کیا وہ تفسیر بالرائے کے وعید میں داخل نہیں ہیں اور کیا خرق اجماع کے الزام سے وہ بری ہیں اور جیسا آپ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان عقائد کو اُن کے غلط سمجھتے ہیں، تو آپ اُن کو کیونکر دینی خیال سے اچھا اور قابل تعلیم جانتے ہیں، اور اگر آپ باوجود ان عقائد کے اُن کو مسلمان اور پکا مسلمان بلکہ مصلح دین سمجھتے ہیں تو آپ اُن کے ان عقائد سے کیوں اپنی مخالفت ظاہر کرتے ہیں۔ غرضکہ آپ کا مسلک ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور لوگ طرح طرح کے شبہے آپ کی نسبت کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ کا درحقیقت کوئی اصول نہیں ہے اور آپ خود کوئی رائے یا خیال نہیں رکھتے۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ درحقیقت سید صاحب کے ہم خیال ہیں مگر اُن کا سا مضبوط دل نہیں رکھتے۔ برادری کی شرم اور مسلمانوں کے خوش کرنے کے خیال سے کبھی کبھی اُن کی

مخالفت ظاہر کرتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ اب تک آپ اُن کے معتقد تھے مگر اب آپ کی رائے اُن کی نسبت بدل گئی ہے، اور اب آپ اُن کو برا سمجھنے لگے ہیں، اور خدا کرے کہ یہ خیال لوگوں کا صحیح اور نیک ہو۔ بہر حال جب تک آپ اُس شبہ کو ہم لوگوں کے دلوں سے دُور نہ کر دیں آپ کا ان کی تفسیر کے متعلق لکھنا مناسب نہیں ہے۔ میں اپنے دوست کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اُن شبہات کے دُور کرنے کا مجھے موقع دیا جو غالباً اور لوگوں کو ہونگے اور جن کو بعض میرے احباب نے حیدرآباد میں خود مجھ سے بالمشافہ بیان کیا تھا۔

لوگوں کا یہ خیال کہ میں خود کوئی رائے یا خیال نہیں رکھتا ویسا ہی غلط ہے جیسا کہ یہ شبہ کہ میں سید صاحب کی نسبت اب وہ رائے نہیں رکھتا جو اول رکھتا تھا، یا برادری کی شرم اور مسلمانوں کے خوش کرنے کا خیال کبھی کبھی مجھے سید صاحب سے مخالفت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ میری تحریرات اس پر شاہد ہیں کہ میں اصول کا نہایت پابند ہوں۔ مگر وہ اصول کیا ہیں؟ وہ نہیں ہیں جسے ضد یا تعصب یا کورانہ پیروی کہتے ہیں۔ بلکہ ہر ایک بات کو ٹھنڈے دل سے سُننا، ہر ایک دعوے کی دلیلوں پر غور کرنا، مگر جب کسی بات کا ثبوت دلائل صحت سے کی طرح مل جاوے، تو اُس کے قبول کرنے میں ایک لحظہ کی بھی دیر نہ کرنا، گو جمہور کی مخالفت کا الزام لگایا جاوے یا خرق اجماع کی تہمت کی جاوے، یا کفر کے فتوے مکہ مدینہ سے منگوائے جاویں۔ اسی اصول کی پابندی نے مجھے سید صاحب کی مخالفت پر قائم رہنے سے بچایا، اور اسی اصول پر قائم رہنے سے میں اُن کے بعض غلط خیالات کے ماننے سے بھی محفوظ رہا۔ اس تیس برس کے زمانہ میں جب سے مجھے ان سے ملنے کا فخر اور اُن کے عمدہ خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ کوئی دن مجھے ایسا یاد نہیں آتا کہ میں اس اصول پر پابند نہ رہا ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ میں نے ان کی تفسیر توریت و انجیل کو اپنے تقلیدی اعتقادات کے خلاف پاکر اُن پر حسد کیا، اور اُن کو کافر و بے دین سمجھ کر اُن سے لڑنے لگا۔ پھر جب اسی مقام بلکہ اسی مکان میں جہاں اب یہ مضمون لکھ رہا ہوں، مجھے اُن سے ملنے کی عزت نصیب ہوئی اور اُن کے نہایت لطیف اور پاکیزہ خیالات پر مطلع ہونے کا موقع ملا، تو نہ صرف میں اُن کے اسلام کا قائل ہوا، بلکہ جسے میں تاریکی کا شیطان سمجھتا تھا وہ نور کا فرشتہ نظر آیا، اُسی وقت سے میں نے اُن کے مذہبی خیالات کو جہاں تک میری سمجھ نے مدد کی انصاف سے دیکھنا شروع کیا۔ اگر میں نے اُن کی کسی رائے کو صحیح پایا اُسے تسلیم کیا، اور اگر کوئی عقیدہ اُن کا میری سمجھ میں نہ آیا اُس کے غلط کہنے اور رد کرنے میں اُن کی عظمت اور ادب کا کچھ خیال نہ کیا۔ پس اے میرے عزیز دوست اگر میں کسی اصول کا پابند نہ ہوتا جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں یا خود

کوئی بُرا نہ دیکھتا تو میرا یہ حال نہ ہوتا۔

آپ پوچھتے ہیں کہ میرا خیال سید صاحب کی نسبت کیا ہے؟ اُس کا جواب یہ ہے کہ میں اُن کو نہایت عالی دماغ، عالی خیال، پاک دل، روشن ضمیر مسلمان سمجھتا ہوں۔ وہ خدا کے دل سے معتقد، رسولؐ کے دل سے عاشق، اسلام پر دل سے شیدا، اور مسلمانوں کے، دل سے خیر خواہ ہیں۔ اسلام کو وہ سچا مذہب سمجھتے ہیں، اور نہ صرف سچا بلکہ اُسی کو تمام دنیا کی، ہدایت اور نجات کا وسیلہ، اور ہر قسم کی دماغی اور اخلاقی اور دینی اور دنیاوی ترقی کا ذریعہ، جانتے ہیں۔ تقلید کے برباد کن خیال سے اُن کا دل پاک ہے، اور کورانہ پیروی کے طوق وسلاسل سے ان کا دماغ آزاد، گو وہ نہ عالم ہیں نہ ملا، نہ جامع معقول ومنقول ہیں، نہ حاوی فروع واصول، نہ فضیلت کی پگڑی سر پر رکھتے ہیں، نہ جبہ پر چڑھ کر ناز وکرشمہ دکھاتے ہیں مگر خدا نے کچھ اپنے دست قدرت سے ان کا دل ودماغ ایسا بنایا ہے کہ حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے جلد تمیز کر لیتے ہیں۔ قومی محبت اور انسانی ہمدردی اور مذہبی جوش سے اُن کا سینہ بھرا ہوا ہے اُن کے پاکیزہ خیالات نے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچایا، اور ان کی محققانہ تحریروں نے اسلام کے پاک اور خوبصورت چہرہ سے بہت سے داغ مٹا دئیے۔ غرضکہ اُن میں وہ صفتیں اور باتیں موجود ہیں کہ اگر میں اُن کو اسلام کا حامی کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر باوجود اس کے میں اُن کو نہ رسول سمجھتا ہوں، نہ اُن پر وحی آنے کا معتقد ہوں۔ انسان جبل دکھون رجال وکلام بنیتا تعالیٰ وہ ایسی ہی خطا کرتے ہیں جیسے کہ اور آدمی، اُن سے اُسی قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں جیسی کہ دیگر انسانوں سے، اس لئے جس طرح میں اُن کے عمدہ خیالات سے مستفید ہوتا ہوں، اسی طرح اُن کی بُری رایوں سے بچتا ہوں۔ اور جس طرح اُن کی تفسیر کے بعض مقامات کو نہایت عالی اور بلند دیکھتا ہوں، اسی طرح بعض جگہ ان کو غلطی اور خطا کے نہایت تاریک اور گہرے غار میں گرا ہوا پاتا ہوں اور چونکہ میں مشرک فی صفۃ النبوۃ نہیں ہوں، اور نہ ان کو مورد ماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی سمجھتا ہوں نہ رسول یاتی من بعدی اسمہ احمد کو ان کی شان میں مانتا ہوں۔ اس لئے باوجود اُس ادب وعزت کے جو اُن کا میرے دل میں ہے ان کی رائے کے غلط کہنے اور ان کے خیالات کے رد کرنے میں جیسا کہ وہ میرے نزدیک غلط اور قابل تردید ہوں ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ اور یہی شعار سچے اور پکے مسلمانوں کا ہے اور یہی اسلام نے ہم کو سکھائی ہے اس لئے کہ سوائے اُس ایک پاک اور مبارک ذات کے جس کا سینہ خدا کے نور سے روشن تھا اور جو مذہبی تعلیم، اور خلق کی ہدایت میں غلطی اور خطا سے پاک تھا جس کا علم خدا تھا اور جس پر وحی لانے والا جبرئیل۔ دنیا میں نہ کوئی خطا سے بری ہے، نہ غلطیوں سے محفوظ۔ اگر کوئی کسی کو ایسا سمجھے، تو وہ

فی الحقیقت شرک فی النبوۃ ہے، اور ایک طرح سے ختم نبوت کا منکر۔ اور چونکہ تقلید اور حسن عقیدت نے توحید کا خالص خیال ہمارے دل سے دُور کر دیا ہے اور یہ پاک اور صاف عقیدہ اسلام کا ایسا بگڑ گیا ہے کہ نہ وہ خدا کی صفات میں اپنی حالت پر قائم رہا، نہ رسول کی رسالت اور عصمت کے متعلق آمیزش سے محفوظ رہا۔ خدا کی توحید کو دیکھئے۔ تو اُس کا یہ حال ہے کہ اگر ہندو تینتیس کروڑ دیوتا رکھتے ہیں، تو مسلمانوں میں بے شمار حلّالِ مشکلات اور قاضی الحاجات ہیں۔ اور اگر رسول کی عصمت پر لحاظ کیجئے، تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ دنیاوی معاملات میں انبیاء کے اجتہاد میں تو غلطی کا اعتراف ہے، مگر اپنے پیروں اور اماموں کے ہر قول کو واجب التصدیق، اور فعل کو واجب التقلید جاننے اور ان کی نسبت خطا و غلطی کے گمان کرنے کو بھی کفر سمجھتے ہیں۔ پس جبکہ لوگوں کے دل تقلید سے یہاں تک تاریک ہو رہے ہوں، اور جبکہ اسلام سے پاک اور نورانی مذہب پر ایسے پردے پڑ گئے ہوں، اور ہر فرقہ نے اپنا اپنا ایک جدا پیغمبر بنا رکھا ہو، تو اُن کے خیال میں کیونکر آ سکتا ہے کہ کوئی شخص اُس سے اختلاف کرے جسے بزرگ اور مجتہد سمجھتا ہوں۔ حضرات ذرا اسلامی زمین کی سیر کیجئے اور مذہب کے میدان میں آکر تماشا فرمائیے کہ اس خیال نے اسلام کا کیا حال کر رکھا ہے اور وحدت اور یکرنگی کا جو اصلی صفت بلکہ یہی ایک صفت اور نشانی اسلام کی تھی کیسا خون ہو رہا ہے۔ ایک اسلام کے بے رنگ جھنڈے کے بدلے آپ ہزاروں رنگ کے پرچم لہلہاتے ہوئے دیکھیں گے! اور ایک توحید کے لشکر کے عوض سینکڑوں فرقے مشرک فی صفات اللہ اور مشرک فی صفۃ النبوۃ نظر آویں گے اگر آج خدا کی توحید کا سبق دینے والا، اور دنیا میں وحدت و یکرنگی کا پھیلانے والا تھوڑی دیر کے لئے ہمارے پاس آئے، اور اپنی امت کا حال دیکھے۔ تو قسم ہے اُس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری اور سارے عالم کی جان ہے، کہ وہ مشکل سے پہچانیگا کہ یہ اُس کی وہی اُمت ہے جن کو اُس نے توحید کا سبق سکھایا تھا، اور یہ وہی مسلمان ہیں جن کی ہدایت کیلئے دنیا کا ہادی خدا کی وہ کتاب چھوڑ گیا ہے کہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ کیا فرق معلوم ہوگا اُن یہود اور نصاریٰ میں جو اپنے احبار و رہبان کو خطا سے پاک اور غلطی سے محفوظ سمجھتے ہیں، اور ان مسلمانوں میں جو اپنے اماموں اور مرشدوں کے قیاس یا قول کی مخالفت کو کفر سمجھتے ہیں۔ ہاں صرف یہ فرق نظر آویگا کہ وہ اپنی اپنی غلطیوں کی اصلاح کر رہے ہیں اور اپنے حالات اور خیالات کی درستی میں سرگرم ہیں، مگر اُس کی اُمت روز بروز اپنے آپ کو اُس کی تعلیم سے جدا کرتی جاتی ہے اور اُس کا دامن چھوڑ کر دوسروں کا ساتھ ڈھونڈ رہی ہے۔ پس اے میرے عزیز دوست جبکہ ہم مسلمانوں کا یہ حال ہو کہ اپنے مجتہد اور امام سے

اختلاف کرنے کو شرک سے بدتر جانیں، اور اپنے بزرگوں کی کھینچی ہوئی لکیر سے ایک قدم باہر رکھنے کو دائرہ شریعت سے نکلنا خیال کریں، اور بجائے قال اللہ وقال الرسول کے قال زید ہٰذا وقال بکر کذا کہتے ہوں، اور اپنے اعتقادات اور اعمال کی تائید میں بجائے خدا کی کتاب کے صرف ایسے لوگوں کی سند پیش کرنے کے عادی ہوں جو مثل اُن کے، چوک اور غلطی کرنے والے تھے۔ تو وہ کیونکر میرے اس اختلاف پر تعجب نہ کریں گے جو میں سید صاحب کی رایوں سے کرتا ہوں۔ اُن کی نظر میں دو صورتوں کے سوائے تیسری صورت ہی نہیں آسکتی۔ یا میں اُن کو کافر کہوں، یا ان کی تمام باتوں کو حق سمجھوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اُن کو محقق اور مصلح بھی جانوں، اور پھر اُن کی کھینچی ہوئی لکیر سے اپنا پاؤں بھی باہر نکالوں۔ مجھے اس موقع کے مناسب ایک حکایت یاد آئی کہ بعض شاگرد اپنے استاد سے بحث کرنے، اور جو بات وہ کہتا اس کو کاٹنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے استاد نے عاجز آکر اور خفا ہوکر یہ کہا کہ "ما اخس ذا منکم فی هذه العادة انه اذا وقعت زلة من معلمه فی فصل الخطاب لا تحتملون بعض هفواته وزلاته فما احسن ادب الصوفية والمريدين حيث يعدون قول مشائخهم ولو نكاسوا بما يخالف من امور الدين" یعنی تمہاری کیا بُری عادت ہے کہ اپنے استاد کا ادب نہیں کرتے اور اگر اُن سے کچھ لغزش ہو جاتی ہے تو اُس کی غلطی کی برداشت نہیں کرسکتے۔ دیکھو کیا اچھا طریقہ ہے صوفیوں اور اُن کے مریدوں کا کہ اپنے پیروں کی ہر بات کو مانتے ہیں اور اگرچہ وہ کچھ دین کے خلاف بھی کہیں اس کی بھی تصدیق کرتے ہیں شاگرد نے سنکر عرض کیا کہ "هكذا ادبهم وادابهم ونحن نحو هذا العلماء واصحابهم۔ وقد علم كل اناس مشربهم وعرف كل طائفة منزلهم" بلاشبہ صوفیوں اور ان کے مریدوں کا وہی ادب ہے جیسا آپ نے فرمایا، اور علما اور اُن کے شاگردوں کا یہی طریقہ ہے جو آپ نے دیکھا، ہر آدمی اپنے طریقہ کو پہچانتا ہے اور ہر فرقہ اپنی راہ پر چلتا ہے پس اے میرے عزیز، پیروں اور صوفیوں کو تو جانے دو کہ اُن کا طور وراء طور العقل ہے، اور ان کو کشف اور حقیقت کا وہ درجہ حاصل ہے، جہاں علم وعقل کی رسائی نہیں ہم تو محسوسات اور منقولات اور معقولات میں بحث کرتے ہیں، اور اس عالم میں ہم کسی انسان کو رائے اور خیال کی غلطی سے پاک نہیں سمجھتے، بلکہ بڑوں بڑوں کو غلطیوں میں پڑا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور غلطیاں بھی ایسی جس سے انسان کے خمیر میں خطا کے ہونے کا ایک حیرت انگیز ثبوت ملتا ہے متوسط درجہ کے لوگوں کو جانے دو۔ اُن شخصوں پر خیال کرو، جن کی تحقیقاتوں نے ایک عالم کے خیالات پلٹ دیئے، اور جن کے

دل و دماغ نے علمی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا جن کی تحریریں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ الہامی صحیفے ہیں، اور جن کی تقریروں پر یہ خیال گذرتا ہے کہ آسمان کے فرشتے بول رہے ہیں، اُن کے بھی بعض خیالات ایسے پست نظر آتے ہیں کہ اُن میں تحقیق کی بو بھی پائی نہیں جاتی، اور اُن کے دوسرے خیالات دیکھ کر اُن کی طرف ایسی باتوں کے منسوب کرنے پر تہمت کا شبہ ہوتا ہے اور اُس کے دو سبب ہیں، ایک یہ کہ موجودہ زمانہ کے خیالات اور الفت و عادت کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور باقی رہتا ہے، دوسرے یہ کہ جب کسی بات کا خیال کسی کے دل میں پورے طور پر بیٹھ جاتا ہے تو اُس کے خیالات جادۂ اعتدال سے گذر جاتے ہیں یہی حال ہمارے سید صاحب کا ہے۔ اُن کی تفسیر کو اُٹھا کر دیکھئے، بعض جگہ اُن کے خیالات ایسے روشن اور پاک نظر آتے ہیں کہ گویا ایک بارانِ رحمت ہے کہ برستا چلا جا رہا ہے، اور خدا کی زمین یعنی مسلمانوں کے دلوں کو شاداب کر رہا ہے اور بعض مقام پر وہ آیاتِ قرآنی کی ایسی تفسیر کرتے ہیں، کہ قرآن ایک کلام مہمل اور پوچ معلوم ہوتا ہے اور اُس کا مقصود اور مطلب بالکل فوت ہو جاتا ہے کہیں اُن کے دلائل ایسے مستحکم اور مضبوط ہیں، جو ہندسی دلیلوں کے موافق دل پر اثر کرتے ہیں۔ کہیں وہ اپنے دعوے کا ایسا ثبوت دیتے ہیں کہ اُس پر ہنسی آتی ہے۔ اور یہ حیرت انگیز اختلاف انہیں کے خیالات میں پایا نہیں جاتا، بلکہ سقراط اور افلاطون اور غزالی اور رازی وغیرہ حکماء یونان و اسلام کی تالیفات میں بھی انسانی طبیعت کا یہ جلوہ نظر آتا ہے۔ پس جو شخص اُن کے کلام سے مستفید ہونا چاہے اُسے چاہئے، کہ خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کرے، اور الحمد للہ کہ اسی پر میرا عمل ہے ؀

اب مجھے اس بات کا جواب دینا باقی ہے، کہ ایسے عقاید کے ساتھ، جو جمہور مسلمانوں کے خلاف ہیں، اور ایسی تفسیر کے لکھنے پر جس کے بعض مقامات پر میں خود مالا یرضی بہ قائلہ کہتا ہوں میں سید صاحب کو کس طرح مسلمان، نہ صرف مسلمان، بلکہ محقق سمجھتا ہوں، اور جیسا کہ میرے دوست نے لکھا ہے تفسیر بالرائے کے وعید اور خرقِ اجماع کے الزام سے میں کیونکر اُن کو بچا سکتا ہوں۔ اس کا حال یہ ہے کہ اگر ہم انصاف اور غور سے پچھلے بزرگوں کے حالات دیکھیں اور اسلام میں جو حکیمانہ خیالات رکھنے والے مسلمان ہوئے ہیں اُن کی کتابوں کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ لیس هذا اول قارورة کسرت فی الاسلام، ایک بیچارہ سید ہی اس جرم کا مجرم نہیں ہے اور نہ صرف اُس کے دماغ میں یہ مجنونانہ خیالات گذرے ہیں۔ بلکہ ہمارے بڑے بڑے اکابر، جو اب شیخ اور امام اور قطب کے معزز ناموں سے پکارے جاتے ہیں اس نشہ کے متوالے تھے، اور ان کے سر میں بھی یہی سودا تھا۔ اور اسی سبب سے کہ اُن کے تمام ملانوں

اور فقیہوں کے خیال سے زیادہ بلند، اور عوام کی سمجھ سے خارج تھے وہ کافر اور زندیق اور ملحد ٹھیرے۔

میں سید صاحب کی کوئی بات ایسی نہیں دیکھتا، جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سے کسی نہ کسی میں پائی نہ جاتی ہو، اور نہ کوئی عقیدہ اُن کا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جس کا پتہ کسی نہ کسی پرانی تحریر میں نہ ملتا ہو پس اگر کوئی عقیدہ اُن کا معتزلہ یا نیچریہ یا صوفیہ یا اور کسی ایسے فرقہ سے ملتا ہو جو اسلام میں داخل ہے، تو کفر کا اطلاق اُن پر ہرگز کوئی نہ کرے گا۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ ہمارے آئمہ کبار نے طے کر دیا ہے کہ کوئی فرقہ مسلمانوں کا دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہے کیا خوب فرمایا ہے امام ابوالحسن اشعری نے کہ مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کو گمراہ سمجھتا اور برا جانتا ہے مگر اسلام میں سب شریک ہیں اور اسلام اُن سب کا جامع ہے "کما قال فی اول کتاب مقالات الاسلامیین اختلف المسلمون بعد نبیھم صلعم فی اشیاء ضلل فیھا بعضھم بعضا وتبرأ بعضھم عن بعض فصاروا فرقا متباینین الا ان الاسلام یجمعھم ویعمھم" اور بالفرض اگر وہ کسی عقیدہ اور کسی قول میں منفرد بھی ہوں تاہم وہ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتے اس لئے کہ "لا یخرج المؤمن من الایمان الا بجحود ما ادخلہ فیہ"، انسان کو ایمان سے صرف اُس چیز کا انکار نکالتا ہے جس کے اقرار نے اُسے داخل کیا تھا۔ البتہ متعصب فقہا اور متعصب علما کے عناد و جدال کے لئے دائرہ وسیع ہے وہ کٹھ حجتیاں کرنے اور خواہ مخواہ کافر بنانے کے لئے مطلب الٹا بیان کرنے اور تہمت لگانے کی بہت گنجائش ہے، مگر کالے دل والوں کے جاری کئے ہوئے کالے کاغذ کسی مسلمان کو کافر نہیں بنا سکتے، اور ملانوں کی عداوت یا حمایت سے کوئی محقق مسلمان اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا۔ فمن تعرض لتکفیرہ وتکفیر ھؤلاء المحققین فانما ھو لجھلہ او لعدم فھمہ وقلت ایمانہ وعدم مبالاتہ بھفوات لسانہ

اگر میرے دوست ذرا تاریخ دیکھنے کی تکلیف گوارا فرماتے اور نہ صرف اسلام بلکہ دیگر مذہب کے اکابر دین کے حالات پڑھتے، تو اُن کو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہتی بلکہ اُن کو معلوم ہو جاتا کہ کوئی مذہب دنیا میں ایسا نہیں ہے جس میں کورانہ تقلید پر مذہب کا مدار نہ سمجھا گیا ہو اور عقل سے کام لینے اور تحقیق و تنقیح کرنے، اور شریعت کو فطرت سے تطبیق دینے، اور حکیمانہ خیالات ظاہر کرنے پر بدعت اور کفر کا الزام نہ لگایا

گیا ہو۔ مسلمانوں میں تو خدا کی مہربانی سے کم کوئی بڑا امام اور مجتہد ایسا ہوا ہے جس کے خیالات ایسے عامیانہ ہوں۔ بلکہ برخلاف اس کے بڑے بڑے محقق اور حکیم ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے دین کو عقل سے، اور مذہب کو حکمت سے، جدا نہیں سمجھا بلکہ حقائق و اسرار کے بیان کرنے ہی کو اسلام کی اصلی تائید خیال کیا ہے۔ مگر ہاں دوسرے مذہبوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگ جو مذہب کے مصلح اور ریفارمر تھے، اور جو مذہب کے بانی اور ہادی سمجھے جاتے ہیں حکمت و فلسفہ اور تحقیق و تنقید کے ایسے دشمن تھے کہ ان کے ارشادات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ذرا لوتھر کو دیکھئے جو پروٹسٹنٹ مذہب کا بانی اور عیسائیت کا مصلح ہوا ہے۔ وہ حکیموں کا کیسا دشمن تھا، اور افلاطون اور ارسطو کی نسبت کیا رائے رکھتا تھا۔ ایک یورپین مصنف لکھتا ہے کہ "لوتھر کا ارادہ یہ تھا کہ فلسفہ کی جڑ اور بنیاد کلیسیا سے نکال کر پھینک دی جائے۔ وہ ارسطو کے فلسفہ کے دیکھنے کو فضول سمجھتا تھا کہ "وہ حقیقت میں خبیث دیو، خوفناک تہمت لگانے والا، بدذات خوشامدی، اور تاریکی کا بادشاہ یعنی شیطان تھا۔ وہ ایک جانور، اور انسان کو نہایت خوفناک دھوکہ دینے والا تھا"، اور پھر حضرت لوتھر مقدس نے اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ فلسفہ کی زمین سے بھی ارسطو کو خارج کیا، اور کہا کہ "یہ (یعنی ارسطو) ایک ایسا شخص ہے جس میں بمشکل کوئی فلسفہ کی بات ہے۔ وہ علانیہ جھوٹ بولنے والا ہے، دروغ گوئی گویا اس کا پیشہ ہے، وہ ایک تن پرور اور نفس پرست ہے، وہ بکری ہے، وہ بڑا ملعون ہے"، اور یہ مقدس لوتھر صرف اسی نامور حکیم کی ہجو پر کفایت نہیں کرتے، بلکہ زمانہ متوسط کے تمام فلاسفروں کی نسبت فرماتے ہیں کہ "وہ ٹڈیاں، کیڑے، مینڈک، اور جوئیں تھے"۔ اسلام میں کسی بڑے امام اور مجتہد کی زبان سے حکمت و فلسفہ کے خلاف ایسی باتیں نہیں نکلیں، اور حکیموں و فلسفیوں کو انہوں نے ایسی گالیاں نہیں دیں۔ البتہ عوام اور متقشفین فقہا اور متعصب علما نے ہمارے یہاں بھی حکمت کو برا سمجھا، اور فلاسفروں اور محققین کو ملحد کہا مگر ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایسے لوگوں کا تخطیہ کیا گیا، اور ہمارے عالی دماغ علما ایسے خیالات اور ایسے اقوال کی ہمیشہ تردید، اور حکیمانہ خیالات رکھنے والوں اور شریعت کو حکمت سے مطابق کرنے والوں کی تائید کرتے رہے۔ اسلام کی تاریخ میں کوئی حکیم اور محقق مسلمان ایسا نہیں تھا جس کے محققانہ خیالات پر لوگوں نے الحاد کا الزام لگایا ہو، اور بڑے بڑے نامور روشن خیال عالموں نے اسکو رد نہ کیا ہو۔ میں بطور مثال کے حضرت محی الدین ابن عربی کا کچھ ذکر کرتا ہوں۔ کہ جب انہوں نے وہ وہ باتیں بیان کیں، جو حشویہ خیالات کے عالموں کی سمجھ سے باہر تھیں تو ظاہری علمائے اُن پر

جھک پڑے، اور فقہا قد کفر کا شور مچانے لگے کسی نے اُن کی کتابوں کے جلانے کا حکم دیا کسی نے اُن کے کفر کو یہود اور نصاریٰ کے کفر سے بڑھ کر قرار دیا کسی نے روزانہ دس مرتبہ اُن پر لعنت کرنے کو اپنا وظیفہ ٹھیرایا، اور بہتوں نے اُن کے مزار مبارک کو مزبلہ بول و براز بنایا ابن مقری نامی ایک بزرگ کو دینداری کا ایسا جوش اُٹھا کہ وہ فرمانے لگے کہ من شک فی کفر طائفۃ ابن عربی فھو کافر کہ جو ابن عربی کے گروہ کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے، مگر آخر کیا ہوا ایک دوسرا گروہ بڑے بڑے نامی عالموں کا اُن کی تائید پر کھڑا ہوا اور اُن کے حقائق و دقائق کو سمجھ کر اُن کی ولایت و قطبیت کا مقر ہوا، اور تکفیر کرنے والوں کی نادانی اور غلطیوں کو ظاہر کرنے لگا۔ اُن کی تائید میں کتابیں تصنیف ہوئیں معترضین کے اعتراضات رد کیے گئے اور اُن کو شیخ وقت اور قطب الاقطاب کا خطاب دیا گیا۔ کیا خوب کہا ہے ہمارے یہاں کے ایک عالم نے ابن مقری کی نسبت کہ انہ یزعم ارادۃ النصیحۃ بتواتر من شک فی کفر ابن عربی فھو کافر۔ تا تشین من الحکم ابهم بالکفر علی من لم یتیقن کفرهم فانظروا الی هذه التعصب الذی بلغ الغایۃ۔ وخرق به ابماع الامۃ وانتقل به الی الکفر غیر المتیقنین کفرهم سبحانک هذا بهتان عظیم اذ تلقونه بالسنتکم وتقولون بافواهکم ما لیس لکم به علم۔ وتحسبونه هینا وهو عند الله عظیم۔

پس اے میرے عزیز دوست، میں باوجود اُس مخالفت کے، جو سید کو ایک بڑے گروہ سے مسلمانوں کے ہے، اُسی سبب سے کافر نہیں کہتا جن وجوہ سے دین نے ابن عربی کو کافر نہیں کہا۔ اور میں اُن کو اُسی طرح اور انہیں وجوہ سے حمایت کرتا ہوں جس طرح اور جن وجوہ سے اکثر روشن خیال مسلمانوں نے ابن عربی کی حمایت کی تھی۔ اے میرے عزیز دوست۔ اگر وہ شخص جس کو میں جانتا ہوں کہ اُس نے اپنی ساری زندگی اسلام کی تائید میں گذاری، اور جس کی نسبت میرا یقین ہے کہ اُس کا ایمان ہزاروں کے ایمان سے سینکڑوں درجہ بڑھ کر ہے، اور جس پر میرا دل شہادت دیتا ہے کہ خدا اور رسول پر اُسے ایسا اعتقاد ہے، کہ اُس کا ہر بن مو لو کشف الغطاء ما ازددت یقینا پکار رہا ہے اور جیسے سوتے، جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے، مذہب ہی کی تائید، اور مسلمانوں ہی کی ترقی کا خیال، رہتا ہے اگر وہی کافر اور اسلام سے خارج ہو، تو میں نہیں سمجھتا، کہ پھر دنیا میں کون مسلمان ہوگا، اور اسلام کی تصویر کہاں نظر آئے گی؟

در جملہ جہاں یکے چو سید و آں ہم کافر
پس در ہمہ جہاں یکی مسلمان نہ بود

اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اس لئے کہ بہت طول ہوگیا۔ دوسرے وقت ان عقائد

اور خیالات سے تفصیلی بحث کرونگا جن کے سبب سے لوگ سید صاحب پر دہریت کا الزام لگاتے ہیں۔ اور اس امر کے دکھلانے کی کوشش کرونگا کہ یہ خیالات اُنہیں کے دماغ کی پیداوار نہیں، بلکہ پچھلے مسلمانوں میں بھی ایسے خیالات رکھنے والے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر میں نفس مطلب پر متوجہ ہونگا، اور سید صاحب کی تفسیر کے اُن مقامات سے بحث کرونگا۔ جہاں میرے نزدیک حضرت نے ایسی بلند پروازی کی ہے کہ آسمان پر جاتے جاتے گھر سے غار میں گر پڑے ہیں، اور اسلام کو نیچر سے ملانے کے شوق میں سیدھی راہ سے بہک کر اُلٹے چلنے لگے ہیں۔ ونتضرع الی اللہ ان ینفع بہ الی اغبون الذین ھم نحق طالبون۔ وعن طریق العناد ناکبون دغرضھم تحصیل الحق المبین لا تصویر الباطل بصورۃ الیقین۔

میں نے اپنے پچھلے مضمون میں وعدہ کیا تھا، کہ آئندہ ان عقائد اور خیالات سے تفصیلی بحث کرونگا جن کے سبب سے لوگ سید صاحب پر دہریت کا الزام لگاتے ہیں۔ اور اس امر کے دکھلانے کی کوشش کرونگا۔ کہ یہ خیالات انہیں کے دماغ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ پچھلے مسلمانوں میں بھی ایسے خیالات رکھنے والے پائے جاتے ہیں۔ اب میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں۔ مگر میرے اس مضمون کے دیکھنے والوں کو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے، کہ میرے اس مضمون کا موضوع اس بات کا دکھانا ہے، کہ سید صاحب کے بعض عقائد میں جس پر ان کو الزام دہریت کا دیا جاتا ہے پچھلے مسلمان بھی ہم خیال تھے۔ کوئی غلطی سے یہ نہ سمجھے کہ میں بھی ان خیالات میں سید صاحب سے متفق ہوں[1] میرے جو خیالات ان مسائل میں ہیں، انہیں سید صاحب کی تفسیر سے بحث کرتے وقت بیان کرونگا۔

میرے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں، کہ کیا آپ کے نزدیک خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرنا، ملائکہ اور شیاطین کے وجود کو نہ ماننا، دوزخ اور جنت سے انکار کرنا، آدم و حوا کے قصہ کو افسانہ سمجھنا، معجزات کی ہنسی اُڑانی کفر نہیں ہے۔ اس کے جواب میں میں اپنے دوست کو دو تحریروں کے دیکھنے پر توجہ دلاتا ہوں۔ ایک وہ جو دفع بہتان کے عنوان سے ۱۲۹۱ ہجری کے تہذیب الاخلاق میں چھپا ہے۔ دوسرے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ جس کا نام ہے التفرقہ بین الاسلام والزندقہ دافع البہتان کے دیکھنے سے میرے دوست کو معلوم ہو جاوے گا، کہ جب اس قسم کے عقائد ان کی نسبت مشہور کئے گئے تھے تو خود انہوں نے اس کی نسبت کیا فرمایا تھا۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ کے ملاحظہ سے میرے دوست کو معلوم ہو سکیگا، کہ کسی چیز کے انکار کے کیا معنی ہیں

---

[1] ضرور متفق ہو ضرور متفق ہو اگر نہیں تو ہو جاوگے بشری لکم (سید احمد)

وجود کی کتنی قسمیں ہیں، اور کفر کی حد اور نشانی کیا ہے، اگر یہ کتاب ہمارے دوست کو نہ ملے تو سید صاحب کا وہ رسالہ منگا کر ملاحظہ فرماویں جس کا نام ہے "المنظر فی بعض مسائل الامام ابو حامد محمد غزالی۔ اس میں امام صاحب فرماتے ہیں:-

کہ ہر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی تکفیر کرتا ہے اور اس پر رسول کی تکذیب کی تہمت دھرتا ہے، حنبلی اشعری کو کافر کہتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے، کہ اس نے جو خدا کے لئے اوپر کی جہت ثابت کی ہے، اور عرش پر خدا کا بیٹھنا مانا ہے، تو اس نے رسول کی تکذیب کی ہے۔ اور اشعری حنبلی کو کافر کہتا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ وہ خدا کی تشبیہ کا قائل ہے، اور رسول نے تو کہا ہے لیس کمثلہ شیئ اس لئے وہ رسول کی تکذیب کرتا ہے، اور اشعری معتزلی کو اس خیال سے کافر بتاتا ہے، کہ اس نے خدا کے دیدار ہونے، اور خدا میں علم اور قدرت اور دیگر صفات کے قائم الذات ہونے سے انکار کرنے میں رسول کی تکذیب کی ہے۔ اور معتزلی اشعری کو اس خیال سے کافر بتاتا ہے، کہ صفات کو عین ذات نہ ماننا تکثیر فی الذات ہے۔ اور توحید ذات باری میں تکذیب رسول کی ہے پس ان جھگڑوں سے نکلنا جب تک کہ تکذیب و تصدیق کی حقیقت نہ سمجھی جائے مشکل ہے"

اس کے بعد امام صاحب تکذیب و تصدیق کی حقیقت اس طرح پر بتلاتے ہیں کہ:-

کسی خبر کی تصدیق صرف اس خبر ہی تک نہیں ٹھہرتی، بلکہ مخبر تک پہنچتی ہے، اور اس کی حقیقت اس چیز کے وجود کو تسلیم کرنا ہے جس کے وجود کی خبر رسول نے دی ہے، لیکن وجود کے پانچ درجے ہیں، اور انہی کے نہ جاننے سے ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر بتاتا ہے، اور وجود کے پانچ درجے یہ ہیں (۱) وجود ذاتی۔ (۲) وجود حسی (۳) وجود خیالی۔ (۴) وجود عقلی (۵) وجود شبہی، پس جس چیز کے وجود کی رسول نے خبر دی ہے، اور جس نے اس کے وجود کو ان پانچوں قسموں میں سے کسی قسم کے وجود کو تسلیم کیا ہے تو وہ اس کی تصدیق کرتا ہے نہ تکذیب۔ تکذیب جب ہی ہوگی، جب وہ ان سب قسم کے معنی اور مراد سے انکار کرے، اور یہ گمان رکھے، کہ جو کہا ہے اس کے کچھ معنی نہیں ہیں، اور وہ کذب محض ہے، اور قائل کی غرض خود دھوکہ دینا ہے۔ یا دنیاوی مصلحت، اور یہ محض کفر اور زندقہ ہے۔ اور تاویل کرنے والوں کو جب تک کہ قانون تاویل کو پکڑے ہوئے ہیں کفر لازم نہیں آتا" سید صاحب اس قول کو امام صاحب کے نقل کر کے اپنے رسالہ

مذکور الصدر میں فرماتے ہیں کہ اب ہم پوچھتے ہیں کہ بموجب اس تشریح کے جو امام صاحب نے بیان کی، کیا وجہ ہے کہ جو لوگ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ "الاخبار من الجنة والنار حق" مگر ان کے نزدیک دلیل سے ثابت ہوا ہے کہ جنت و دوزخ مثل مالی کا سا باغ اور کلوا لوہار کی سی بھٹی نہیں ہو سکتی اور اس لئے وہ اس کا وجود شبہی قرار دیتے ہیں، پھر وہ کیوں کافر ہیں؟ وہ لوگ جن کے نزدیک کسی دوسرے جسم غیر مرئی و غیر محسوس کا مغوی الانسان یا ہادی الانسان ہونا محال ثابت ہوا ہے۔ اس لئے وہ شیطان یا ملائک کے وجود خارجی کے منکر ہو کر اس کا وجود فی نفس الانسان تسلیم کرتے ہیں، اور بعوض اس کے کہ عورت کے رحم میں ایک مصور فرشتہ گھسا ہوا سمجھیں قوت مصورہ ہی پر ملک کا اطلاق کرتے ہیں۔ کیوں کافر ہیں؟ جو لوگ کہ لوح محفوظ کو لڑکوں کی سی تختی اور قلم کو نیزہ یا نرسل کا قلم نہیں سمجھتے بلکہ اس کا وجود عقلی تسلیم کرتے ہیں، وہ کیوں کافر ہیں؟ جو لوگ کہ وحی من اللہ میں کسی دوسرے کے واسطے کو بدلائل محال سمجھتے ہیں اور وہ اسی قوت کو جو انبیا میں ہے جس کے سبب اُن پر نزول وحی ہوتا ہے اور جس کو ملکۂ نبوت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جبرئیل امین تسلیم کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ "الجبرئیل حق" وہ کیوں کافر ہیں؟

علاوہ اس کے بے انتہا دریا اسی قسم کی مثالوں کا اس چشمہ سے جس کو امام صاحب نے کھولا ہے بہ سکتا ہے۔

وانّی بوانی وفقنی الله الی هذه العبارات، تجد المنکرین الذین یصیحون علی هذا الرجل العظیم ویجزعون بکفره، قد رکبوا متن عمیا، وخبطوا خبط عشوا، وان الله اعمی بصائرهم واصم آذانهم عن ذالک، حتی وقعوا فی ما وقعوا۔ وینبغی لکل ذی عقل ودین ان لا یقع فی ورطة الانکار علی هذا الرجل العظیم۔ لان علمه ومعرفته، واشتهار براءته عن هذه المقالات الشنیعة ولا بدّ من معرفة مدلول کلامه وبحمد الله، المنکرون علیه کلهم، جاهلون بذالک۔ اذ لیس منهم احد نقی علوم المعقولات والهیئة والطبعیات وطبقات الارض وغیرها۔ بل ولا سمع لها رائحة ویکفرونه بحمل کلامه علی المعنی الفاسد والمطلب الکاسد، وما الباعث علی هذا، غیرتهم علی ظاهر الشریعة، بل الحسد والفساد واللدد والعناد۔

اگرچہ میں اپنے دوست کی انصاف پسندی اور نیکدلی سے امید رکھتا ہوں کہ ان کے اطمینان

قلب کے لئے سید صاحب کی تحریر جو اوپر میں نے نقل کی کافی ہوگی۔ اور اُن کے دل سے سب غلط شبہے دُور ہو جاوینگے مگر مجھے اپنے وعدہ کے موافق ان مسائل سے زیادہ بحث کرتا، اور علماء سلف کے خیالات اُس کی نسبت ظاہر کرنا ضرور ہے خصوصاً نیچر اور لا آف نیچر یعنی فطرۃ اور قانونِ فطرت کی نسبت۔ کہ یہ وہ اہم اور ضروری مسئلہ ہے جس کی وجہ سے سید صاحب معاذ اللہ ایک نئے دین کے بانی کہے جاتے، اور وہ اور اُن کے پیرو نیچری کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں بھی جو یقیناً ایک حیثیت سے سید صاحب کا اس مسئلہ میں مخالف ہوں اسی مبارک لقب سے یاد کیا جاتا ہوں۔ اس لئے مجھے اس مسئلہ کی نسبت قدرے تفصیل سے بحث کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ معلوم ہو کہ نیچر کی حقیقت کیا ہے، اُس کی نسبت حکماء قدیم و فلاسفہ حال کی کیا رائے ہے، سید صاحب اس کی نسبت کیا کہتے ہیں، اور ان کی رائے و خیال کا پتہ متقدمین حکماء اسلام میں بھی کہیں ملتا ہے یا نہیں ❊

نیچر و لا آف نیچر یعنی فطرت اور قانونِ فطرت

نیچر[1] ایک لفظ انگریزی ہے جس کا ترجمہ ہماری زبان میں کبھی طبیعت کبھی فطرت کبھی قدرت کیا جاتا ہے طبیعت کے معنی لسان العرب میں یہ لکھے ہیں "الطبع والطبیعۃ الخلیقۃ و السجیۃ التی جبل علیہا الانسان" یعنی طبیعت وہ چیز ہے کہ جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے

[1] نیچر لفظ مشتق ہے لیٹن کے لفظ ... نیٹس سے جس کے معنی ہیں پیدا شدہ کے ❊
اس لفظ کے کثیر الاستعمالی زبان انگریزی میں مفصلہ ذیل ہیں ...

اول۔ مجموعہ ان صفات کا کہ جن سے کوئی چیز مرکب ہو کر اپنی حیثیت ایسی رکھتی ہو کہ دیگر اشیاء سے ممیز ہو خواہ حیثیت پیدائش کے ساتھ پیدا ہو۔ وصف ضروری خاص باوث ❊

دوم۔ اصطلاحی معنی۔ مہربانی قسم جنس خصلت ❊

سوم۔ معینہ دور اشیاء معمولی ترتیب واقعات تعلق مابین علت و معلول وغیرہ کے ❊

چہارم۔ موجودہ نظام اشیاء مجموعہ معلوم اسباب و نتائج کا۔ عالم مادہ و عقل مخلوق۔ کائنات ❊

پنجم۔ اصطلاحی معنی مجموعہ و ترتیب جملہ اسباب و نتائج کی۔ وہ قوتیں جو کہ کسی ظہور اشیاء کی ممد ہوتی ہیں خواہ جزءاً و کلاً۔ وہ قوتیں جن سے کہ عمل پیدائش واقع ہوتا ہے۔ مجموعہ تمام ان قوتوں کا بحیثیت تمیز اس عقل کل سے کہ جو مبدء کائنات سمجھا جاتا ہے ❊

ششم۔ فطرتی حیثیت بادب و عظمت ❊

ہفتم۔ مطابقت ان چیزوں سے کہ جو فطرتی یعنی نیچرل ہیں بحیثیت تمیز ان چیزوں سے کہ جو مصنوعی ہیں یا بعد میں قرار دی گئی ہیں یا جو واقعی تجربہ کے بعد ہوں مطابق ان چیزوں کے جو کہ معمولی ہیں اور عموماً ہوتی ہیں ❊

ہشتم۔ شخص ذہین اور صاحب خصلت ذہن یا عقل یا صفت ❊

نہم۔ فطرتی حالت باعتبار لباس۔ عدم پوشش۔ برہنگی ❊

مگر حقیقت میں یہ تعریف پوری اور جامع نہیں ہے اور نہ اس سے ذہن میں وہ پورا مفہوم آتا ہے جن معنوں میں نیچر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے! اور نہ صرف انسان ہی سے یہ مخصوص ہے، بلکہ تمام موجوداتِ عالم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ فطرت کے معنی بھی جو لغت کی کتابوں میں درج ہیں، نیچر کے مفہوم کو پورا پورا ادا نہیں کرتے۔ لسان العرب میں لکھا ہے "الفطرۃ الابتداء والاختراع وفطرۃ اللہ ای خلقۃ اللہ التی خلق علیہا البشر" یعنی فطرت کے معنی ہیں ابتدا و اختراع کے، اور فطرت اللہ سے مراد ہے خدائی بناوٹ جس پر اس نے آدمی کو بنایا اور پیدا کیا۔ جس طرح لغت میں طبیعت اور فطرت کے صاف اور پورے معنی بیان نہیں کئے گئے، اسی طرح حکمت اور مذہب کی کتابوں میں بھی اس کی حد اور تعریف صاف صاف پائی نہیں جاتی! اور نہ زمانۂ حال میں ہمارے کسی عالم نے اس کی تشریح فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ سید صاحب قبلہ نے بھی جن کی زبان پر ہر وقت نیچر کا مبارک لفظ رہتا ہے اور جن کے قلم سے ہر دم نیچر نکلتا رہتا ہے، اور جن کی تفسیر کا مدار نیچر پر ہے اس لفظ کی نہ حد بتائی نہ تعریف! اور اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے، کہ حکماء یورپ بھی اب تک اس لفظ کے معنی اور مفہوم میں غلطیاں کرتے ہیں، اور فلاسفۂ قدیم کی تالیفات میں بھی اس لفظ کی صحیح حد اور تعریف پائی نہیں جاتی سقراط کے مکالمات میں بھی کوئی مکالمہ نیچر پر نہیں ہے، ورنہ جیسا کہ اس کا طرز استدلال اور طرز بیان ہے، اس لفظ کے معنی بھی وہ صاف صاف بیان کر دیتا، اور اس میں وہ ابہام نہ رہتا جس سے اس لفظ کے استعمال میں لوگ دھوکہ کھاتے ہیں۔ سب سے عمدہ اور شاید اول ہی بیان جو نیچر کے معنی اور حقیقت کی نسبت کیا گیا ہے وہ ہے، جو جان اسٹوارٹ مل نے اپنے مشہور مضمون میں جو نیچر پر لکھا ہے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"کہ نیچر کا یہ لفظ اور جو الفاظ اس سے نکلتے ہیں انسان کے خیالات اور جذبات پر بہت قابو رکھتے ہیں، اور ان کا اثر انسانوں پر ہمیشہ بہت کچھ رہا ہے لیکن جب ہم غور کرتے ہیں، کہ ان الفاظ کے ابتدائی اور اصلی معنی کیا تھے، اور اس کا مفہوم کیا تھا، تو نہ صرف حیرت بلکہ افسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ الفاظ جن کا علم اخلاق اور مابعد الطبعیات میں اس قدر دخل ہے، ان کے معنی اس قدر بدل گئے ہیں، اور ایسے مختلف معنی پیدا ہو گئے ہیں کہ ان سے غلط مبحث ہو جاتا ہے، اور اسی واسطے اس لفظ نیچر کے مغالطہ آمیز معنی سے لوگ دھوکا کھاتے ہیں" پھر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر ہم افلاطونی طریقہ کے مطابق اس لفظ کے ٹھیک معنی تحقیق کریں۔ تو اول سوال یہ ہونا چاہیے، کہ ایک خاص شے کے نیچر سے کیا مراد ہے مثلاً آگ یا پانی یا درخت کا نیچر۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اس کی تمام قوتوں اور خاصیتوں کا مجموعہ ہے

جس سے وہ اور چیزوں پر اپنا اثر ڈالتی، اور نیز دوسری اشیاء کا اثر اُس پر ہوتا ہے اور نیچر جب عام بولا جائے تو اُس کے معنی ہیں۔ تمام چیزوں کی کل قوتوں اور خاصیتوں کا مجموعہ، اور تمام مظاہر عالم کا جملہ مع اُن علتوں کے جن سے وہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں نہ صرف وہ چیزیں شامل ہیں جو وقوع ہوئی ہیں، بلکہ وہ بھی جو قابل الوقوع ہیں۔ اور جس طرح علتوں کی مستعمل قوتیں نیچر کی ایک جزو ہیں، اسی طرح پر نامستعمل قوتیں بھی پس نیچر کا سب سے مفہوم یہ ہے۔ کہ وہ ایک مجموعی نام ان تمام واقعات کا ہے جو بالفعل ہوں یا بالقوہ۔ یا زیادہ صحیح طور پہ کہا جائے تو وہ نام ہے، اُس طریقہ کا جو کچھ معلوم ہے اور کچھ نہ معلوم جس میں سب چیزیں واقع ہوتی ہیں کیونکہ اس لفظ سے جو مفہوم ہوتا ہے وہ اُن بے شمار مظاہر کا تفصیلی حال نہیں۔ ہے جو واقع ہوتے رہتے ہیں، بلکہ ان سب واقعات عالم کا ایک مجموعی تصور ہے جو انسانی دماغ میں اُن سب مظاہر کے علم حاصل کرنے کی قابلیت ہو، تو اس کے خیال میں جو مجموعی تصور بنے گا وہ نیچر کا مفہوم ہے"۔

جان اسٹوارٹ مل نے اس معنی کو شین ثیفاٹ معنی بیان کئے ہیں مگر وہ لکھتے ہیں کہ یہ تعریف اس مبہم اصطلاحی نیچر کی بہت سے معنوں میں سے صرف ایک معنی ہیں۔ پھر انھوں نے آگے چلکر اس لفظ کے مختلف موردا اور مصدرق سے بحث کی ہے جو اس وقت ہمارے اس مضمون سے خارج ہے اس موقع پر ہم اسی پر بس کرتے ہیں۔

نیچر کے ساتھ ایک دوسرا لفظ بھی بولا جاتا ہے، جسے لا آف نیچر کہتے ہیں، اور جسے ہم کبھی قانون فطرت کبھی قانون قدرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ ان تعلقات اور ارتباط اور انسلاک کا نام ہے جو باہم عالم کے تمام موجودات میں پایا جاتا ہے وہ ایک نیا لفظ ہے اور سائنس یعنی علم کا آخری اور سب سے عمدہ انکشاف ہے۔ قدیم زبانوں میں یعنی جب سے علم پیدا ہوا مظاہر کائنات پر فرداً فرداً غور کیا جاتا تھا۔ اس وقت دنیا ایک رسم بر رسم عالم سمجھی جاتی تھی۔ یا یوں کہئے کہ مفرد دعلیحدہ علیحدہ اور بے تعلق واقعات کا مجموعہ تھی اہل نظر نے اپنے غور اور فکر سے یہ تو جان لیا تھا کہ ان واقعات کے مابین کوئی تعلق ضرور ہونا چاہیئے مگر قانون کا عمل قدیم زمانے کے لوگوں کی نگاہ سے بہت دور تھا کوپرنکس اور گیلیلیو اور کاپلر کے زمانے سے کائنات کی باقاعدہ سطریں اوّل اوّل نظر آنے لگیں۔ جب قدرت نے نیوٹن کے سامنے اپنا بڑا راز کھولدیا۔ اُس وقت سے یہ ظاہر ہوا کہ قانون فطرت فی نفسہ ایک واقعی امر ہے۔ اس وقت سے اس قانون کے تجسس میں سائنس (علم) سرگرمی سے کوشش کرنے لگا۔ اور ان تحقیق شدہ اور عمل پذیر سلسلہ یا متعلق نظم دنسق کا جو موجودات عالم میں پایا جاتا ہے، نام لا آف نیچر

یعنی قانون فطرت رکھا گیا۔ قانون فطرت صرف اُس باقاعدہ ترتیب کا اظہار ہے جو قدرتی اشیاء میں پائی جاتی ہے، اور جسکو ارباب نظر کی ایک کافی تعداد نے دیکھا ہے۔ اس امر کی نسبت اتفاق نہیں ہے، کہ قوانین خود کیا ہیں۔ یہ قوانین کسی چیز کو پیدا یا کسی کی پرورش کرتے ہیں۔ وہ صرف ان چیزوں کو یکساں حالت پر قائم رکھتے ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں، اور جن کی پرورش ہو رہی ہے در حقیقت وہ ایک طرز عمل ہیں نہ کہ عامل، وہ ایک آئین ہیں نہ کہ قوت، مثلاً قانون کشش صرف ایک طرز کارروائی کا بیان ہے، وہ خود کشش کی نسبت کسی قسم کی روشنی نہیں ڈالتا ہے نیوٹن نے کشش کا انکشاف نہیں کیا، نہ اس کی حقیقت اب تک منکشف ہوئی ہے۔ اُس نے صرف قانون کشش کو دریافت اور ظاہر کیا۔ مگر وہ اس قانون کی ابتدا یا خاصیت یا سبب کا کوئی علم نہیں دیتا۔

یہ ہے مختصر حقیقت نیچر اور لا آف نیچر یعنی فطرت و قانون فطرت کی، جو اس زمانے کے فلسفی بیان کرتے ہیں۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس کی نسبت علماء قدیم کیا کہتے ہیں۔ وہ نیچر کے معنی اور مفہوم پر طبیعت کا لفظ استعمال کرتے تھے اور اُسے ایک قوت روحانیہ مدبرۂ عالم سمجھتے تھے جیسا کہا گیا ہے کہ انہ قوۃ روحانیہ مدبرۃ الکل۔ افلاطون کا یہ خیال تھا کہ طبیعت کی دو قسمیں ہیں ایک عام، جو تمام عالم میں ساری ہے۔ دوسری خاص، جو ہر چیز میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے تمام تغیرات اور تاثیرات ہوتی ہیں کما قال ان فی العالم طبیعۃ عامۃ ساریۃ فی الکل وفی کل واحد من المرکبات طبیعۃ خاصۃ، واحد الطبیعۃ انہا مبدأ الحرکۃ والسکون فی الاشیاء، ای مبدأ التغیر، وھو قوۃ ساریۃ فی الموجودات کلہا تکون السکنات والحرکات بھا یعنی عالم کی ایک طبیعت عام ہے جو سب کی جامع ہے، اور پھر ہر ایک چیز کی خاص طبیعت ہے اور طبیعت کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک قوت ہے جو تمام موجودات میں ساری ہے، اور تمام تغیرات اور سارے کام یعنی دوسروں پر اثر کرنا اور دوسری چیزوں کا اثر قبول کرنا اسی سے ہوتا ہے درحقیقت یہ معنی طبیعت کے قریب قریب نیچر کی اُس تعریف کے ہیں، جو فلاسفہ حال کرتے ہیں۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ سید صاحب کیا فرماتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں جو "نیچری" کے عنوان سے ١٢٩٦ سنہ ہجری کے تہذیب الاخلاق میں چھپا ہے لکھتے ہیں کہ "ابتدا میں علم نیچر محدود تھا، مگر جس قدر زیادہ تحقیقات ہوتی گئی۔ اُسی قدر زیادہ وسیع ہوتا گیا اور ثابت ہو گیا، کہ جس قدر چیزیں دکھائی دیتی ہیں یا جانی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے کام، اور انسان کے خیالات، اور اُس کے اعتقادات، سب کے سب نیچر کے قوانین کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں" یہ بیان سید صاحب کا کچھ نیچر اور لا آف نیچر کی حقیقت کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے ایک عام مفہوم کا بیان ہے اور اس سے وہ اس بحث کے اصل نتیجہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، یعنی نیچر کے

ماننے اور نہ ماننے کا اثر مذہب پر کیا پڑتا، اور یہ بحث کیا تغیر پیدا کرتی ہے چنانچہ وہ اس کے آگے یہ فرماتے ہیں کہ جس طرح تمام انسان اس خیال سے جس کو ہم کبھی مذہب سے اور کبھی لامذہب سے تعبیر کرتے ہیں خالی نہیں ہیں، اسی طرح اس علم کے عالم بھی اس خیال سے خالی نہ تھے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا۔ کہ جب ہم نیچر ہی کو تمام چیزوں میں، ان کے پیدا ہونے میں ان کی بقا میں ان کی فنا میں، پاتے ہیں تو جو کچھ ہے نیچر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ انہوں نے اس کا بھی جس کو ہم تم خدا کہتے ہیں انکار کیا، اور کہا کہ یہ آپ ہی آپ ہوئی۔ اور آپ ہی قائم ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی بعضوں نے کہا کہ وہ جس کو ہم تم خدا کہتے ہیں شاید ہو یا نہ ہو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ شاید انہی کے مشابہ وہ لوگ ہونگے جن کو ہمارے علماء اسلام نے دہریہ کا خطاب دیا ہے۔ انہیں عالموں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ انہوں نے جس قدر زیادہ نیچر کی اور اس کے قوانین کی تحقیقات کی، اسی قدر اس کو ایسی ترتیب اور ایسی مناسبت اور ایسے انتظام سے پایا، جس سے وہ حیران ہو گئے، اور انہوں نے یقین کیا، کہ یہ سب چیزیں آپ ہی آپ ایسی عمدگی سے نہیں ہو سکتیں۔ بے شک ان کو کسی بڑے کاریگر نے سمجھ بوجھ کر بنایا ہے انہوں نے اس علۃ العلل کا جس کی یہ سب چیزیں معلول ہیں، یا نیچر کے قوانین بنانے والے کا یا ان سب چیزوں کے پیدا کرنے والے کا، یا اس کا جس کو ہم خدا کہتے ہیں اقرار کیا، اور ٹھیک وہی رستہ چلے، جو کلدانیہ کے رہنے والے ایک نوجوان نے جس کو ابراہیم کہتے ہیں اختیار کیا تھا۔" سید صاحب کے اس بیان کو ہر منصف مزاج جو مذہب اور علم دونوں سے واقفیت رکھتا ہو قبول کریگا، اور ان حکیموں کے خیالات کو اس کا موید پاویگا جو سائنس (علم) کی بیجا حمایت نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ بھی نیچر اور قوانین نیچر کو ایک خدائے قادر مطلق کی ذات و صفات کا ثابت کرنے والا، اور توحید پر یقین دلانے والا سمجھتے، اور کہتے ہیں۔ کہ قوانین فطرت کے علم ہی نے انسان کا خیال ایک خدا کی طرف رجوع کیا، اور نظام عالم کے اس سلسلہ نے جو نہایت استحکام سے ایک دوسرے سے ملا ہوا اور تمام دنیا کو اپنی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہے، بندوں کو توحید کی طرف متوجہ کیا۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے، کہ مظاہر عالم پر نظر کرنے اور موجودات عالم کے دیکھنے سے انسان کا خیال خدا کی طرف کیوں رجوع ہوا، اور بالآخر اس نظارہ نے ایک ایسے خدا کا جو اپنی ذات و صفات میں کامل ہو کیوں یقین دلایا۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب انسان نے موجودات عالم پر نظر کی، تو دیکھا کہ جتنی چیزیں اس دنیا میں ہیں ان کی کوئی ہستی ہے، وہ پیدا ہوتی ہیں، نشوونما پاتی ہیں ان میں خاص خاص قوتیں اور تاثیریں ہیں۔ تو اس نے اپنا خیال دوڑایا، کہ ان کی ہستی کس سے ہے

ان کا قائم رکھنے والا اور محافظ کون ہے، اور ان میں یہ خاصیتیں اور تاثیریں کس نے رکھی ہیں۔ تب اُس نے سوچا کہ جسم تو مِنْ حَیْثُ ذَاتِہٖ جِسْمٌ ان افعال متنوعہ اور خواص مختلفہ اور تاثیرات عجیبہ کا پیدا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کا خیال کسی پوشیدہ اور باطنی قوت کی طرف گیا۔ غیر تربیت یافتہ دماغوں نے علم کے زمانہ سے پہلے مظاہر کائنات کے اختلاف کو مختلف قوتوں اور مختلف ارادوں سے منسوب کیا اور ہر فعل اور ہر کام کے لئے ایک دیوتا قرار دیا۔ علم کے زمانہ سے اول لوگوں کی سمجھ سے یہ بات دور تھی۔ کہ وہ مظاہر کائنات کے اختلافات کو کسی ایک قوت یا ایک ارادہ سے منسوب کرتے بلکہ اُن کے قدرتی میلان طبیعت نے انہیں مجبور کیا، کہ ہر مختلف فعل اور ہر مختلف ظہور کو ایسی مختلف قوتوں سے منسوب کریں جو اپنے ارادہ اور اپنی مرضی سے اُن افعال مختلفہ کے بانی ہوں اور اپنے اپنے صیغہ اور اپنے علاقہ کے حاکم ذی اقتدار ہوں، گو کوئی بڑا خدا ایسا بھی خیال کیا جاتا۔ جس کو تمام خداؤں پر نگرانی کا اختیار حاصل ہے مگر وہ مختلف علاقوں کا حاکم تسلیم کیا جاتا، اور ہر کام کے لئے جداگانہ خداؤں سے رجوع کرنا ضروری سمجھا جاتا۔ ایک قوت یا ایک حاکم یا ایک خالق یا ایک مدبر کا سچا عقیدہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ انسان نے یہ غور کرنا شروع نہ کیا، کہ مظاہر کائنات اور موجودات عالم جو ایک ابتری کی حالت میں نظر آتے ہیں، وہ ایک ایسے نظام پر مبنی ہیں، جس میں ہم ایک منفرد ارادہ اور بلا شرکت غیرے خاص اُس کے دخل اور اُس کی حکومت اور اُس کے عمل کو دیکھتے ہیں۔ دنیا کی نسبت ایسا خیال شاید مستثنیٰ ذہن کے آدمیوں میں پیدا ہوا ہو، مگر یہ خیال عام اسی وقت ہو سکتا ہے، جبکہ علمی خیال کی ترقی کو ایک مدت گذر چکی ہو اور وہ ترقی جو انسان نے علم میں کی، اور وہ تربیت یافتہ دماغ جنہوں نے علمی تحقیقات سے اس کائنات کا خیال کیا، اس قابل ہو سکتی تھی۔ کہ ان گنتی دیوتاؤں کے ماننے کے بدلے وہ ایک ایسے خدا کو مانیں، جو اپنی ذات میں کامل اور صفات میں یکتا ہو۔ اور اپنی قدرت اور ارادہ میں کوئی شریک نہ رکھتا ہو۔ اس جگہ سے ایک خدا کے ماننے کا اعتقاد شروع ہوتا، اور نیچر خدا کی وحدت اور یکتائی سکھاتا ہے۔ اور جہاں تک نیچر کے قوانین کا انکشاف ہو جاتا ہے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے عقیدہ کی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ سائنس (علم) کا کام کیا ہے؟ اس کا کام ہے شہادت جمع کر کے اس بات کا ثبوت کرنا، کہ نیچر میں ہر ایک واقعہ کسی پچھلے واقعہ یا واقعات سے تعلق رکھتا ہے یا یوں کہئے کہ ہر واقعہ کا وجود کسی مقدم واقعہ پر منحصر ہے لیکن نہ ایسا کہ وہ دوسروں کے عمل سے باطل یا ترمیم ہو سکے۔ کیونکہ یہ جداگانہ سلسلے علل کے ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں، اور ہر علت کے عمل میں دوسری علتوں کی اس قدر مداخلت ہوتی ہے، کہ ہر نتیجہ حقیقت میں بجائے ایک ہی علت سے پیدا ہونے کے تمام موجودہ علل کے مجموعی اثر سے

پیدا ہوتا ہے پس جبکہ یہ خیال دل میں جاگزین ہوا کہ، ہر واقعہ کا وجود پچھلے واقعات پر منحصر ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے وقوع ہونے کے لئے نہ صرف چند بلکہ شاید کل گذرے ہوئے واقعات کا باہم ملنا ضرور ہے، اور ملنا بھی اس طور پر کہ خفیف سا فرق بھی اس واقعہ کو پیدا نہ کرتا، یا اس کی حیثیت بہت کچھ بدل دیتا۔ تو لامحالہ یہ عقیدہ پیدا ہوتا۔ کہ ایسے ارتباط اور انتظام اور تسلسل کو جس سے تمام عالم جکڑا ہوا ہے، کوئی معین نہیں کر سکتا، نہ وہ قائم رہ سکتا تھا بجز ایک ایسی ذات کے جس کے قبضۂ قدرت میں نہ صرف ایک علاقہ کی، بلکہ تمام کائنات کی حکومت ہو۔ اور جس کا کوئی سہیم اور شریک نہ ہو۔ اس لئے ایک خدا اور ایک قادر مطلق کے یقین کا سبب یہ نہیں ہے۔ کہ زیادہ ترقی یافتہ قوموں میں وہ پایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی یہ وجہ ہے، کہ علم کی زمین پر صرف یہی اعتقاد اپنے قدم جمانے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ شرک کا خیال اور بہت سے دیوتاؤں کے ماننے کا اعتقاد، یعنی یہ کہ ہر دیوتا یا ہر ایک خدا اپنے علاقہ پر جُدی حکومت رکھتا ہے یا تو اس مقررہ اور مسلم شدہ اصول کے خلاف ہوگا۔ کہ منفردہ قوانین کے بموجب ہر ایک عمل اور ہر ایک واقعہ پچھلے اعمال اور گذرے ہوئے واقعات کا نتیجہ ہے۔ یا اس بات کو ماننا پڑیگا، کہ نظام عالم میں واقعات کا کوئی تسلسل اور ارتباط نہیں ہے، اور نہ کسی ایک چیز کا وجود دوسری گذشتہ چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں جو عالمِ نتائج علم کی ہیں، توحید کے انکار اور تعدد الٰہ کے عقیدہ کے قدم کو علم کی زمین پر جمنے نہ دینگی، اور علم اس اعتقاد کے رد کرنے، اور اپنی زمین سے نکال دینے پر مجبور ہوگا۔ کیا خوب کہا ہے زمانۂ حال کے ایک فلسفی نے کہ جب علمی نگاہ سے یہ امر دیکھا جاتے، کہ یہ کائنات ایک مستحکم اور مسلسل اور منتظم نظام ہے، اور وہ باہم ایسا متحد ہے، کہ بمثل حال کے بلکہ انسان کے جسم کے یا ایک ایسے آلہ کے جو اپنے پرزوں کی دائمی حرکت سے چل رہا ہے تو یہ ضرور تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ سوال جس کا جواب عقیدہ خدا ہے، بالکل ایک طبعی سوال ہے اور انسانی دماغ کی ایک ظاہری ضرورت سے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ ہم مشاہدہ کی وسعت سے ہر جداگانہ واقعہ کی ایک محدود ابتدا کی تلاش کرنے کے عادی ہیں، اور چونکہ جہاں کہیں ابتدا ہے وہاں ہم ایک مقدم واقعہ کو پاتے ہیں، جسے ہم علت کہتے ہیں۔ اس لئے یہ ناممکن تھا کہ انسانی دماغ اپنے سے یہ سوال نہ کرتا۔ کہ آیا کل کائنات کی ابتدا تھی جس کے یہ خاص مظاہر محض ایک جزو ہیں، اور اگر تھی تو آیا وہ ابتدا ایک واجب الوجود ہستی تھی یا کیا۔ آیا علل اور نتائج کے ان کل سلسلوں سے جن کو ہم نیچر کہتے ہیں پہلے کوئی چیز جس کے بغیر خود نیچر کی ہستی نہ ہوتی تھی یا نہیں۔ اس زمانہ سے جب کہ انسان نے پہلی ہی مرتبہ فکر کو جولانی دی، یہ سوال کبھی بغیر کسی نہ کسی فرضی جواب کے نہیں رہا ہے، اور اس کا صرف ایک جواب تشفی بخش ہے یعنی ایک خدا کا ماننا، اور اس کی

ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ سمجھنا، اور اس کی قدرت اور حکومت میں کسی کی مداخلت نہ ہونا؛ نیچر، جو نیچر اور اس کے غیر متغیر اور مستحکم اور مقررہ قوانین نے پیدا کیا ہے، درحقیقت اسلام کی تصدیق ہے، اور علم کا سچے دل سے اس بات کا اقرار، کہ ان الدین عند اللہ الاسلام فطرة اللہ التی فطر الناس علیها، اور در اصل نیچر ہر ایک بندہ کو خدا کی یہ منادی سنانے والا اور اس حکم کا اشتہار دینے والا ہے کہ "اقم وجهك للدين حنيفا، فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله، ذالك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون"

اب میں اپنے دوست سے جن کا یہ خیال ہے، کہ سید صاحب خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرتے ہیں، اور جن کا مجھ سے یہ سوال ہے، کہ کیا آپ کے نزدیک خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرنا کفر نہیں ہے بکمال ادب عرض کرتا ہوں۔ کہ وہ سید صاحب کے عقیدہ کی نسبت انصاف سے خود فیصلہ کریں، کہ آیا سید صاحب خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرتے ہیں، یا نیچر کو خدا کا قائم کیا ہوا سمجھ کر نیچر سے خدا کی خدائی اور اس کی یکتائی اور بے ہمتائی ثابت کرتے ہیں۔ اور وہ بھی نہ اپنی زبان سے بلکہ خدا کی زبان سے، اور نہ اپنے دل سے بلکہ خدا کی وحی سے۔ میرے دوست سید صاحب کے اس مضمون کو ذرا غور سے ملاحظہ فرماویں، جو ۱۲۹۶ ہجری کے تہذیب الاخلاق کے شروع میں نیچر پر لکھا ہے۔ اور جس میں ایک عجیب دل پر اثر کرنے والی تحریر سے خدا کی خدائی اور اس کی کبریائی وہ نیچر سے دکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کسی نے خدا کو اور کسی طرح نہیں جانا، اگر جانا تو نیچر ہی سے جانا۔ موسیٰ نے رب ارنی کے جواب میں کیا سنا، لن ترانی ولکن انظر الی الجبل، پہاڑ کیا تھا وہی نیچر قانون قدرت کا نمونہ تھا، خود خدا آپ ہی اپنے آپ کو کچھ نہیں بتلا سکا اور جو بتلایا تو نیچر ہی کو بتلایا۔ بولا کہ جس نے زمین کو تمہارے لئے بچھونا اور آسمان کو ڈیرہ بنایا اور آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہارے کھانے کے لئے طرح طرح کے میووں کو اُگایا، وہی خدا ہے۔ بولا کہ سمجھ داروں کیلئے آسمان و زمین کے پیدا کرنے، رات دن کے مختلف ہونے، کشتی کے دریا میں چلنے، آسمان سے پانی برسنے، زمین کے مرکر زندہ ہونے، ہواؤں کے ادھر اُدھر چلنے بادلوں کے آسمان و زمین ادھر اُدھر ہونے ہی میں نشانیاں ہیں۔ جب پوچھو کہ تو کون ہے، اس کا جواب تو کچھ نہ دے، اور اپنے قانون قدرت کو بتائے اور بولے کہ وہ جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدل بدل کر دیتا ہے۔ زندہ سے مردہ، مردہ سے زندہ نکالتا ہے" اسی طرح وہ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں کا بیان کرکے لکھتے ہیں کہ "خدا نے ہم کو، ہماری جان کو، ہماری سمجھ کو، ہمارے قیاس کو، ہمارے دل و دماغ کو، ہمارے رُوئیں رُوئیں کو، نیچر سے جکڑ دیا ہے۔ ہمارے چاروں طرف

نیچر ہی نیچر پھیلا دیا ہے نیچر ہی کو ہم دیکھتے ہیں، نیچر ہی کو ہم سمجھتے ہیں، نیچر ہی سے خدا کو پہچانتے ہیں ...... ہمارے باپ دادا بھی کچھ کرشمہ اور کرامات دیکھ کر ایمان نہیں لائے تھے، وہ بھی فطرتی مسلمان تھے ہمارا ہی دادا تھا جس کے دل میں فطرتی ایمان نے جب جوش کیا تو گھبرا گیا، اور نیچر کو، فطرت کو، خدا کے دین کو، ڈھونڈھنے لگا خدا ہی نے اُس کو ملکوت السموات والارض دکھلا دیئے وہ ملکوت کیا تھا، وہی نیچر فطرت خدا کا دین تھا۔ رات کی اندھیری میں ایک روشن ستارہ نیچر کا پرکالہ دیکھا، جانا کہ یہی خدا ہے، چاند کو نور کا ٹکڑا پایا۔ اُسی پر خدا ہونے کا دھوکا کھایا۔ سورج کو سب سے زیادہ چمکیلا دیکھا۔ اُسی پر خدا ہونے کا گمان کیا۔ مگر جب دیکھا کہ یہ سب تو ڈوب جاتے ہیں، تو بول اٹھا کہ میں اُس پر ایمان لایا جس نے فطرت نیچر کو بنایا اور پکا فطرتی مسلمان ہو گیا۔"

اے میرے دوست۔ اگر تم آنکھ رکھتے ہو دیکھنے والی اور کان رکھتے ہو سننے والے اور دل رکھتے ہو سمجھنے والا، تو اس تحریر کو۔ اس بیان کو۔ اس اعتقاد کو دیکھو، اور انصاف کرو۔ کہ یہ تحریر سید کی کیا پکارتی ہے، اس کا کہنے والا کیا کہتا ہے، اور اس کا تحریر سے کیا عقیدہ ظاہر ہے، کیا وہ نیچر کی جگہ خدا کو قائم کرتا ہے، کیا وہ خدا کی خدائی، اور اس کی قدرت کا منکر ہے کیا وہ ابراہیمی ملت پر نہیں ہے۔ کیا اُس کے ہر بُن مو سے اسلام نہیں ٹپکتا ہے، اور کیا ایسا شخص اسلام سے خارج سمجھا جا سکتا ہے اگر اس پر بھی تم یہی کہو، کہ وہ دہریہ ہے اور ملحد ہے وہ اسلام کا مخالف ہے، وہ نیچری ہے، اور نیچری بھی وہ جسے تم مرادف دہریہ سمجھتے ہو۔ تو آؤ اور مباہلہ کرو، ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنت اللہ علی الکاذبین ہیں ان سادہ لوح اور نیک دل مسلمانوں کو کچھ نہیں کہتا جو کچھ نہیں جانتے اور کچھ نہیں دیکھتے، اور کچھ نہیں سمجھتے، بلکہ اس اعرابی کی طرح جو رسول عربی روحی فداہ کی بات سنکر لا ازید ولا انقص کہتا ہوا چلا گیا تھا، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ دل سے کہتے، معمولی فرائض ادا کرتے، اور اپنے پیٹ کے دھندے میں لگے رہتے ہیں۔ کہ وہ سچے اور پکے مسلمان ہیں، اور سیدھے بہشت میں چلے جاویں گے وہ جو چاہیں بیچارے سید کی نسبت خیال کریں، کافر کہیں، ملحد سمجھیں، فانھم معذورون البتہ ان بزرگوں سے جنکے سر عمامۂ فضیلت سے، جن کے گلوئے مبارک ہزار دانہ کی مقدس تسبیح سے، جن کے نورانی سینے زرنگار حمائل سے، ہمیشہ مزین اور مرتب رہتے ہیں جن کی زبان پر ہر وقت قال اللہ وقال الرسول جاری ہے، جن کے ہاتھ میں ورد اور زبان پر لعنت ہوتی ہے، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ہر دم مشغول رہتے، بات بات پر مسلمانوں کو کافر بتاتے، مالک جہنم کے نام وارنٹ جاری کرتے، اور لوگوں کو دوزخ بھیجتے رہتے ہیں، کہتا ہوں اور پکار کر کہتا ہوں کہ وہ ڈریں

اُس روز سے جو آنے والا ہے، اور یاد رکھیں اُس دن کو جس میں دل کی بات کھلنے والی ہے۔ وہ کہتے ہیں وہ بات جسے اُس کا دل جھٹلاتا ہے۔ وہ دکھلاتے ہیں وہ چیز جس کے خلاف اُن کے سینہ میں ہے، وہ جانتے ہیں کہ سیّد مسلمان ہے اور پکا مسلمان پر اُسے کافر کہتے ہیں تاکہ عوام خوش ہوں اور انہیں بڑا مقدس اور ابرار جانیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ سیّد خدا کا معتقد، رسولؐ پر شیدا، اسلام کا عاشق، مگر دہریہ اور ملحد بتاتے ہیں تاکہ ان کے دل کی آگ ٹھنڈی پڑے۔ اور جہلا اُن کو شریعت کا ستون اور دین کا رکن سمجھیں۔ کیا جواب دینگے اُس حاکم کو جس کے سامنے نہ کوئی حیلہ چلیگا نہ کوئی بناوٹ، جبکہ اُس کے روبرو اور اُن کا بنایا ہوا کافر (سیّد) دونوں ہونگے اور خدا اُن سے پوچھیگا کہ یامن کان الٰھکم ھواکم، ومعبودکم سلاطینکم وقبلتکم دراھمکم، وشی یعنکم بی حونتکم، وعبادتکم خن منکم اغتیاءکم وذکرکم وسواسکم، وفکرکم استنباط الحیل لما تقتضیہ حشمتکم، کیف میزتکم ظلمتہ الفکر من ضیاء الایمان، وبای ذنب کفرتم عبدی الذی کان علیٰ بصیرۃ من العرفان، ومتمسکا بقول لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ صادقا بھما غیر منافض لہا، اینتقد بہ القرآن علےٰ غیرہ، ام باتباعہ البینات واجتنابہ عن الشبھات، واختیارہ العمد علی الجھل، وایثارہ الیقین علی الشک والارتیاب، وایمانہ علی ان القرآن کان کلاما حیا واماما صادقا، وعدم ایثارہ اقوالکم علی القرآن، وعدم اختیارہ الضلالۃ لتزیین الھدیٰ والایمان۔ بتاؤ اور جواب دو اے وہ لوگو جو اپنی خواہشات کو پوجتے، اپنے بادشاہوں کو معبود سمجھتے، اور درہم و دینار کو قبلہ جانتے تھے۔ نہ سوائے رعونت کے نہ دوسرا تمہیں خیال تھا، نہ بجز عزت وجاہ حاصل کرنے کے علم و عبادت سے تمہارا کوئی مقصود تھا، تم اپنے وسوسوں کو ذکر سمجھتے، اور دولت وجاہ پیدا کرنے کے حیلے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ کفر کیا تھا اور ایمان کیا، تم نے کیونکر جانا کہ کافر کون تھا، اور مسلمان کون، کفر اور ایمان کی روشنی میں تم نے کیونکر تمیز کی، ضلالت اور ہدایت کا فرق تم کو کس نے بتایا، اور کس گناہ میں تم نے میرے بندے اور میرے حبیب کے فرزند کو کافر ٹھہرایا۔ جبکہ تم جانتے تھے کہ وہ میری توحید اور رسالت پر ایمان رکھتا ہے۔ کیا اس سبب سے وہ کفر کا مستوجب ٹھیرا، کہ اُس نے میری کتاب کو دوسری کتابوں پر مقدم جانا، اور میرے سچے کلام کے مقابلہ میں جھوٹے قصوں اور باطل روایتوں اور غلط کہانیوں کو نہ سُنا۔ کیا یہ اُس کی خطا تھی، کہ اُس نے قرآن کو زندہ کلام اور سچا امام مانا، اور میری سنت اور عادت کے تغیر اور تبدل سے انکار کیا، اور لا تبدیل فی خلق اللہ ولا تحویل فی سنت اللہ کہتا رہا۔ وہ کافر تھا یا مسلمان، ملحد تھا، یا مومن، مگر تم جانتے، اور

خوب جانتے تھے، کہ اُس کی نیت تھی دین کی حمایت، اور اسلام کی سچائی کا اظہار۔ تم جانتے تھے کہ یہ میرے رسول کا عاشق، اور میرے بندوں کا خیر طلب ہے۔ گو اُس نے غلطی کی یا خطا، اُس کا معاملہ مجھ سے تھا۔ تم نے کس جرم میں اُس کی تکفیر کی، اور کس خطا میں اُسے واجب القتل ٹھیرایا۔ اے میرے دوست ذرا انصاف کر، کہ یہ لوگ کیا جواب دینگے۔ بلاشبہ وہ لوگ جو اپنی نیک نیتی، غلطی سے مگر اسلامی جوش اور ایمانی محبت اور دل کی سچائی سے اُسے بُرا کہتے ہیں چھوٹ جاوینگے۔ مگر دل میں کپٹ رکھنے والے اور جان بوجھ کر اُسے کافر کہنے والوں کا کیا انجام ہوگا۔ عجب نہیں کہ اُس وقت سید ہی کی سیادت جوش کرے اور اپنے دادا کا دامن پکڑ کر لاتثریب علیکم الیوم کہتا ہوا شفاعت چاہے، اور اپنے خدا کے روبرو سر بسجدہ ہوکر ربنا افتح بیننا و بینھم بالحق کی جگہ "ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم کہنے لگے"۔ [2]

میں اپنے دوست اور اس مضمون کے پڑھنے والوں سے معافی چاہتا ہوں، کہ میں اصل بحث چھوڑ کر دوسری باتیں لکھنے لگا۔ مگر وہ انصاف کریں، کہ سید کی نیت اور کوشش کا وجہ اسلام کی سچائی دکھانے میں کرتے ہیں کیا یہی صلہ ہے، کہ شکر کے بدلے ان کی تکفیر کی جائے، اور غلطی جو اُن کے بعض خیالات میں پائی جاتی ہے خطاء اجتہادی سمجھنے کے عوض، الحاد اور دہریت سے منسوب کی جائے۔ کیا میں سید صاحب کی رائے سے اختلاف نہیں کرتا، کیا میں اُن کی غلطیاں نہیں بتاتا، بلکہ شاید مجھ سے بڑھ کر اُن کے مذہبی خیالات پر انصاف اور اعتدال سے نکتہ چینی کرنے والا دوسرا نہ ہوگا۔ مگر یہ اختلاف رائے اور خیال کی سچائی اور ایمانداری کا اختلاف ہے، اُس سے اُن مساعی جمیلہ سے چشم پوشی نہیں کی جاتی، جو وہ حقائق اسلام اور اسرار شریعت اور حقیقت اسلام کے اظہار میں کرتے ہیں، اور جس میں سے بعض ایسے عالی اور بلند مقام ہیں کہ غالباً اکثر لوگوں کی فکر اور نظر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی، اگر ایسا اختلاف اُن کے ساتھ کیا جائے تو وہ رحمت ہے، اور یقیناً خود سید صاحب کی مشکوری کا باعث۔ مگر جب کہ اُن کی تمام خوبیاں چھپائی جاتی اور اُن کی تمام پاک اور مفید کوششوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور ان حقائق اور دقائق سے جو اسلام اور شریعت کے انہوں نے ظاہر کئے ہیں انکار کیا

---

[1] میں یقین کرتا ہوں کہ ایسا کوئی نہیں ہے (سید احمد)

[2] واہ جناب افضل ابی محسن الملک آپ بھی خوب شخص ہیں۔ جو کچھ ہمارے برخلاف لکھیں، وہ بھی صحیح نہ ہو اور جو کچھ ہمارے موافق لکھیں وہ بھی صحیح نہ ہو کبھی ہم کو آسمان پر چڑھادیں اور کبھی تحت الثرا میں گرادیں آپ کو سلام ہے (سید احمد)

جاتا ہے۔ اور یہاں بوجہ کہ لوگ اُن کو ملحد، اور دہریہ اور طعناً نیچری کہتے ہیں۔ تو دل جلتا ہے اور اسلام کی محبت بے اختیار اُن کی حمایت میں ایسے چند کلمے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس مضمون کے لکھتے وقت میرے دل کی یہی حالت ہوئی، اور بیخود ہو کر جو دل میں آیا وہ قلم سے نکل گیا۔ اب میں پھر نفس مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں ۞

نیچر کے متعلق جو انتخاب سید صاحب کی تحریر سے میں نے کیا ہے۔ اُس کے دیکھنے کے بعد یقیناً یہ تو کوئی نہ کہیگا، کہ سید صاحب نیچر کو خدا سمجھتے ہیں، یا معاذ اللہ وہ خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرتے ہیں، بلکہ وہ اُسے ایک قوت سمجھتے ہیں۔ جو خدا نے اپنی مرضی اور ارادہ سے ہر چیز میں ودیعت رکھی ہے اور اُسے ایک قانون جانتے ہیں، جسے قادر مطلق نے اپنی قدرت کاملہ سے نظام عالم کے قائم رکھنے کے لئے اپنی مشیت اور اپنے اختیار سے بنایا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہتے ہیں کہ یہ قانون ایسا مستحکم اور مضبوط ہے کہ اُسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ نہ خدا جب تک اس قانون کو قائم رکھے گا خود اُسے توڑیگا۔ اور یہ نہ توڑنا اُس کا اُس کی قدرت کا نقص ظاہر نہیں کرتا، بلکہ وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔ اُس کے بدلنے، اُس کے منسوخ کرنے، اور اس کے بجائے دوسرا قانون قائم کرنے کی۔ مگر جب تک وہ اُسے قائم رکھے گا، اُس کے کسی حصہ یا کسی جزو کو نہ بدلا ہے نہ بدلیگا اور یہ بات بھی وہ اپنی طرف سے نہیں کہتے، نہ اور فلسفیوں اور حکیموں کی طرح صرف عقلی دلیلوں سے اُسے ثابت کرتے ہیں۔ بلکہ خدا کے ارشاد کے مطابق، اور قرآن کی شہادت پر کہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ اپنی تفسیر کی جلد سوم میں فرماتے ہیں "کہ ہم اس کے (یعنی قانون قدرت کے خلاف کسی بات کے ہونے یا اُس قانون کے ٹوٹنے) کے انکار پر مجبور ہیں، کیونکہ خدا تعالےٰ نے ہم کو صاف صاف بتلایا ہے، کہ قانونِ قدرت اس نے بنایا ہے۔ اس میں کسی طرح تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ نہ خدا اُس میں تبدیلی کرتا ہے اور نہ تبدیل کریگا۔ خدا کا بنایا ہوا قانون قدرت اس کا عملی وعدہ ہے کہ اسی طرح ہوا کریگا، اگر اس کے برخلاف ہو تو خلف وعدہ اور کذب خدا کی ذات پاک پر لازم آتا ہے۔ جس سے اس کی ذات پاک بری ہے ۞

خدا نے فرمایا ہے "انا کل شیٔ خلقناہ بقدر (یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ پر پیدا کیا ہے اور فرمایا ہے "وکل شیٔ عندہ بمقدار" یعنی ہر چیز خدا کے نزدیک ایک اندازہ پر ہے تفسیر کبیر میں امام فخرالدین رازیؒ نے لکھا ہے کہ "معناہ بقدر وحد لا یجاوزہ ولا ینقص عنہ" یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک اندازہ اور ایک حد ہے کہ نہ اس سے بڑھتی ہے نہ کم ہوتی ہے۔ اور فرمایا ہے "وخلق کل شیٔ فقدرہ تقدیراً یعنی اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر مقرر کیا اس کا ایک اندازہ" اور یہی اندازہ قانون قدرت ہے۔ دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے:

لاتبدیل لخلق اللہ یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے لئے بدل جانا نہیں ہے اور ایک جگہ فرمایا کہ "فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا" یعنی تو ہرگز نہیں پانے کا اللہ کی سنت میں ادل بدل ہونا اور نہ پاویگا تو اللہ کی سنت میں الٹ جانا۔ اور اسی طرح فرمایا ہے "سنت اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" اور ایک جگہ فرمایا "قل کل یعمل علی شاکلتہ ای علی طریقۃ التی جبل علیہا" یعنی ہر ایک اسی طریقہ پر عمل کرتا ہے جو اس کی جبلت میں بنایا گیا ہے پس کسی کا مقدور نہیں ہے کہ جو قانون قدرت خدا نے بنایا ہے اس کے برخلاف کوئی کرسکے یہ کہا جاتا ہے کہ خدا جو ہر چیز پر قادر ہے اور جس نے خود قانون قدرت بنایا ہے وہ کیوں نہیں اگر چاہے تو اس کے برخلاف کرسکتا۔ بلاشبہ وہ قادر مطلق ہے اگر وہ چاہے تو تمام دنیا کو اور تمام قانون قدرت کو معدوم کر کے اور نئی دنیا اور نیا قانون قدرت پیدا کرے جو قانون قدرت کہ وہ بنا چکا ہے اُن کی صداقت کے لئے ضرور ہے کہ ان میں تبدیل نہ ہو یا اُن میں تبدیل نہ کرے۔ اور اس سے اُس کی قدرت کاملہ میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ جیسے کہ جو وعدہ خدا نے کیا ہے اُس کے برخلاف نہیں کرتا اور اس کے سبب سے اس کی قدرت کاملہ میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

یہ بحث اہم المباحث ہے اور اس مسئلہ پر ہر مذہب میں آجکل بہت بڑی بحث ہو رہی ہے اور اس زمانہ کے فلسفہ اور سائنس نے گویا اس مسئلہ کو طے کر دیا ہے کہ لا آف نیچر یعنی قانون قدرت کسی طرح ٹوٹ نہیں، اور نیچر جو خدا کی ہستی ثابت کرتا ہے وہ صرف اسی خدا کی جو کہ اپنے قانون قدرت کو نہیں توڑتا چنانچہ بجواب اس سوال کے کہ آیا وہ عقیدہ جو کائنات کی ایجاد ایک خالق کو ایک خالق کے ارادہ سے منسوب کرتا ہے سائنس (علم) کے محقق نتائج سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر مطابقت رکھتا ہے ایک یورپین فلسفی یہ لکھتا ہے کہ "خدا کا اعتقاد دو قسم کا ہے ایک ایسا ہے، جو علمی تحقیقات کی سب سے زیادہ علم حقائق اور محقق نتائج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور دوسرا ایسا ہے، جو مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ وہ جو مطابقت نہیں رکھتا، وہ ایک ایسے خدا کا اعتقاد ہے، جو دنیا پر تغیر پذیر ارادہ اور غیر مستحکم قانون سے حکومت کرتا ہے اور وہ مطابقت رکھتا ہے وہ ایک ایسے خدا کا اعتقاد ہے جس کی رو سے وہ عالم پر غیر متغیر قوانین کے ذریعہ سے اپنی حکومت چلاتا ہے ابتدائی زمانہ اور نیز خود ہمارے زمانہ کا عام خیال خدا کی حکومت کی نسبت یہ ہے کہ وہ ایک خدا مثل قدیم زمانہ کے مانے ہوئے دیوتاؤں کے دنیا کی حکومت خاص خاص احکام کے ذریعہ سے چلاتا ہے اور گو وہ علم اور ارادہ اور قدرت میں کامل مانا گیا ہے۔ مگر یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ وہ کسی کام کے لئے اپنا ارادہ قائم نہیں کرتا، جب تک کہ

اس صورت وقت نہ آسکے، بالکہ یہ کہ وہ اپنے ارادہ کو ایسے استقلال اور ایسی مضبوطی سے قائم نہیں کرتا ہے کہ اپنے بندوں کی مناجات اور دعا اور اُن کی گریہ و زاری اور مصیبت زدوں کی تضرع اور التجا اُس سے وقت پر نہ بدلے ہم بغیر بیان کرنے اس بات کے کہ خدا کے علم اور حکمت کے کمال کے ساتھ، خدائی حکومت کے اس اعتقاد کو جس میں اس کی نا عاقبت بینی ثابت ہوتی ہے، مشکل سے مطابق کر سکتے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اعتقاد کائنات کے اُس سلسلہ کے متناقض ہے، جس کے موافق ہم بلا استثنا اسے تمام واقعات عالم کا وقوع دیکھتے ہیں اور جس سے کل مظاہر کائنات کو ہم ایک عام اور غیر تغیر پذیر قوانین کا پابند پاتے ہیں۔ جبکہ ہر واقع پچھلے واقعات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، تو اس اعتقاد کے ساتھ کہ ان واقعات کی ابتدا (یعنی اس عالم کی ایجاد اور ابداع) ایک ارادہ یعنی ایک خدا سے ہے" اس بات کا ماننا بھی لازم اور ضروری ہے کہ اُس ارادہ نے ہم اور نہ بدلنے والے قوانین قائم اور پچھلے واقعات پیدا کئے ہوں اگر کوئی خالق ہے، تو بالضرور اُس کا یہ ارادہ ہوگا کہ کل واقعات اپنے وجود کا حصر متقدم واقعات پر رکھیں، اور قوانین مقررہ کے بموجب پیدا ہوں۔ اگر صرف یہ بات مان لی جاتی ہے تو علمی تجسس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس عقیدہ کے خلاف ہو۔ کہ وہ قوانین اور علل اور نتائج کے سلسلے خود ایک خدائی ارادہ سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ ہم اس بات کے ماننے پر بھی مجبور نہیں ہوئے کہ خدا کے ارادہ کا عمل صرف ایک مرتبہ ہمیشہ کے لئے ہوا، اور اس نے نظام کائنات کو ایک حرکت دے کر جس سے وہ خود بخود چلتا رہے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ سائنس (علم) اس بات کے ماننے کو بھی روکتا ہے۔ کہ ہر واقعہ جو وقوع میں آتا ہے، خدا کی ایک مرضی خاص سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ، خدا اپنی ایسی مرضی میں ان قوانین کا پابند رہے، جو خود اس نے قائم کئے ہیں عام رائے یہ ہے کہ ایسے اعتقاد سے خدا کی حشمت اور بزرگی زیادہ قائم رہتی ہے، بہ نسبت اُس عقیدہ کے جس کے بموجب کائنات کی اس طرح پیدائش ہوئی کہ وہ خود بخود چل رہی ہے۔ مگر ایسے آدمی بھی گذرے ہیں جنہوں نے آخر الذکر خیال کو خدا کی شان کے لائق سمجھا ہے، اور خدا کو ایسے گھڑی ساز سے تشبیہ دینے پر اعتراض کیا ہے، جس کی گھڑی جب تک کہ وہ ہاتھ نہ لگاتا ہے اور اُس کو جاری نہ رکھے نہیں چلتی ہے۔ ہم اس معاملہ کو کچھ تعظیم کی نگاہ سے نہیں۔ بلکہ سائنس (علم) کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور سائنس (علم) کے نزدیک یہ دونوں خیالات خدائی عمل کے طریقہ کے متعلق یکساں ہیں"۔

اس انتخاب سے جو ہم نے ایک نامور فلسفی کی کتاب سے نقل کیا۔ یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ نیچر اور لا آف نیچر کا ماننا خدا کے اعتقاد کو باطل نہیں کرتا، بلکہ خدا کی خدائی اور اُس کی قدرت

مع علم اور ارادہ کے اعتقاد کے بالکل موافق ہے مگر ہاں وہ اسی خدا کو مانتا ہے جس نے اپنے کامل علم و حکمت سے ایسا مستحکم اور بے نقص قانون بنایا ہے کہ نہ اس میں ترمیم کی ضرورت ہے نہ اس سے وہ کسی ضرورت سے بدلتا بلکہ تمام عالم کو اس قانون کے مطابق چلاتا، اور اس کے استحکام اور خوبی پر خود ناز کرتا اور فرماتا ہے "ما تری فی خلق الرحمٰن من تفاوت، فارجع البصر هل تری من فطور، ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وهو حسیر" اور یہی اعتقاد سید صاحب کا اسی کو وہ سچا عقیدہ سمجھتے ہیں اسلام کا، اسی کو وہ ثابت کرتے ہیں خدا کے کلام سے، اور اسی پر وہ شہادت لاتے ہیں خدا کی آیات کو، لا تبدیل لخلق اللہ، ولا تبدیل لکلمات اللہ، وفطرة اللہ التی فطر الناس علیها۔ اگرچہ اب ہم ایسے نقطہ پر پہنچتے ہیں، جہاں سے خرق عادت اور استحالہ طبیعت، اور لا آف نیچر کے ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے کی بحث شروع ہوتی ہے مگر ہم اس بحث کو نہ اپنی طرف سے نہ اس وقت شروع کرتے، نہ اپنا خیال اس کی نسبت کچھ ظاہر کرتے ہیں اس لئے کہ اس وقت روئے سخن ہمارا سید صاحب کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ جیسا ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ اس وقت ہمارا مقصود صرف اس بات کا دکھانا ہے، کہ سید صاحب کا نیچر اور لا آف نیچر کو ماننا اور قوانین قدرت کو غیر تغیر پذیر سمجھنا ایسا عقیدہ نہیں ہے جس سے وہ معاذ اللہ دہریہ، یا ملحد، سمجھے جاویں۔ اور نیز اس بات کا ثابت کرنا ہے، کہ اسلام میں اور بھی ایسے نامور حکیم، اور عالم ہوئے ہیں جو سید صاحب کے ہم خیال تھے چنانچہ اب ہم اسے شروع کرتے ہیں۔ یہ بات عموماً سب مسلمان مانتے ہیں کہ دنیا ایک کارخانہ ہے جس کا بنانے اور چلانے والا، ایک ہی ہے مگر اس نے اپنے کارخانہ چلانے کے لئے اپنی نگرانی میں بہت سے موکل، و عامل، اور منتظم، مقرر کر رکھے ہیں جو اس کی مرضی اور حکم کے موافق اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ اسے انہوں نے ایک دنیاوی سلطنت سے مثال دی ہے جس کا حقیقی مالک اور بادشاہ تو ایک ہی ہوتا ہے، مگر اس کے ماتحت ایک بڑا سلسلہ نوکروں کا ہوتا ہے جن کے صیغے اور علاقے اور درجے اور کام مختلف ہوتے ہیں۔ اور جن کی ہدایت اور عمل کے لئے ایک قانون ہوتا ہے، مگر اس دنیاوی بادشاہت کا بادشاہ اور اس کی سلطنت کے کام کرنے والے نوکر، چاکر، سب کو ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ مگر اس عالم کا حقیقی مالک، نہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے، نہ اس کی سلطنت کے کام کرنے والے، نظر آتے ہیں۔ البتہ جس طرح دنیا کو دیکھ کر اس کے بنانے والے پر ہم یقین کرتے ہیں۔ اسی طرح موجودات عالم کے وجود، ان کے افعال، انکے خواص، اور انکی تاثیرات کو دیکھ کر ہم یقین کرتے ہیں کہ ان کے قیام، اور حفاظت اور ان سے کام لینے کے لئے، ضرور خدا کی طرف سے کام والے مقرر ہیں۔ یہاں تک تو سب متفق ہیں۔ مگر اس میں اختلاف ہے، کہ وہ کام کرنے والے کون ہیں۔ چونکہ وہ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے، اور کسی حواس سے

معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس بات کے ماننے میں بھی کل کا اتفاق ہے، کہ وہ کام والے جسمانی نہیں ہیں بلکہ روحانی[1]۔ اور روح وہ چیز ہے جس کی حقیقت کوئی جانتا نہیں، اور جس کے جاننے کی اہلیت اور استعداد خدا نے انسان میں رکھی ہی نہیں۔ اسی لئے وہ اُسے انسانوں کو سمجھا بھی نہ سکا، اور قل الروح من امر ربی کے سوا کچھ نہ کہا۔ جب روح کو کوئی جانتا نہیں، سوائے اس کے کہ وہ عالم امر سے ہے، اور نہ جان سکتا ہے، تو جن کو روحانیات کہا جاتا ہے، اُن کے وجود کی حقیقت بھی کوئی دریافت نہیں کر سکتا، اور سوائے اس کے کہ سمجھانے یا سمجھنے کے لئے ان کے کچھ نام رکھ دیئے یا رکھ لئے جاویں کوئی کچھ کر نہیں سکتا۔ مذہب نے ان کا نام ملائکہ رکھا، اور حکماء نے طبیعت، اور نیچریوں نے نیچر۔ مطلب ایک ہی ہے، صرف الفاظ کا فرق ہے۔ مگر یہ فرق ایسا ہے جس پر بہت سے لوگ ایمان اور کفر کا مدار سمجھتے ہیں، اور صرف ناموں کے تبدیل سے کسی کو بہشت اور کسی کو دوزخ میں بھیجتے ہیں۔ علماء شریعت فرماتے ہیں کہ ملائکہ صرف پیغمبروں کے سکھانے اور اُن کے پاس پیام لانے کے لئے مقرر نہیں ہیں، بلکہ ہر کام اور ہر چیز کے لئے ایک فرشتہ مامور ہے یہاں تک کہ کوئی دانہ زمین سے نہیں اُگتا، کوئی قطرہ آسمان سے نہیں گرتا جس کے ساتھ کوئی فرشتہ نہ ہو، اور نہ صرف یہی کہ ہر چیز کے لئے ایک فرشتہ ہو، بلکہ کوئی کام کوئی تاثیر کوئی عمل کسی چیز سے نہیں ہوتا جس کا کرنے والا فرشتہ نہ ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ ایک غذا ہی پر نظر کرو تو معلوم ہوگا کہ تمہارے نباتات کو بھی غذا پہنچانے کے لئے کم سے کم سات فرشتے موکل ہیں۔ اور اُسے وہ یوں سمجھاتے ہیں، غذا کے معنی یہ ہیں کہ ایک جزو اُس کا دوسرے جزو کی جگہ پر رکھا جائے۔ اور اخیر کو وہ خون ہو کر گوشت و پوست بنے۔ لیکن تمہارا خون اور تمہارا گوشت و پوست تو جسم ہے اُسے نہ قدرت ہے، نہ اختیار، نہ معرفت، اس لئے وہ متحرک ہو سکتا ہے، اور نہ اپنے آپ کو کسی دوسری چیز میں بدل سکتا ہے۔ نہ اُس کے لئے کسی بدلنے والے کی ضرورت ہے جس طرح گیہوں اپنی مختلف حالتیں بدل کر خود روٹی نہیں بن سکتا، اسی طرح غذا خود اپنی تمام مختلف حالتیں بدل کر خود جسم کا جزو نہیں ہو سکتی۔ پس جس طرح تم ظاہری چیزوں کے بنانے کے لئے مختلف صناع اور کاریگر دیکھتے ہو، مثلاً کوئی گیہوں پیستا ہے، کوئی آٹا گوندھتا ہے، کوئی روٹی پکاتا ہے اسی طرح تم کو غذا پہنچانے میں جتنی حالتیں غذا کی بدلتیں ہیں۔ اُن سب کے لئے فرشتے مقرر ہیں کوئی اس لئے کہ غذا کو جذب کرے، کوئی اس لئے کہ اُسے خون بنائے، کوئی اس لئے کہ اُسے گوشت و پوست کا لباس پہنا دے، کوئی اس لئے کہ فضلہ خارج کرے، اور کوئی اس لئے

[1] اگرچہ بعض لوگوں نے ملائکہ کو اجسام لطیفہ کہا ہے مگر درحقیقت ان پر اطلاق جسم کا اس حیثیت سے کہ وہ جسم رکھتے ہوں مع ابعاد ثلاثہ اور منقسم ہوں اور متحیز صادق نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہی کہ وہ روحانی ہیں نہ جسمانی۔

کہ ہر چیز کو اُس کا حصہ مناسب پہنچائے، اور ہر جزو بدن میں مقدار اور اندازہ کا خیال رکھے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی جگہ غذا زیادہ پہنچ جائے، اور کسی جگہ کم، اگر ایسا ہو مثلاً ناک کو غذا بہت پہنچ جاوے، تو وہی حد مناسب سے بڑھ کر انسان پر وبال ہو جاوے پس تقسیم میں ایسی ہندسی رعایت کا رکھنا ایک فرشتہ کو سپرد ہے، اور یہ تمام کام کرنے والے فرشتے اپنا کام کر رہے ہیں، اور تو آرام سے سو رہا ہے تجھے خبر تک نہیں کہ صرف ایک تیری غذا کو جزو بدن بنانے کیلئے سو فرشتوں سے زیادہ کام کرتے ہیں اور پھر یہ فرشتے تو زمین کے فرشتے ہیں اُن کو آسمان کے فرشتوں سے مدد پہنچتی ہے اور آسمان کے فرشتوں کو عرش کے فرشتوں سے، ترتیب معلوم لا یحیط بکنہھا الا اللہ تعالیٰ الی ان ینتھی الی حضرۃ الربوبیۃ التی ھی ینبوع کل نظام و مطلع کل حسن و جمال و منشاء کل ترتیب و تالیف وکل ذالک نعم من رب الارباب و مسبب الاسباب ؛

جس طرح علماء شریعت نے تمام افعال اور تاثیرات کو فرشتوں سے منسوب کیا ہے، اور جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ہر فعل اور ہر عمل اور ہر تاثیر کے لئے وہ ایک ایک فرشتے کو خدا کی طرف سے موکل مانتے ہیں۔ اسی طرح حکما اسلام نے ان تمام چیزوں کو ان قوتوں سے منسوب کیا ہے، جو خدا تعالیٰ نے ہر ہر چیز میں رکھی ہیں، وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ قوتیں بالذات خود فاعل اور بغیر پیدا کئے ہوئے کسی کے خود پیدا ہوگئی ہیں، بلکہ وہ بھی ان کو پیدا کیا ہوا اور خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا سمجھتے ہیں۔ اور جن کا نام شریعت میں فرشتہ رکھا گیا ہے۔ اُسی کا نام وہ طبیعت اور نیچر رکھتے ہیں، اور وہ بھی دو قسم کی قوتیں مانتے ہیں ایک جزئی جو ہر چیز میں موجود ہے اور دوسری کلی جو تمام عالم میں ساری ہے۔ جیسے اس زمانہ کے فلسفی ایک کو ہر شے کا خاص نیچر اور دوسری کو یونیورسل نیچر کہتے ہیں یعنی ہر چیز کا جدا جدا نیچر اور تمام عالم کا ایک عام نیچر، اور وہ یہ بات جو ہم کہتے ہیں حکماء اسلام کے کلام سے اجمالاً ہی نہیں نکلتی بلکہ انھوں نے بصراحت بیان کر دیا ہے، کہ جس قوتِ فاعلہ اور محرکہ اور موثرہ کا نام فلاسفہ نے طبیعت رکھا ہے اُسی کو شرع نے ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور انھوں نے صاف لکھ دیا ہے کہ یہی قوتیں جن کو فرشتے کہتے ہیں ہر چیز کو بناتیں اور قائم رکھتیں اور اُن سے اُن کے معینہ کام لیتی ہیں اور وہ ان کاموں کے کرنے پر ایسی مجبور اور مجبول ہیں کہ اس کے خلاف وہ کر نہیں سکتیں۔ کما قال بعض حکماء الاسلام ان الطبیعۃ انما ھی ملک من ملٰئکۃ اللہ الموبدین و عبادہ الطائعین یفعلون ما یومرون لا یعصون اللہ ما امرھم وھم من خشیتہ مشفقون ؛

اب ہم چند شواہد اس قول کی تائید میں کہ حکماء اسلام طبیعت یعنی نیچر کو اُسی قوت یا قوتوں سے

تعبیر کرتے ہیں جن کا نام ملائکہ ہے اور وہ تمام عالم میں ایک ایسی ترتیب اور ایک ایسے نظام کو ملاتے ہیں جس کا نام اس زمانہ میں لاآف نیچر یعنی قانون قدرت رکھا گیا ہے پیش کرتے ہیں۔ سب سے اول اس کتاب اخوان الصفا جس کو امام احمد بن عبداللہ نے دوسری صدی میں یا چند حکماء اسلام نے چوتھی صدی میں لکھا ہے چند اقوال نقل کرتے ہیں مگر قبل ان اقوال کے نقل کرنے کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُس زمانہ کے ایک عالم نے اس کتاب کی نسبت کیا فرمایا ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ جو

والعلة التي اعيت الائمة في اظهارها سترا
اياه، وفي رفع البراقع وحل العقود عن محياها
ان الدولة الاسلامية لما سخرت للمسلمين
اقاليم البلاد شرقا وغربا وكسرت لهم
بسطوتها القاهرة وقدرتها الباهرة اساطين
العباد سلما وحربا، وجاء النصر والفتح من
جميع الجهات ودخل الناس في دين الله افواجا
وازيدت بهبوب العواصف الحنفية
والقواصف الملة الابراهيمية اعجاز العقائد
المهدمة من الملل المنسوخة لججا وامواجا
اقبلت الملاحدة وفي النفوس ما فيها، فساروا
للخلافة العباسية اعوانا واخوانا وجعلوا
يزهدونها في الديانات ويرغبونها
في الفلسفيات والمسائل السوفسطائيات
من الليل والنهار آناء واحيانا، فاستفحل
امرهم كما نشاهد في زماننا هذا استفحال
امر المعرضين عن الدين، وارتفع كوكبهم
كارتفاع كواكب المعاضدين للدولة
النصرانية بين المسلمين، ومالت الخلافة
الى استحسان قوانينهم واثرت اقوالهم
في قلبها. واقبل ابليس في صورهم فقام
يوما فيوما في نزع الملابس الدينية وسلبها

سبب امام کو اس کتاب کے چہرہ سے برقع
اٹھانے اور گرہوں کے کھولنے کا باعث ہوا وہ
یہ ہے کہ سلطنت اسلامی نے جب مسلمانوں کیلئے
ملکوں کو شرقاً و غرباً مسخر کر دیا اور اپنی زبردست
طاقت سے مسلمانوں کے مقابلہ میں صلح و جنگ
سے طاقتور لوگوں کو شکست دیدی اور تمام اطراف
سے فتح و نصرت پہنچی اور خدا کے دین میں لوگ
فوج فوج داخل ہونے لگے اور مذہب حنفی اور
ملت ابراہیمی کی تند ہواؤں کے چلنے سے
منسوخ مذہبوں کے منہدم ارکان دریا کے گردابوں
اور موجوں کی صورت میں جھاگ لانے لگے۔
تو ملاحدہ اسی حالت میں سامنے آئے کہ اُن
کے نفس میں برائیاں بھری ہوئی تھیں اور وہ
خلافت عباسیہ کے معاون بن گئے مذہبی امور
سے وہ اُس کو نفرت دلاتے تھے اور فلسفی
اور سوفسطائی لوگوں کی باتوں پر رات دن
راغب کرتے اس واسطے ان ملاحدہ کو بہت
قوت ہو گئی جیسے کہ ہم اس زمانہ میں مذہب
سے اعراض کرنے والوں کی قوت کو دیکھ رہے
ہیں اور ان کا ستارہ ایسا ہی بلند ہوا جیسے اس
زمانہ میں دولت نصرانی کے معاون مسلمانوں
کا۔ خلافت نے ان ملاحدہ کے قوانین کی

ونادى منها حتى الفلسفة على المسلمين
بيسر عظيم، واتبعوا في تعطيل الشريعة وترويج
الالحاد في لباس الفلسفة رأي شيطان رجيم
حينئذٍ حركت العناية بامر ربها على مقتضى
قوله انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون
وليه فقام رحمه الله تعالى مستمداً من اللدن
المترع والقلم الجاري يسقي رياض القلوب
من هذه الرسائل وسميه ووليه وكان
رضوان الله عليه من الله على صيانة الشريعة
وحفظها دون الخلق حرياً، فعاد بنعمة
الله وسعي وليه صبح الدين مشرقاً صادقاً
وعش الدين غضاً طرياً، واضحى ان
الفلسفة بعتبها تدعو الى الشريعة الغراء
وتؤيد قضاياها ما تتضمن احكام الشريعة
من الاوامر والزواجر في السراء والضراء
وتام الكتاب اعني اخوان الصفاء لكلها من
الشريعة والفلسفة ميزان عدل وانصاف
وجاء كالصحف السماوية كتاباً مقدساً لا يأتيه
الباطل من بين يديه ولا من خلفه لا يحتاج
الى امداح واوصاف ◌

تقریظ مولانا مولوی حضرۃ شیخ
محمد علی رامپوری صفحہ ۲۰۸
اخوان الصفاء جلد چہارم

پسندیدگی کی طرف میلان کیا اور اُن کے قولوں کو
اپنے دل میں پسند کیا اور ابلیس ان کی شکلوں
میں سامنے آیا اور روز بروز مذہبی لباسوں کے
اتارنے میں مستعدی کی۔ ملاحدہ نے فلسفہ کے
ذریعہ سے مسلمانوں پر حملہ کیا اور شریعت کے
بیکار کرنے اور الحاد کو فلسفہ کے لباس میں رواج
دینے میں انہوں نے شیطان کی رائے کی پیروی
کی ایسے وقت میں نحن نزلنا الذکر وانا لہ
لحافظون کے موافق خدا کی مہربانی نے اپنے
ایک ولی کو جنبش دی تب وہ بھری ہوئی دوات
اور جاری قلم کی مدد سے دل کے باغوں کو ان
رسالوں کے لکھنے سے سیراب کرنے لگے۔ اور
وہ امام حفاظت شریعت کے لیے سب سے
بڑھ کر قابل تھا پس خدا کی نعمت اور اس کے
ولی کی سعی سے دین کی صبح روشن ہو گئی اور
دین کا باغ تر و تازہ ہو گیا اور یہ بات ظاہر ہو گئی
کہ خود فلسفہ بھی لوگوں کو شریعت روشن کی طرف
بلاتا ہے اور وہ شریعت کے فیصلوں کی تائید کرتا
ہے اس لئے کتاب اخوان الصفا شریعت اور
فلسفہ کے لیے میزان انصاف بن گئی اور آسمانی کتابوں کی
طرح پاک و مقدس کتاب ہو گئی جس کے سامنے
اور پیچھے سے باطل نہیں آتا اور اس کو کسی کی
تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ◌

غرضکہ اس کتاب کا مصنف وہ مجتہد ہے جس نے اس کتاب کو واجب الوجود کی ذات کی معرفت اور نفس کے وجود کے اثبات پر لکھا ہے اور ایسی قطعی دلیلیں اور روشن مثالیں بیان کی ہیں، جس سے اُن ملحدوں کے جو اپنے آپ کو فلسفہ سے منسوب کرتے ہیں سارے قول باطل کر دیئے۔ اس کتاب کے لکھنے پر اسلامی محبت نے ان کو آمادہ کیا، اور ان کی اس کتاب سے

ثابت ہوگیا کہ خود فلسفہ شریعت محمدی کی طرف بولاتا، اور شریعت کے احکام اور مسائل کی تائید کرتا ہے"

اور وہ اقوال یہ ہیں :-

القول الاول: طبیعت یعنی نیچر کو وہ کہتے ہیں، کہ ایک قوت ہے جو تمام اجسام میں سرایت کئے ہوئے ہے، خواہ جسم بسیط ہو یا مرکب، یہی قوت ان اجسام کی مدبر ہوتی ہے، یہی ان کو چلاتی ہے۔ یہی ان سے کام لیتی ہے، جیسے کہ مرضی ان کے پروردگار کی ہے۔ اور ہر ایک چیز کو اس کے انتہائی درجہ تک پہنچا دیتی ہے :-

ان الطبیعۃ انما ھی قوۃ النفس الکلیۃ الفلکیۃ، وھی ساریۃ فی جمیع الاجسام التی دون فلک القمر من لدن کرۃ الاثیر الی منتھی مرکز الارض، واعلم ان الاجسام التی دون فلک القمر نوعان، بسیط ومرکبۃ، اربعۃ انواع، وھی النار والھواء والماء والارض، والمرکبۃ ثلاثۃ انواع، وھی المعادن والنبات والحیوانات، وھذہ القوۃ اعنی الطبیعۃ ساریۃ فیھا کلھا وھی محرکۃ لہ، ومسکنۃ، ومدبرۃ لھا، ومتممۃ ومبلغۃ لکل واحدۃ منھا، الی اقصیٰ مدی غایاتھا بحسب ما یلیق بواحد واحد منھا کما شاء باریھا، وکما بینا فی الرسائل الخمس وھی رسائل الکون والفساد، ورسالۃ الاثار العلویۃ، ورسالۃ المعادن، ورسالۃ النبات ورسالۃ الحیوان، (اخوان الصفا جلد دوم صفحہ ۸۸)

القول الثانی: طبیعت نفس کلی کی قوتوں میں سے ایک قوت ہے، جو تمام اجسام میں پھیلی ہوئی ہے زبان شریعت میں اس کا نام ملائکہ ہے" جو اس عالم کی حفاظت اور موجودات عالم کی نظم قائم رکھنے پر خدا کے حکم سے مقرر ہیں، اور اسی قوت کا نام حکمت میں قوائے طبیعیہ ہے :-

الطبیعۃ انما ھی قوۃ من قوی النفس الکلیۃ منبسطۃ منھا فی جمیع الاجسام التی دون فلک القمر، ساریۃ فی جمیع اجزائھا کلھا، تسمی باللفظ الشرعی الملائکۃ الموکلین بحفظ العالم وتدبیر الخلیقۃ باذن اللہ، وتسمی باللفظ الفلسفی قوی طبیعیۃ، وھی فاعلۃ فی ھذہ الاجسام باذن الباری جل ثناؤہ (اخوان الصفا جلد دوم صفحہ ۴۲)

القول الثالث:- وہ کہتے ہیں کہ بعض لوگ طبیعت یعنی نیچر کے منکر ہیں اور بعض اس کے مقر۔ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے اس کا یہ سبب ہے، کہ انہوں نے اسے حواس کے ذریعہ سے دریافت کرنا چاہا، اور جب وہ اس ذریعہ سے اسے دریافت

واعلم یا اخی انما ذھب علی الذین انکروا فعل الطبیعۃ علم النفس وخفی علیھم معرفتھا من اجل انھم طلبوا ادراکھا بالحواس فلم یجدوھا فانکروا وجودھا واما الذین اقروا بالنفس

وادوكروا وجودها انما عرفوا ذلك بافعال الصادرة عنها في الاجسام و ذلك انهم اعتبروا احوال الجسم فوجدوه مجرد لا فعل له البتة ولا للاعراض الحالة في الجسم وانما الافعال كلها للنفس واما الجسم واعراضه فانها للنفس بمنزلة ادوات وآلات لصانع يظهر بها ومنها افعاله كما يرى ذلك من الصناع البشريين تاتهم بادوات جسمانية يظهرون صنائعهم في الاشياء (اخوان الصفا جلد دوم)

ذکر سکے تو اُس کے ماننے سے منکر ہو گئے۔ اور جن لوگوں نے اس کا اقرار کیا، انہوں نے بھی حواس کے ذریعے سے اُسے کچھ دریافت نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ان افعال کو دیکھ کر جو اجسام میں اس کے ذریعہ سے ہوتے ہیں اس کا اقرار کیا ہے۔ انہوں نے جب اجسام کو دیکھا تو مجرد جسم کو خالی پایا یعنی اس سے کوئی فعل نہیں ہوتا اس لئے انہوں نے یقین کیا کہ یہ سب کام نفس کے ہیں، یہ جسم اور اعراض جسم سے اُسی طرح کام لیتا ہے جس طرح کاریگر اپنے ہتیاروں سے۔

القول الرابع:- جو لوگ طبیعت یعنی نیچر کے فعل سے انکار کرتے ہیں، انہوں نے طبیعت کے معنی میں غلطی کی، اور یہ سمجھے کہ یہ نام جسم کا ہے، اور جسم بلحاظ جسم ہونے کے باتفاق فریقین اُن دلیلوں کے موجب جو صحیح ہیں نہ کوئی کام کرتا ہے نہ تاثیر۔ پھر یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں، کہ فعل تو اُس سے ہوتا ہے جو زندہ اور قدرت رکھنے والا ہو۔ یہ بات تو ان کی صحیح ہے، لیکن وہ خیال کرتے ہیں کہ کوئی چیز زندہ اور قادر جب ہی ہوتی ہے کہ وہ بہیئت خاص ایک جسم ہو، اور عارضی امور اُن کے زعم کے موافق مثل حیات اور قدرت اور علم کے اُس میں آ گئے ہوں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس جسم کے ساتھ ایک اور روحانی جوہر ہے جو نظر نہیں آتا۔ اُس کا نام نفس ہے اور یہ عارضی امور حیات اور قدرت اور علم وغیرہ، جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جسم میں سمائے ہوئے ہیں نفس ہی اُن کو اپنے فعل اور اثر سے جسم پیدا کرتا ہے۔

والذين انكروا فعل الطبيعة انما ذهب عليهم معنى هذه التسمية وظنوا انها مترجمة نحو الجسم والجسم من حيث هو جسم لا فعل له البتة بالاجماع من الفريقين بدلائل قد صحت وبراهين قد قامت واعلم يا اخي بان الذين انكروا فعل الطبيعة يقولون انه لا يصح الفعل الا من حي قادر وهذا هو قول صحيح ولكن يظنون ان الحي القادر لا يكون الا اجساما اذا كان على هيئة مخصوصة باعراض تحلها بزعمهم مثل الحيوة والقدرة والعلم وما شاكلها ولا يدرون ان مع هذا الجسم جوهرا آخر روحانيا غير مرئي وهي النفس وان هذه التي وصفوها من الاعراض بانها حالة في الجسم هي التي تظهرها فيه اعني النفس بفعلها في الجسم۔ (اخوان الصفا جلد دوم)

القول الخامس:- اعضائے بدن میں سے ہر عضو کے لئے نفس کی قوتوں میں سے ایک قوت ہوا کرتی ہے جو صرف اُس عضو کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، اور وہی اُس عضو کی مدبر ہوتی ہے

اعلم ان لكل عضو من اعضاء الجسد قوة من قوى النفس مختصة بها، وهي يدبر ذلك العضو وتفعل بها افعالاً خلاف ما تفعل قوة اخرى من عضو آخر، وان تلك القوة تسمى نفساً لذلك العضو المختصة به مثل تلك القوة الباصرة، فانها تسمى نفس العين، والقوة السامعة تسمى نفس الاذن، والقوة الذائقة تسمى نفس اللسان، والقوة الشامة تسمى نفس الانف، وعلى هذا القياس سائر الاعضاء للقوى التي تدبرها وتفعل بها، (ايضاً)

ہر عضو اسی کی وجہ سے اپنا اپنا کام کرتا ہے جو دوسرے عضو کی قوت سے جدا ہوتا ہے اُس قوت کا نام اُس عضو کا نفس ہے یعنی اُس عضو کا نیچر مثلاً قوت باصرہ کا نام آنکھ کا نفس، اور قوت سامعہ کا نام کان کا نفس، اور قوت ذائقہ کا نام زبان کا نفس، اور قوت شامہ کا نام ناک کا نفس، اسی پر باقی اور اعضا کا قیاس کرو، جن میں اُن کی قوتیں اپنا عمل کرتی ہیں اور وہ اعضا انہیں کی وجہ سے کام کرتے ہیں ؂

یہ بیان جو نفس کا کیا گیا ہے، بالکل اُسی بیان کے مطابق ہے جو اس زمانہ کے فلاسفر نیچر کا کرتے ہیں بجز اس کے کہ نیچر کے لفظ کی جگہ نفس کا لفظ ہے اور کچھ فرق مطلب میں نہیں ہے صاف صاف اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکماء اسلام نے دوسری یا زیادہ سے زیادہ چوتھی صدی میں نیچر کی وہی حقیقت سمجھی تھی، جو اس زمانہ کے فلسفی سمجھتے ہیں۔ اور وہ وہی بات کہتے تھے جو اس وقت سید صاحب فرماتے ہیں۔ کہ نیچر دو طرح کا ہے، ایک عام، جسے یونیورسل نیچر کہتے ہیں، اور ایک خاص جو ہر ہر چیز بلکہ ہر ہر عضو میں جدا جدا ہے۔ اور اسی قوت کو وہ لاء کہ سمجھتے ہیں۔ تو کیسے تعجب کی بات ہے کہ پہلے مسلمان اسی بات کے کہنے سے مجتہد، عارف باللہ، حامی دین، اور قامع الملحدین مانے جاویں، اور ان کی تصنیفات کی نسبت کہا جاوے کہ "تمام الکتاب اعنی اخوان الصفا لكليهما من الشرايعة والفلسفة ميزان عدل وانصاف وجاء كالصحف السماوية لنا يامقدسا لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه ولا يحتاج الى اهل الحق واوصاف" اور سید صاحب اسی بات کے کہنے سے کافر سمجھے جاویں اور ان کی کتاب کتاب الکفر والزندقہ کہی جاوے فاعتبروا يااولي الالباب ان هذا الشئ عجاب۔ میرے نزدیک سید صاحب کی یہ غلطی ہے کہ اُنھوں نے وہی پرانے مبارک نام جن سے ہمارے دل اور زبان آشنا تھے، اور جن کو کتب مقدسہ کے ناموں کی طرح ہم مبارک سمجھتے تھے، بدل دیا۔ اور بجائے ان کے انگریزی نام استعمال کئے۔ کاش وہ نیچر کی جگہ طبیعت اور نفس کا نام قائم رکھتے، اور نفس اور طبیعت کلیہ

کا ترجمہ یونیورس نیچر سے نہ کرتے، تو اُن پر کفر و لعنت کی بوچھاڑ نہ ہوتی، اور ان پاکیزہ اور مقدس لفظوں کی بدولت وہ کفر اور زندقہ کے الزام سے بچے رہتے۔ مجھے اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا، کہ ایک بزرگ عالم دسترخوان پر بیٹھے ہوئے ایک دعوت میں کھانا کھا رہے تھے۔ پوڈنگ جو ایک انگریزی میٹھا کھانا ہوتا ہے ان کے سامنے آیا۔ انہوں نے بھی اُسے نوش فرمایا۔ ایک ستم ظریف دوست نے براہ مذاق مولوی صاحب کے چھیڑنے کے کہا، کہ حضرت آپ بھی پوڈنگ کھاتے ہیں، مولوی صاحب نے جو نہایت ذہین تھے فرمایا، کہ نہیں یہ پوڈنگ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا نام نان تنیر ہے۔ اس ظریف دوست نے عرض کیا کہ حضرت نام کے بدلنے سے کھانے کی حقیقت میں کیا فرق ہوا۔ مولوی صاحب نے فرمایا، کہ تم جاہل اور نادان ہو، پہلے اسماء و مسمیات کی بحث کا سبق لو۔ پھر ایسے سوال کرنا۔ اسی طرح اگر سید صاحب طبیعت اور نفس کے بدلے نیچر کا استعمال نہ کرتے تو ان کا خیال صحیح، اور ان کا عقیدہ پاک سمجھا جاتا، اور حکماء اسلام کے ہم خیال ٹھہرتے۔ جو کچھ کیا وہ اس کم بخت لفظ نیچر نے کیا۔

القول السادس: نباتات کی بحث میں لکھا ہے، کہ نفس فلکیہ بسیطہ کی قوتیں جن کا ہم نے ذکر کیا، کہ وہ نباتات کی جنسوں اور نوعوں میں اپنا اپنا کام کرتی ہیں، وہ وہی ہیں جن کا ذکر انبیاء علیہم السلام کی کتابوں میں ہے خدا کے فرشتے اور اس کے لشکر ہیں، جو ان چیزوں پر مقرر ہیں اور جن کی نسبت متواتر خبروں میں وارد ہوا ہے، کہ ہر قطرہ کے ساتھ آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوتا ہے جو اس قطرہ پر مقرر ہوا کرتا ہے یہاں تک کہ اس قطرہ کو وہ زمین پر پہنچا دیتا ہے، اور یقیناً ہر ایک پتہ اور پھل اور تخم کے ساتھ جو زمین سے باہر آتے ہیں ایک فرشتہ مقرر ہوا کرتا ہے، جو ان چیزوں کی تربیت کرتا، اور ان کو پیدا کرتا، اور جو آفتیں ان کو پیش آتی ہیں اُن سے ان کو بچاتا ہے یہاں تک کہ وہ سب چیزیں پوری اور مکمل ہو جاتی، اور اپنی غایت کی

اعلم یا اخی بان قوی النفس الفلکیة البسیطة التی ذکرها انها تحل اجناس النبات وانواعها، هی التی ذکرت فی کتب الانبیاء علیهم السلام، انها ملئکة الله وجنوده الموکلون بها، وذکروا انه قد وردت الاخبار المتواترة، بان مع کل قطرة ینزل من السماء ملك موکل بها، حتی یحطها الی الارض، وان مع کل ورقة وثمرة وحبة تخرجها الارض من النبات، موکلا یربیها وینشئها ویحفظها من الآفات العارضة لها الی ان تتم وتکمل وتبلغ الی اقصی مدی غایاتها، ومنتهی نهایاتها، کل ذلك باذن الله خالقها وبارئها، وکذلك حکم الحیوانات اجمع، کما ذکر الله جل ثناءه بقوله: له معقبات من بین یدیه ومن خلفه یحفظونه من الله" "ونحن نسمی ما کان منها موکل بالنبات النفس النباتیة" (ایضاً)۔

آخر حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ سب مراتب ان اشیاء کے خالق کے حکم سے ہوتی ہیں، اور یہی حکم تمام حیوانات کا ہے، جیسے خدا جل شانہ نے اس کا ذکر کیا ہے، کہ "اُس شے کے آگے اور پیچھے سے تعاقب کرنے والے فرشتے ہیں جو خدا کے حکم سے اُس کو محفوظ رکھتے ہیں" اور ان میں سے جو نباتات پر مقرر ہیں ہم ان کا نام نفس نباتاتی رکھتے ہیں۔

القول السابع :۔ نباتات کے بیان میں پھر لکھا ہے، کہ نباتات کو سب ظاہری طور پر دیکھتے ہیں کہ وہ مصنوع ہیں لیکن اُن کا بنانے والا اور ان کی علت لوگوں کی نظر سے مخفی ہے۔ اس علت کو فلاسفہ قوائے طبعیہ کہتے ہیں، اور مذہب کو فرشتے اور خدا کے لشکر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو نباتات کی پرورش اور حیوانات کے پیدا کرنے اور معدنیات کے موجود کرنے پر مقرر ہیں، اور ہم ان کا نام نفوس جزئیہ رکھتے ہیں۔ الفاظ اور عبارتیں مختلف ہیں لیکن سب کا مقصود ایک ہی ہے۔ حکما نے ان مصنوعات کو قوائے طبعی کی طرف اور صاحب شرع نے فرشتوں کی طرف منسوب کیا اور خدا کی طرف منسوب نہ کرنے کا سبب یہ ہے، کہ خدا کی ذات اس سے برتر ہے کہ وہ طبعی اجسام اور بدنی حرکات اور جسمانی افعال خود کرے جیسا کہ بادشاہوں اور رئیسوں کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ خود کام کریں، اگرچہ حکم دینے کے سبب تمام کام انہیں سے

ان النباتات مصنوعات ظاهرة جلية ... ولكن صانعها وعلتها باطنة خفية محتجبة عن ادراك الابصار لها وهي التي تسميها الفلاسفة القوى الطبيعية، ويسميها الناموس الملائكة، وجنود الله الموكلين بتربية النبات، و توليد الحيوانات، وتكوين المعادن، ونحن نسميها النفوس الجزئية، والعبارات مختلفة والمعنى واحد، وانما نسبتها الفلاسفة الحكماء هذه المصنوعات الى القوى الطبيعية وصاحب الشرع الى الملائكة، ولم تنسبها الى الله تعالى لانه يجل الباري جل ثناؤه عن مباشرة الاجسام الطبيعية والحركات الجسمانية والاعمال الجسدانية، كما يجل الملوك والسادة والرؤساء عن مباشرة الافعال بانفسها، وان كانت تنسب اليها على سبيل الامر بها والارادة لها، كما يقال بنى الاسكندر السد، وبنى سليمان مسجد ايليا، وبنى المنصور مدينة السلام اذ كان بناؤها بامرهم لا يتولون الافعال بانفسهم فعلى هذا المثال ينسب افعال عباد الله الى الله جل ثناؤه، كما ذكر هو بقوله تعالى للنبي محمد صلى الله عليه واله وسلم "وما رميت اذ رميت ولكن الله رمى" وقال "فلم تقتلوهم ولكن الله قتلهم" وقال "قاتلوهم يعذبهم الله بايديكم" وآيات كثيرة في هذا المعنى في القرآن المبين۔ (اخوان الصفا جلد دوم)

منسوب کئے جاتے ہیں جیسے کہتے ہیں کہ سکندر نے دیوار بنائی اور سلیمان نے مسجد ایلیاء اور منصور نے بغداد بنایا۔ یہ خود ان کاموں کے متکفل نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح تمام کام بندوں کے خدا کیطرف منسوب کئے جاتے ہیں جیسا خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ تم نے اُن کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اُن کو قتل کیا۔ یا فرمایا کہ اُن کو مارو خدا تمہارے ہاتھوں سے اُن کو عذاب دیگا۔ اور قرآن شریف میں اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں *

القول الثامن:۔ سنگ مقناطیس کی خاصیت اور معدنیات میں جو جذب اور دفع کی قوتیں ہیں اُن کو بھی نیچر سے منسوب کیا ہے، اور کہا ہے کہ پتھروں کی پیدائش اور تاثیر اور جو پھلوں میں ہے وہ بھی اس قوت طبیعہ کا فعل ہے، (جسے ہم نیچر کہتے ہیں) جو خدا کی طرف سے دی گئی ہے اور خدا کے حکم سے وہ یہ کام کرتی ہے سنگ مقناطیس اہل نظر کے لئے اور اُن کے لئے جو دنیا کے طبعی حالات اور خواص اشیا پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ایک حیرت انگیز چیز ہے اس میں اور لوہے میں ایسی طبعی مناسبت اور ربط ہے جیسے عاشق اور معشوق کے درمیان کیسی عجیب بات ہے کہ لوہا باوجود اپنی کثافت اور سختی کے اور تمام معدنی، نباتی، اور حیوانی اجسام پر غالب ہونے کے سنگ مقناطیس کی جانب حرکت کرتا اور اس سے اس طرح چمٹ جاتا ہے جس طرح عاشق اپنے محبوب سے جو شخص اس پتھر اور لوہے

واما حجر المغناطيس فهو ايضا عبرة لاولى الابصار والتفكر في الامور الطبيعة وخواص افعال بعضها في بعض وذلك ان في هذا الحجر بالحديد مناسبة ومشاكلة في الطبيعة كالمناسبة والمشاكلة التي بين العاشق والمعشوق وذلك ان الحديد مع شدة يبسه وصلابة جسمه وقهره الاجسام المعدنية والنباتية والحيوانية يتحرك نحو هذا الحجر ويلتزق به ويلتزمه كالتزام العاشق المحب المعشوق المحبوب المشتاق اليه فاذا فكر العاقل اللبيب في فعل هذين الحجرين وغيرهما من الاحجار المعدنية والاجسام المباينة علم وتبين له بان الفاعل المحرك لهما هو غيرهما لان الجسم لا فعل له من حيث هو جسم ببراهين قد قامت ودلائل قد صحت وان هذه الاجسام كلها مع اختلافها واختلاف طبايعها وفنون اشكالها وخواص طبايعها هي كالادوات والآلات للفاعل الصانع المحرك وهو النفس الكلية الفلكية التي هي هذه التاثيرات كلها افعالها وهي المسماة طبيعة تظهر وتعمل باذن باريها جل ثناؤه واذ قد تبين بدلائل عقلية ان الباري جل ثناؤه لا يباشر الاجسام بذاته ولا يتولى من الافعال بنفسه الا الاختراع والابداع فاما التاليف والتراكيب والصنائع والافعال والحركات التي تكون بالآلات

والادوات فی الاماکن والازمان انما یامر ملائکة الموکلین وعبادہ المؤیدین بان یفعلوا ما یؤمرون مثل امر الملوک والرؤساء لعبیدھم وخدمھم وجنودھم رفعل، وقد تبین بما ذکرنا ان الجواھر المعدنیة مع کثرة انواعھا واختلاف طبایعھا وفنون خواصھا اصلھا کلھا وھیولاھا ھی الارکان الاربعة التی تسمی الامھات وھی النار والھواء والماء والارض وتبین ایضا ان الفاعل فیھا والمؤلف لاجزائھا والمرکب لھا ھی الطبیعة باذن اللہ تعالیٰ وتبین بان الغرض من ھذہ الجواھر المعدنیة ھو منافع الناس والحیوان واصلاح امر الحیوٰة الدنیا وعیشة الحیوان الی وقت معلوم واعلم یا اخی بان الجواھر المعدنیة مع اختلاف طبایعھا وانواع اشکالھا وفنون جواھرھا وخواصھا ھی کالادوات للطبیعة الفاعلة والالات لھا تفعل بھا فیھا ومنھا فی الاماکن المتباینة والازمان المختلفة ھذہ الافعال والصنائع والاعمال من الترکیب والتالیف والجمع والتفریق لاجزاء ھذہ الارکان الاربعة من الکون والفساد والنشو والبلی بحسب دوران الافلاک وحرکات الکواکب وطوالع البروج علی آفاق البلدان من البر والبحر والسھل والجبل والعمران والخراب کل ذلک باذن اللہ تعالیٰ الذی خلقھا ودکانھا بالارکان وایدھا بالقوة الالھیة علی ھذہ الافعال والصنائع من تکوین المعادن والنبات والحیوان۔ ردوا علم ان الطبیعة انما ھی ملک من ملائکة اللہ المؤیدین وعبادہ الطائعین یفعلون ما یؤمرون لا یعصون اللہ ما امرھم وھم من خشیتہ مشفقون۔ واعلم ان اللہ تعالیٰ غیر محتاج فی افعالہ الی الادوات الالات والاماکن والازمان والھیولی والحرکات بل فعلہ الخاص بہ ھو الابداع والاختراع اذ الاختراع ھو الاخراج من العدم الی الوجود محسب بینا فی رسالة المبادی العقلیة والافعال الروحانیة

اور دیگر معدنی اور نباتی اشیاء کے ان افعال پر غور کرتا ہے اس پر منکشف ہوجاتا ہے کہ ان کو حرکت دینے والی اور ان میں تاثیر کرنے والی ایک اور چیز ہے جو ان سے جدا ہے کیونکہ جسم ہے تو من حیث نہ جسم کوئی فعل ظہور میں نہیں آسکتا۔ اس پر دلیلیں قائم ہو چکی ہیں اور یہ تمام اجسام جن میں یہ مختلف طبیعتیں گوناگوں شکلیں اور طرح طرح کے خواص موجود ہیں اپنے فاعل اور بنانے والی اور حرکت میں لانے والی طاقت کے لئے بمنزلہ آلات کے ہیں۔ اس زبردست طاقت کا نام نفس کلی فلکی ہے جس کے افعال سے یہ تمام تاثیریں ظہور میں آتی ہیں اور اسی کا نام طبیعت ہے جو خدا کے حکم سے عمل کرتی ہے کیونکہ دلائل عقلیہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ خدا اپنی ذات سے ان اجسام میں تصرف نہیں کرتا اور اختراع وابداع کے سوا کوئی فعل اس سے متعلق نہیں ہے! ور تالیف وترکیب۔ افعال وحرکات جو خاص خاص مقامات اور اوقات میں

آلات کی مدد سے ظہور میں آتے ہیں۔ یہ سب کچھ اُس کے فرشتے اسی کے حکم کے موافق کرتے ہیں جس طرح بادشاہ اور امیر اپنے غلاموں۔ نوکروں اور لشکروں سے کام لیتے ہیں۔ پچھلے بیان سے معلوم ہوگیا کہ ان تمام معدنی اجسام کی اصل جن کی نوعیں کثیر طبیعتیں مختلف، اور خواص جدا جدا ہیں۔ صرف چار چیزیں ہیں۔ آگ۔ پانی۔ ہوا اور مٹی۔ انہیں کو امہات کہتے ہیں اور طبیعت حکم الٰہی سے ان میں تاثیر کرتی۔ ان کے اجزا کو ملاتی اور جوڑتی رہتی ہے۔ ان معدنی جواہر سے غرض یہ ہے کہ انسان اور حیوان اپنی زندگی میں ایک خاص وقت تک اُن سے منفعت حاصل کریں۔ یہ تمام معدنی اجسام جن کی طبیعتیں اور ماہیتیں مختلف ہیں۔ جن کی شکلیں اور خاصیتیں جدا جدا ہیں طبیعت فاعلہ کے لئے بمنزلہ آلات کے ہیں جن میں یہ طبیعت مختلف مقامات و اوقات میں اپنا عمل کرتی ہے ؛

یہ تمام ترکیب، تالیف اور اجزائے عناصر کا باہم ملنا اور جدا ہونا جس کو علوم طبعی کی اصلاح میں کون و فساد کہتے ہیں اور بحر و بر، کوہ و صحرا، آباد اور ویران مقامات میں افلاک کے دوروں ستاروں کی حرکتوں اور برجوں کے طالع کے موافق مرکبات عنصری کا بننا اور بگڑنا سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے جس نے یہ خواص اور تاثیریں ان میں پیدا کیں۔ اور معدنی نباتی اور حیوانی اشیاء پر اپنا عمل کرنے کے لئے اپنی قوت سے اُن کی تائید کی ؛

بے شک طبیعت خدا ان فرشتوں میں سے ہے جو اُس کے حکم پر چلتے اور اسکی نافرمانی نہیں کرتے۔ اور ہمیشہ اُس سے خائف اور لرزاں رہتے ہیں۔ خدا کو اپنے افعال میں نہ آلات درکار ہیں۔ نہ مکان نہ وقت نہ مادہ نہ اُس کی حرکتیں۔ بلکہ اُس کا خاص فعل ابداع و اختراع ہے جس سے مراد ہے عدم سے وجود میں لانا جیسا کہ ہم رسالہ مبادی عقلیہ و افعال روحانیہ میں اس کی تشریح کر چکے ہیں ؛

القول التاسع :۔ ملا صدرالدین شیرازی نے اپنی مشہور کتاب اسفار اربعہ میں صاف صاف کہدیا ہے کہ یہ قوت جو اجسام میں اپنا اثر کرتی ہے اور جس سے سارے افعال اور خواص جسم کے ظاہر ہوتے ہیں جسم سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلاسفہ یونان اور صوفیہ کرام سمجھتے ہیں کہ یہ قوتیں جو فاعل اور مدبر اجسام ہیں وہ ملاء اعلےٰ

فصل فی ان المبدٔ القریب لهذه الافاعیل والحرکات المخصوصة لیس امرا مفارقا عن المادة، فنقول اختصاص هذا الجسم بقبول هذه التاثیر عن مفارق لا یخلو اما لانه جسم، او لقوة فیه، او لقوة فی المفارق، اما الاول فیلزم ان یشارکه فیه کل جسم کما عرفت ولیس الامر لذا؛ و اما الثانی وهو ان یکون القوة فیه، وهو المطلوب ،

واما الثالث فتلك القوة في المفارق، اما ان يكون نفسها يوجب هذا التاثير، فيكون الكلام فيه كالكلام في المفارق، وقد مر وان كان على سبيل الارادة ميلزم هذا الجسم مخلصيه فيه اولا بل اثر فيه جزافا فان كان تاثير جزافا فكيف اتفق لم يستمر وضاع العالم مع الافلاك على هذا النظام الدائمي او الاكثرية لكن الامور الطبيعة كثرية ودائمية، فليس فيها شئ بالاتفاق والجزاف، كما متعلم ان جميعها متوجهة نحو اغراض كلية فلا ۔ عن اذن باتفاقية فبقي ان يكون بخاصية فيه ويكون تلك الخاصية لانها موجبة المحركة، وهي القوة والطبيعة وهي التي بسببها يطلب الجسم بالحركة تمالاتها، الثانية من اجزاءها واشكالها وغير ذلك۔

میں موجود ہیں اور جیسے اہل شریعت ملائکہ کہتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مادہ سے مفارق اور جسم سے جدا کوئی اور قوت نہیں ہے جو ان افعال کی کرنے والی ہو۔ اور یہی صاف صاف لفظوں میں نیچر کا ثبوت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان تمام افعال اور حرکات خاص کا مبدا قریب یا یعنی علت فاعلی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مجرد یعنی مادہ اور جسم سے جدا ہو اور اس کی یہ دلیل ہے کہ جسم نے اس جداگانہ چیز سے جیسے قوت مفارق ہو۔ مانا گیا ہے تاثیر مخصوص کو کیوں قبول کیا۔ یا اس لئے کہ وہ جداگانہ قوت خود جسم تھی یا اس لئے کہ اس جسم میں وہ قوت تھی یا کسی قوت کی وجہ سے جو اس سے بھی علیحدہ اور اس پر موثر تھی۔ پہلی صورت یعنی جسم کی وجہ سے یہ تاثیر ہوئی تو خصوصیت باقی نہیں رہتی بلکہ لازم آتا ہے کہ تمام جسم اس میں شریک ہوتے اور اگر خود اس کے جسم میں کوئی قوت تھی جس کی وجہ سے یہ تاثیر ہوئی تو یہی ہمارا مقصود ہے اور اگر اس سے بھی کسی جداگانہ چیز سے ہوئی تو جو بحث اول میں ہے وہی اُس قوت میں پیدا ہوگی۔ بعد اس کے وہ لکھتے ہیں کہ تاثیر اتفاقی بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس سے عالم کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام چیزوں کی کوئی غایت ہے تو تمام چیزوں کا اغراض کلی کی طرف متوجہ ہونا اتفاق اور گزاف سے نہیں ہو سکتا پس ثابت ہوا کہ یہ تمام افعال اور حرکات جو اجسام سے ہوتے ہیں۔ وہ کسی ایسی قوت سے ہوں کہ اسی میں موجود ہو۔ اور یہی خاصیت موجود فی الجسم، بالذات باعث تمام افعال اور حرکات کی ہو۔ اور اسی کا نام قوت اور طبیعت (یعنی نیچر) ہے اور اسی کے ذریعہ سے جسم کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اُس کے اشکال اور خواص ظاہر ہوتے ہیں ۔

القول العاشر ۔ علامہ عبدالرزاق لاہجی جو بڑے حکیم و فلسفی امامیہ مذہب کے ہیں اور ملا صدرالدین شیرازی کے شاگرد، انہوں نے نیچر کا بیان اس صراحت اور صفائی سے کیا ہے کہ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید انہیں کی روح سید صاحب میں حلول کر آئی ہے ۔ اور وہ سید صاحب کی زبان سے یا سید صاحب اُن کی زبان سے نیچر کا بیان کر رہے ہیں ۔ یہ علامہ بھی کچھ کٹر خیال کا معلوم ہوتا ہے ہمارے بھائی سُنّی تو یہ کہہ کر چپ ہو جائینگے کہ کان سا افضیا مگر اُس کے اہل نیلہ ہونے سے تو انکار نہیں کر سکتے اور شیعہ بھائیوں کو تو اُس کا قول ماننا ہی پڑیگا اور جو لوگ نہ شیعہ ہیں نہ سُنّی بلکہ ٹھیٹ اسلام کے ماننے والے محمّدی ۔ وہ نہایت تعجب آمیز خوشی اُس کے اس خیال اور اس قول پر ظاہر کرینگے ۔ چونکہ اُن کا قول فارسی عبارت میں ہے ۔ اس لئے ہم اُسی کی نقل پر کفایت ہیں ۔ وہ گوہر مراد میں فرماتے ہیں کہ "بعضے دیگر از علما نفی قوی بالکلیہ نمودہ اند، و افاعیل قوی و بقوی را اسناد بملائکہ کردہ اند، و اینہا ہیچکدام درکار نیست چہ با قول وجود صانع حکیم علیم، کہ ہمہ موجودات و موثرات مستند باوند عجب نیست عطائے قوتے و خاصیتے مر طبیعت را، کہ صدور افعال محکمہ متقنہ از و بواسطہ آں قوت شود، و خاصیت ممکن گردد ۔ و وجود علم و حکمت در بیدا اوّل کافیست، و تحقیق آں در ہر مرتبہ از مراتب وسایط لازم نیست و صدور ایں از ملائکہ مقدسہ بدل وساطت ایں قوی بل بمباشرت آں ذوات مقدسہ مر ایں افعال را کہ اکثر آنہا خالی از مناسبتے نیست بسیار عجب تر ست، از اسناد ایں افعال بقوی طبعیہ بتدبیر و تسخیر صانع حکیم خبیر و قبول ایں نزد عقل قریب تر از اذعان باں بمراتب کثیرہ "۔

القول الحادی عشر ۔ اشعریہ طبیعت کا بالکل انکار کرتے ہیں اور اُن کے ہنسنے کے قابل خیالات، البتہ نیچر کے مخالف ہیں ۔ اس کی نسبت جو کچھ امام ابن حزم نے اپنی کتاب

القول فی الطبایع :۔ قال ابو محمد رحمہ اللہ ذهبت الاشعریة الی انکار الطبایع جملة، وقالوا لیس فی النار حر، ولا فی الثلج برد، ولا فی العالم طبیعة اصلا، وقالوا انما حدث حر النار و برد الثلج عند الملامسة، وقالوا فلا فی الخمر طبیعة اسکار، ولا فی المنی قوة یحدث بها ما یحدث منه، ولکن اللہ تعالیٰ یخلق ما شاء، وقد کان ممکنا ان یحدث من منی الرجل جملا، ومن منی الحمار انسانا، ومن زریعة الکزبرة نخلة قال ابو محمد رحمہ اللہ ما نعلم لهم حجة شغبوا بها فی هذا الهوس اصلا، وقد ناظر

ملل ونحل میں لکھا ہے وہ یہ ہے "ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اشعریہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ طبایع کا بالکل انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں [illegible] گرمی ہے نہ [illegible] سردی اور [illegible] ہی نہیں، وہ کہتے ہیں، کہ

بعضهم فی ذلك، فقلت له: ان لغة التی نزل القرآن بها یبطل قولهم، لان من لغة العرب القدیمة ذکر الطبیعة والخلیقة، والسلیقة، والنحیزة والغریزة، والسجیة، والشیمة، والجبلة، والخیمة، ولا یشك ذو علم ان هذه الالفاظ استعملت فی الجاهلیة وسمعها رسول الله صلعم ولم ینکرها قط ولا انکرها احد من الصحابة رض ولا احد ممن بعدهم حتی حدث من لا یعتد به وقد قال امرء القیس، «وان تکن قد ساءتك منی خلیقة فسلی ثیابی من ثیابك تنسل»، وقال حمید بن ثور الهذلی، «لکل امرء یا ام عمرو طبیعة. وتفریق ما بین الرجال الطبائع» وقال النابغة الذبیانی، «لهم شیمة لم یعطها الله غیرهم من الجود والاحلام غیر عوازب» وقال رسول الله صلعم للجارود اذا خبره، ان فیه الحلم والاناة فقال له الجارود الله جبلنی علیهما یا رسول الله ام هما کان؟ فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم بل الله جبلك علیهما، ومثل هذا کثیر وکل هذه الالفاظ اسماء مترادفة لمعنی واحد عندهم، وهو قوة فی شیٔ یوجد بها علی ما هو علیه فالخطیب والجار الی ان قال انزل بهذا فی الناس خاصة، فقلت والی لك بالتخصیص، وهذا موجود بالحس وبدیهة العقل فی کل مخلوق فی العالم، فلم یکن عنده تمویة۔

صرف چھونے سے آگ کی گرمی، یا برف کی سردی پیدا ہوجایا کرتی ہے اور وہ قائل ہیں کہ شراب میں نشہ لانے کی طبیعت نہیں ہے اور نہ منی میں کوئی ایسی قوت ہے جس سے وہ چیزیں پیدا ہوں جو منی سے پیدا ہوا کرتی ہیں لیکن خدا جو چاہتا ہے پیدا کر دیا کرتا ہے یہ ممکن ہے کہ آدمی کی منی سے اونٹ پیدا ہو، اور گدھے کی منی سے آدمی پیدا ہو، اور گندنے کے کھیت سے خرمے کا درخت پیدا ہو۔ ابو محمدؒ کا قول ہے کہ ہم اشعریوں کے پاس کوئی ایسی دلیل معلوم نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ اس خبط میں پڑے ہیں۔ اور اس مسئلہ کے متعلق میں نے ایک اشعری سے مناظرہ بھی کیا۔ میں نے اس سے کہا، کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، اُس سے تمہارے قول کا بطلان معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عرب کی قدیمی زبان میں طبیعت، خلیقہ، سلیقہ، نحیزہ، غریزہ، سجیہ، شیمہ، جبلہ، خیمہ، موجود تھے، اور کوئی ذی علم اس میں شبہ نہیں کر سکتا ہے، کہ جاہلیت میں ان لفظوں کا استعمال ہوتا تھا۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو سنا، اور کبھی ان لفظوں سے بیزاری ظاہر نہ کی، اور نہ کسی صحابی نے اور نہ صحابہ کے بعد کسی شخص نے ان کا انکار کیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ پیدا ہوئے جو شمار کے قابل نہ تھے امرء القیس کا قول ہے، اگر تجھ کو میرا کوئی خلق ناگوار ہے تو میرے کپڑوں کو اپنے کپڑوں سے جُدا

کرنے وہ علاحدہ ہو جاوینگے جمیز بن ثور ہلالی کا قول ہے، اے عمر ہر آدمی کی ایک طبیعت ہوا کرتی ہے اور طبیعتوں سے ہی لوگوں میں فرق ہوا کرتا ہے۔ نابغہ ذیبانی کا قول ہے " اخلاق، جود، وحلم، اُن کے سوا خدا نے کسی اور کو نہیں دیتے ہیں وہ ان میں لازمی ہیں رسول خدا صلعم کا قول ہے، جب جارود کو آپ نے خبر دی کہ تجھ میں حلم اور بردباری ہے، تو جارود نے آپ سے کہا کہ خدا نے مجھ میں وہ دونوں صفتیں پیدا کی ہیں۔ اُس نے کہا اے رسولؐ خدا کیا واقعی یہ دونوں صفتیں ایسی ہی ہیں، تب اُس سے رسول خدا نے کہا خدا ہی نے تجھ کو ان پر پیدا کیا ہے ایسی روایتیں بہت ہیں یہ سب لفظ عرب کے نزدیک ہم معنی ہیں، اور وہ طبیعت ایک طاقت ہے ہر چیز میں، جس کی وجہ سے وہ چیز اپنی اس اصلی حالت پر رہتی ہے جو اُس کی ہوتی ہے۔ اس تقریر سے وہ گھبرا گیا، اور کہنے لگا کہ، میں اس طبیعت کو آدمیوں ہی سے مخصوص سمجھتا ہوں میں نے کہا کہ تم تخصیص کیسے کر سکتے ہو اس قوت کی صرف انسان سے اس لئے کہ حس اور ہدایت عقل سے علم کے ہر مخلوق میں طبیعت (نیچر) کا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تب وہ پھر بیہودہ بات نہ کر سکا۔

القول الثانی عشر:- امام ابن حزم اپنی کتاب ملل نحل میں پھر طبیعت (یعنی نیچر) پر بحث کرنے اور فرماتے ہیں۔ کہ یہ تمام قوتیں اور عادتیں خدا نے ہر چیز میں رکھی ہیں اور اس نے نیچر میں ایسی ترتیب رکھی ہے کہ اس میں کبھی تبدیلی ہو نہیں سکتی۔ اور ہر عقلمند کی نظر میں اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے مثلاً انسان کی طبیعت اگر کوئی اُس کو آفت پیش نہ آئے، تو یہ ہے کہ وہ علوم اور دستکاریوں میں تصرف کر سکتا ہے۔ اور گدھے اور خچر کی طبیعت یہ ہے کہ ایسا تصرف ... اُن سے ناممکن ہے۔ اور مثلاً گیہوں کی طبیعت یہ ہے

قال ابو محمد رحمہ اللہ وکل ھذہ الطبایع والعادات مخلوقۃ، خلقھا اللہ عزوجل فرتب الطبیعۃ علی انھا لا تستحیل ابدا ولا یمکن تبدلھا عند کل ذی عقل کطبیعۃ الانسان بان یکون ممکنا لہ التصرف فی العلوم والصناعات ان لم تعترضہ آفۃ، وطبیعۃ الحمیر والبغال بان ذلک غیر ممکن وکطبیعۃ البران لا ینبت شعیرا ولا جوزا، وھکذا اعمانی العالم والقوم مقرون بالصفات وھی الطبیعۃ نفسھا لان فی الصفات المحمولۃ فی الموصوف ما ھو ذاتی لا یتوھم زوالہ، الا بفساد اسم حاملہ، وسقوط الاسم کصفات الخمر اللتی ان زالت عنھا ... بطل اسم الخمر، وکصفات الخبز واللحم اللتی اذا زالت عنھا صارت زبلا، وسقط اسم الخبز واللحم عنھما، و ھکذا کل شئ لہ صفۃ ذاتیۃ فھذہ ھی الطبیعۃ ۔

ومن الصفات المحمولة فی الموصوف ما لو توهم زواله عنه لم یبطل حامله ولا فارقه اسمه، وهذا القسم ینقسم اقساما ثلثة فاحدها ممتنع الزوال، کالفصم الورق وسواد الزنجی ونحو ذلك الا انه لو توهم زواله لبقی الانسان انسانا بحاله، وثانیها بطی الزوال کالموقة وسواد الشعر، وما شبه ذلك وثالثها سریع الزوال کحمرة الخجل وصفرة الوجل وکمودة الهم ونحو ذلك فهذه هی حقیقة الکلام فی الصفات وما عدا ذلك بطریق السوفسطائیة الذین لا یحققون حقیقة ونعوذ بالله من الخذلان ؂

کہ اُس سے جو اور اخروٹ پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور ایسے ہی تمام ان چیزوں کا حال ہے جو موجود ہیں۔ اور یا شاعرہ اشیا کی صفتوں کے مقر ہیں، اور خود انہیں صفات کا نام طبیعت ہے اس لئے جو صفتیں موصوف میں پائی جاتی ہیں، بعض یہ صفتیں ذاتی ہوا کرتی ہیں۔ ایسی صفات کا زائل ہونا جب ہی خیال میں آتا ہے کہ ان کے موصوف کا نام جاتا رہے مثلاً شراب کی وہ صفتیں اگر شراب میں سے جاتی رہیں، تو شراب کا نام نہ رہیگا۔ بلکہ وہ شراب سرکہ ہو جائیگی۔ اور جیسے روٹی اور گوشت کی صفتیں کہ اگر وہ روٹی اور گوشت میں نہ رہیں، تو ان کا نام روٹی اور گوشت نہ رہیگا۔ اور ایسے ہی ہر چیز کا حال ہے جس کی کوئی ذاتی صفت ہوا کرتی ہے۔ انہیں صفات کا نام طبیعت ہے۔ اور جو صفتیں موصوف میں پائی جاتی ہیں، ان میں سے بعض ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان صفات کی علیحدگی کا موصوف سے خیال کریں۔ تو موصوف زائل نہیں ہوتا، اور نہ اُس موصوف کا نام اُس سے جدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی صفات تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک ایسی صفتیں جن کا زائل ہونا ممکن نہ ہو۔ جیسے کوتاہئے قد، زنگی کی سیاہی، اور ایسے ہی اور لیکن اگر یہ خیال کریں کہ یہ صفات موصوف سے زائل ہو گئی ہیں، تاہم انسان بحالہ انسان ہی رہتا ہے۔ دوسری قسم کی ایسی صفتیں ہیں، جو دیر میں زائل ہوتی ہیں، جیسے دوستی اور بال کی سیاہی، ایسی ہی اور صفتیں۔ اور تیسری قسم ان صفات کی ہے۔ جو جلد زائل ہو جاتی ہیں، جیسے شرمندہ کی سرخی، اور ڈرنے والی زردی، اور رنج کے وقت رنگ کا تاریک ہونا، اور ایسے ہی اور صفات کے متعلق گفتگو کرنے کی حقیقت یہ ہے۔ اور اس تقریر کے علاوہ سوفسطائیوں کا طریقہ ہے جو کسی حقیقت کو ثابت نہیں کرتے۔ نعوذ باللہ من الخذلان ؂

القول الثالث عشر:۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ خدائے تعالےٰ کے تصرف فی القوی کے معتقد ہیں، اور جسے وہ قبض و بسط، احالہ و الہام سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر مثل حکما کے اُن کا بھی یہ اعتقاد ہے۔ کہ تمام دنیا کا ایک علم اور ہر جنس کا علیحدہ در ہر ہر

چیز کا جدا جدا نیچر ہے۔ اور اُسے وہ صورت نوعیہ اور خواص جزئیہ سے تعبیر کرتے ہیں وہ اشعریوں کی طرح لغو خیال نہیں رکھتے کہ کسی چیز کی کوئی طبیعت نہیں ہوتی، اور نہ کسی شے میں کوئی خواص ہوتا ہے۔ نہ اسے مانتے ہیں کہ گدھے سے آدمی اور درخت سے اونٹ بن سکتا ہے۔ بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ جرت عادۃ اللہ تعالیٰ ان لا تنفک الخواص عما جعلت خواص لھا کہ خدائے تعالیٰ کی یہ عادت جاری ہے کہ جن چیزوں میں جو خاصیتیں رکھی گئی ہیں (یعنی جس چیز کا جو نیچر اُس نے رکھا ہے) وہ ان چیزوں سے جدا نہیں ہوتیں۔ اور اس امر کو بھی انہوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ یہ خاصیتیں یعنی یہ نیچر جو ہر چیز میں ہے، وہ اسی نیچر کے تابع ہے جو اس چیز کی نوع کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں "وھذہ کلھا تابعۃ للصورۃ النوعیۃ ملتویۃ معھا انما تجئ من حیث جارت الصورۃ النوعیۃ" اور یہ بھی ان کا خیال ہے کہ افعال اور خواص چیزوں کے کچھ خارجی اور بیرونی قوت سے نہیں ہوتے، بلکہ خدا نے ہر چیز میں ایک قوت رکھی ہے اور ہر چیز کا ایک نیچر ہے وہ اپنی نوع کے نیچر کے مطابق کام کرتا ہے۔ جیسا کہ حیوانات کے بیان میں فرماتے ہیں ولھا حرکات اختیاریۃ والھامات طبیعیۃ وتدبیرات جبلیۃ یعنی حیوانات کے جو کام ہیں وہ ان کے اختیاری ہیں وہ اس کام کو اس الہام کے مطابق کرتے ہیں جو ان کے نیچر کو دیا گیا ہے اور اُس تدبیر اور قوت سے کام لیتے ہیں جو اُن کی جبلت یعنی نیچر میں رکھی گئی ہے۔

شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں عقل و نقل دونوں اس بات پر گواہ ہیں کہ دنیا کو خدا نے انواع و اجناس پر پیدا کیا ہے اور ہر نوع و جنس میں جدا جدا خواص پیدا کئے

وقد دل العقل والنقل علی ان اللہ تعالیٰ خلق العالم انواعا واجناسا وجعل لکل نوع وجنس خواص، فنوع الانسان مثلا خاصتہ النطق وظھور البشرۃ واستواء القامۃ وفھم الخطاب، ونوع الفرس خاصتہ الصھیل وکون بشرتہ شعرا وقامتہ عوجاء وان لا یفھم الخطاب وخاصۃ السم اھلاک الانسان الذی یتناولہ وخاصۃ الزنجبیل الحرارۃ والیبوسۃ وخاصۃ الکافور والبرودۃ وعلی ھذا القیاس جمیع الانواع من المعدن والنبات والحیوان وجرت عادۃ اللہ تعالیٰ ان لا تنفک الخواص عما جعلت خواص لھا وان تکون متخصصات الافراد خصوصا فی تلک الخواص وتعیینا

ہیں مثلاً نوع انسانی کا خاصہ ہے بولنا، جلد پر بالوں کا نہ ہونا اور راست قامت ہونا باہم ایک دوسرے کا کلام سمجھنا، اور گھوڑے کی نوع کا خاصہ ہے ہنہنانا، جلد پر بالوں کا ہونا کج قامت ہونا اور کلام کا نہ سمجھنا۔ اور زہر کا خاصہ ہے اپنے کھانے والے انسان کو ہلاک

لبعض محتملاتها لكن تلك مميزات الانواع خصوصا فی خواص اجناسها وان تكون معانی هذه الاسامی المرتبة فی العموم والخصوص كالجسم والنامی والحیوان والانسان وهذا الشخص متمازجة متشابكة فی الظاهر ثم يدرك العقل الفرق بينها ويضيف كل خاصة الی ما هی خاصة له وقد بين النبی صلی الله علیه وسلم خواص كثير من الاشياء واضاف الآثار اليها۔

کرنا اور زنجبیل کا خاصہ ہے حرارت اور یبوست اور کافور کا خاصہ ہے برودت اسی طرح تمام معدنی نباتی اور حیوانی نوعوں کے جدا جدا خاصے ہیں خدا تعالیٰ کی یہ عادت جاری ہے کہ جن چیزوں میں جو خاصیتیں رکھی گئی ہیں وہ ان چیزوں سے جدا نہیں ہوتیں اور ان خاصیتوں میں افراد مخصوص کی خاصیتیں زیادہ خاص ہوا کرتی ہیں۔ اُن سے بعض بعض احتمالات کا یقین ہو جایا کرتا ہے۔ ایسے ہی جنسی خاصیتوں کی نسبت نوعوں کے تمیز دینے والے امور میں خصوصیت زیادہ ہوا کرتی ہے اور ان ناموں کے اوصاف جو عموم وخصوص کے لحاظ سے مرتب ہیں۔ مثلاً جسم۔ نامی۔ حیوان۔ انسان۔ اور اُس خاص شخص کے اوصاف باہم ظاہراً ملے جلے ہوا کرتے ہیں۔ لیکن عقل ان سب کو جدا جدا کر دیتی ہے اور جس کی جو خاصیت ہوتی ہے اس کو اُسی سے ملا دیتی ہے۔ رسول خدا نے اکثر اشیا کی خاصیتیں بیان کی ہیں۔ اور ان کی تاثیروں کو اُنہی سے متعلق بیان فرمایا ہے۔

القول الرابع عشر:۔ دوسرے مقام پر جناب شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ مخلوق میں خدا کی ایسی نشانیاں ہیں جن سے ان میں غور کرنے والے کو اس امر کی رہبری ہوتی ہے کہ خدا

اعلم ان للّٰه تعالیٰ آیات فی خلقه يهتدی الناظر فيها الی ان الله له الحجة البالغة فی تكليفه لعباده بالشرائع فانظر الی الاشجار واوراقها وازهارها وثمراتها وما فی كل ذلك من الكيفيات المبصرة والمذوقة وغيرها فانه جعل لكل نوع اوراقا بشكل خاص وانهارا بلون خاص وثمارا مختصة بطعوم وبتلك الامور يعرف ان هذا الفرد من نوع كذا وكذا وهذه كلها تابعة للصورة النوعية متلوية معها انما تجیٔ من حيث جاءت الصورة النوعية وقضاء الله تعالی بان تكون هذه المادة نخلة مثلا مشتبك مع قضاءه التفصيلی بان تكون ثمرتها كذا وخواصها كذا ومن

نے جو لوگوں کو شریعتوں کا مکلف کیا ہے اس کے لئے بڑی دلیل ہے۔ درختوں اور درختوں کے پتّوں۔ پھولوں اور پھلوں کو اور تمام چیزوں کو جن میں دیکھنے یا چکھنے سے کوئی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو خدا نے ہر ایک نوع کے پتّے خاص خاص شکلوں کے

خواص النوع ما یدرکہ کل من لہ بال ومن خواصہ ما لا یدرکہ
الا الالمعی الفطن کتاثیر الیاقوت فی نفس حاملہ بالتفریح
والتشجیع ومن خواصہ ما یعم علی الافراد ومن خواصہ
لا یوجد الا فی بعضہا حیث تستعد المادۃ کالاہلیلج الذی
یسہل بطن من تبعض علیہ بیدہ ولیس لک ان تقول ام کانت
ثمرۃ النخل علی ہذہ الصفۃ فانہ سوال باطل لان لوازم
الماہیات لا یطلب بلم۔ ثم انظر الی اصناف الحیوان تجد لکل نوع
شکلا وخلقۃ کما تجد فی الاشجار وتجد مع ذلک بالحرکات
اختیاریۃ والہامات طبیعۃ وتدبیرات جبیلۃ یمتاز کل
نوع بہا فبہیمۃ الانعام ترعی الحشیش تجتر والفرس والحمار
والبغل ترعی الحشیش ولا تجتر والسباع تاکل اللحم والطیر
یطیر فی الہواء والسمک یسبح فی الماء ولکل نوع من الحیوان
صوت غیر صوت الاخر ومسافدۃ الاخر وحضانۃ للاولاد
غیر حضانۃ الاخر شرح ہذا یطول وما الہم نوعا من الا
نواع الا حلوما تناسب مزاجہ والا ما یصلح بہ ذالک النوع وکل
ہذہ الالہامات تترشح علیہ من جانب بارئہا من کونۃ الصورۃ النوعیۃ

اور پھول خاص خاص رنگوں کے اور پھل خاص خاص مزوں کے پیدا کئے ہیں۔ انہیں امور سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ فرد فلاں نوع کی ہے اور یہ تمام امور صورت نوعیہ سے تابع ہیں اور اُسی سے وابستہ ہیں۔ خدا کا یہ حکم کرنا کہ یہ مادہ درخت خرما بنے خدا کے اس تفصیلی حکم سے پیوند ہے کہ اس کا پھل ایسا ہو۔ اور خواص ایسے ہوں اور نوع کے بعض خواص تو ایسے ہوتے ہیں جن کو ہر ایک شخص ادنیٰ توجہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اور بعض ایسے جن کو سوائے بڑے دانا اور زیرک شخص کے نہیں جان سکتا۔ مثلاً یاقوت کی تاثیر یہ ہے کہ جو اِس کو اپنے پاس رکھتا ہے وہ خوش اور دلیر رہتا ہے۔ اور بعض خواص کل افراد پر حاوی ہوتے ہیں۔ اور بعض خواص صرف اسی جگہ ظاہر ہوتے ہیں جہاں مادہ میں صلاحیت ہوتی ہے۔ مثلاً ہلیلہ جہاں تبض ہو وہیں اپنا مسہل کا اثر دکھلاتی ہے اور یہ سوال کرنا عبث ہے کہ درخت خرما کا پھل اس خاص صفت پر کیوں پیدا ہوا اس لئے کہ ماہیتوں کے ساتھ ان کے لوازم کا پایا جانا ضروری ہے جس کی نسبت سوال کرنا بیکار ہے پھر ہر قسم کے حیوان کو دیکھو۔ ہر ایک نوع کی شکل اور پیدائش ایسی ہی پاؤگے جیسے درختوں میں پاتے تھے اور ان امور کے ساتھ حیوانات کے لئے اختیاری حرکات۔ قدرتی الہامات اور ذاتی تدبیریں بھی ہیں جن کی وجہ سے ہر ایک نوع کو امتیاز حاصل ہے۔ چارپائے گھاس چرتے ہیں جگالی کرتے ہیں اور درندے گوشت کھاتے ہیں۔ پرند ہوا میں اڑتے ہیں مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ اور حیوانات میں ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے جُدا ہے۔ اور جفت ہونے کے طریقے بھی ہر نوع میں جُدا جُدا

ہیں۔ اسی طرح ہر نوع میں بچوں کی پرورش کا طریق مختلف ہے۔ اس کا بیان طویل ہے ہر ایک نوع کو وہی علوم الہام کئے گئے ہیں جو اُس نوع کے مناسب ہیں! ورانہیں سے نوعی اصلاح ہوتی ہے۔ یہ سب الہامات پروردگار کی جانب سے صورت نوعیہ کمدروشندان کے ذریعہ سے مترشح ہوتے ہیں ؛

ان چند اقوال سے جو ہم نے نیچر کے متعلق ذکر کئے غالباً اس بات کے ثابت کرنے میں ہم کامیاب ہوئے کہ یہ خیال غلط ہے کہ سید صاحب خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرتے ہیں۔ بلکہ وہ نیچر سے خدا کا وجود ثابت اور جو اصل مسئلہ اسلام کا ہے یعنی توحید، اس کے ثبوت کے لئے نیچر کو پیش کرتے ہیں! اور یہ وہ استدلال ہے جس سے اس زمانہ کے اکثر فلسفی خدا کے وحدہ لاشریک لہٗ ہونے کو نہایت مستحکم اور پختہ سمجھتے ہیں۔ اور اس مضمون کے دیکھنے والے منصف مزاج مسلمان غالباً یہ بھی تسلیم کرینگے، کہ بڑے بڑے مسلمان حکیم بھی سید صاحب کے ہم خیال تھے نیچر ناموں اور لفظوں کے اختلاف کے دوسرا کچھ فرق نہیں ہے جسے اگلے علماء نے صورت نوعیہ، صورت جزئیہ، طبعیہ کلیہ، طبعیہ جزئیہ نفس کلیہ، نفس جزئیہ۔ اور علماء شریعت نے ملائکہ مقربین،، اور ملائکہ موکلین، کے ناموں سے تعبیر کیا ہے، اسی کو سید صاحب عام اور خاص نیچر کہتے ہیں۔ صرف عبارت اور الفاظ اور طرز بیان کا فرق ہے مطلب دونوں کا ایک ہے ؛

دوسرے مضمون میں ہم سید صاحب کے دیگر عقاید کی نسبت اس بات کے دکھانے کی کوشش کرینگے، کہ ان میں وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ پچھلے زمانہ کے بعض بعض علماء اسلام بھی اُن کے ہم خیال پائے جاتے ہیں۔ اُس کے بعد ان عقاید اور ان خیالات کی نسبت جو ہمارا اعتقاد اور ہمارا خیال ہے سید صاحب کی تفسیر کی بحث میں جو ہم لکھ رہے ہیں ظاہر کرینگے ؛

خط سوم ایک دوست کی تحریر کے جواب میں

اس مضمون میں ہم سید صاحب کے دیگر عقاید کی نسبت یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ پچھلے مسلمانوں میں بھی بعض ان کے ہم خیال تھے۔ ان کی صحت اور غلطی سے اس وقت کچھ بحث نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کا دکھانا منظور ہے کہ سید صاحب ہی نے تیرہ سو برس کے بعد علم خیالات سے مخالفت نہیں کی ہے بلکہ اسلام میں پہلے بھی بہت سے ایسے سودائی گذرے ہیں۔ مگر اس قسم کی

مخالفت کو اہل تحقیق نے کفر قرار نہیں دیا۔ بلکہ ان خیالات پر تصوف کا رنگ بدیا گیا تو وہ الہام الٰہی اور القائے ربانی سمجھے گئے ہیں ؛

ملائکہ و حور و غلمان

سید صاحب کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ملائکہ کے وجود سے منکر ہیں مگر درحقیقت وہ صرف ملائکہ کے اُس وجود سے منکر ہیں جس کو عموماً ہم مسلمان مانتے ہیں۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان قوتوں کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں ملک یا ملائکہ کہا ہے۔ جن میں سے ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے۔ ہمارے ناظرین کو پچھلے مضمون کے دیکھنے سے معلوم ہوا ہوگا کہ بعض حکماء اسلام کا یہی خیال تھا۔ اور جو شہادتیں ہم اس مضمون میں لکھ چکے ہیں وہ اس کے لئے کافی ہیں مگر وہ مجمل تھیں اب ہم بعض اقوال ایسے پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ پچھلے علماء نے حاملان عرش اور جبرئیل و اسرافیل و عزرائیل و منکر و نکیر و رضوان و مالک و حور و غلمان سب کے وجود خارجی سے انکار کیا ہے۔ اور کسی کو کواکب ثابتہ اور کسی کو سیارات سبعہ کی روحانیت سے تعبیر کیا ہے چنانچہ وہ اقوال یہ ہیں ؛

حاملان عرش بریں

اعلم یا اخی ان الملائکۃ الحافین بالعرش هم حملۃ العرش وهی الکواکب الثابتۃ الحافون بالفلک التاسع من داخله ؛

جو ستارے نویں آسمان میں جڑے ہوئے ہیں وہی حاملان عرش ہیں۔ اخوان الصفا جلد دوم ؛

اگلے زمانے میں ستارے سات خیال کئے جاتے تھے اور ان میں یہی قوتیں مانی جاتی تھیں۔ جو موثر فی العالم ہیں۔ فلاسفۂ قدیم ان قوتوں کو روحانیات کواکب کہتے تھے صاحب اخوان الصفا فرماتے ہیں کہ انہیں کا نام زبان شرع میں اسرافیل و جبرئیل وغیرہ ہے چنانچہ اس مضمون کو انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے ہم مختصراً اسے نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

جبرئیل، اسرافیل، عزرائیل، منکر و نکیر، رضوان، مالک، حور، غلمان ؛

آفتاب کے جرم سے ایک روحانی قوت تمام دنیا میں پھیلتی ہے فلسفی اس قوت کو اور اس کے آثار کو جو دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آفتاب کی روحانیت کہتے ہیں۔ اور شریعت نے اس قوت کا نام فرشتہ رکھا ہے جن میں سے

وتنبث من جرم الشمس قوۃ روحانیۃ فی جمیع العالم

وتسمی الفلاسفة هذه القوة وما انبث منها فی العالم بروحانیات الشمس وتسمیه الناموس هذه القوة ملکا ذا جنود و اعوان و اسرافیل منهم صاحب الصور۔ وهکذا ینبث من جرم زحل قوة روحانیة تسری فی جمیع العالم وتسمی الفلاسفة هذه القوة روحانیات الزحل۔ والناموس یسمیها ملکا ذا جنود و اعوان۔ وملک الموت منهم ومنکر ونکیر ایضاً وهکذا ینبث من جرم المریخ قوة روحانیة تسری فی العالم وتسمی الفلاسفة هذه القوة وما ینبث منها من الافعال فی العالم روحانیات المریخ۔ ویسمیها الناموس ملکا ذا جنود و اعوان وجبرائیل منهم ومالک الغضبان وخزنة جهنم اجمعون۔ وهکذا ینبث من جرم المشتری قوة روحانیة تسری فی جمیع العالم۔ وتسمی الفلاسفة هذه القوة وما ینبث من افعالها روحانیات المشتری ویسمیها الناموس ملکا ذا جنود و اعوان ورضوان خازن الجنان منهم۔ وهکذا ینبث من جرم الزهرة قوة روحانیة وتسمی الفلاسفة هذه القوة وما یفرح منها روحانیات الزهرة ویسمیها الناموس ملکا ذا جنود و اعوان منها الحور العین خزان الجنان وهکذا ینبث من جرم عطارد قوة روحانیة۔ ویسمیها الناموس ملکا ذا جنود و اعوان والولدان الذین هم خدم اهل الجنان والکرم البررة والکرام الکاتبون منهم وهکذا ینبث من جرم القمر قوة روحانیة وتسمی الفلاسفة هذه القوة وما ینبث منها من الافعال روحانیات القمر ویسمیها الناموس ملکا ذا جنود و اعوان ۔

اسرافیل ہے جس کو صور پھونکنے کی خدمت سپرد ہے اسی طرح زحل کے جرم سے ایک روحانی قوت دنیا میں پھیلتی ہے فلسفی اس قوت کو زحل کی روحانیت کہتے ہیں۔ اور اہل شرع کے نزدیک وہ ایک فرشتہ ہے جس کے ساتھ لشکر اور بہت سے مددگار ہیں جن میں سے ایک ملک الموت بھی ہے اور منکر نکیر بھی اسی کی ذیل میں ہیں۔ اسی طرح مریخ کے جرم سے ایک روحانی قوت عالم میں پھیلتی ہے۔ فلسفی اس قوت کو مریخ کی روحانیت کہتے ہیں۔ اور اہل شرع کے نزدیک وہ ایک فرشتہ ہے جس کے خیل و حشم میں جبرئیل اور دوزخ کے نگہبان ہیں۔ اسی طرح مشتری کے جرم سے ایک روحانی قوت تمام دنیا میں پھیلتی ہے فلسفی اس کو مشتری کی روحانیت کہتے ہیں اور اہل شرع کے نزدیک وہ ایک فرشتہ ہے جس کے لشکر اور اعوان ہیں جن میں سے جنت کا محافظ رضوان ہے۔ اسی طرح زہرہ سے ایک روحانی قوت دنیا میں پھیلتی ہے جس کو فلسفی زہرہ کی روحانیت کہتے ہیں اور اہل شریعت کے نزدیک وہ ایک فرشتہ ہے جس کے اعوان و انصار میں جنت کی حوریں اور جنت کے نگہبان ہیں۔ اسی طرح عطارد کے جرم سے

ایک روحانی قوت پھیلتی ہے۔ یہ بھی اہل شریعت کے نزدیک ایک فرشتہ ہے جس کے لشکر میں غلمان اور کراماً کاتبین شامل ہیں ۔

سید صاحب اس مباحثہ کی نسبت جو قصۂ آدم میں خدا اور فرشتوں میں ہوا تھا یہ لکھتے ہیں کہ "اگر ہم فرض کریں کہ فرشتے اور شیطان ایک علیحدہ وجود رکھتے ہیں جیسا کہ عموماً مسلمانوں کا عقیدہ ہے تو بھی یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا فی الواقع یہ مباحثہ خدا اور فرشتوں میں ہوا تھا۔ کیونکہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کر سکتے بلکہ اُس کے حکم کو بجا لاتے ہیں پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ فی الواقع فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا کیا تھا ؟ یہی بات وہ ہے جو شرح فصوص الحکم میں قیصری لکھتے ہیں کہ جن فرشتوں نے آدم کے معاملہ میں خدا سے جھگڑا کیا، وہ آسمان کے فرشتے نہ تھے کیونکہ وہ انسان کی بزرگی اور درجہ کو جو اُس کا خدا کے پاس ہے خوب جانتے تھے جھگڑنے والے فرشتے زمین کے فرشتے اور جن اور شیطان تھے جو بہ سبب غلبۂ ظلمت کے اُس سے واقف نہ تھے، اور پھر لکھتے ہیں کہ قوت شہوانیہ اور غضبیہ وہی وہ فرشتے ہیں جو ملائکۂ ارض ہیں اور جو نفس ناطقہ پر غالب آجاتے ہیں اور اُسے اپنے افعال و اغراض کیلئے مطیع اور منقاد کرنا چاہتے ہیں اور اسی سے نفس امارہ برائیاں کرانے لگتا ہے اور وہی فی الحقیقت وہ مفسدین ہیں جن کو خدا نے فرمایا ہے انھم ھم المفسدون اور چونکہ فساد قوائے جسمانیہ سے ہوتا ہے نہ روحانیہ سے اس لئے یہ صاف دلیل ہے ہمارے اس قول کی ملائکہ سماویہ خدا کے ساتھ نہ جھگڑا کر سکتے ہیں نہ اُس کے امر و نہی کی مخالفت کر سکتے ہیں اور انکے قول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ جو قوتیں روحانی او قلبی ہیں وہی فرشتے ہیں کیونکہ وہ آگے چلکر لکھتے ہیں کہ قوائے روحانیہ و قلبیہ سے کوئی فعل ایسا ہو ہی نہیں سکتا جو خدا کے حکم کے خلاف ہو اصل عبارت شرح فصوص الحکم کی یہ ہے :۔

وھذا تنبیہٌ علی ان الملائکۃ الذین نازعوا فی آدم لیسوا من اھل الجبروت ولا من اھل الملکوت السماویۃ فانھم لغلبۃ النوریۃ علیھم واحاطتھم بالمراتب یعرفون شرف الانسان الکامل ورتبتہ عند اللہ وان لم یعرفوا حقیقتہ کما ھی بل ملائکۃ الارض والجن والشیاطین الذین غلبت علیھم الظلمۃ والنشاۃ الموجبۃ للحجاب، وفی قولہ تعالیٰ انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ تخصیص الارض بالذکر ان کان الکامل خلیفۃ فی العالم کلہ فی الحقیقۃ ایماء ایضاً بان الملائکۃ الارض ھم الطاعنون اذ لا تطعن ولا یصدر الا ممن ھو فی معرض ذلک المنصب واھل السموات من بیات للعالم العلوی بالفصل الاول والسفلی بالفصل الثانی، واذا حقیقت الامر وامعنت النظر تجدھم فی ھذہ النشاۃ الانسانیۃ ایضاً انھم ھم المفسدون کما قال تعالیٰ الا انھم ھم المفسدون

ولکن لا یشعرون ۔ الا تریٰ ان القوۃ الشھویۃ والغضبیۃ اللتین ھما ملکان من ملائکۃ الارض ھما اللتان تغلبان علی النفس الناطقۃ وتجعلانھا اسیرا منقادا لافعالھما و اغراضھما وعند ذلک تصیر النفس امارۃ بسوء فھم المفسدون بالحقیقۃ وکون الفساد والفساد صادرا من القوی الجسمانیۃ لا الروحانیۃ والقلبیۃ دلیل واضح علی ما ذھبنا الیہ من ان اھل الجبروت والملکوت السماویۃ لا ینازعون مع الحق ولا یخالفون امرہ ونھیہ اذ القوی الروحانیۃ والقلبیۃ لا یاتی منھما مخالفۃ امر اللہ فافھم ۔

سید صاحب آدم و ملائکہ کے قصہ کو حقیقی واقعہ نہیں سمجھتے اور فرشتوں اور شیطان کو ان اچھی اور بری قوتوں سے تعبیر کرتے ہیں جو خدا نے خود انسان میں رکھی ہیں صاحب اخوان الصفا ملائکہ جنہوں نے آدم کو سجدہ کیا وہ نفوس حیوانی ہیں۔ یہی ان فرشتوں کو جنہوں نے آدم کو سجدہ

واما الملائکۃ الذین سجدوا لآدم الی النفس۔ فھم الذین فی الارض خلفاء ھولاء الذین ھم فی افلاک ۔ وھی نفوس سائر الحیوانات الساجدات لآدم وذریتہ بالطاعۃ المسخرۃ لھم الی یوم القیامۃ ۔

کیا نفوس حیوانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں وہ فرشتے جنہوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ وہ آسمان کے فرشتوں کے زمین میں قائم مقام ہیں اور اُن سے مراد تمام حیوانات کے نفوس ہیں۔ جنہوں نے آدم اور اس کی اولاد کو سجدہ کیا یعنی قیامت تک اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری پر مجبور کئے گئے ہیں ۔

پھر اس سوال کے جواب میں کہ سردار ان ملائکہ مقربین کا جو بنی آدم کی حفاظت اور تدبیر پر مقرر ہیں کون ہے ؟ صاحب اخوان الصفا یہ جواب دیتے ہیں کہ نفس ناطقہ انسانیہ ہے جو خدا

سردار ملائکہ

کما قال نمن رئیس الملائکۃ المقربین الموکلین بنی آدم وحفظھم ومراعات امرھم۔ قال الحکیم ھی النفس الناطقۃ الانسانیۃ الکلیۃ التی ھی خلیفۃ اللہ فی ارضہ ۔ وھی التی قرنت بجسد آدم لما خلق من التراب وسجدت لہ الملائکۃ کلھم اجمعون ۔

وھی النفوس الحیوانیۃ المنقادۃ لطاعۃ النفس ناطقۃ الباقیۃ الی یومنا ھذا ۔ فی ذریۃ آدم ۔ کان صورۃ الجسد

کی زمین میں اس کا نائب ہے، اور یہی آدم کے جسم میں جبکہ وہ مٹی سے پیدا ہوا داخل ہوا تھا۔ اور اسی کو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اور وہ نفوس حیوانی جو نفس ناطقہ کے مطیع ہیں اور یہ نفس ناطقہ بنی آدم میں آج تک موجود ہے

جیساکہ جسم کی ہیئت ترکیبی آج تک ان میں باقی ہے بنی آدم اسی نفس ناطقہ کے سبب نشو ونما پانے جزا وسزا میں مبتلا ہوتے ہیں - اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی سے قیامت میں پہچانے جائینگے، اسی پر دوبارہ پیدا ہونگے، اسی سے جنت میں داخل ہونگے، اور اسی کے سبب عالم افلاک تک پرواز کرینگے ۔

الجسمانية باقية في ذريته الى يومنا هذا - وبها ينشئون وبها يموتون وبها يعاقبون يوم القيامة وبها يواخذون واليها يرجعون وبها يعرفون يوم القيمة وبها يبعثون وبها يدخلون الجنة وبها يتصعدون الى عالم الافلاك اعني صعود النفس الناطقة التي هي خليفة الله في ارضه (صفحه ۲۲۱ اخوان الصفا جلد ثانی) ۔

شرح فصوص الحکم قیصری میں لکھتے ہیں کہ ان فرشتوں نے آدم پر تعریض کی وہ اہل جبروت اور ملکوت سماوی میں سے نہ تھے کیونکہ وہ تو نورانیت کے غلبہ اور مراتب کمال پر حاوی ہونے کے سبب سے انسان کامل کی فضیلت اور اس کے مقرب الٰہی ہونے کو جانتے ہیں اگرچہ اچھی طرح حقیقت انسانی سے واقف نہیں ہیں - بلکہ وہ زمین کے فرشتے اور جن شیاطین تھے جن کی تاریک خلقت ہی ایسی ہے کہ ان پر اسرار الٰہی کا انکشاف نہیں ہوسکتا - آیت انی جاعل فی الارض خلیفہ میں زمین کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا اور دنیا میں سب کامل کو اپنا نائب بنانا درحقیقت اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ زمین کے فرشتے ہی تھے جو آدم کے ساتھ تعریض سے

وهذا تنبيه على ان الملائكة الذين تنازعوا الخ ... لم ليسوا من اهل الجبروت ولا من اهل الملكوت السماوية لانهم بغاية النورية عندهم واحاطتهم بالمراتب يعرفون شرف الانسان الكامل ورتبته عند الله وان لم يعرفوا حقيقته كما هي بل ملائكة الارض والجن والشياطين الذين غلبت عليهم الظلمة والنشاة الموجبة للحجاب - وفي قوله تعالى انى جاعل في الارض خليفة تخصيص الارض بالذكر وان كان الكامل خليفة في العالم كله في الحقيقة ايماء ايضا بان ملائكة الارض هم الطاعنون اذ الطعن لا يصدر الا ممن هو في معرض ذلك المنصب واهل السموات من جزئيات العالم يعنون بالفصل الاول والسفلي بالفصل الثاني - واذا حققت الامر واعمنت النظر تجدهم في هذه النشاة الانسانية ايضا - الا انهم هم المفسدون كما قال الله تعالى الا انهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون - الا ترى ان القوة الشهوية والغضبية اللتين هما ملكان من ملائكة الارض هما اللتان تغلبان على النفس الناطقة وتجعلانها اسيرا منقادا لافعالهما واغراضهما وعنها

ذلك تصيير النفس امارة بالسوء فهم المفسدون بالحقيقة وكون السفك والفساد صادراً من القوى الجسمانية لا الروحانية دليل واضح على ما ذهبنا اليه من ان اهل الجبروت والملكوت السماوية لا ينازعون الحق ولا يخالفون امره ونهيه والقوى الروحانية والقلبية لا يأتي منهم ما يخالف امر الله فافهم (شرح فصوص الحکم صفحہ ۳۰)

پیش آئے کیونکہ ایسے ہی ادنے درجہ والوں سے یہ فعل صادر ہو سکتا ہے۔ اہل سموات تو قصد اول سے عالم علوی کا اور قصد ثانی سے عالم سفلی کا انتظام کرنے والے ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھو تو عالم انسانی میں فساد اور بے اعتدالی بھی پاؤ گے جس کا خدا نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ بے شک وہ مفسد ہیں، اور نہیں جانتے، اور تم دیکھتے ہو کہ قوت شہوانی اور قوت غضبی دو ارضی فرشتے ہیں جو نفس ناطقہ پر غالب آ کر اس کو اپنے ارادوں اور خواہشوں کا مطیع کر لیتے ہیں۔ اس حالت میں نفس بدی پر اصرار کرتا ہے، پس حقیقت میں بنی آدم مفسد ہیں اور فساد و خونریزی کا قوائے جسمانی سے صادر ہونا نہ قوائے روحانی سے، اس مطلب پر روشن دلیل ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اہل جبروت اور ملکوت سماوی امر و نہی الٰہی سے مخالفت نہیں کرتے نہ قوائے روحانی و قلبی سے خدا کی نافرمانی صادر ہو سکتی ہے۔

ابلیس جس نے آدم کے سجدہ سے انکار کیا اُسے صاحب اخوان الصفا بھی مثل شیخ صاحب کے قوت غضبیہ و شہوانیہ اور نفس امارہ سے تعبیر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ابلیس نے آدم کے سجدہ سے انکار کیا

كما قال - وابى ابليس عن سجدة آدم وهي القوت الغضبية والشهوانية والنفس الامارة بالسوء

کہ یہاں ابلیس سے مراد قوت غضبیہ و شہویہ اور نفس امارہ ہے۔

بعض اہل تصوف کے نزدیک ابلیس سے وہ قوت وہمیہ مراد ہے جو انسانوں میں ہے۔ اور جو عقل سے مخالفت کرتی ہے اگرچہ بعض لوگ ایسا نہیں سمجھتے مگر پھر بھی ان تحریروں سے جو اس خیال زمانے پر لکھی گئی ہیں اس بات کا استنباط ہوتا ہے کہ قوت وہمیہ کو کچھ لوگ ابلیس سمجھتے تھے شرح فصوص الحکم قیصری میں لکھا ہے کہ ابلیس اس عالمگیر قوت وہمی کا نام ہے جو

قيل ابليس هو القوة الوهمية الكلية التي في العالم الكبير والقوى الوهمية التي في الاشخاص الانسانية والحيوانية افرادها المعارضة لها مع العقل الهادي طريق الحق وفيه نظر لان النفس المنطبعة هي الامارة بالسوء والوهم من سدنتها وتحت حكمها لانها من قواها في اولا يذلك كما قال تعالى ونعلم ما توسوس به نفسه وقال ان النفس لامارة بالسوء و قال عليه السلام اعدى عدوك نفسك التي بين جنبيك

عالم کبیر میں پائی جاتی ہے اور جو وہمی قوتیں انسان و حیوان کی اشخاص میں ہیں وہ اس قوت عامہ کی افراد ہیں کیونکہ وہ عقل سے جو ہادی ہے مخالفت کرتے ہیں ہم کو اس میں تامل ہے

وقال علیہ السلام الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم ہذا شان النفس ولو کان تکذیبہ للعقل موجبا لکونہ شیطانا لکان العقل ایضاً کذالک لانہ یکذب ماوراء طورہ مما یدرک بالمکاشفات الحقیقۃ کاحوال الآخرۃ ؛

کیونکہ نفس ہی بدی کا حکم کرتا ہے اور وہم اس کا تابع ہے اور اسی کی ایک قوت ہے۔ اسی لئے وہ اس کا مستحق ہے، چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ ہم جانتے ہیں جو آدمی کے نفس میں وسوسے آتے ہیں اور فرمایا کہ نفس بدی پر حکم کرنے والا ہے اور آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ تیرا سب سے بڑا دشمن نفس ہے جو تیرے پہلو میں ہے اور فرماتے ہیں کہ شیطان جسم انسانی میں خون کی مانند دوڑتا ہے اور یہ سب نفس کا حال ہے اگر نفس عقل کی مخالفت کے سبب سے شیطان کہلائے جانے کا مستحق ہے تو عقل کا بھی یہی حال ہے کیونکہ وہ بھی ان باتوں کو جھٹلاتی ہے جو اس کی حد فہم سے باہر ہیں اور صرف حقیقی مکاشفات ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں جیسے آخرت کا حال ؛

سید صاحب اس عذر میں کہ کہ خدا نے فرشتوں اور ابلیس کے قصہ کو اس طرح کیوں بیان کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات حقیقی ہیں اور فرشتوں اور خدا میں درحقیقت کچھ مباحثہ ہوا تھا اور شیطان نے آدم کو اسی طرح بہکایا تھا جس طرح کوئی ایک شخص دوسرے کو ورغلاتا ہو۔ یہ جواب دیتے ہیں کہ ان آیتوں میں یعنی جن میں اس قسم کے تذکرے ہیں خدا تعالیٰ انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوائے بہیمیہ اس میں ہیں ان کی بُرائی یا ان کی دشمنی سے اسکو آگاہ کرتا ہے مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کی اور اونٹ چرانے والوں کی فہم سے دُور تھا اس لئے خدا نے انسانی فطرت کی زبان حال سے آدم و شیطان کے قصے یا خدا اور فرشتوں کے مباحثہ کے طور پر اس فطرت کو بیان کیا ہے تاکہ ہر کوئی خواہ اس کو فطرت کا راز سمجھے خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا اصل مقصد حاصل کرنے سے محروم نہ رہے اسطرح پر عام و خواص سمجھ دار و ناسمجھ عالم و جاہل کا یکساں قرآن مجید سے مقصد پانا درحقیقت بہت بڑا معجزہ قرآن کا ہے۔ سید صاحبؒ نے جو وجہ بیان کی ہے یہی وجہ ہمارے علمائے سلف نے بھی لکھی ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اکثر قرآن مجید اور اس کے پیغمبروں کے کلام میں اور حکما کے اقوال میں ایسی چیزوں کا جن کو عام نہ سمجھ سکیں بیان بطور اسرار اور مثالوں کے ہوا کرتا ہے چنانچہ ایک عالم فرماتے ہیں کہ اکثر کلام الٰہی اور کلام انبیا میں اور حکما کے اقوال میں ایسے اسرار مخفی ہیں جن کو یا تو خدا جانتا ہے

کما قال. ان اکثر کلام اللہ تعالیٰ وکلام انبیائہ واقاویل الحکماء موجود فیہ من الاسرار مخفیا من الاسرار وما یعلمہا الا اللہ والراسخون فی العلم وذلک ان القلوب الخواطر

یا وہ لوگ جو علم میں بلند پایہ رکھتے ہیں اس لئے کہ بہت سے دل ہیں جو ان

ما كانت تحتمل فهم معاني ذلك. وبهذا قال عليه السلام كلموا
الناس على قدر عقولهم وافشاء سرار بوبية كفر واما الخواص
من الحكماء الذين هم الراسخون في العلم فهم لا يحتاجون
الى زيادة بيان اذ هم مطلعون على حقايق جميع الاسرار والرموز
من ذلك قول الله تعالى علمنا منطق الطير واوتينا من كل شئ
علماً ان هذا لهو الفضل المبين. وقوله سبحان الذي اسرى
بعبده ليلاً من المسجد الحرام الى المسجد الاقصى الذي باركنا
حوله. وقوله في البقعة المباركة من الشجرة ان يا موسى اني انا
الله رب العالمين. وقوله والق عصاك فلما رآها تهتز كانها
جان ولى مدبرا. ونظائر ذلك من الآيات والاخبار تحت ذلك
سر من الاسرار التي لا يجوز ان تكشف على العوام والجهال سيما
في آخر الزمان فلهذا الغرض البسوا حقايق الاشياء بلباس
غير ما يليق بذلك حسب فهم عامة الناس لكن الخواص والحكماء
يعلمون الغرض والحقيقة في ذلك ويخفون عن الاشرار والا
جاهلين فمن منح الجهال علما اضاعه ومن منع المستوجبين
فقد ظلم (صفحہ ۲۲۲ جلد ثانی اخوان الصفا)

باریک باتوں کے سمجھنے کا تحمل نہیں کر سکتے اسی لئے آنحضرت نے فرمایا کہ لوگوں کی عقل و دانش کے موافق کلام کرو اور اسرار الٰہی کا کھولنا کفر ہے اور وہ خواص خاص حکیم جو علم میں بلند پایہ ہیں تفصیل کے اس لئے محتاج نہیں ہیں کہ ان کو ان تمام پوشیدہ باتوں اور مخفی رازوں پر اطلاع اور عبور حاصل ہے چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ ہم نے اسکو (سلیمان کو) جانوروں کی منطق سکھائی ہم نے ہر چیز کا علم اسکو دیا۔ اور یہ کھلی فضیلت ہے اسی طرح خدا نے درخت سے آواز دی اے موسیٰ میں ہوں دنیا کا پرورش کرنے والا خدا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ سے یہ کہنا کہ اپنی لاٹھی پھینک دے جب دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح لہراتی ہے تو پیچھے ہٹ گیا۔ اسی طرح اور بہت سی آئتیں اور حدیثیں ہیں جن میں ایسے اسرار پنہاں ہیں جن کا عوام اور نادانوں پر کھولنا خاصکر اس زمانے میں کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اسی سبب سے حقائق و معارف کو ایسا لباس پہنایا ہے جو عوام کی عقل و فہم کے موافق ہو لیکن خواص حکما اصلی غرض اور حقیقت کو جانتے ہیں۔ ہاں وہ شریروں اور نااہلوں سے اس کو چھپاتے ہیں پس جو شخص نااہلوں کو علم سکھاتا ہے اس کو ضائع کرتا ہے اور جو ان کو روکتا ہے جو علم کے مستحق ہیں وہ ان پر ظلم کرتا ہے"۔

سید صاحب قوائے بہیمیہ کو شیطان اور ابلیس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہی قوائے بہیمیہ جو انسان میں ہیں اور جو اس کے سخت دشمن ہیں شیطان ہیں اور انہیں کا قابو میں لانا اور فرمانبردار کرنا انسان کا انسان ہوتا ہے۔ صوفیہ کرام اور اولیائے عظام کی نسبت بھی یہی خیال منسوب کیا گیا ہے۔ چنانچہ اخوان الصفا میں جہاں اولیاء اللہ کی علامات اور ان کے علم کے

لطائف اور معرفت کے دقائق کا ذکر کیا ہے یہ لکھا ہے "کہ اولیاء اللہ کے دقائق معرفت و لطائف علوم میں سے یہ ہے کہ وہ شیطانوں اور اس کے لشکر کی حقیقت جانتے ہیں اور نیز یہ کہ وہ کیونکر ان کو ورغلاتا ہے اور اسکے وسوسے اور مس کی کیا حقیقت ہے اور خدا نے جو کچھ اسکے متعلق فرمایا ہے مثلاً ان الذین اتقوا اذا مسہم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ہم مبصرون و اخوانہم یمدونہم فی الغی ثم لا یقصرون اور یہ ان مسائل دقیقہ میں سے ہے کہ جس میں علمائے شریعت اور فقہائے امت حیران ہیں اور ابلیسیت اور ابلیس کی حقیقت میں متحیر ہیں اور اکثر علما اس کے وجود ہی میں شک کرتے ہیں اور اکثر مدعیان فلسفہ آدم کے قصے اور شیطان کے جھگڑے اور اس مباحثہ کا جو خدا کے ساتھ ہوا انکار کرتے ہیں" یہ لکھ کر صاحب اخوان الصفا ابلیس کی حقیقت اور شیطان کی مخالفت اور اس کے وساوس کی کیفیت لکھتے ہیں۔ جیسے وہ ایک ولی کی زبان سے حکایتہً یوں بیان کرتے ہیں کہ "ایک دانشمند عالم نے ایک ولی اللہ سے پوچھا کہ شیطان کے مکاید اور مخالفت کی کیا حقیقت ہے تو اس نے یہ جواب دیا کہ جب میرے ہوش کا زمانہ آیا اور میں نے کچھ علم تحصیل کر لیا اور اوامر و نواہی اور سنن و فرائض اور احکام و حدود اور وعدہ و وعید اور ترغیب و تنفیر اور سزا و جزا سے واقف ہوا اور اپنی طاقت کے موافق عمل کرنے لگا تو میں خدا کے اس قول میں فکر کرنے لگا کہ ان الشیطان کان للانسان عدوا مبینا اور اسی طرح اور بہت سی اس قسم کی آیتوں میں جو قرآن میں آئی ہیں اور بہت سی حدیثوں میں مثلاً رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر میں غور کرنے لگا اور مجاہدہ نفس کی حقیقت سمجھنے میں متفکر ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ خدا کے قول میں مثلاً الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس کی حقیقت کیا ہے، اور اس حدیث کا کہ لکل انسان شیطان بعنریانہ وان شیطانی اعاننی اللہ علیہ فاسلم کے کیا معنی ہیں پھر میں نے دیکھا اور خوب سوچا اور دل میں غور کیا اور عقل لڑائی۔ تو کسی کو بظاہر میں نے ایسا نہ پایا جو میری مخالفت کرتا یا مجھے بہکاتا ہو، سوائے اپنے ابنائے جنس کے۔ تو میں نے سوچا کہ اس حکم میں تو وہ سب میرے شریک ہیں اور یہ خطاب ان سے بھی ویسا ہی ہے جیسا مجھ سے۔ تو میں سمجھا کہ یہ تو وہ بات ہے جو تمام بنی آدم کو شامل ہے۔ تب میں نے خوب غور کیا اور دقیق نظر سے دیکھا، تو مجھے معلوم ہوا کہ شیطان کی حقیقت اور اس کے لشکر کی کثرت اور بنی آدم کے ساتھ اس کی مخالفت اور عداوت اور اس کے وسوسے سب امور باطنی اور اسرار مخفی ہیں، اور یہ سب خود انسان کی طبیعت میں موجود ہیں۔ اور انسان کی خلقت یعنی اس کا نیچر ایسا ہی بنایا گیا ہے۔ اور اخلاق سیئہ اور برے اخلاق اور بدخیالات جو انسان کے ساتھ لڑکپن

سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس کی جہالتیں اور باطل اعتقاد اور فاسد رائیں جو بغیر معرفت اور بصیرت کے انسان کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں، اور اُس کے سبب سے جو اعمال سیئہ اور افعال قبیحہ سرزد ہوتے ہیں، یہ نفس شہوانیہ اور نفس غضبیہ کے کام ہیں۔ اور امر ونہی اور وعدہ و وعید اور مدح و ذم جو کچھ ہے یہ سب نفس ناطقہ کے سبب سے ہے کہ اس میں خدا نے ایک قوت ایسی رکھی ہے جو نیک بد کو پہچانتی ہے اور جو اخلاق جمیلہ اور معارف حقیقیہ اور آرا صحیحہ اور اعمال ذکیہ سے موصوف ہے اور یہ نفس شہوانیہ و غضبیہ کے مقابل میں فرشتہ ہے اور نفس شہوانیہ و غضبیہ نفس ناطقہ کے مقابل میں شیطان ہیں پھر میں نے غور کیا اور بہت نظر دقیق سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ تمام پاک کام اور نیک عمل نفس ناطقہ سے ہوتے ہیں، اور تمام برائی و فساد اور اعمال قبیحہ نفس شہوانیہ و غضبانیہ سے صادر ہوتے ہیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ ان قوتوں کا توڑنا اور نفس ناطقہ کا ان پر غالب کرنا ہی وہ جہاد ہے جو رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں مذکور ہے رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر۔"

اصل عبارت اخوان الصفا کی یہ ہے۔

ومن دقیق معرفتهم ولطيف علومهم معرفة حقيقة الشياطين وجنود ابليس اللعابن وكيف وسواسهم ومسهم كما ذكر الله سبحانه بقوله ان الذين اتقوا اذا مسهم طايف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون واخوانهم يمدونهم فى الغى ثم لا يقصرون ومن علامات هم وصفاتهم ودقيق علومهم ولطيف اسرارهم معرفة البعث والقيامة والنشر والحشر والحساب والميزان والصراط والجواز وذلك ان اكثر علماء اهل الشرايع والنبوية وفقهايها المتعبدين بها متحيرون فى معنى الابليسية وحقيقة ابليس المخاطب لرب العالمين بقوله انظرنى الى يوم يبعثون واكثر العلماء متشككون فى وجود هذا القايل لاغوينهم اجمعين، واكثر المتفلسفة منكرون قصته مع آدم وعداوته وخطابه لرب العالمين ومواجهته له بخشونة الخطاب بما ذكر الله سبحانه فى القرآن فى نحو من خمسين اية مثل قوله ثم لاتينهم من بين ايديهم ومن خلفهم وعن ايمانهم وعن شمائلهم ولا تجد اكثرهم شاكرين وايات كثيرة فى امثال هذه الحكايات موجودة فى التورات والانجيل وصحف الانبياء عليهم السلام كثيرة وقد بينا نحن معانيها فى رسالة البعث والقيامة ولكن نريد ان نذكر فى هذا الفصل منها طرفا فى كيفية عداوة اولياء الله لهم مع ابليس وكيفية محاربتهم مع الشياطين ومخالفتهم ومجاهدتهم معهم طول اعمارهم ليلا ونهارا وسرا وجهرا وانه لا يخفى عليهم

مكايدهم ولا يذهب عنهم غرورهم زمانهم (فصل) فيما حكاه ولي من اولياء الله
من كيفية معرفته مكايد الشيطان ومحاربته معهم ومخالفته جنود ابليس اجمعين + قال العارف
المستبصر لاخ له من ابناء جنسه فيما جرى بينهما من المذاكرة في امر الشياطين علام
كيف عرفت الشياطين ووساوسهم + قال اني لما نشأت وتربيت وشدوت من الاداب
طرفا واخذت من العلم نصيبا وعقلت من امر المعاش قسطا وعرفت امر المنافع
والمضار تبينت ما يجب علي من احكام الناموس من الاوامر والنواهي والسنن والفرائض
والاحكام والحدود والوعد والوعيد والذم والمدح على الاعمال والافعال وعلى تركها
ثم تقيدت بواجبها جهدي وطاقتي بحسب ما وفقت وقضي علي ولبس لي ثم تفكرت في قول الله
تعالى ان الشيطان لكم عدو فاتخذوه عدوا وقوله ان الشيطان كان للانسان عدوا
مبينا وايات كثيرة في القران في هذه المعنى وتفكرت في قول النبي صلى الله عليه وعلى اله
وسلم رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر يعني مجاهدة النفس وتصديقه قول الله تعالى
ومن جاهد فانما يجاهد لنفسه وتفكرت في قوله عليه السلام لكل انسان شيطان يغويه
وقوله ان شيطاني اعانني الله عليه فاسلم وقوله ان الشيطان يجري من ابن ادم مجرى
الدم وتصديق ذلك قول الله تعالى من شر الوسواس الخناس الذي يوسوس في صدور الناس
الى اخر السورة وقوله تعالى انه يراكم هو وقبيله من حيث لا ترونهم وايات كثيرة في
القران في هذا المعنى واحاديث مروية ايضا في هذا المعنى كثيرة فلما سمعت ما ذكر الله تعالى
وتفكرت فيما روي عن النبي صلعم في هذه المعنى نظرت عند ذلك بعيني وتفكرت بقلبي
وتاملت بروتي فلم اجد احدا في ظاهر الامر يعاديني في هذا المعنى ولا يخالفني ولا
يعاديني من ابناء جنسي وذلك لاني وجدت الخطاب متوجها اليهم كلهم مثل ما
هو متوجه علي ووجدت حكمهم في ذلك حكمي سواء لا فرق بيني وبينهم في هذا
الامر فعلمت ان هذا الامر عموم يشتمل جميع بني ادم كلهم ثم تاملت وبحثت ودققت
النظر فوجدت حقيقة معنى الشياطين وكثرة جنود ابليس اللعين اجمعين ومخالفتهم
بني ادم وعداوتهم لهم ووساوسهم بانهم هي امور باطنة واسرار خفية مركوزة في
الجبلة مطبوعة في الخلقة وهي الاخلاق الردية والطباع المذمومة المنشية مثل النصبي
مع الانسان بالجهالات المتراكمة والاعتقادات الاراء الفاسدة من غير معرفة ولا بصيرة
ولا يتبعها من الاعمال السيئة والافعال القبيحة المكتسبة بالعادات الجارية الخارجة من
الاعتدال بالزيادة والنقصان المنسوبة الى النفس الشهوانية والنفس الغضبية ثم تاملت

ونظرت فوجدت الخطاب فی الامر والنهی والوعد والوعید والمدح والذم متوجها کله الی النفس الناطقة الفاضلة الممیزة المستبصرة ووجدتها بما توصف من الاخلاق الجمیلة والمعارف الحقیقة والآراء الصحیحة والاعمال الزکیة ملکا من الملائکة بالاضافة الی النفس الشهوانیة والغضبیة جمیعا ووجدت هاتین النفس اعنی الشهوانیه والغضبیه بما توصفان من الجهلات المتراکمة والاخلاق المذمومة والطباع المرکوزة والافعال التی لها بانکر والارویة کانهما شیطانان بالاضافة الی النفس الناطقة ثم تاملت وبحثت ودققت النظر فوجدت جمیع الاعمال الزکیة والافعال الحسنة التی هی منسوبة الی النفس الناطقة انما هی لها بحسب رأیها الصحیحة واعتقاداتها الجمیلة ثم وجدت تلک الآراء والاعتقادات انما هی لها بحسب اخلاقها المحمودة المکتسبة بالاجتهاد والرویة والعادات الجاریة العادلة او ما کانت مرکوزة فی الجبلة فتبینت عند ذالک وعرفت بهذا الاعتبار بان اصل جمیع الخیرات وصلاح الامور الانسان کلها هی الاخلاق المحمودة المکتسبة بالعادات الجاریة وعرفت ایضا ان اصل جمیع الشر وروفسا وامور الانسان کلها هی الاخلاق المذمومة المکتسبة بالعادات الجاریة منذ الصبا من غیر بصیرة او ما کانت مرکوزة فی الجبلة فلما تبین لی ما قلت وعرفت حقیقة ما وصفت تاملت قول النبی صلی الله علیه وعلی آله وسلم اجمعین رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر وقول الله تعالیٰ ان الشیطان لکم عدو فاتخذوه عدوا یعنی خالفوهم وجاربوهم کما تحاربون اعدائکم من الکفار والمشرکین ❊

معجزات

اعجاز قرآن کے متعلق جو کچھ سید صاحب نے لکھا ہے مسلمانوں کے بعض دیگر فرقے

اعجاز قرآن

کے علما نے بھی ویسا ہی خیال کیا ہے ❊

فرقہ نظامی کا بانی ابراہیم ابن سیار نظام جو بڑا فلسفی اور معتزلی تھا اعجاز قرآن کا منکر ہے ملل ونحل شہرستانی کی جلد اول صفحہ ۳۹ مطبوعہ لندن میں لکھا ہے التاسعة قوله فی الاعجاز القرآن انه من حیث الاخبار عن الامور الماضیة والآتیة ومن جهة صرف الدواعی عن المعارضة ومنع العرب عن الاهتمام به جبرا وتعجیزا حتی لو خلاهم لکانوا قادرین علی ان یاتوا بسورة من مثله بلاغة وفصاحة ونظما ❊

کتاب الخطط میں علامہ مقریزی نے بھی نظام کا یہی قول لکھا ہے قرآن اس لحاظ سے
ان الاعجاز فی القرآن من حیث الاخبار علی الغیب معجزہ ہے کہ اس نے غیب
(صفحہ ۳۴۲) جلد دوم ۔ کی باتوں کی خبر دی ۔

فرقہ مزداریہ جس کا بانی عیسے ابن صبیح المکنی بابی موسے الملقب بالمزدار جو کہ بشیر ابن معتمر کا شاگرد تھا اور بسبب اپنے زہد کے معتزلیوں کا راہب مشہور تھا یہی کہتا ہے ۔ ملل ونحل (صفحہ ۴۸)
الثالثۃ قولہ فی القرآن ان الناس قادرون علی مثل میں لکھا ہے کہ فصاحت
القرآن فصاحۃ و نظما و بلاغۃ وھو الذی بالغ فی و بلاغت اور نظم کلام کے
القول بخلق القرآن ۔ لحاظ سے قرآن کے معارضہ
پر لوگ قادر ہیں ۔

مزداریہ فرقہ قرآن کی نسبت کہتا ہے کہ قرآن کا معارضہ ہو سکتا ہے اور اس کی فصاحت
و زعم ان القرآن مما لقدرۃ علیہ و ان بلاغۃ اور بلاغت معجزہ نہیں ہے
و فصاحتہ لا تعجز الناس بل یقدرون علی الاتیان بمثلھا بلکہ ایسا کلام بنانے پر
مقریزی جلد دوم (۳۴۲) ۔ لوگ قادر ہیں ۔

ہشام ابن عمر فوطی معجزات کا منکر ہے ابن مقریزی نے اس کے عقائد کے بیان میں لکھا
معجزات موسی وعیسی و شق القمر و منع ان ہے کہ وہ موسے کے لئے
یکون البحر انفلق لموسی وان عصاہ انقلبت حیۃ دریا کا پھٹنا ۔ اور ان کی
وان عیسی احی الموتی باذن اللہ ان القمر انشق للنبی لاٹھی کا سانپ بن جانا
صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اور عیسیٰ کا حکم الٰہی سے
مردوں کو زندہ کرنا ۔ اور آنحضرتؐ کے لئے چاند کا شق ہونا نہیں مانتا تھا ۔

نظام شق القمر کا منکر ہے ۔ مقریزی لکھتا ہے ۔
وکذب بانشقاق القمر ۔

فرقہ باطنیہ وحی کو اس طور پر کہ کوئی فرشتہ لاتا ہو اور معجزات کو اور خرق عادت کو نہیں مانتا یہانتک کہ وہ حضرت عیسے کے بن باپ پیدا ہونے کے بھی منکر ہیں اور نبوت کی حقیقت قریب قریب اُسی کے بیان کرتے ہیں جو سید صاحب کہتے ہیں ۔ چنانچہ کتاب المنیۃ والامل فی شرح ملل و النحل میں جو تصنیف امام احمد ابن یحیے المرتضے فرقہ زیدیہ کے ایک بڑے عالم کی ہے فرقہ باطنیہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ :-

" وحی اور نزول ملائکہ اور معجزات کا انکار کرتے ہیں ۔ اور وہ ایسی باتوں کو اشارے اور

استعارے سمجھتے ہیں جن کو عام لوگ نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک موسیٰ کے اژدہا سے ظاہر قرآن کے موافق اژدہا مراد نہیں ہے بلکہ موسیٰ کی حجت مراد ہے۔ اور بادلوں کے سایہ کرنے سے موسیٰ کا اپنی قوم پر حاکم ہونا مراد ہے نہ کہ حقیقت میں بادل ان پر سایہ کرتا تھا۔ وہ عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے سے بھی منکر ہیں ان کے نزدیک نبوت ایک قوت ہے جو نبی کے دل پر وارد ہو کر اس کو علمی روشنی سے منور کر دیتی ہے۔ اور اسی قوت سے نبی حقایق اشیا اور طبایع اجسام سے آگاہ ہوتا ہے معاد سے ان کے نزدیک ہر چیز کا اپنی اصلی طبیعت کی طرف مائل ہونا مراد ہے اور قرآن میں جو جنت کے کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر ہے اُس کو بھی نہیں مانتے کیونکہ ان کے نزدیک اعادۂ اجسام محال ہے ۔

انہم ینکرون الوحی وھبوط الملائکة فالمعجز سبل یجعلونہا رموزا الی امور لا یعرفہا اھل الظاھر۔ فثعبان موسیٰ عبارة من حجة لان ثم ثعبانا علی ما یقتضیہ ظاھر القرآن وتظلیل الغمام امارة ای امر موسیٰ لان ثم غماما اظلھم وانکروا کون عیسیٰ بن غیر اب ۔ والنبوة قوة تنزل من التالی علی قلب النبی وھو تنویر بالعلوم فیعرف بواطن الاشیاء وطبائع الاجسام ۔ والمعاد عود کل شئ الی اصلہ من الطبائع الاربع ولا یثبتون سوی الدنیا وامارد ما فی القرآن من ذکر الماکول والمشروب فی الجنة لا یقرون بہ لانہم احالوا اعادة الاجسام ۔

میرے دوست اور ان مضامین کے دیکھنے والوں کو غالباً اُن اسناد اور شواہد کے ملاحظہ سے جو میں نے نقل کئے ہیں معلوم ہو جائیگا کہ عام خیالات سے جو مخالفت سید صاحب کے عقاید میں معلوم ہوتی ہے ان میں اسلاف بھی شریک ہیں اور یہ اختلاف مستلزم کفر نہیں ہے ۔ فتکفیر السید امر لا ینہض بہ الا فایلہ فان تکفیر اھل القبلة امر خطیر وذلک فی کل احد من العامة فضلا عن ھذا الرجل الکبیر۔ اس لئے میں اپنے دوست اور ان لوگوں کو جو کہ مذہب اور علم کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے وہ صلاح دیتا ہوں جو ابن حجر مکی نے حضرت شیخ محی الدین عربی پر اعتراض کرنے والوں کو دی تھی ۔ کل من اراد السلامة لدینہ ان لا ینظر فی تلک المشکلات ما لم یکن اھلا لھا ۔ جو شخص اپنے دین کی حفاظت چاہے اور ان مسائل مشکل کی جیسے انہوں نے بیان کیا ہے تحقیق کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ انہیں نہ دیکھے ۔ من لم یطلع علی معانیہ یجب علیہ السکوت بقولہ تعالیٰ ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا ۔ اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ مختصر طور پر سید صاحب کی ذات اور اُن کی تصنیفات کی نسبت مجھ سے

پوچھے تو میں وہ جواب دینا پسند کرتا ہوں جو شیخ شرف الدین المناوی اور علامہ سیوطی نے ابن عربی کی ذات اور اُن کی تصنیفات کی نسبت ایک پوچھنے والے کو دیا تھا۔ وهو اعتقاد ولایته وتحریم النظر فی کتبه۔ کہ اسے ولی سمجھو اور اس کی کتابوں کے دیکھنے کو حرام جانو۔ لان بعض مسائلها مفهوم النص والمعنی وموافق الامر الالهی والشرع النبوی وبعض خفی عن ادراک اهل الظاهر دون اهل الحکمة والعرفان۔ فقط

پہلا خط۔ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علیخاں کا

بنام

سیّد احمد خاں

حیدر آباد دکن ۹۔ اگست ۱۸۹۲ء

جناب عالی

دوسری بات لکھنے کی یہ ہے کہ آج کل میں آپ کی تفسیر دیکھ رہا ہوں جسے درحقیقت اب تک اچھی طرح بلکہ سرسری طور پر بھی نہ دیکھا تھا اور اس کے نہ دیکھنے کا سبب آپ سے کہہ بھی دیا تھا۔ غالباً آپ اس بات کے سننے سے تو خوش نہ ہوں گے کہ میں اب تک آپ کی رایوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ اور ہر بحث میں اُسے قرآن کی وہ تفسیر جس کو کوئی قرآن کے مطالب کی تشریح اور تفصیل و تفسیر سمجھے نہیں سمجھتا بلکہ اکثر جگہ تفسیر کو تفسیر القول بما لا یرضی به قائلہ تصور کرتا ہوں مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ جس مضمون کو آپ نے لکھا ہے ایسی عمدگی اور خوبی اور صفائی سے بیان کیا ہے کہ اگر آدمی نہایت ہی راسخ الاعتقاد نہ ہو۔ تو ضرور اس کی تصدیق کرنے لگے۔ اور بلاشبہ ایک جادو کیے ہوئے آدمی کی طرح آمنا و صدقنا پکارنے لگے۔ واقعی خدا نے دل کے حالات کو الفاظ میں ادا کرنے اور تحریر میں لانے کی عجیب حیرت انگیز قوت اور طاقت آپ کو دی ہے کہ اگر اُسے جادو کہیں یا سحر تو بے محل نہ ہو۔ مگر افسوس ہے کہ آپ نے ان مسائل کو جو کل یورپ کے تعلیم یافتہ لوگ جو مذہب کے پورے پابند اور معتقد نہیں ہیں صحیح اور یقینی اور غیر قابل الاعتراض سمجھتے ہیں مان لیا اور قرآن کی آیتوں کو جن میں ان کا ذکر ہے ایسا ماول کرنا یا کہ وہ تاویل ایسے درجہ پر پہنچ گئی کہ اُس پر تاویل کا لفظ بھی صادق نہیں ہو سکتا آپ

نے مسلمان مفسروں کو تو خوب کم بیانیں اور بُرا بھلا کہا اور یہودیوں کا مقلد بتایا۔ مگر آپ نے خود اس مادہ کے لامذہبوں کی باتوں پر ایسا یقین کر لیا کہ ان کو مسائل محققہ صحیحہ یقینیہ قرار دے کر تمام آیتوں کو قرآن کے ماؤل کر دیا۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ اُسے تاویل بھی نہیں کہتے (تاویل کو تو آپ کفر سمجھتے ہیں) بلکہ صحیح تفسیر اور اصلی تفسیر قرآن کی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ نہ سیاق کلام نہ الفاظ قرآنی نہ محاورات عرب سے اس کی تائید ہوتی ہے اگر آپ میرے اس شبہ کو کسی طرح دُور کر سکیں تو مجھے ایسی خوشی ہو کہ ایسی او رچیز سے نہ ہو۔ اس لئے کہ اکثر مقامات اُس کے ایسے عمدہ او پاکیزہ اور اعلےٰ درجہ کے ہیں کہ بعد قرآن و حدیث کے اگر کوئی اُسے ورد زبان کرے اور دل پر نقش تو دنیا میں عالم اور سچا مسلمان ہو اور عاقبت میں اُن ثوابوں کا مستحق جو سچے مسلمانوں کے لئے خدا نے مقرر کئے ہیں ؞

دُوسرا خط

حیدر آباد دکن ۱۹ ستمبر ۱۸۹۲ء

جناب عالی

آپ کا خط ۲۷ اگست کا لکھا ہوا پہنچا۔ مجھے اُس کا ذرا بھی خیال نہ تھا کہ ان دو فقروں پر جو یونہی سرسری طور پر میرے قلم سے آپ کی تفسیر کی نسبت نکل گئے تھے آپ اتنی توجہ فرماوینگے اور اُس کے متعلق ایسا بڑا خط لکھیں گے مگر میں نہایت خوش ہوں کہ آپ نے اس پر ایسی توجہ فرمائی اور مجھے اپنے شبہات کا زیادہ تفصیل سے عرض کرنے کا موقع دیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ نہایت ٹھنڈے دل سے میری اس تحریر کو ملاحظہ فرماوینگے اور محققانہ جواب سے میرے دل کے سارے شکوک دُور کر دینگے۔ آپ یقین کیجئے کہ میں اگرچہ آپکے نزدیک آبائی تقلید کی دلدل میں پھنسا ہوں۔ مگر اُس سے نکلنے پر آمادہ ہوں۔ بشرطیکہ آپ مجھے ثابت کر دیں کہ میں درحقیقت کسی ایسی دلدل میں پھنسا ہوں اور یہ کہ اُس سے نکلنے کے بعد کسی ایسے گہرے تاریک اور آگ سے بھرے ہوئے غار میں گرنے کا اندیشہ نہیں ہے جس کی نسبت میرے حق میں دلدل میں پھنسا رہنا زیادہ مفید ہو ؞

حضرت آپنے اٹھارہ برس کے بعد میرے دل پر تازیانہ لگایا ہے اور میرے بھولے زخم کو پھر ہرا کیا ہے اگر اُسکے درد سے میں چلاؤں اور نالہ و شیون کروں تو مجھے معذور سمجھئے اور میرے شور و فغاں کو سُنکر میرے درد کی دوا فرمائیے ایسا نہ ہو کہ آپ اور چوٹ لگا دیں اور مجھے چلانے اور غل مچانے پر زیادہ مجبور کریں ؞

جناب والا۔ آپ نے میرے اُس خیال کی نسبت جو آپ کی تفسیر کی نسبت ہے، دو سبب قرار دیئے ہیں۔ ایک آبائی خیالات کی پابندی۔ دوسرے علما کے اقوال اور تفاسیر پر یقین۔ پہلے امر کی نسبت میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدا نے اپنی مہربانی سے مجھے مسلمان کے گھر میں پیدا کیا۔ بچپن سے میرے کان میں اسلام کی باتیں ڈالیں۔ لڑکپن سے میں اسلامی باتیں سنتا رہا اور بلاشبہ ان کا بہت بڑا اثر میرے دل پر ہوا۔ مگر میں یہ بات نہیں مان سکتا کہ جو کچھ میں نے سنا اور جو کچھ سنی ہوئی باتوں کا اثر میرے دل پر ہوا وہ عموماً ایسا قوی تھا کہ اس کو میں دل سے مٹا نہیں سکا۔ میں اپنی زندگی کے پچھلے دنوں پر جب ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں تو ایک بہت بڑا سلسلہ ایسے خیالات اور اعتقادات کا پاتا ہوں جن میں نہایت تغیر و تبدل ہوا ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی دیکھتا ہوں جن کو میں اول صحیح سمجھتا تھا مگر اب غلط جانتا ہوں اور بہت سے خیالات ایسے ہیں جن کو ایک زمانہ میں بُرا جانتا تھا مگر اب اچھا سمجھتا ہوں۔ پھر میں یہ تغیر خیالات کا صرف جزئیات میں نہیں پاتا بلکہ اصول اور کلیات میں بھی۔ پس اگر آپ کے ارشاد کے موافق آبائی تقلید کی جڑ میرے دل میں ایسی مضبوط ہوتی کہ کسی طرح وہ اکھڑ نہ سکتی۔ تو میں اپنے دل سے ایسے خیالات کو جو لڑکپن سے میرے دل میں جمے ہوئے تھے کیونکر اکھاڑ کر پھینک دیتا اور بہت سی ایسی باتوں کو جو سنتے سنتے کالنقش فی الحجر ہوگئی تھیں حرف غلط کی طرح صفحۂ دل سے کس طرح مٹا سکتا۔ اس لئے جہاں تک میں اپنے دل کو دیکھتا ہوں اُسے حق کے قبول پر آمادہ اور آبائی خیالات اور رسم و رواج اور قوم اور برادری کی پابندی سے آزاد پاتا ہوں۔ اس پر میری رائے جبکہ آپ کی تفسیر کے بعض مضامین سے ایسی مخالف ہے کہ اُس کی نسبت القول بما لا یرضی بہ قائلہ کہہ بیٹھا تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوگا۔ بظاہر حالات تو مقتضی اس کے تھے کہ میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتا۔ اور آپ کے ہر خیال کو اچھا سمجھتا۔ اس لئے کہ علاوہ اس یقین کے کہ جو مجھے آپ کے اسلام اور عالی دماغی اور بلند خیالی اور پاک باطنی پر ہے میرے دل کو آپ سے وہ نسبت ہے جو لوہے کو مقناطیس سے جس طرح کہ اُس کے اختیار سے خارج ہے کہ مقناطیس کی طرف نہ جھکے اور اپنے آپ کو اُس کی کوشش سے بچا سکے اسی طرح میرے امکان میں نہیں ہے کہ آپ کی بات نہ مانوں اور آپ کے خیالات کا ہم صفیر نہ بنوں مگر باوجود اس کے جب میں آپ کی تفسیر کے بعض مضامین کا مخالف ہوا اور مخالف بھی ایسا کہ اُس مخالفت کو نہ آپ کی وہ عظمت و رفعت جو میرے دل میں ہے روک سکی نہ وہ محبت و ارادت جو مجھے آپ سے ہے اُس کی مانع ہوئی نہ آپ کی جادو بھری تقریر نے اثر کیا۔ نہ آپ کی پر زور تقریر نے تو میرے پیارے سید! خدا کے لئے انصاف کرو۔ کہ اس کا سبب بچپن کی سُنی سنائی باتوں کا اثر ہوگا۔ یا اُس قوت ایمانیہ کا جس کے مقابلے میں سارے خیالات محبت اور عظمت اور ارادت کے

دب گئے اور یہ کمزور دل کا کام ہے یا اُس زبردست دل کا جس نے حق بات پر کسی اور چیز کو غالب ہونے نہ دیا۔

دوسرا سبب میری مخالفت کا آپ اُس اعتقاد کو قرار دیتے ہیں جو مجھے علما کے اقوال اور تفاسیر کے رطب یابس روایات پر ہے اور جو آپ کے نزدیک پہلے سبب کا قوی اور مضبوط کرنے والا ہے۔ آپ کی اس تحریر نے مجھے نہایت متعجب کیا۔ اس لئے کہ آپ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ میرے خیالات اس بارہ میں کیا ہیں اور علما اور ان کی کتابوں کی نسبت میں کیا رائے رکھتا ہوں آپ خوب جانتے ہیں کہ میرے نزدیک نہ کوئی کتاب خدا کی کتاب کے سوا غلطی سے پاک ہے گو وہ کیسی ہی اصح الکتب کیوں نہ سمجھی گئی ہو اور نہ کوئی شخص سوائے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطا اور غلطی سے محفوظ ہے گو وہ صحابی اور امام ہی کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ اسلام اس پر فخر کر سکتا ہے کہ اُس میں بڑے بڑے مفسر اور محدث اور مجتہد اور عالم اور فقیہ اور حکیم ہوئے اور بہت مفید اور قابل قدر کتابیں لکھی گئیں اور ہمارے بزرگوں نے بہت بڑا ذخیرہ علم کا ہمارے لئے چھوڑا اور ہم ان کے علم اور اجتہاد اور رائے اور تالیفات سے بڑی مدد پاتے ہیں مگر کوئی بھی اُن میں معصوم نہ تھا نہ کسی پر جبرئیل امین وحی لائے تھے نہ کسی کی شان میں خدا نے وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی فرمایا تھا اس پر بھی اگر کوئی کسی کو ہر طرح سے ہر بات میں اور ہر حالت میں حق تقلید سمجھے اور باوجود ظاہر ہو جانے غلطی کے خواہ وہ عقل و فطرت کی وجہ سے ہو یا کسی اور سبب سے اسی کی کہی ہوئی یا لکھی ہوئی بات کو سچ سمجھتا اور یقین کرتا رہے تو وہ میرے نزدیک مشرک فی صفة النبوة ہے اور عقل سے خارج اور راہ راست سے کوسوں دور۔ کیا خوب فرمایا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے من جہل الحق وقعا علی واحد من النظار فهو الی الکفر والتناقض اقرب پس جبکہ عالموں اور کتابوں کی نسبت میری یہ رائے ہو اور جیسے آپ خوب جانتے ہوں تو آپ میرے اس تعجب بعد تاسف کا اندازہ کر سکتے ہیں جو آپ کی اس تحریر سے مجھے ہوا ہوگا خیر آپ کو اختیار ہے جو سبب چاہیں آپ اُس کا قرار دیں خواہ بچپن کے خیالات کو خواہ علما کے اقوال پر یقین کرنے کو۔ مگر میرے نزدیک تو اُس کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ کی تفسیر بعض مقام پر تفسیر الکلام بما لا یرضی بہ قایلہ ہے۔

جناب من مجھے تو آپ نے اپنی تفسیر کے اعلیٰ مقامات کے نہ سمجھنے پر یہ الزام لگایا۔ کہ بچپن کی سُنی سنائی ہوئی باتیں دل میں ایسی جم گئی ہیں۔ کہ انہوں نے غور و فکر کی قوت کو بیکار کر دیا ہے مگر یہ تو فرمایئے کہ اس زمانہ کے فلاسفر اور سائنس (علم) کے جاننے والے جو تمام درجے نیچر (فطرت) کے طے کر کے نئی روشنی دنیا میں پھیلا رہے ہیں اگر حضرت کی نسبت کہیں کہ گویا آپ نے تقلید چھوڑی کتابوں کو ردی سمجھا عالموں اور مفسروں کی تضحیک کی اور اپنے نزدیک تحقیق کے بڑے بڑے درجے

پر قدم رکھا اور قرآن کو نیچر اور قوانین نیچر کے مطابق کرنے میں بڑی زحمت اٹھائی مگر باوجود اس عالی دماغی اور روشن ضمیری اور محققانہ خیالات اور حکیمانہ دماغ کے بچپن کی سنی سنائی باتوں کے اثر سے آپ اپنے آپ کو بچا نہ سکے[1] اور اب تک خدا کے مقرر رسول کے قائل اور اصول دین کے معتقد بنے رہے قصور معاف۔ آپ کو اس کے جواب دینے میں اتنی آسانی نہ ہوگی جتنی کہ مجھے آپ کے ارشاد کے جواب میں ہے اس لئے کہ میں ایک حد پر پہنچکر عقل کو معزول اور فطرت سے اپنے آپ کو بے خبر کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لوں گا۔ اور علی بدین العجایز کا اقرار کرنے لگونگا مگر آپ کو بڑی مشکل پیش آویگی کہ آپ ایک اصل کو بھی اصول دین سے اور ایک اعتقاد کو بھی منجملہ معتقدات مذہب کے ماڈرن سائنس وعلوم جدیدہ اور زمانہ حال کے فلسفہ کی رو سے لاآف نیچر کے مطابق ثابت نہ کر سکینگے[2] یہ میرا کہنا درحقیقت معارضہ بالمثل نہیں ہے اور نہ آپ کی جناب میں گستاخانہ خیال۔ میں اپنی ارادت اور عقیدت اور آپ کی شان کو اس سے بہت ارفع واعلیٰ سمجھتا ہوں کہ کوئی بے ادبانہ اور گستاخانہ بات زبان پر لاؤں مگر عقیدت یا عظمت واقعات کو بدل نہیں سکتی جو کچھ میں نے کہا ہے یہ ایک واقعہ ہے اور اس زمانہ کے فلاسفر اور حکیم اور نئی سائنس کے عالم مذہبی خیالات رکھنے والوں کی نسبت یہی کہتے ہیں چنانچہ ایک بہت بڑا یوروپین عالم اپنی ایک مشہور کتاب میں میں جہاں کہ اس نے خدا کی قدرت اور ارادہ اور علم اور تصرف فی العالم اور خالق خیر و شر ہونے سے انکار کیا ہے اور اسے صرف ایک ایسی علۃ العلل قرار دیا ہے جسے کسی قسم کا اختیار یا تصرف عالم میں نہیں ہے کہتا ہے کہ یہ عقیدہ پرانے خیالات سے زیادہ تر صاف اور عاقلانہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اسکے ماننے کیلئے زیادہ قوت دل کی ضرورت ہے اور جن لوگوں کو ہر معمولی واقعہ میں خدا کی خاص قدرت اور ارادہ اور پیش بینی اور ہر روزمرہ کی چیز میں اس کی نگرانی اور علم کے آثار پانے کی عادت ہوگئی ہے ان کو یہ عقیدہ سرد اور غیر تسکین بخش معلوم ہوگا لیکن امیدیں اور خیالات واقعات کے مقابلہ میں بے طاقت ہیں۔ ایک اور صاحب فرماتے ہیں کہ "جسے لوگ خدا اور خالق کہتے ہیں وہ خود انسان کا مخلوق ہے" یعنی اپنے دل سے اُسے پیدا کر لیا ہے اور اپنے صفات کا جامع قرار دیا ہے" یہ صاحب دنیا کے ناقص اور غیر مکمل اور بے ترتیب ہونے پر اُس کے بنانے والے کو براہ تمسخر و طنز نو آموز قرار دیکر خدا کے ماننے والوں کو احمق اور بے وقوف کہتے اور کتب سماوی کے غلط اور جھوٹ ہونے پر انہیں کی شہادت لاتے ہیں۔

[1] کچھ عجب نہیں کہ اس مقام پر جو کچھ کہا ہے سچ ہو مگر میں نے اپنی دانست میں خدا اور رسول کو اور اسلام کی حقیقت کو بعد تحقیق اور بعد یقین مانا ہے ہاں ہم اگر اس میں کوئی شائبہ بچپن کی سنی ہوئی باتوں اور تعلیم پائی ہوئی کے اثر کا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ سید احمد

[2] یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ مجھے دعوے ہے اور یقین ہے کہ میں عہدہ برآ ہو سکونگا۔ ولا فخر و کاف لتسلین قلبی ولا حاجتی الی ان اقول علی بدین العجائز۔ سید احمد

چنانچہ انجیل سی پاک کتاب کی نسبت آپ فرماتے ہیں کہ میری رائے میں کسی دانشمند آدمی کو اس بات کے یقین دلانے کو کہ انجیل انسان کی بناوٹ بلکہ وحشیانہ ایجاد ہے صرف اسی قدر ضرورت ہے کہ وہ انجیل کو پڑھے ''پھر آپ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ ''تم انجیل کو اس طور سے پڑھو جیسے کہ تم اور کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اُس کی نسبت ایسے خیالات کرو جیسے کہ اور کتابوں کی نسبت کرتے ہو اپنی آنکھوں سے تعظیم کی پٹی نکال ڈالو۔ اور اپنے دل سے خوف کے بھوت کو بھگا دو اور دماغ اوہام سے خالی کرو تب انجیل مقدس کو پڑھو۔ تو تم کو تعجب ہوگا کہ تم نے ایک لحظہ کے لئے بھی کیونکر اس جہالت اور ظلم کے مصنف کو عقلمند اور نیک اور پاک خیال کیا تھا[۵۱]'' یہ خیالات کچھ ایک دو مصنفوں کے نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر سائنس کے جاننے والے مذہب کے ماننے والوں اور خدا کے متصف بصفات وجودیہ سلبیہ سمجھنے والوں پر نہایت تعجب اور تاسف کرتے ہیں پس جبتک کہ آدمی علم کی معراج کے اس درجہ پر نہ پہنچ جاوے وہ ایسے لوگوں کے نزدیک ضرور آبائی خیالات کا پابند سمجھا جاویگا اور جب تک خدا اور رسول اور معاد اور اصول دین کو مانتا ہے گو وہ کتنے ہی زینے علم و نیچر کے طے کر چکا ہو مجھ ہی سا ضعیف القلب اور کمزور ٹھہریگا۔ اگر فرق ہوگا تو کمی بیشی کا۔ مجھے ایسے لوگ زیادہ بودے دل کا سمجھیں گے اس لئے کہ میں خدا کو قاضی الحاجات سمجھتا ہوں دعا کو ایک سبب حصول مقصد کا اور اجابت دعا کے معنی مطلب کا حاصل ہونا جانتا ہوں جبرئیل کو ایک فرشتہ وحی لانے والا اور نبوت کو ایک عہدہ خدا کا دیا ہوا خیال کرتا ہوں۔ آپ کو ان باتوں کے انکار سے بہ نسبت میرے زیادہ قوی اور زیادہ ہمت والا سمجھیں گے مگر پورا مرد اور بچپن کی سُنی سنائی باتوں کی قید سے کامل آزاد نہ کہینگے۔ اس لئے کہ آپ بھی خدا کے معتقد رسول کے قائل قرآن مجید کے مقر ہیں اور عذاب و ثواب حشر و نشر وغیرہ اصول دین کو مانتے ہیں گو بعض کی حقیقت میں عام مسلمین سے کچھ اختلاف رکھتے ہوں ؎

بہرحال جو دو سبب آپ نے میری مخالفت کے اپنی تفسیر سے قرار دئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو کبھی میں نہیں مانتا (الحمد اللہ۔ ۱۲ سید احمد) اب رہا یہ امر کہ میرے پاس خدا کی بھیجی ہوئی وحی آئی تھی جس سے مجھے ثابت ہوا کہ مرضی قائل یعنی خدا کی وہ نہیں ہے جو آپ سمجھتے ہیں اسکی نسبت بادب تمام عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر تو وحی آنے کی ضرورت جب ہوتی کہ میں کوئی ایسی بات بیان کرتا جو انسانوں کی معمولی سمجھ سے خارج ہوتی یا وہ معنی قرآن کے بیان کرتا جسے نہ صاحب الوحی سمجھے تھے نہ صحابہ نہ ائمہ نہ عام مسلمین[۵۲]۔ ہاں آپ نے بعض مقامات پر قرآن کے وہ معنی بتائے ہیں

---

۵۱ آپ یقین کریں کہ جب ہم انکے مقابل کچھ لکھینگے تو انکے ان اقوال کا غلط ہونا نیچر کی رو سے اور عقلی دلائل سے ثابت کرینگے ۔ سید احمد

۵۲ ابھی یہ معنی ثابت نہیں اور بغیر اسکے ثابت کرنے کے کیونکر اُس کو دلیل گردانا ہے ۔ سید احمد

جو نہ لفظوں سے نکلتے ہیں نہ محاورہ عرب کے مطابق ہیں نہ سیاق کلام کے موافق بلکہ جو اسلام کا منشا اور قرآن کا مقصود اور پیغمبر کی ہدایت کی غرض ہے ان سب کے خلاف۔ پس ایسی صریح اور صاف بات کے لئے مجھ پر وحی آنے کی ضرورت نہ تھی اور خدا کی عام مرضی معلوم ہونے کے بعد جو معنی اس کے خلاف لئے گئے اس پر لا یرضیٰ بہ قائلہ کہنا نہ تھا۔ اب ہاں اس کا ثبوت وہ میں آئندہ آپ کی تفسیر کے بعض اقوال نقل کر کے بخوبی دونگا[ف]

مگر بایں ہمہ آپ یہ خیال نہ فرماویں کہ میں اس ضرورت سے بیخبر ہوں جس نے آپ کو تفسیر لکھنے پر مجبور کیا۔ یا مذہب اور علم کی اس لڑائی سے ناواقف ہوں جو نہایت زور شور سے اس زمانہ میں ہو رہی ہے۔ یا میں علم کے حملہ کو خفیف سمجھتا ہوں جو وہ نئے ڈھنگ سے اور نو ایجاد ہتھیاروں سے مذہب پر کر رہا ہے یا میں اپنے ہاں کی موجودہ کتابوں کو اس وقت کی ضرورت کیلئے کافی سمجھتا ہوں یا نئے خیالات اور نئے افکار کا مخالف ہوں۔ غالباً بہت کم آدمی ایسے ہونگے جو مجھ سے بڑھ کر اس بات کے خواہشمند ہوں کہ مذہب علم کے حملہ سے بچایا جاوے اور کم ایسے لوگ ہونگے جو آپ کی اس مردانہ ہمت کی داد دیتے ہوں آپ اس لڑائی میں اسلام کا سفید علم لیکر علم کے سامنے آئے اور ایسے غالب اور قوی حریف سے مصالحت کی کوشش کی۔ مجھ سے بڑھکر کوئی نہیں جانتا کہ تفسیر کے لکھنے سے آپ کا مقصود کیا ہے۔ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اسلام اپنی سلطنت پر قائم رہے اور علم اس کا دوست سمجھا جاوے اور آپ کی تفسیر میں اس بات کی بہت سی نشانیاں بھی پائی جاتی ہیں اور وہ غور سے دیکھنے والے کو نہایت اعلےٰ مضامین اور حکیمانہ خیالات اور محققانہ باتوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ لاریب فیہ انہ کنز مدفون من جواھر الفواید و لجۃ مشحون بنفایس الفواید مگر میں یہ نہیں مانتا کہ آپ ہر جگہ اس مقصود کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے بلکہ برخلاف اس کے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بعض جگہ تسامح کے درجہ سے گزر کر مغالطہ میں پڑ گئے اور جس حد پر پہنچکر آپ کو ٹھہرنا چاہئے تھا اس سے گزر گئے آپ نے ان باتوں کو جو اس زمانہ کے علم و سائنس نے پیدا کی ہیں بغیر کسی شک و شبہ کے صحیح اور یقینی مان لیا۔ اور جو باتیں قرآن میں بظاہر اس کی مخالف معلوم ہوئیں اس میں ایسی تاویلیں کرنی شروع کیں کہ قرآن کا مقصود ہی فوت ہو گیا اور اس پر ستم ظریفی آپ کی یہ ہے کہ آپ تاویل کو کفر قرار دیتے ہیں اور اپنی تفسیر کو قرآن کے الفاظ اور سیاق اور محاورے اور مقصود و محاورے کے مطابق بتاتے ہیں لیکن اس سے بھی آپ کا اصل مقصود کوسوں دُور رہا۔ اس لئے کہ نیچر اور لا آف نیچر اگر وہی ہے جو اس زمانہ کے یورپین حکیم بتاتے ہیں تو خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت اور عذاب

ف جب دو گے اور جب ثابت کر دو گے تب دلیل میں لانا اس وقت اس پر استدلال بے موقع ہے ۔ سید احمد

وتو اسکا اقرار بھی آبائی تقلید اور بچپن کی سُنی سُنائی باتوں کا اثر سمجھا جائیگا اور قرآن باوجود انکار معجزات اور خرق عادات اور دعا اور اجابت دعا اور فرشتوں اور جنات کے نیچر اور لا آف نیچر کے مخالف ہی رہیگا پس میرے نزدیک آپ مصیبتوں سے ایک میں سے بھی نہ نکل سکے کہیں قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی کی اور کہیں نیچر اور لا آف نیچر کے ثابت کرنے میں بعض جگہ تو آپ قرآن کا وہ مطلب سمجھے جو نہ خدا سمجھا نہ جبرئیل نہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نہ صحابہ نہ اہلبیت نہ عام مسلمان اور کہیں نیچر کے دائرہ سے نکل گئے اور مذہبی آدمیوں کی طرح پرانے خیالات اور پرانی دلیلوں اور پرانی باتوں کا گیت گانے لگے چنانچہ آپ کی تفسیر میں دونوں باتوں کا جلوہ نظر آتا ہے جہاں آپنے دعا اور اجابت دعا کے مشہور معنوں سے انکار کیا معجزات اور خرق عادات کو ناممکن سمجھ کر حضرت عیسٰے کے بے باپ پیدا ہونے اور ان کی طفلی کے زمانہ کے اقوال اور احیائے اموات وغیرہ باتوں کو اہل کتاب کی کہانیاں بتلا دیا وہاں آپ نے دکھا دیا کہ آپ کی تفسیر قرآن کے الفاظ اور سیاق عبارت اور اس کے عام منشا سے کچھ مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتی اور جہاں آپ نے خدا کی خدائی اور پیغمبر کی پیغمبری اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور ثواب عذاب وغیرہ کا اقرار کیا گو اس کی حقیقت میں علمائے ظاہری کی رایوں سے اختلاف کیا ہو وہاں آپنے ثابت کر دیا کہ نیچر اور لا آف نیچر کا کچھ بھی اثر آپ پر نہیں ہوا وہی سب پرانے خیالات آپ کے دل میں سمائے ہوئے ہیں جن پر نیچر کے جاننے والے اور لا آف نیچر کے ماننے والے ہنستے ہیں۔ کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ اعتقادات لا آف نیچر (قوانین فطرت) کے مطابق ہیں (ہاں ۱۲ سید احمد) یا ماڈرن سائنس (علوم جدیدہ) سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے (ہاں ہو سکتی ہے ۱۲ سید احمد) اور اعتقادات کا تو کیا ذکر ہے۔ آپ صرف خدا کی خدائی فلسفہ جدید سے ثابت کر دیجئے (بے شک ۱۲ سید احمد) اور اس کے خالق اور قادر حکیم اور علیم ہونے کا ثبوت حکمائے زمانہ کے اقوال سے پیش کیجئے (اس کی مجھے حاجت نہیں ۱۲ سید احمد) میرے نزدیک اکثر فلسفی تو ایسے باہمت اور بہادر اور دل کے قوی ہیں کہ وہ خدا کے وجود کے اعتقاد سے بڑھکر کسی بات کو بیہودہ نہیں سمجھتے اور نعوذ باللہ خدا کو خود انسان کے وہم و خیال کا پیدا کیا ہوا کہتے ہیں۔ ہاں بعض اس کے وجود کے قائل ہیں یا یوں کہئے کہ منکر نہیں ہیں۔ مگر وہ بھی کس خدا کے قائل ہیں اُس خدا کے نہیں جو ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور محمدؐ کا خدا ہے بلکہ اُس خدا کے جو ڈارون اور ہیکل کا خدا ہے جس کا نام ان کی زبان میں فرسٹ کاز اور عربی میں علۃ العلل ہے وایں خدا بجوے نمی ارزد و بکار نمی آید۔ اُن کے خدا نے نہ کسی چیز کو اپنے ارادے اور مرضی سے پیدا کیا اور نہ کر سکتا ہے نہ کسی چیز میں تصرف کیا نہ کر سکتا ہے نہ وہ کسی قسم کا اختیار رکھتا ہے نہ کسی چیز کو جانتا ہے۔ نہ کسی بات کو سُنتا ہے نہ قاضی الحاجات ہے نہ سمیع الدعوات۔ نہ فاعل مختار ہے نہ قادر علے الاطلاق۔ ہاں اس سے

انکار نہیں کہ وہ ایک ہستی ہو جس سے کوئی غیر معلوم مادہ بلا اُس کے اختیار اور بغیر اس کی مرضی کے اور بغیر تقدم زمانہ کے ظاہر یا پیدا ہو گیا۔ اور اس سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا اور تیسرے سے چوتھا۔ وھلم جرا۔ مواد پیدا ہوتے ہوتے مادی کائنات کا ظہور ہوا اور ایک ناکامل حالت سے آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے لاکھوں کروڑوں برسوں کے تغیرات اور تنازعات کے بعد یہ دنیا بنی اور جو کچھ اب ہم دیکھتے ہیں اس کا اس طور پر ظہور تدریجی عمل ہی کی بدولت لکن لیس فیہما ما یدل علی الاختیار بل علی عدم الاضطرار۔ پس اگر یہ مسئلہ نیچر کا مان لیا جاوے اور یہ لا آف نیچر تسلیم کر لئے جاویں۔ تو فرمائیے کہ وہ خدا جو خالق اور صانع قادر اور مرید سمیع علیم مصور اور حکیم اور کیا کیا مانا جاتا ہے کہاں باقی رہتا ہے اور جب تک کوئی ڈارون کا ہم خیال اور ہیکل کا ہم صفیر نہ بن جاوے کیونکر وہ دل کا مضبوط اور دانشمند کہا جا سکتا ہے[۱]۔ ہاں ان کا ہم خیال اور ہم صفیر ہونا۔ اس کی کسی اور کو خواہش ہو تو ہو مگر مجھے تو نہ اس کی خواہش ہے اور نہ طاقت (شاباش۔ شاباش اے سید احمد) میرا بودا دل اور ضعیف دماغ تو ایسے اولڈ (پرانے) خدا کے چھوڑنے اور ساری صفات سے اُسے خالی کر کے صرف فرسٹ کاز (علۃ العلل) ماننے سے بہت گھبراتا اور لرزتا ہے (شاباش۔ شاباش اے سید احمد) میں تو اپنی نادانی اور بزدلی کو اپنے حق میں ایسے حکیموں کی دانائی اور جوانمردی سے بہت زیادہ مفید سمجھتا ہوں۔ لان البلاھۃ ادنی الی الخلاص من فطانۃ بتراء والعمی اقرب الی السلامۃ من بصیرۃ حولاء۔

اب میں اس خط کو تمام کرتا ہوں اس لئے کہ جو دلچسپ مضمون آپ نے چھیڑا ہے وہ ایک یا دو خط میں نہیں آ سکتا۔ ضرور ہے کہ ایک سلسلہ ایسی تحریرات کا آپ کی اور آپ کی بدولت اور شائقین کی خدمت میں پیش کیا جاوے میں اگلے خط میں نیچر اور لا آف نیچر اور ورک آف گاڈ یعنی خدا کے کام اور ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کے کلام سے جو آپ کی تفسیر کے اصول میں سے ایک اصول ہے بحث کروں گا اور اس بات کو دکھاؤں گا کہ اس زمانہ کی سائنس کی رو سے جن کو آپ ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کہتے ہیں بلکہ خود گاڈ خیالی ڈھکوسلے اور اولڈ فیشن والوں کے سڑیل خیالات ہیں کہاں کا گاڈ اور کہاں کا ورک آف گاڈ اور کیسا ورڈ آف گاڈ علم کی روشنی نے ان تاریک خیالات سے دنیا کو پاک کرنا شروع کر دیا ہے اور جن کے دل نئے خیالات کی تیز شعاعوں سے روشن ہو گئے ہیں وہ ان لغویات کو کچھ نہیں سمجھتے انکے نزدیک ان پرانی باتوں اور ان جہالت و وحشت کے یادگار خیالات کی جگہ اب باقی نہیں رہی الا ان لوگوں میں جو آبائی تقلید کے پھندوں میں

[۱] ہم ان کی ان سب باتوں کی غلطی نیچر سے ثابت کرنے کو موجود ہیں اور نیچر ہی سے اُس خدا کو ثابت کرتے ہیں جو ابراہیمؑ اور محمدؐ کا خدا ہے۔ سید احمد

اور بچپن کی سُنی سُنائی باتوں کے دام میں گرفتار ہیں ورنہ ماڈرن سائنیس نے فتویٰ دیدیا ہے کہ خدا وجود معطل ہے رزاقی اور الوہیت بیہودہ خیالات ہیں۔ دعا اور عبادت وحشیوں اور جاہلوں کے ڈر اور خوف کا نتیجہ ہے۔ نبوت دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ وحی افسانہ ہے۔ الہام خواب ہے۔ روح فانی ہے قیامت ڈھکوسلہ ہے عذاب ثواب انسانی اوہام ہیں دوزخ و جنت الفاظ بے معنی ہیں انسان صرف ایک ترقی یافتہ بندر ہے۔ مابعد الموت نہ سزا ہے نہ جزا۔ وہ مرنے کے بعد سب جھگڑوں قصوں سے پاک ہے پس اے میرے بزرگ سرسید اور اے میرے پیارے مرشد یہ ہیں خیالات اُن لوگوں کے جو کہ حقیقت میں دل کے "دی اور عقل کے کامل اور حکمت کے موجد اور علوم کے دریا کے شناور ہیں۔ الذین یستحبون الحیوٰة الدنیا علی الاخرة ویصدون عن سبیل الله ویبغونها عوجا اولئك فی ضلال بعید[1]۔

تیسرا خط

مدّتے ایں مثنوی تاخیر شد
مہلتے بایست تا خوں شیر شد

علیگڈھ ۹۔ فروری ۱۸۹۵ء

جناب عالی

مجھ سے جو تاخیر آپ کی تفسیر کے متعلق اپنے شبہات ظاہر کرنے میں ہوئی، اس پر جس قدر مجھے افسوس تھا اتنی ہی اس بات کی امید تھی، کہ آپ کی خدمت میں زیادہ حاضر ہوتے اور آپ کی زبان مبارک سے الہامی مضامین سُننے سے میرے شکوک دُور ہوجاوینگے۔ مگر باوجودیکہ مجھے ہفتوں بلکہ مہینوں آپ کی حضوری نصیب ہوئی، آپ کی زبان الہام ترجمان سے میں نے بہت کچھ سُنا اور آپ نے اکثر نہایت عالی اور بلند مقامات دکھائے مگر افسوس ہے، کہ میرے دل کا ایک شک بھی دُور نہ ہوا، بلکہ بچپن سے جو خیالات میرے دل میں بیٹھے ہوئے تھے، اور جن بندوں نے

---

[1] لاکن یا حبیبی انت تنظر الامور بعین واحدة لا بعینین فانت تنظر الاسلام بعین وتلساة اقوال الملحدین بعین ولا تنظر بجانب الاخر فلو نظرت کلیهما بعینین تکشف لك حقیقة الاسلام ظاهرة وباطنه وتظهر لك الاغلاط والصواب فی اقوال الملحدین الذین ذکرت اقوالهم باعظم الشان وافضل البرهان ولاخترت صراطا مستقیما اللهم اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین آمین ۔ (سید احمد)

آپ مجھے چھڑانا چاہتے تھے وہ اور مضبوط ہو گئے اور اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا، کہ فلسفیانہ خیالات اور حکیمانہ رایوں نے آپکے خیالات اس قدر بلند کر دیئے ہیں، کہ ہم کم سمجھ آدمیوں کی سمجھ وہاں تک پہنچ نہیں سکتی، اور نیچر کے طوفان خیز اور ناپیدا کنار دریا میں آپنے اپنے جہاز کو اس مردانگی اور بے باکی سے ڈالدیا ہے کہ ہمارے خیالات کی کمزور کشتیاں وہاں تک پہنچتے پہنچتے پاش پاش ہو جاتی ہیں اس لئے میں اپنے شبہات تحریراً عرض کرنا چاہتا ہوں، شاید آپکے الہامی قلم سے کچھ ایسے دلائل نکلیں کہ مجھے اُس سے فائدہ پہنچے یا دوسرے لوگ اس سے مستفید ہوسکیں +

آپنے اپنے عنایت نامہ مورخہ ۸ اکتوبر [illegible]ء میں تحریر فرمایا تھا، کہ تفسیر پر بحث کرنے سے اول ان اصول کا تصفیہ کر لینا چاہیئے، جو تفسیر لکھتے وقت آپ کے پیش نظر تھے اور ان اصول کو آپ نے تحریر فی اصول التفسیر میں بیان بھی کر دیا ہے، مگر میں اُن اصول پر بحث کرنے سے معافی چاہتا ہوں، اور اجمالاً بھی اُن کی نسبت اپنی موافقت یا مخالفت ظاہر نہیں کر سکتا اس لئے کہ جو اصول آپ نے بیان فرمائے ہیں اور جس طرح اُن کو تحریر کیا ہے، اُسکے ہر لفظ میں ہزار معنی پوشیدہ ہیں، اور ہر اصول پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور اگر یہ شروع ہو۔ تو نفس مطلب رہ جاویگا اور تفسیر کے متعلق جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں اُس کی نوبت نہ آویگی +

میں مثالاً عرض کرتا ہوں، کہ آپ اصل اول میں لکھتے ہیں۔ کہ "ایک خدا خالق کائنات موجود ہے" بلاشبہ یہ اصل بالکل صحیح ہے، اور کون مسلمان ہے کہ اس میں شبہ کریگا۔ مگر اسی کے ساتھ آپ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں، کہ "وھو علۃ العلل لجمیع المخلوقات علی ماکانت وعلی ماتکون" اور گو اس کا علۃ العلل ہونا بھی ایک طور پر مسلم ہے، یعنی اگر وہ فاعل[۵۱] اور مرید بھی مانا جائے، مگر علۃ کا فاعل اور مرید ہونا ضروری نہیں[۵۲] ہے، بلکہ ہر علۃ کا اپنے معلول کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ اور خالق کا اپنی مخلوق کے ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ علۃ و معلول کا تعلق[۵۳] اضطراری ہے اور فاعل و مفعول یعنی خالق و مخلوق کا تعلق اختیاری۔ فالفاعل عندنا عبارۃ عن من یصدر منہ الفعل مع الارادۃ علی سبیل الاختیار و مع العلم بالمراد و عند کما ان العالم من اللہ تعالیٰ کالمعلول من العلۃ یلزم لہٗ و مًاصدرًا، لا یتصور من اللہ تعالیٰ دفعہ لزوم الظل من الشخص و النور من الشمس۔ و لیس ھذا من الفعل شیًا، و بل الفعل

---

۵۱ بے شک خدا فاعل و مرید ہے اور یہ دونوں اس کی صفتیں ہیں اور تمام صفات اس کی عین ذات ہیں لیس وہ اپنی ذات سے فاعل و مرید ہے (سید احمد)

۵۲ یہ امر غیر ذوی العقول علت پر صادق آسکتا ہے نہ ذوی العقول علۃ پر اور خدا سے زیادہ صاحب عقل کون ہے (سید احمد)

۵۳ خدا کا تعلق اپنی معلول کیساتھ اضطراری نہیں بلکہ ایجابی ہے۔ (سید احمد)

لم یسم نا علاً صانعاً مجرد کونہ سببا بل بکونہ سببا علی وجہ مخصوص ۔ وھو وقوع الفعل منہ علی وجہ الارادۃ والاختیار[1] پس اگر اس اصول سے میں بحث شروع کروں، تو علۃ العلل کے مسئلہ کی بحث چھڑ جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں، کہ یہ کیسی باریک و مشکل و دقیق بحث ہے ۔ اور جب تک کہ اُس سے تفصیلی بحث نہ ہو میں کس طرح آپ کے اس اصول کے ساتھ اتفاق یا اختلاف کا لفظ زبان پر لا سکوں ۔ اسی طرح پانچویں اصول میں آپ فرماتے ہیں، کہ قرآن مجید بالکل سچ ہے" کون مسلمان ایسا ہے کہ اُسے اس میں شبہ ہوگا، مگر اسی میں آپ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "کسی قول کا نقل کرنا صرف بغرض بیان یا بغرض تردید یا لوگوں کے اعتقادات کو جو منافی مقصد قرآن کے نہیں ہیں ۔ بلا بحث ان کی صحیت اور واقعیت کے تسلیم کرکے ان پر استدلال کرنا یا بطرز حجت الزامی کے پیش کرنا یا امور ظاہر الوقوع کو ان کی ظاہری حالت پر بلا اُن کی اصلیت پر بحث کے بیان کرنا یا کلام غیر مقصود بالذات کا اثنائے کلام میں آنا قرآن مجید کی صداقت کے منافی نہیں ہے" اس میں آپ نے ایسے مختصر مگر پُر معنی الفاظ تحریر فرماتے ہیں، کہ اگر میں اُسے تسلیم کرلوں، تو آپ کی تفسیر کے بہت بڑے حصہ کا قبول کرنا لازم آتا ہے، اور اس میں وہ حصے بھی شامل ہو جاتے ہیں جس میں مجھے آپ سے اختلاف ہے، اور اگر اس سے بحث کروں تو اُس کے لئے ایک علیحدہ رسالہ کی ضرورت ہے اسی طرح آپ آٹھویں اصول میں بیان فرماتے ہیں کہ "تمام صفات باری کی نامحدود اور مطلق عن القیود ہیں یفعل مایشاء و یحکم مایرید" کوئی وجہ اس سے اختلاف کی نہیں ہے، مگر اُسے اس طور پر آپ نے تحریر کیا ہے ۔ کہ اگر میں اُسے اجمالاً تسلیم کرلوں، تو مجھے بھی آپ کی طرح خدا کو نیچر کا اور نہ نیچر کا بلکہ خیالی اور فرضی نیچر کا پابند ہونا ماننا پڑتا ہے ۔ اور میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا ایک وجود معطل ہے اور اس کی طرف قدرت و اختیار و مشیت و ارادہ کی نسبت بے معنی[2] ہے ۔ اور سوائے اس کے جن آیتوں سے آپ نے اس اصل میں نیچر کا ثبوت کیا ہے، اُسی سے میرے خیال کے موافق آپ کے دعوے کا بطلان ہوتا ہے، مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ "ایک جگہ ابراہیم کے قصہ میں فرمایا ہے فما کان جواب قومہ الا ان قالوا اقتلوہ او حرقوہ فانجاہ اللہ من النار (آیت ۲۳ عنکبوت ۲۹) فانجاہ اللہ من النار سے ثابت ہوتا ہے کہ احراق خاصہ نار کا ہے ایک اور جگہ تمثیل میں فرمایا ہے

---

[1] ھذا قول من تصور ارادۃ اللہ واختیارہ کارادتنا واختیارنا ولیس کذالک لا وصفاتہ عن ذاتہ لا یحدث فیہ ولا ینفک منہ ۔ بخلاف ارادتنا واختیارنا لانھما یحدث فینا بوقت من الاوقات بسبب من اسباب ۔ اللہ تعالی بری عن یحدث فیہ شیا ما کان قبلہ ھو قدیم ازلی بذاتہ مع جمیع صفاتہ کما لہ (سید احمد)

[2] ان خدا کی طرف انسانوں کیسی قدرت اور اختیار اور مشیت اور ارادہ کی نسبت کرنی بے معنی ہے (سید احمد)

فاصابہا اعصار فیہ نار فاحترقت (آیت ۲۶۸ البقرہ ۲) پس ان دونوں آیتوں سے خدا نے ہم کو قانون فطرت یہ بتایا کہ آگ جلا دینے والی ہے پس جب تک یہ قانون فطرت قائم ہے۔ اُس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے اور اس سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ احراق خاصہ نار کا ہے اور یہ بالکل سچ ہے۔ مگر اُس سے آپ کا مقصود اس بات کا ثابت کرنا ہے کہ اس خاصیت کو خدا کسی طرح اور کسی حالت میں اور کسی کے لئے اور کسی وقت میں بھی جدا نہیں کر سکتا ہے تاکہ اُس سے آپ کا یہ خیال صحیح سمجھا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے ہی نہیں گئے اور اگر آگ میں ڈالے جاتے تو آگ اپنے نیچر کے موافق ضرور اُن کو جلا دیتی۔ مگر اس آیت میں خدا کے الفاظ فانجاہ اللہ من النار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو جلانا آگ کا خاصہ تھا مگر خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو اُس سے بچا لیا۔ ورنہ فانجاہ اللہ من النار کے کچھ معنی نہیں رہتے اور ان الفاظ کے مہمل اور پوچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا۔ یا ایک دوسری آیت اپنے دعوے کے ثبوت میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک جگہ موسےؑ کے قصہ میں فرمایا ہے کہ واذ فرقنا بکم البحر فانجینا کم واغرقنا ال فرعون وانتم تنظرون (آیت ۴۷ البقرہ ۲) ایک جگہ فرمایا ہے وقوم نوح لما کذبوا الرسل اغرقناھم وجعلناھم للناس آیۃ (آیت ۳۹ فرقان ۲۵) ان آیتوں میں اور ان کی مثل کی بہت سی آیتوں میں خدا نے یہ قانون فطرت بتایا کہ پانی میں بوجھل چیز ڈوب جاتی ہے پس جب تک یہ قانون قدرت قایم ہے پانی سے یہ فطرت معدوم نہیں ہو سکتی۔ اس کا معدوم ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے"۔ جناب عالی آپ نے اغرقنا ال فرعون سے تو نیچر کا ثبوت نکالا، مگر واذ فرقنا بکم البحر فانجینا کم کا خیال نہ رکھا اگر اغرقنا ال فرعون میں یہ قول آپ کے خدا نے اپنے نیچر کا یہ قانون بتایا ہے کہ پانی میں بوجھل چیز ڈوب جاتی ہے، تو اُسی کے ساتھ میرے نزدیک اُس نے واذ فرقنا بکم البحر فانجینا کم میں اپنے اختیار اور قدرت کا بھی یہ قانون بتا دیا ہے کہ جسکو ہم چاہتے ہیں اُسے ہم ڈوبنے سے بچا دیتے ہیں پھر حیرت اور تعجب تو مجھے اس پر ہے کہ آپ اسی اصل کے بیان آخر حصہ میں فرماتے ہیں کہ "جو کچھ کہ ہم نے قرآن مجید کی آیتوں سے قانون فطرت بتایا ہے اس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قانون فطرت عام نہیں ہے بلکہ اُس میں مستثنیات بھی ہیں لیکن اس کے ذمہ ان مستثنیات کا قرآن مجید سے ثابت کرنا لازم ہوگا۔ مگر ہمارا یہ دعوے ہے کہ قرآن مجید سے اس قانون فطرت میں مستثنیٰ ہونا ثابت نہیں ہوتا جس کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔ جو قانون قدرت کہ انسان نے تجربہ سے قائم کیا ہے اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ جبکہ تمام

قانون فطرت ابھی تک نامعلوم ہیں تو ممکن ہے کہ کوئی قانون فطرت ایسا ہو جس سے مستثنیات ثابت ہوتے ہوں مگر یہ کہنا کافی نہیں ہے اس لئے کہ امکان عقلی تو کوئی شے وجودی نہیں ہے صرف ایک خیال غیر محقق الوقوع ہے وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔ علاوہ اسکے امکان کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو کبھی ہو اور کبھی نہ ہو۔ لیکن جس چیز کا کبھی وقوع ثابت نہ ہوا ہو تو اس پر امکان کا اطلاق غلط اور محض سفسطہ ہے، غرضکہ جو شخص قانون فطرت میں مستثنیات کا مدعی ہو اس کو ان مستثنیات کے کبھی واقع ہونے کو ثابت کرنا بھی لازم ہے۔ اگر آپ کی اس تحریر کے مطابق میں فرض کر لوں کہ قانون فطرت عام ہے، اور یہ بھی فرض کر لوں کہ قانون قدرت وہی ہے جو انسان نے اپنے تجربہ سے قایم کیا ہے، تو میں اس کا یہ جواب دونگا کہ اس عام قانون میں مستثنیات کا ہونا خود قرآن سے ثابت ہے جیسا کہ میں نے نظیراً اوپر بیان کیا اور آئندہ بیان کرونگا لیکن گو کہ یہ میں مانتا ہوں کہ قانون فطرت تبدیل نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ میں نہیں مانتا کہ جس کو قانون قدرت کہا جاتا ہے اور جس کی بنا استقراء اور تجربہ اور جزئیات کی تحقیقات پر ہے اُسے انسان نے ایسا دریافت کر لیا ہے کہ جو چیز بظاہر اس کے خلاف معلوم ہو اُسے خلاف قانون قدرت کہہ کر اُس کا انکار کر دیا جائے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اُس کا ثبوت عمدہ شہادت سے ہوتا ہو۔ انسان کی عقل محدود ہے، اور وہ قدرت الٰہی کی کنہ نہیں جان سکتا، اور نہ اُس کا جزوی تجربہ خدا کے کلام کو باطل کر سکتا ہے۔ کائنات کی حدود میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جو خدا کی قدرت کی حد ہو، اور جہاں پر قادر مطلق کی قدرت کی بڑھنے والی موج سے کوئی ملاح یہ کہہ سکے کہ یہ تیری حد ہے تو اس سے آگے مت بڑھ ورنہ تو روکی جائے گی۔ یہ خود دریا کے اختیار میں ہے، کہ جہاں تک چاہے اپنی لہریں بڑھاتا ہے۔ خدا کا قادر مطلق ماننا ہی اس بات کے لئے کافی ہے، کہ نہ اُس کی قدرت محدود ہے، نہ اُس کی قدرت کو کوئی جان سکتا اور نہ سمجھ سکتا اور نہ محدود کر سکتا ہے۔ خدا کے ارادہ اور فعل کے بیچ میں ایک ایسا عمیق خندق ہے، کہ انسان کی عقل و ادراک کا اُس پر سے گذرنا ناممکن ہے۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ قدرت کے قوانین ناقابل تبدیل ہیں، اور اس کا ناقابل تبدیل ہونا خود خدا کے فرمانے سے ہمیں معلوم ہوا، کیونکہ اُس نے قرآن میں متعدد جگہ فرمایا ہے، لا تبدیل لکلمات اللہ ولا تجد لسنت اللہ تحویلا وغیرہ وغیرہ، مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ انسان نے ان قوانین کو پورے طور پر ضبط کر لیا ہے، اور جو کچھ اُس کے خلاف واقع ہو گو اُس کا ثبوت قرآن ہی سے ہوتا ہو اُس کا انکار کیا جائے، اور اُسے قانون قدرت کی تبدیلی کہا جائے یہ خیال درحقیقت خدا سے اُس کے شاہی حقوق چھینتا، اور اُسے کائنات کے تخت سے اُتار دینا ہے جو خدا ہی

حکومت سے اس عالم میں خارج نہیں ہوگیا، نہ وہ اپنے کامل اقتدار اور حقوق الوہیت سے دست بردار ہوا ہے پس ہم صرف اسی بنیاد پر کہ خدا قادر مطلق ہے، اور اپنی قدرت دوسرے کو دیکر عرش پر آرام سے بیٹھ نہیں رہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جو فعل اُس کا کلام سے ثابت ہو وہ قانون قدرت کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ اسی قانون کے کسی ضمن یا دفعہ میں داخل[۱] ہے +

اس سے زیادہ لکھنا اس موقع پر غیر ضروری ہے کیونکہ ہر امل آپ کے اصول مقررہ کی تفصیل بحث کی محتاج ہے اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے اصول کی بصول بعیبوں میں مجھے دکھا دیجئے اور تفسیر کی بحث کرنے کی اجازت دیجئے اور خاتمہ پر اس بات کی اور اجازت چاہتا ہوں کہ مجھے بھی اپنے اصول مختصراً بیان کرنے دیجئے جو آپ کی تفسیر سے بحث کرنے کے متعلق میں نے اختیار کئے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ نہیں ہیں بلکہ کلمہ طیبہ کی طرح صرف دو جملے ہیں۔ ایک یہ کہ مجھے تحقیق منظور ہے نہ مناظرہ، خصوصاً وہ مکروہ اور قابل نفرت مباحثہ کا طریقہ جو ہمارے متکلمین نے مذہبی بحثوں میں اختیار کیا ہے، جو درحقیقت سخن پروری اور اظہار قابلیت ہے۔ دوسرے یہ کہ میں قرآن کو معیار صدق قرار دیتا ہوں، نہ کسی اور علم اور نہ کسی قانون قدرت کو۔ اس لئے کہ قرآن یقینی ہے اور وہ یقین کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی بات صریح اور صاف صاف قرآن مجید سے ایسی ثابت ہو جس کے دوسرے معنی کسی طرح قرآن کے مقصود، عرب کی زبان، اور انکے محاورے کے مطابق نہ ہوں تو وہ واجب القبول ہے اور جو بات اُسکے خلاف ہو گو اُس کا نام سائینس ہو یا نیچر یا لا آف نیچر اُسے میں قرآن پر مقدم نہ کرونگا اور نہ اُس کے سبب سے قرآن کی ایسی تاویل جائز سمجھونگا جو بمنزلہ تحریف کے ہو۔ آئندہ خط میں میں دعا کے متعلق جو آپ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے اس سے بحث کرونگا[۲] +

---

[۱] اگر تمہارا یہ یقین ہے کہ جو واقعات ہوتے ہیں وہ قانون قدرت کی کسی ضمن یا دفعہ میں داخل ہیں گو ہم نہ جانتے ہوں تو ہمارے اور تمہارے اعتقاد میں کچھ بھی فرق نہیں ہے

من تو شدم تو من شدی تو من شدی من تو شدم
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری (سید احمد)

[۲] بسم اللہ شروع کیجئے مگر بھائی ایک بات ہماری بھی مان لو کہ قرآن مجید کے ایسے الفاظ جن کے متعدد معنی ہوں ان میں سے کسی ایک معنی کو اختیار کرنے کی دلیل نقلی یا عقلی ضرور بتا دینا اور نقلی دلیل سے ہماری مراد تفسیر القرآن بالقرآن سے ہے + والسلام

(سید احمد)

چوتھا خط

بمبئی یکم اگست ۱۸۹۵ء

جنابِ عالی۔ آپ نے جو کچھ دعا کی نسبت اپنی تفسیر اور رسالہ الدعا والاستجابہ میں تحریر فرمایا ہے اُسے میں نے غور سے دیکھا، اور جو کچھ بالمشافہ آپ نے کہا اُسے بھی دل سے سُنا مگر افسوس ہے کہ میرے دل کو کچھ تسلی نہ ہوئی، اور نہ وہ اختلاف جو مجھے آپ سے اس مسئلہ میں تھا رفع ہوا۔

چونکہ یہ مسئلہ دعا کا منجملہ دیگر مذہبی مسائل کے نہایت اہم اور ضروری ہے، بلکہ بہت سے ضروری عقاید کے مباحث پر مشتمل ذات وصفات باری اور فطرت اور قوانین فطرت کے شامل ہے، اور ہر زمانہ میں نہایت پیچیدہ اور مشکل خیال کیا گیا ہے اس لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ اُس کے تمام مالہ وما علیہ سے پوری بحث کی جائے، اور نہ صرف مذہبی رُخ سے بلکہ علمی نظر سے بھی دیکھا جائے لان ہذہ المسئلۃ من جملۃ المسائل الغامضۃ الشریفۃ التی اختلف فیہ الاراء وتشعب فیہ المذاہب والاہواء وتحیرت فیہ الافہام واضطربت فیہ ادراک الانام۔

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ دعا مذہبی زندگی کی جان ہے، اور اہل مذہب کے نزدیک مذہب کے علمی زندگی کا فیصلہ بہت کچھ اس پر منحصر ہے اور دعا سے امر مسئول عنہ کا حاصل ہونا اور انبیاء کرام علیہم السلام کا خاص خاص مطالب کے لئے دعا مانگنا اور اُس کا قبول ہونا کتب سماوی سے ایسا ثابت ہے کہ نہ اُس سے انکار ہوسکتا ہے اور نہ اُس کی کوئی تاویل کی جاسکتی ہے مگر باوجود اس کے وہ لوگ بھی جنہوں نے اس مسئلہ کو صرف مذہبی نظر سے دیکھا اور دعا کو سبب حصول مقصد قرار دیا ہے، ہزاروں دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی کافی اور اطمینان بخش وجوہ بیان کرنے سے عاجز رہے ہیں۔ اور علمی نگاہ سے دیکھنے والوں نے تو دعا کو یا خیالی فلسفہ کی پیچیدگی میں ڈال کر غیر قابل الفہم بنا دیا ہے یا آپ کی طرح دعا کو صرف عبادت اور اجابت کو محض تسکین قلب خیال کیا ہے۔ اور اس زمانہ میں قوانین فطرت کے غیر تبدیل پذیر اصول کے ماننے والوں نے اس مسئلہ کی وقت اور پیچیدگی کو جیسا کچھ بڑھا دیا ہے وہ تو خدا کی قدرت اور مشیت کے انکار اور دہریت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ غرضکہ دعا اور اجابت دعا کا مسئلہ نہ صرف اس وجہ سے دلچسپ ہے کہ وہ ایک معمولی مسئلہ منجملہ مذہبی مسائل کے ہے۔ یا علمی مضامین میں سے ایک مضمون خیالی اور غور کے

قابل ہے بلکہ اس لئے قابل بحث اور لائق غور ہے کہ وہ ان امور پر حاوی اور مشتمل ہے جو ایک مسلمان بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے جو خدا کو مانتے ہیں بمنزلہ روح اور جان کے ہیں۔ اگر دعا اس متبرک اور مقدس مقام سے ہٹا دی جائے جس پر وہ مذہبی زندگی کے آغاز سے قابض رہی ہے تو کون اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ مذہبی خیال اور مذہبی عقاید کی حیثیت میں کیسا عظیم تغیر پیدا ہوگا۔ اور مذہب کا وسیع دائرہ کس قدر تنگ ہو جاویگا۔ ایک سادہ دل مسلمان جو قوانین فطرت سے ناواقف ہے۔ یہ سُن کر کہ دعا سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اُس کا خدا نیچر کی زنجیر میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ وہ اُس سے اپنے ہاتھ پاؤں باہر نہیں نکال سکتا۔ نہایت حسرت اور مایوسی سے پکار اُٹھیگا۔ کہ خدا خدائی سے معزول ہو گیا۔ اور مذہبی زندگی کی جان باقی نہ رہی۔ ایسا خدا ہمارے کس کام کا جو نہ ہماری دعا سُن سکتا۔ نہ بغیر معمولی وسائل کے ہماری کوئی حاجت پوری کر سکتا ہے۔ اس سے دعا کرنا تو ایسا ہے جیسا کہ ایک پتھر کے بے جان بت کے سامنے گڑگڑانا اور اُس سے مانگنا۔ کیونکہ دعا کا مانگنا صرف اس یقین پر مبنی ہے کہ خدا قادر مطلق اور فاعل مختار اور نامعلوم طور پر بے قرار دل کی نکلی ہوئی دعا کا سننے والا اور اس کی حاجت پوری کرنے والا ہے۔ اگر ایک لحظ کے لئے اس یقین میں تذبذب ہو۔ تو کونسا دل ہوگا جو بیقراری کی حالت میں اس کی طرف رجوع کرے اور وہ کونسا خیال ہوگا جو اُس کے اضطرار کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔ اس لئے کہ صرف یہ خیال کہ خدا دعائیں سننے اور حاجت پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے اضطرار کی حالت میں بندہ کا خیال خدا کی طرف رجوع کراتا ہے۔ اور محض اس اعتقاد سے کہ باوجود قدرت کے خدا کا دعا قبول نہ کرنا کسی مصلحت پر مبنی ہوگا۔ اور وہ امر مسئول عنہ سے بہتر کوئی چیز دیگا دعا کرنے والے کے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ اگر دعا کا عمل موقوف ہو گیا اور خدا سے دعاؤں کے سننے اور حاجتوں کے پورا کرنے کا خدائی حق لے لیا گیا۔ تو مذہبی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اگر یہ مان لیا جاوے کہ دعا ذریعہ حصول مقصد نہیں ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے بندوں کی مصیبتوں کے دُور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اور نہ کسی کی گریہ وازی اور اضطرار و بیقراری کا اثر ہوتا ہے۔ تو دعا بیکار اور خدا پر توکل فضول ہے پھر یقین اور اعتقاد کو بھی اپنے قدم جمانے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی اور بندہ کو بجز اس کے کہ وہ غیر تغیر پذیر قوانین فطرت کو اپنا خدا مانے دوسرا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں انسان کو بے جان قانون سے واسطہ رہتا ہے نہ ایک زندہ خدا سے۔ اور یہ خیال اُس محبت کے رشتہ کو جو خدا اور اس کے بندوں کے بیچ میں ہے توڑ دیتا ہے۔ اگر اس میں مدد کرنے کی طاقت نہیں ہے

توہم کس لئے اس پر بھروسہ کریں۔ اور اگر وہ ہماری دعائیں نہیں سنتا۔ تو ہم کیونکر اُسے رحیم مانیں اور اگر اس میں رحم نہیں تو ہم کیوں اُس سے محبت رکھیں پس درحقیقت اس سے ہمارا یقین جاتا رہتا ہے۔ ہم کو خدا سے محبت باقی نہیں رہتی۔ اور ہم ایسے مذہب کے ماننے والے رہ جاتے ہیں جس میں نہ یقین ہے نہ محبت۔ اس لئے اگر دعا کی اجابت ناممکن ہے تو مذہب بھی ناممکن ہے۔ لان من شرائط الایمان التوکل علی اللہ والتوکل هو الاعتماد علی الغیر عند الحاجة بان ینوب عنک فیها واذا کان المتوکل علیه ثقة یکون قلب المتوکل علیه ساکنا ونفسه مطمئنة۔ والتوکل علی اللہ والاخلاص فی الدعا لایکون عند انقطاع الحیلة والتبری من الحول والقوة۔ والمثال فی ذلک من رکاب البحر وذلک انهم ید عون اللہ ویسئلونه السلامة عند دخولهم السفینة ولکن غیر مخلصین لاتکالهم علی الملاحین فی حفظها حتی اذا توسط البحر وهاجت الامواج واضطربت المراکب وفزع الملاحون واشرفوا علی الهلاک فعند ذلک ید عون اللہ مخلصین له الدین۔ لانهم قد علموا انه لایقدر احد من خلق اللہ علی معاونتهم ولا قوة لاحد علی دفع ما ورد علیهم الا اللہ عز وجل لاتتعلق قلوبهم بسبب من الاسباب فیعلمون عند ذلک فی دعائهم وتضرعهم الی اللہ۔ بالکشف عنهم ما فیه۔ ان لهم الها جبارا عالما قادرا یسمع دعاءهم ویعلم ما هم فیه وهو قادر علی نجاتهم براهم وان کانوا لایرونه ولا یدرون این هو۔ وعلی هذا القیاس کل ما یصیب الناس من الجهد والبلاء۔ فیضطرهم ذلک الی الدعاء والتضرع الی اللہ عز وجل۔ مثل الغلاء والوباء والام الاطفال ومصائب الاخیار وما شاکلها من الامور التی لاسبیل لاحد له دفعها عنه الا اللہ تعالی۔ فیکون ذلک دلالة لهم علی اللہ عز وجل وهدایة الیه۔ کما قال ام من یجیب المضطر اذا دعاه ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض ء اله مع اللہ قلیلا ما تذکرون۔ اس لئے کہ ایمان کی شرائط میں سے ہے اللہ پر توکل رکھنا اور اس پر بھروسہ کرنا۔ اور توکل کے معنی ہیں۔ حاجت کے وقت کسی غیر پر اعتماد کرنا کہ وہ ہماری طرف سے قایم مقائم ہو اور ہمارا کام کر دے اور اعتماد اسی پر ہوتا ہے جو اعتماد کے قابل ہو۔ یعنی کام کرنے کی قدرت رکھنے والا سمجھا جاتا ہو۔ اور قدرت بھی ایسی جو اس کام کے پورا کرنے کے لئے بکار آمد ہو اُس کا کوئی مانع اور مزاحم نہ ہو۔ اور متوکل یعنی بھروسہ کرنے والا بغیر کسی واسطہ کے سیدھا اس تک پہنچ سکتا ہو۔ تاکہ بھروسہ

کرنے والا اور وکیل سمجھنے والا اس شخص کو اپنے کام سپرد کرکے فارغ البال ہو جائے۔ اور ایسے وکیل کے ملنے سے اس کے دل کو ایسا اطمینان اور اس کے نفس کو ایسی تسلی حاصل ہو جس سے عین مصیبت کے وقت اس کا غم جاتا رہے۔ اور اس کے دل میں امید اور خوشی پیدا ہو بلکہ اس مصیبت کے قائم رہنے پر بھی اس خیال سے کہ اس کا وکیل حکیم اور دانا ہے اور اپنے موکل کے مصالح کو اس سے بہتر سمجھتا ہے۔ خوش اور بشاش رہے جب ایسا توکل کسی دعا کرنے والے کو خدا پر ہوگا تب اس کی دعا سچی اور خالصاً للہ ہوگی۔ اور ایسی دعا اسی وقت دل سے نکل سکتی ہے جبکہ سارے حیلے جاتے رہیں اور تمام دیگر قوتوں سے مایوس ہو۔ اور کوئی سبب اسباب ظاہری میں سے نظر نہ آتا ہو چنانچہ یہ حالت رات دن دیکھنے میں آتی ہے اور جس کی مثال خود خداوند تعالےٰ نے اپنے پاک کلام میں اچھی طرح بیان فرمائی ہے اور وہ مثال دریا میں سوار ہونے والوں کی ہے کہ وہ کشتی میں سوار ہونے کے وقت خدا سے دعا کرتے ہیں اور اس سے سلامتی چاہتے ہیں لیکن ان کو خلوص نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کا بھروسہ اس وقت ملاحوں اور کشتی اور بادبانوں پر ہوتا ہے مگر جبکہ کشتی منجدھار میں جا پڑتی ہے اور دریا اپنی ہولناک موجوں سے اسے گھیر لیتا ہے اور طوفان کے طمانچے اس پر پڑنے لگتے ہیں اور خوفناک ہوائیں کشتی کو ڈانواں ڈول کرنے اور رسیوں اور بادبانوں کو توڑنے لگتی ہیں۔ اور ناخدا اور ملاح بے بس ہوکر اپنی مجبوری ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ اور کشتی کے ڈوبنے اور مرنے کا وقت نزدیک آجاتا ہے۔ اور کوئی کشتی کا پار لگانے والا اور ان کا بچانے والا نظر نہیں آتا۔ اس وقت تمام وسایل اور اسباب کا خیال دل سے نکل جاتا ہے۔ اور سچے دل سے اضطرار اور بیقراری کی حالت میں اس کی طرف نظر جاتی ہے جو نہ کسی سبب کا پابند ہے نہ کسی ذریعہ کا محتاج۔ اور جس کے قبضۂ قدرت میں دریا اور اس کی موجیں ہیں اور جس کے کہنے میں سمندر اور اس کا تلاطم ہے وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی مخلوقات میں سے کوئی اس وقت ان کو بچا نہیں سکتا اور نہ بجز اس کے جو اسباب کا پیدا کرنیوالا ہے اس مصیبت کو جو ان پر پڑی ہے دور کرسکتا ہے اس وقت بے اختیار ہر ایک دل سے یہ دعا نکلتی ہے[۵۱] اور ہر کافر و مسلمان مضطر ہوکر یہ کہنے لگتا ہے ؎

اے خدا آں کس کہ از تو مے سزد — کہ زہر سوراخ مارم مے گزد
وقت تنگ آمد مرا و یک نفس — پادشاہی کن مرا فریاد رس
در جگر افتادہ ہستم صد شرر — ورنہ جانم بیں خون جگر

اور یہ حالت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ اس بات کا اعتقاد ہو کہ ان لہما الہا جبارا

۵۱ مگر باوصف اس اضطرار اور دعا کے جو کشتی ڈوبنے والی ہوتی ہے وہ ڈوب ہی جاتی ہے۔ (سید احمد)

عالماً قادراً یسمع دعاءھم ویعلم ما ھم فیہ وھو قادر علی نجاتھم[1] مما ھم وان کانوا لا یرونہ ولا یدرون این ھو" کہ وہ ایک خدا رکھتے ہیں جو کہ سب پر حاکم اور سب پر مسلط ہے اور جو ہر چیز کا جاننے والا اور ہر بات پر قدرت رکھنے والا اور ہر بلا کا ٹالنے والا ہے وہ ان کی دعاؤں کو سنتا ہے اور جس مصیبت میں وہ گرفتار ہیں اُسے جانتا اور اُس سے بچانے کی قوت رکھتا ہے اور ان کو دیکھ رہا ہے گو وہ اُسے نہ دیکھتے ہوں اور نہ یہ جانتے ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ اور یہ یقین فطرت ہر انسان کے دل میں ہے اگر مسلم ہو یا کافر۔ یہاں تک کہ وہ ملحد اور دہریہ بھی جو اطمینان اور چین کی حالت میں خدا کے انکار پر دلیلیں لایا کرتے ہیں مصیبت کے وقت بے قرار ہو کر بے اختیار خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ اگر یہ اعتقاد نہ ہو اور خدا کی قدرت اور اختیار کا درحقیقت ان کو یقین نہ ہو۔ بلکہ بجائے اس کے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ جسے خدا کہتے ہیں ایک قوت ہے۔ ماورا فطرت اور مافوق ادراک جو دنیا کو پیدا کر کے اور اس کے انتظام کے لئے قانون بنا کر خود پس پردہ نہاں ہو گئی۔ اور ایسے بلند مقام پر جا بیٹھی ہے۔ جہاں کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی اور اُس کے قانون نے بندہ کو اُس سے اور اُس کو بندہ سے جدا اور بے تعلق اور مستغنی کر دیا ہے اور نظم کائنات ایک ایسے سلسلہ سے مسلسل اور ایسی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے کہ ہر ایک کڑی اس کی دوسری کڑی کے سہارے پر ہے اور دوسری کو سہارا دے رہی ہے۔ اور وہ کسی طور پر کسی جگہ سے کسی کے توڑنے سے ٹوٹ نہیں سکتی اور کوئی چیز خارج از سلسلہ ظاہر نہیں ہو سکتی یعنی بقول آپ کے "حصول مطلب کے لئے جو اسباب خدا نے مقرر کئے ہیں وہ مطلب تو انہیں اسباب کے جمع ہونے سے ہوتا ہے دعا نہ اس مطلب کے اسباب میں سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی صورت میں اور اضطرار کی اس حالت میں جس کی تصویر خدا نے کھینچی ہے کیونکر کوئی انسان خدا کی طرف رجوع کرے گا اور ایک دست بستہ اور پاشکستہ خدا سے کون اپنی نجات کی اُمید رکھیگا۔ اور ایسے بے اختیار اور معذور خدا سے کیوں دعا مانگے گا۔ اور اُس کی عظمت اور اس کی بے انتہا قدرت کا وہ کونسا خیال اس کے دل میں آویگا جس سے اُس رنج اور مصیبت میں وہ اپنے تمام فطرتی قوے کو اس کی طرف متوجہ اور اپنے دل کو تسکین دیگا۔ کیا وہ فقیر جو آپ کو امیر کریم النفس سمجھتا ہو آپ کی بہت بڑی عظمت بھی اُس کے دل میں ہو۔ آپ کو وہ بڑا صاحب قدرت بھی سمجھتا ہو

[1] اگر عشق و محبت بدانست کہ جمالش مستحق عشق و محبت است عبادت است و اگر خواہش نفسانی است نہ عشق است نہ محبت بلکہ ضلالت است و ندامت (سید احمد)

آپ کی حیرت انگیز اور عالیشان کوٹھی اور کارخانے کو دیکھ کر وہ آپ کو بہت بڑا امیر بھی جانتا ہو مگر اُسے یہ معلوم ہو کہ آپ نے فقیروں کے لئے اپنا دروازہ بند کر دیا ہے اور بھیک مانگنے والوں کو کارخانے میں اینٹیں اُٹھانے اور پتھر ڈھونے پر روٹی پیدا کرنے کا رستہ بتا دیا ہے۔ بھوک کی حالت میں گو اُس کی جان ہی جاتی ہو کیا آپ کے دروازہ پر شیئاً للہ پکارتا ہوا آوے گا۔ اور کیا آپ کی عظمت۔ قدرت۔ امارت۔ اور بزرگی کا خیال اُس کے دل کو آپ کی طرف رجوع کریگا اور بھوک سے بیقرار ہو کر وہ آپ سے بھیک کا ٹکڑا مانگے گا؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

بس یہی حال اُس انسان کا سمجھنا چاہیے جو خدا کو صرف ایک علۃ العلل سمجھتا۔ اور معینہ اسباب اور مقررہ دلائل میں دخل نہ دینے والا جانتا ہو۔ کیونکر کسی مصیبت میں اسباب دخیل کو چھوڑ کر اُس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اور کس طور سے وہ اُسے قاضی الحاجات اور سمیع الدعوات سمجھ کر اُس سے دعا مانگے گا۔ پس درحقیقت دعا کو اسباب حصول مقصد میں سے نہ سمجھنا اور اس سلسلہ مظاہر کو جو کائنات میں ہم ناقص العقل انسانوں کی نظر میں آتا ہے خدا کا وہ اصلی قانون قدرت سمجھ لینا جو ٹوٹ نہیں سکتا، ایک ایسا عقیدہ ہے جس کی تعلیم نہ خدا نے کی ہے نہ رسول نے اور کسی مذہب کا ماننے والا اُسے قبول کر سکتا ہے۔ درحقیقت عملاً وہ اب تک قبول کیا گیا ہے بلکہ درحقیقت یہ ایک خیال ہے جو قولاً کیسا ہی مذہبی کہا جائے۔ اور گو کیسے ہی عمدہ طور سے مذہبی الفاظ میں بیان کیا جائے، مگر عملاً دہریت ہے۔ اور خدا سے بے تعلق اور مستغنی کرنے والا ہے۔ اگر اس سلسلۂ عالم کو جو ہم دیکھتے ہیں ہم وہ قانون قدرت خیال کریں جس کی نسبت کہا گیا ہے لا تبدیل لکلمات اللہ اور مظاہر عالم کے واقعات کو جو ایک دوسرے کے بعد ہوتے ہیں اس زنجیر کی کڑیاں سمجھیں جو خدا نے بنائی ہیں اور اپنی تصویری اور خیالی کو اُس کے راز سربستہ کا کھولنے والا جانیں، اور درحقیقت ان کے غیر متغیر ہونے پر ہم کو دل سے اعتقاد ہو۔ تو کیا فائدہ ہے روح کی اس کوشش سے کہ وہ خدا سے توسل پیدا کرے، اور کیا سبب ہے کہ دعا کا خیال ایک دھوکا نہ سمجھا جائے۔ اگر نظام فطرت ایک ایسی سڑک پر چلنا ہے جس سے بچنے میں ہماری قوت ارادی ضعیف اور عاجز ہے اور نہ صرف ہماری قوت ارادی بلکہ وہ قوت بھی جو مادر فطرت کہی جاتی ہے اس سے بچانے میں مجبور ہے تو کیا فائدہ ہوگا کہ اُس سے بچنے کے لئے ہم کوئی کوشش یا کسی سے کچھ درخواست کریں۔ یا سوائے ظاہری اسباب کے ہم کیوں کسی دوسرے مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہوں۔

پھر یہ نظام فطرت جو بیدردی اور بے پروائی سے ہم کو ایک ایسی رفتار پر چلاتا ہے

جو کبھی بند نہیں ہو سکتی، اور جس میں ہمارا اور اُس نظام کے بنانے والے کا کچھ دخل نہیں ہے، خدا کی محبت کے خیال سے بھی دل کو فارغ کر دیتا ہے! اور خدا کے ساتھ محبت کا دعوے جو اصل ایمان ہے، صرف مغالطہ اور دھوکا رہ جاتا ہے اس لئے کہ یہ دعوے اس نظام فطرت کے ساتھ جو دعا کو اپنی قلمرو سے خارج کرتا ہے، جمع نہیں ہو سکتا۔ اور وہ مذہب جس میں خدا اعلیٰ رحمت کی صفت سے پاک ہو، اور جس میں کوئی ذریعہ خدا سے محبت پیدا ہونے کا نہ ہو مشکل سے مذہب اور دہریت سے جدا سمجھا جائیگا۔

غالباً یہ کہا جائے کہ یہ طفلانہ خیال ہے، اور ایسے رحم و محبت کو خدا سے منسوب کرنا گویا اُسے انسان سے مشابہ سمجھنا ہے لیکن ہم کہیں گے کہ بلاشبہ ہم خدا کے سامنے نادان بچہ بلکہ اس سے بھی زیادہ احمق ہیں۔ اور بلاشبہ وہ صفات جو اُس کی طرف ہم منسوب کرتے ہیں انسانی صفات ہیں! اور اُس سے گو تم ہماری ہنسی اُڑاؤ، مگر درحقیقت یہ اُس تعلیم کی ہنسی ہوگی جو خدا نے ہم کو دی ہے! اور ان خیالات کا ٹھٹھا اڑانا ہوگا جو اُس نے بذریعہ انبیا کے ہمارے دل میں ڈالے ہیں۔ کیونکہ اُس نے خود اسی طرح اپنے آپ کو بتایا ہے، اور اُس نے اپنے صفات کے خط و خال اسی طرح کے کھینچے ہیں۔ اور رحم اور فریادرسی اور اجابت دعا کو انہیں لفظوں سے تعبیر کیا ہے جو انسان باہم استعمال کرتے ہیں۔ اگر اُن صفات سے اسے یاد کرنا جو اُس نے اپنی ذات کے متعلق خود انسانی الفاظ میں کئے ہیں، اور وہ خیالات جو اس نے ہمارے دل میں ڈالے، اور وہ ولولے جو اُس نے ہماری طبیعت میں پیدا کئے، اور وہ بیان شوق اور محبت دلانے کا جو اُس نے ہم سے کیا۔ ان کا خیال اور ان کی نسبت خدا کی طرف تشبیہ بالانسان اور اُس متقدس ذات کی نسبت گستاخی ہے۔ تو ہم نہیں جانتے کہ پھر ہم کن لفظوں سے اُسے یاد کریں اور کن ناموں سے اُسے پکاریں۔ اور کن صفتوں سے اُسے موصوف سمجھیں، اگر ہم ان سب الفاظ سے اس کی ذات و صفات کو منزہ اور مقدس کر لیں تو سوائے اُس کے کہ ایک بے جان اور بے حس قوت کا خیال باقی رہنے کوئی خیال خدا کی ذات و صفات کی نسبت باقی نہیں رہ سکتا۔ پھر باوجود اس کے کہ ہم جانتے اور دل سے مانتے ہیں کہ اس کی صفات کو ہماری صفات سے کچھ مناسبت نہیں ہے، اور بجز نام کے دونوں میں کچھ مشابہت ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ان الفاظ کے وہی معانی ہیں جو ان لفظوں سے نکلتے ہیں مثلاً ہم اُسے بصیر یعنی دیکھنے والا کہتے ہیں تو گو ہم یہ خوب سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری سی آنکھ نہیں رکھتا اور اُس کا دیکھنا ہمارا سا دیکھنا نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اُس کا یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ وہ ہم کو اور ہمارے افعال کو دیکھتا ہے۔ اور یہی حال

باقی صفات کا ہے مثلاً جب اُسے ہم رحیم سمجھتے ہیں، تو گو ہم اسے بخوبی جانتے ہیں کہ وہ کیفیت رحم کی جو انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جس طرح کسی مصیبت زدہ کی فریاد اور دردناک حالت کا اثر انسان پر ہوتا ہے، اس کیفیت اور اس حالت سے اس کی ذات مقدس اور منزہ ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ہم اُسے رحیم مانتے ہیں اور اس کی رحمت اور اسی قسم کی سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ انسان کی رحمت۔ اس لئے کہ ہمارے پاس دوسرا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم ان صفات کو بھی مانیں اور شائبۂ بالا انسان کے لوث سے بھی اُسے پاک رکھیں نہ ہمارے پاس دوسرے ایسے الفاظ ہیں جو ہم اسکی صفات میں استعمال کریں جس سے انسانی صفات اور صفات الٰہی میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہو جائے لان واضع اللغۃ انما وضع ھذہ الاسامی اولا للخلق اسبق الی العقول ولا فہام من الخالق فکان استعمالہا فی حق الخالق بطریق الاستعارۃ والتجوز والنقل" غرضکہ انسانی فطرت کا یہ ایک عام مظہر ہے، کہ وہ خدا کو رحم و کرم کی صفات سے موصوف سمجھے اور دعا کو موثر مانے۔ ورنہ جو تصور خدا نے اپنا ہمارے دل میں قائم کیا ہے غلط، اور وہ جذبات اور خیالات جو ہمارے دل میں پیدا کئے ہیں سب جھوٹے سمجھے جائینگے کیونکہ خدا کی رحمت کا تصور دعا کے نہ سُننے اور ہمیں ایک بیدرد اور بے رحم نیچر کے ہاتھ میں چھوڑ دینے کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ تصور جھوٹا ہے اور خدا کے رحم اور اجابت دعا کا خیال غلط ہے، اور غلطی بھی ایسی جس میں قریباً تمام انسان پڑے ہوئے ہیں۔ تو ہم کو سمجھنا چاہئے کہ انسانی فطرت بھی جھوٹی ہے" وذلک عین الجھل" اب میں اپنی اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ یہ صرف تمہید اس مضمون کی ہے جو متعلق دعا اور استجابت کے میں لکھ رہا ہوں مجھے امید ہے کہ اسے دیکھ کر ابھی آپ اس کی ہنسی نہ اُڑائینگے اور اپنے قلم کے (جو تلوار سے کم نہیں ہے) جوہر دکھانے میں تامل کرینگے۔ اصل مطلب تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے جب میں اپنا سارا مضمون ختم، اور اُس کے تمام مالہ وما علیہ سے بحث کرلوں۔ تب آپ کو جو فرمانا ہو فرمایئے میں یہ مضمون اس لئے نہیں لکھتا کہ آپ سے مخالفت ظاہر کروں اور نہ میری تحریر مجادلانہ رہے۔ بلکہ میرا مقصود صرف یہ ہے کہ آپ کو میرے شبہات دُور کرنے کا موقع ملے، اور جو کمی آپ کے بیان میں رہ گئی ہے۔ وہ پوری ہوجائے میں نے اس عرصہ میں اس خاص مسئلہ پر بہت غور کیا ہے اور اکثر اہل مذہب اور اہل علم اور حکماء جدید اور قدیم کے خیالات سے اپنی سمجھ کے موافق واقفیت پیدا کی ہے۔ اور آپ کی تحریر میں بھی بہت سی محققانہ اور عارفانہ باتیں میں نے پائی ہیں۔ اور بہت سے عالی اور پاک خیالات دعا کی نسبت جو آپ نے ظاہر کئے ہیں انہیں سمجھتا ہوں ان سب کو

میں اپنے اس مضمون کے سلسلہ میں بیان کرونگا۔ اور مخالفت جو دعا اور قانون قدرت میں سمجھی جاتی ہے، اور دیگر اعتراضات جو اہل مذہب اور اہل علم نے دعا کی نسبت کئے، اور جو جوابات اُس کے دئے ہیں۔ اُن سب کو بقدر اپنی ناقص سمجھ کے بیان کرونگا تاکہ آپ انکو ملاحظہ فرماکر میری غلطیوں کی اصلاح اور میرے شبہات کو رفع کرسکیں اور اس نازک زمانہ میں جبکہ مذہب پر علم کے حملے، اور مذہبی عقاید میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ بڑا ادر ضروری اور اہم اور عمدہ مسئلہ جس پر بہت سے ضروری عقاید کا تصفیہ منحصر ہے صاف ہو جائے اور ہمارے بھائی مسلمانوں کو عموماً۔ اور تعلیم یافتوں کو خصوصاً اس سے فائدہ پہنچے۔ وعلی اللّٰہ قصد السبیل وھو حسبی ونعم الوکیل[1]

پانچواں خط

بمبئی ۴ اگست ۱۸۹۵ء

جناب عالی۔ دعا کے متعلق جو عریضہ میں نے آپ کی خدمت میں روانہ کیا ہے۔ وہ صرف ایک تمہیدی مضمون ہے جس میں میں نے اپنے خیالات بالاجمال اس مسئلہ کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں آپ کی خدمت میں عرض کرچکا ہوں اس ضروری اور مشکل مسئلہ کے ہر پہلو کو دیکھنا اور اس کے ہر مالہ وما علیہ سے بحث کرنا ضرور ہے اور جو اعتراضات مذہبی یا علمی طور پر کئے گئے ہیں ان پر بھی نہایت سچائی اور ایمانداری سے نظر کرنی لازم ہے۔ چنانچہ میں اب اُسے شروع کرتا ہوں ؂

سب سے اول ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ خدا اور اس کے رسول ؐ نے دعا کی نسبت کیا فرمایا ہے اور ان کے پاک کلام سے اس کی کیا حقیقت معلوم ہوتی ہے اور اجابت دعا کے کیا معنی نکلتے ہیں اور چونکہ تفسیر پر بحث کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا مقدم ہے کہ قرآن کی سچائی ایک تسلیم شدہ امر ہے اس لئے آپ کے بیان کئے ہوئے معانی کی صحت وغلطی کا خود قرآن مجید سمجھا جائے۔ چنانچہ آپ نے بھی تفسیر پر بحث کرتے وقت اسی امر کی خواہش کی ہے اور بلاشبہ یہی ٹھیک اور درست ہے۔ چنانچہ میں اس خط میں صرف اسی بات کو دیکھنا

---

[1] ہمارے مولانا مہدی شاہ عبدالعزیز وقت نے نہایت ہی عمدہ اور فصیح تقریر لکھی ہے جسکی فصاحت کی کچھ تعریف نہیں ہوسکتی مگر اب تک تو یہ باتیں خطابیات کی قسم سے ہیں جب وہ حقیقت کی تحقیق کرینگے اور ان ہونی کو ہونی اور ہونی کو ان ہونی ثابت کرینگے جب ہم بھی نہایت ادب سے ان کو سلام عرض کرینگے ؂ (سید احمد)

چاہتا ہوں کہ قرآن مجید سے دعا اور اجابت دعا کے معنی کیا معلوم ہوتے ہیں اور آیات قرآنی سے امر مسئول عنہ کا دعا میں داخل ہونا اور دعا کا ایک سبب اسباب حصول مقصد سے ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بلاشبہ وہ ثابت ہوتا ہے مگر آپ فرماتے ہیں کہ نہیں، قرآن مجید سے ایسا ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ آپ اپنے رسالہ دعا و استجابت میں فرماتے ہیں کہ "دعا کے معنی پکارنے کے ہیں اور یہ لفظ دعا کا ندا کا مرادف ہے اور دعا اور ندا میں بلحاظ اُس کے حقیقی معنی کے امر مسئول عنہ داخل نہیں ہوتا بلکہ وہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے اور جب خدا سے کچھ مانگا جائے اور سوال کیا جائے تو اس حالت میں بھی خدا کی طرف متوجہ ہونا لازم آتا ہے۔ اس لئے دعا کا لفظ مسئول عنہ پر بھی بولا جاتا ہے اور لفظ دعا کے معنی "الابتھال الی اللہ بالسوال" کے ہو جاتے ہیں یعنی عاجزی کے ساتھ خدا سے کچھ مانگنے کے۔" اور اسی خیال سے آپ نے فرمایا کہ "دعا کو بمعنی اول لو یا بمعنی ثانی وہ عبادت کہی گئی ہے"۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ دعا اور ندا کے معنی لغوی پکارنے کے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ دعا کو عبادت کہا گیا ہے مگر یہ میں نہیں تسلیم کرتا کہ دعا اور عبادت مرادف ہیں۔ بلکہ دعا اور عبادت میں نسبت عموم و خصوص مطلق کی ہے۔ ہر دعا عبادت ہے۔ مگر ہر عبادت دعا نہیں اور یہ بھی میں قبول نہیں کرتا کہ دعا میں کوئی امر مطلوب نہیں ہوتا بلکہ ہر دعا میں صراحت۔ یا اشارہ۔ ظاہراً یا باطناً نصاً یا ضمناً۔ کوئی مقصود ضرور داخل ہوتا ہے۔ خواہ دینی ہو یا دنیاوی۔ جسمانی ہو یا روحانی۔ معاش سے متعلق ہو یا معاد سے۔ اسی واسطے جسے عرفاً دعا کہتے ہیں، اور مذہب میں جو چیز دعا سے تعبیر کی جاتی ہے اس میں امر مسئول عنہ کا داخل ہونا ضرور ہے، اور قرآن مجید کی آیتوں سے اس کا ایسا ثبوت ہوتا ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ملا صدرالدین شیرازی نے صحیفہ کاملہ میں اس کو بہت اچھی طرح سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عرفاً دعا کے معنی ہیں خدا کی طرف متوجہ ہونا۔ اور

الدعاء عرفاً الرغبة الی اللہ تعالیٰ وطلب الرحمة منه علی وجه الاستکانة والخضوع وقد یطلق علی تحمید وتقدیس لما فیه من التعرض للطلب۔ مثل عطاء عن معنی قول النبی خیر الدعاء دعائی ودعاء الانبیاء من قبلی وهو لا اله الا اللہ وحده لا شریك له له الملك وله الحمد یحیی ویمیت۔

عجز و نیاز کے ساتھ اس سے رحمت کا طلب کرنا۔ کبھی دعا کا اطلاق خدا کی حمد اور تقدیس بیان کرنے پر بھی ہوتا ہے اس لئے کہ اس طرح حمد و ثناء کرنے میں بھی درخواست کرنے کا اشارہ ہوا کرتا ہے۔ ایک شخص نے عطاء (مفسر کی ہیں) سے رسول خدا کے اس قول کے معنی دریافت

وھو حی لا یموت بیدہ الخیر وھو علی کل شیٔ
قدیر۔ ولیس ھذا دعاء انما ھو التقدیس
والتمجید فقال لہ ھذا امیۃ بن الصلت
یقول فی ابن جدعان۔ شعر
اذا اثنی علیک المرء یوما
کفاہ من تعرضہ الثناء
افیعلم ابن جدعان ما یراد منہ بالثناء
علیہ ولا یعلم رب العالمین ما یراد
بالثناء علیہ؟

گئے کہ بہتر دعا وہ ہے جس کو میں کیا کرتا ہوں اور مجھ سے پہلے انبیا کیا کرتے تھے اور وہ ہے "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو حی لا یموت بیدہ الخیر وھو علی کل شیٔ قدیر" اور سائل نے کہا کہ یہ دعا نہیں ہے بلکہ خدا کی بزرگی اور تقدیس ظاہر کرتا ہے۔ تب عطا نے اس کے جواب میں کہا کہ دیکھو امیہ بن الصلت عبداللہ بن جدعان کی تعریف میں کہتا ہے اذا اثنی علیک المرء یعنی جب کوئی شخص کسی روز تیری تعریف کرے تو صرف تعریف ہی کر دینا عرض حاجت کے لئے اُسے کافی ہے۔ جب ابن جدعان کو وہ غرض معلوم ہو جاتی جس کے لئے اس کی تعریف کی گئی ہے تو کیا رب العالمین کو وہ غرض معلوم نہ ہوگی جو اس کی تعریف سے مقصود ہوگی؟

غرضکہ دعا کو ندا کا مرادف سمجھو یا عبادت کا مگر دعا کا اطلاق اسی پر ہوگا جس میں خدا پکارا جاوے، اور اس کے پکارے جانے میں کوئی مقصود ظاہر و مضمر ہوگا۔ اگرچہ روحانی برکتیں اور نزول رحمت اور مغفرت عن الذنوب ہی ہو۔ آیت "اجیب دعوۃ الداع اذا دعان" اور "ادعونی استجب لکم" کے کچھ ہی معنی لو مگر اس سے یہ بات ثابت ہے کہ پکارنا اور سننا۔ مانگنا اور دیا جانا، درخواست کرنا اور اس کا قبول ہونا۔ دعا اور اجابت کی اصلی حیثیت ہے اور یہ وہ نسبتی الفاظ ہیں جن میں ہر لفظ سے یہ مقصد ہے۔ کہ دوسرا حاصل ہو۔ مانگنے کے لئے دیا جانا ضرور ہے۔ گو یہ ضرور نہیں ہے کہ امر مسئول عنہ جسمانی اور دنیاوی ہی ہو، بلکہ صرف مقاصد روحانی اور اغراض دینی ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر ہم امور دنیاوی کو دعا سے خارج بھی کر دیں اور اس باب میں آپ کے ہم خیال ہی ہو جائیں تاہم مقاصد دینی کیونکر دعا سے خارج ہو سکتے ہیں اور ان پر امر مسئول عنہ کا اطلاق کیونکر نہیں ہو سکتا۔ اگر دعا میں کسی خاص مطلب کا اظہار نہ کیا جاتے، اور صرف بطور تمجید اور تقدیس خدا کی ثنا اور صفت ہی پر کفایت کی جاوے۔ جیسے عارفوں اور صدیقوں کی دعائیں ہوا کرتی ہیں تاہم امر مسئول عنہ کا اس میں داخل ہونا ضروری ہے۔

اگر امر مسئول عنہ بالکل دعا سے خارج کر دیا جائے اور اجابت کے معنی صرف تسکینِ قلب قرار دیئے جاویں، تو دعا اور اجابت میں جو مناسبت ہونی چاہیئے وہ باقی نہیں رہتی اجابت کو سوال سے مناسبت ہونی چاہیئے اور حکم کا درخواست کے مناسب ہونا لازم ہے۔ اور اطمینانِ قلب بھی اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ جواب مطابق سوال کے اور اجابت مناسب دعا کے ہو۔ ہم کسی امیر کو ایک عرضی دیتے ہیں، اور ہم کسی بخشش کی اس سے خواہش کرتے ہیں، اور کسی مصیبت کا دور ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کو بخشش مل گئی، اور وہ مشکل جس میں ہم پھنسے تھے اس سے ہم نے نجات پائی، تو ہم اسے اپنے سوال کے مطابق سمجھیں گے، اس سے ہمارے دل میں ایک خوشی پیدا ہوگی، ہم دینے والے کے شکرگزار ہونگے، ہم کو اس سے ایک دلی محبت پیدا ہوگی، ہم اس کے شکرانہ کے گیت گاتے پھرینگے، اور دعا قبول نہ ہونے کی حالت میں بھی اسی خیال سے ہم کو تسکین ہوگی کہ جس سے ہم نے دعا مانگی ہے وہ بلاشبہ دینے والا ہے مگر ہم سے زیادہ وہ ہمارے مصالح کو سمجھتا ہے۔ اگر اس نے دینے میں دیر کی تو وہ بھی کسی ہمارے فائدہ کی وجہ سے ہوگی اور اس سے بہتر وہ ہم کو دیگا؛ اور اس کو بھی مجازاً ہم اپنی دعا کی اجابت سمجھینگے لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ دعا کسی خاص مطلب کے لئے مانگنا فضول ہے تو ہم کسی طرح سے کسی چیز کو نہ مانگینگے، نہ کسی مقصد کی خواہش کریں گے، نہ کوئی عرضی گذرانینگے، نہ کسی قسم کی امید رکھینگے اور ہر صورت میں ہماری نظر صرف اسباب پر ہوگی نہ مسبب الاسباب پر۔ اور ایسی حالت میں دعا جو مذہب میں ایک ضروری چیز ہے۔ بلکہ مذہب کی جان ہے وہ ایک شے بے معنی بھی جائیگی۔ اور اصلی تعلیم مذہب کی کہ نہ صرف اسباب پر نظر رکھی جائے بلکہ مسبب الاسباب پر وہ بالکل غلط اور لغو اور بے معنی ہو جائیگی ٭

دعا درحقیقت سوال ہے جیسا کہ ہم ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں۔ ایک انسان جو دوسرے سے دعا یا درخواست کرتا ہے اس کی حیثیت وہی ہے جو اس دعا کی ہوتی ہے جو انسان خدا سے کرتا ہے اور دعا کا انسان کی جسمانی زندگی سے اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کہ اس کی روحانی زندگی سے۔ ہم پہلے جسمانی عالم میں اس بات کا علم حاصل کرتے ہیں کہ دعا کا کیا کام اور اس کا کیا اثر ہے اور بعدہٗ ہم کو اپنی روحانی زندگی میں اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ ہمارے تعلقات اول جسمانی ہیں بعدہٗ روحانی۔ اول ہم کو جسمانی حالتوں اور خواہشوں سے آگاہی ہوتی ہے اور پیچھے روحانی حاجتوں اور خواہشوں سے ہم اول جسمانی عالم میں اپنی قوتوں کا استعمال کرتے ہیں، اور ان کے طرز عمل سے واقف ہوتے ہیں ان کے نتائج کو دیکھتے ہیں، اُن کے قانون کو معلوم کرتے ہیں، اور جب

ان کا عمل روحانی دائرہ میں منتقل ہوتا ہے تو ہم پاتے ہیں کہ ان کے قوانین میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، اور ان کے نتائج وہ ہی قائم رہتے ہیں۔ صرف تبدیلی یہی ہوتی ہے کہ ہمارے جسمانی اغراض کی جگہ روحانی مقاصد قائم ہو جاتے ہیں۔ خدا سے جو ہمارا تعلق ہے اُسے ہم روحانی کہتے ہیں۔ اور اس تعلق میں ہماری قوتوں کا جو استعمال ہوتا ہے وہ روحانی عمل ہے اس وقت ہمارا تجربہ روحانی ہوتا ہے اور ایسے ہر تجربہ کو جو نام دیا جاتا ہے وہ وہی ہے جو پہلے جسمانی تجربہ کو دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ جسمانی اور روحانی چیزوں کے واسطے ایک ہی قسم کے الفاظ ہیں۔ جس طرح محبت، خوشی، تسکین، رحم، نیکی، اوّل جسمانی ہوتے ہیں اور بعدہٗ روحانی، اوّل ان کو ہم انسانوں میں پاتے ہیں۔ پھر خدا میں، عبادت جو ہم خدا کی کرتے ہیں وہ ہمارا روحانی عمل ہے وہ اس کے اصول اور قواعد وہی ہیں جو اول ہم اپنے جسمانی تعلقات میں سیکھتے اور عمل میں لاتے ہیں۔ ہم اپنے ماں باپ، اپنے بزرگوں، اپنے حاکموں کی تعظیم کرتے ہیں، اور اس تعظیم کو ہم زبان سے اور عجز و نیاز کی مختلف علامتوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ ہم انسان کی خوبیوں اور صفتوں اور نیکیوں کی تعریف کرتے ہیں، ہم ان سے مدد چاہتے ہیں، ہم ان سے فریاد کرتے ہیں، ہم ان سے رحم کے ملتجی ہوتے ہیں۔ ہم ان سے معافی چاہتے ہیں، ہم ان سے اپنے اغراض اور مقاصد عرض کرتے ہیں، اور ہم ان کے سامنے عرضیاں پیش کرتے ہیں۔ غرضکہ تمام باتیں یعنی عبادت تعظیم، حمد و ثنا عجز و ذلت اور خواہش و طلب کے ہم جسمانی عالم میں سیکھتے ہیں، اور یہ سب اول جسمانی تعلقات سے ہوتے ہیں، اور مادی تعلقات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر بعد اُس کے یہی روحانی عالم میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ خدا کی ہم تعظیم کرتے ہیں، اُس کو بڑا مانتے ہیں، اُس سے محبت کرتے ہیں، اُس کی رحمت کے خواستگار ہوتے ہیں، اُس سے اپنے گناہوں کی معافیاں چاہتے ہیں، اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں، زمین پر سر رکھ کر اُس کے روبرو گڑگڑاتے ہیں۔ اپنی ذلت و عاجزی دکھا کر اُس کی خوشامد کرتے ہیں، اُس کے احسانوں کا شکر بجا لاتے ہیں، اس سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں، اس کو مصیبت اور آفت کے وقت پکارتے ہیں۔ یہ سب کام ویسے ہی ہم کرتے ہیں، جیسے ہم انسانوں کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ جو چیزیں اول جسمانی تھیں اور بندوں کے ساتھ کی جاتی تھیں وہ روحانی ہو جاتی ہیں اور خدا کے ساتھ کی جاتی ہیں پس جس طرح ہمارے تمام دنیاوی کاموں میں ہماری اغراض مضمر ہوتی ہیں اسی طرح ہمارے روحانی اعمال میں بھی۔ دعا بھی وہی فعل ہے جس کا برتاؤ ہم بندوں کے ساتھ کرتے ہیں اور جس طرح اور جس امید پر انسانوں سے ہم سوال کرتے ہیں اسی طرح بعد

ہم خدا کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں اگر مانگنے اور دعا کرنے میں جبکہ ہم بندوں سے کرتے ہیں امر مسئول عنہ داخل نہیں ہے تو خدا سے دعا کرنے میں داخل نہ ہوگا۔ ورنہ یہ لفظ دعا کا عالم جسمانی میں بامعنی اور روحانی عالم میں بے معنی ہو جائیگا۔ اور جہاں تک ہم خدا کے کلام سے شہادت پا سکتے ہیں اُس سے ہمارے دعوے کی تائید ہوتی ہے ایک جگہ اور ایک مقام پر نہیں بلکہ بیسیوں جگہ اور بیسیوں مقام پر خدا کے کلام سے دعا میں امر مسئول عنہ کا داخل ہونا پایا جاتا ہے اور ایک نبی نہیں بلکہ بہت سے انبیاء کے تذکرہ میں اُن کا خاص خاص مقاصد کے لیئے خدا سے خاص خاص باتوں کا سوال کرنا اور مخصوص حاجتوں کے مانگنے کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ ہم چند آیتیں اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ اور ہم صرف انہیں آیتوں کی نقل پر کفایت کرتے ہیں جن میں وہ حاجتیں مانگی گئی ہیں جو اس عالم سے تعلق رکھتی ہیں روحانی خواہشوں کے مانگنے اور اُس کے دیئے جانے سے تو سارا قرآن بھرا ہوا ہے ٭

سب سے اول حضرت نوحؑ کی دعا کو دیکھیئے ان کے بیان میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے قال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے خدا سے دعا کی کہ کافروں کو زمین پر باقی نہ رکھے۔ اور اس کی وجہ بھی بیان کی کہ اگر یہ باقی رہینگے تو لوگوں کو گمراہ کرینگے اور ان کی اولاد کافر و فاجر ہی رہیگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا نے اس دعا کو قبول کیا اور کفار کو طوفان لا کر ڈبو دیا کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ ونوحا اذ نادیٰ من قبل فاستجبنا لہ فنجیناہ واھلہ من الکرب العظیم ونصرناہ من القوم الذین کذبوا بایتنا انھم کانوا قوم سوء فاغرقنٰھم اجمعین۔ حضرت نوح کے قصہ میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ ان کی دعا جس طرح کفار کے حق میں قبول کی گئی ویسے ان کے بیٹے کے حق میں نامنظور رہی۔ ونادیٰ نوح ربہ فقال رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین قال یا نوح انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم انی اعظک ان تکون من الجاھلین۔ خدا نے اس دعا کو قبول نہ کیا اور جب حضرت نوحؑ نے کہا کہ میرے اہل میں سے ہے اور تو نے میرے لوگوں کے بچانے کا وعدہ کیا ہے۔ اُس کے جواب میں خدا نے فرمایا کہ نہیں یہ تیری دعا قبول نہ ہوگی اس لئے کہ وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ اچھے کام کرنے والا نہیں ہے اور نامقبولیت دعا کے سبب بتلانے کے علاوہ خدا نے جھڑکی بھی دی اور فرمایا کہ جس چیز کا تجھے علم نہ ہو اُسے نہ مانگا کر اور میں تجھے سمجھاتا

ہوں کہ تو جاہلوں میں سے نہ ہو۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر دعا کا قبول ہونا مطابق وعدہ الٰہی کے ضرور نہیں ہے۔ نہ ہر دعا کے قبول ہونے کا وعدہ خدا نے فرمایا ہے بلکہ دعائیں جو جاہلانہ بے سمجھے بوجھے کی جاتی ہیں وہ وعدہ اجابت الٰہی سے خارج اور اکثر نامقبول دعائیں اسی مد میں داخل ہیں۔

پھر حضرت ابراہیمؑ کی دعا پر نظر کیجئے۔ سورہ بقر کے رکوع پندرہ میں خدا فرماتا ہے واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا اٰمنا وارزق اھلہ من الثمرات من اٰمن منھم باللہ والیوم الاٰخر۔ ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم۔ اس میں صاف صاف امر مسئول عنہ کا بیان ہے اور اس کا قبول ہونا ثابت۔ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ معظمہ کے لئے دعا کی کہ خدایا اس کو بلد مامون بنا۔ اور میری ذریت میں سے ایک ایسا رسول جو کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے پیدا کر۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمائی۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی ذریت میں پیدا کیا۔ اور کتاب اور حکمت کی تعلیم کے لئے ان کو بھیجا۔

حضرت ایوبؑ کے ذکر میں خدا فرماتا ہے کہ ان کو جو تکلیف اور مصیبت تھی۔ اس کے دور ہونے کی انہوں نے دعا مانگی اور خدا نے اُسے قبول کیا یعنی وہ اجابت نہیں جس کے معنی بغیر دور کرنے مصیبت کے صرف ان کے دل کو تسکین دیدی ہو بلکہ اصلی قبولیت اور حقیقی اجابت ان کی دعا کی خدا نے فرمائی۔ یعنی اس تکلیف کو دور کیا جیسا کہ فرمایا ہے:

وایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین فاستجبنا لہ فکشفنا ما بہ من ضر واتیناہ اھلہ ومثلھم معھم رحمۃ من عندنا وذکری للعابدین۔

حضرت یونس علیہ السلام کی دعا سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ جس غم میں وہ پڑ گئے تھے اس سے نجات پانے کی انہوں نے دعا کی اور اُسے خدا نے قبول فرمایا اور ان کے غم کو دور کر دیا۔ کما قال اللہ تعالیٰ وذا النون اذ ذھب مغاضبا فظن ان لن نقدر علیہ فنادی فی الظلمات ان لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین فاستجبنا لہ ونجیناہ من الغم وکذلک ننجی المومنین۔ اور اس آیت سے صرف یہی نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام کا غم خدا نے دور کر دیا۔ بلکہ اس سے ہمارے دعوے کی پوری تائید ہوتی ہے کہ خداوند تعالیٰ مومنین کی دعا بھی جبکہ وہ ایسی حالت میں پھنس جاویں اور وہ خدا سے بیقراری اور اضطرار کی حالت میں دعا کریں قبول کرتا ہے۔ کیا بعد خدا کے

اس فرمانے کے "وکذلک ننجی المومنین"۔ اس باب میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے کہ دعا ذریعہ حصول مقصد نہیں ہے! ورنہ ناامیدی اور مایوسی کی حالت میں خدا دعا قبول نہیں فرماتا۔

حضرت موسےٰ کی دعا سے بھی اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ دعا خاص چیزوں کیلئے مانگی جاتی ہے اور خدا اسے قبول فرماتا ہے۔ جیسا کہ خداوندعالم بیان فرماتا ہے ایک جگہ سورہ طٰہٰ میں "قال رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی واجعل لی وزیرا من اھلی ھرون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کے نسبحک کثیرا ونذکرک کثیرا انک کنت بنا بصیرا ہ قال قد اوتیت سئولک یا موسیٰ"۔

اس میں صاف بیان اس امر کا ہے کہ حضرت موسےٰ نے چند باتوں کی خدا سے درخواست کی، ایک یہ کہ ان کے دل کو خدا قوی کرے، دوسرے ان کی زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ ان کی بات سمجھنے لگیں تیسرے یہ کہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر بنادے اور دعا مانگتے وقت حضرت موسےٰ نے یہ بھی کہا کہ ان خواہشوں کے پورا کرنے سے ہم کو ایسی خوشی ہوگی کہ ہم بہت زیادہ تیری تسبیح کریں گے اور تجھے بہت یاد کیا کریں گے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کا قبول ہونا، اور امر مسئول عنہ کا دیا جانا اصل خوشی اور محبت پیدا ہونے کا سبب ہے اور ان تمام دعاؤں کو خدا نے پورا کیا اور ان کی اجابت کو ان لفظوں میں ادا کیا۔ کہ "قد اوتیت سئولک یا موسیٰ" میرے نزدیک اس سے زیادہ کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ جب خدا کو کوئی عرضی دی جاتی ہے تو خدا تعالےٰ اس کے موافق اور مناسب بشرطیکہ وہ جاہلانہ درخواست نہ ہو حکم تحریر فرماتا ہے۔ سورہ یونس میں حضرت موسیٰ کی ایک اور دعا کی اجابت کا بیان ہے جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں نے مل کر دعا کی تھی اور جس سے فرعون غارت کیا گیا۔ چنانچہ فرماتا ہے "قال موسیٰ ربنا انک اتیت فرعون وملاۂ زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم ہ قال قد اجیبت دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون ہ" اس آیت میں "قد اجیبت دعوتکما"، کے کیا معنی ہیں۔ کیا اس سے امر مسئول عنہ کا دیا جانا، اور دعا کا ایک سبب اسباب حصول مقصد سے ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ کے ذکر میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ دعاؤں کا قبول ہونا لازمی نہیں ہے، بلکہ وہ دعا جو نافہمی اور نادانی سے کی جائیں اور خلاف حکمت اور قواعد مقررہ خدا کے ہوں وہ قبول

نہیں ہوتیں۔ اور ایسا دعا کرنے والا اسرار الٰہی سے ناواقف سمجھا جاتا ہے۔ دیکھو حضرت موسیٰ نے خدا سے درخواست کی "رب ارنی انظر الیک" یعنی خدا تو مجھے اپنے آپ کو دکھا میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا کہ "لن ترانی" کہ تو نہیں دیکھ سکتا۔ وہ جھڑکی کہ خدا نے اُن کو سنائی اس سے متنبہ ہو کر وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے اور عرض کرتے لگے "سبحانک تبت الیک وانا اول المومنین" خدایا میں نے توبہ کی اور اس دعا کے کرنے سے جو مجھے نہ کرنی چاہیے تھی میں نادم ہوا ۔۔

حضرت زکریا کی دعا تو آپ نے اپنے مفید سمجھ کر اس دعوے کے ثبوت میں بیان فرمائی ہے کہ لفظ دعا اور ندا میں بلحاظ اس کے حقیقی معنی کے امر مسئول عنہ داخل نہیں ہوتا بلکہ وہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کا یہ دعوے اور دلیل دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے اس لئے کہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض دعائیں مفصل ہوتی ہیں بعض مجمل بعضوں میں بالعموم رحمت و مہربانی مانگی جاتی ہے بعض میں بالتخصیص خاص خاص چیزوں کا سوال ہوتا ہے اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امر مسئول عنہ کو دعا سے علاقہ نہیں اور دعا صرف ندا ہے بغیر کسی غرض اور کسی مطلب کے۔ حضرت زکریا کی مثال دینے سے تو درحقیقت آپ نے اپنے دعویٰ کو انصاف اور ایمان کی عدالت میں قرآن کی شہادت سے ڈسمس کر دیا۔ اور پورے طور پر آپ ہار گئے۔ کیا کوئی سمجھ دار آدمی حضرت زکریا کی دعا اور اور خدا کی اجابت کو جن کا متعدد آیتوں میں ذکر ہے دیکھ کر ایک لحظ کے لئے بھی آپ کے دعوے کو قابل غور خیال کریگا۔ اور سنتے ہی حیرت زدہ ہو کر اس استدلال کو آپ کی شان کے خلاف نہ سمجھے گا۔ حضرت زکریا کی دعاؤں سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے صرف دعا کا اسباب حصول مقاصد میں سے ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب اسباب کی طرف سے مایوسی اور نا اُمیدی ہوتی ہے، اور کسی طرح امر مسئول عنہ کا ملنا بظاہر اسباب قیاس میں نہیں آتا۔ اور خود دعا کرنے والا مایوسی کے سامان دیکھ کر دعا کرنے سے ہچکچاتا ہے، تو خدا خود اپنی قدرت کی شان دکھاتا، اور اپنے مسبب الاسباب ہونے کی طرف رغبت دلاتا، اور دعا کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ جس سے اُس کے خاص بندے اسباب اور وسایل ہی کو نہ دیکھیں بلکہ اُس کی طاقت کو اُس سے مافوق سمجھ کر اس کی طرف رجوع کریں۔ دیکھیے وہ آیت جو آپ نے نقل کی اس میں حضرت زکریا خدا سے دعا کرتے ہیں "رب ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ انک سمیع الدعاء" انہوں نے اولاد کی دعا مانگتے وقت خدا سے یہ کہا کہ تو دعائیں سنتا ہے، یعنی جو کوئی کچھ مانگے اُسے دے سکتا

ہے اور اسی امید پر میں تجھ سے دعا کرتا ہوں۔ اور پھر اپنے وارث نہ ہونے پر مضطر ہو کر خدا سے یہ دعا کی "رب لا تذرنی فرداً وانت خیر الوارثین" کہ اگرچہ بہتر ین وارث تو ہی ہے مگر مقتضاء بشریت مجھے اولاد کی تمنا ہے تو اپنے رحم و کرم سے عطا کر اس کے جواب میں خدا اُن کو بذریعہ ملائکہ کے بشارت دیتا ہے اور فرماتا ہے "نبشرناہ بغلام حلیم" اور دوسرے مقام پر زکریا کی اجابت کو ان لفظوں میں خدا وند تعالے بیان کرتا ہے کہ "فنادتہ الملائکۃ وھو قائم یصلی فی المحراب ان اللہ یبشرک بیحی مصدقا بکلمۃ من اللہ وسیدا وحصورا و نبیا من الصالحین" دوسرے مقام پر خدا وند تعالے نے حضرت زکریا کے بیان میں فرماتا ہے کہ زکریا نے نا امیدی کی حالت میں خدا سے عرض کیا کہ "رب انی وھن العظم منی واشتعل الراس شیبا ولم اکن بدعائک رب شقیا" کہ میں بڈھا ہو گیا ہوں اور میرا سر سفید ہو گیا ہے اس پر بھی میں تجھ سے مانگتا ہوں باوجودیکہ میری بی بی بانجھ ہے اور اولاد ہونے کی اسباب نہیں چنانچہ الفاظ "وکانت امرأتی عاقرا" سے یہ ظاہر ہے اور باوجود اس کے یعنی اس نا امیدی پر بھی میں تجھے قادر مطلق سمجھ کر تجھ سے دعا کرتا ہوں "فھب لی من لدنک ولیا یرثنی ویرث من آل یعقوب واجعلہ رب رضیا"۔ کہ صرف اپنی طرف سے اور صرف اپنے فضل و کرم سے باوجود ان حالتوں کے بھی مجھے اولاد دے۔ اور اپنی قدرت کا تماشا دکھا اُس پر خدا فرماتا ہے "انا نبشرک بغلام اسمہ یحیی لم نجعل لہ من قبل سمیا"۔ کہ اچھا ہم اپنی قدرت کا تماشا تجھے دکھاتے ہیں اور بڑھاپے میں تجھے بیٹا دیتے ہیں ؛

اسی طرح حضرت ابراہیم کے بیان میں خدا فرماتا ہے کہ جب آن کو اولاد کی خوشخبری دی گئی تو ان کی بیوی حیرت زدہ ہو کر کہنے لگی "یا ویلتی ءالد وانا عجوز وھذا بعلی شیخا ان ھذا لشیء عجیب"۔ کہ کیا میرے اولاد ہوگی ایسی حالت میں کہ میں بڑھیا ہو گئی اور میرا خاوند بھی بوڑھا ہے یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اس پر خدا نے فرمایا "اتعجبین من امر اللہ رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت انہ حمید مجید" کیا تو تعجب کرتی ہے خدا کی رحمت سے۔ یہ خدا کی مہربانیوں میں سے ہے ؛

علاوہ ان آیتوں کے حضرت سلیمان کی دعا "رب اغفر لی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی انک انت الوھاب" اور حضرت عیسےٰ کی دعا "اللھم ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء" اور اس کا جواب خدا کی طرف سے "قال اللہ انی منزلھا علیکم" وغیرہ آیتیں ہیں جس سے امر مسئول عنہ کا دعا میں داخل ہونا ثابت ہوتا ہے ؛

کیا جو شخص قرآن مجید کی ان آیتوں پر سرسری نظر سے بھی غور کریگا تو اُسے دعا کے قبول ہونے اور امر مسئول عنہ کے خدا کی طرف سے دئے جانے میں کچھ شبہ رہیگا۔ میرے نزدیک اس کے بعد یہ بحث کہ دعا اور ندا الفاظ مرادف ہیں یا نہیں اور لفظ دعا اور ندا کے حقیقی معنی میں امر مسئول عنہ داخل ہوتا ہے یا نہیں غیر ضروری بلکہ لغو و فضول رہ جاتی ہے اس لئے کہ امر بحث طلب یہ نہیں ہے کہ لفظ دعا میں امر مسئول عنہ داخل ہے یا اس سے خارج بلکہ یہ ہے کہ خدا مانگنے سے دیتا ہے یا دے سکتا ہے اور اس سے مانگنا اسباب حصول مقصد میں سے ہے یا نہیں۔ اس کا جواب آپ نفی میں دیتے ہیں اور میں اور تمام مسلمان بلکہ کل بنی نوع انسان جو خدا کو مانتے ہیں اثبات میں۔ اور اس کے لئے ہم قرآن سے اتنی شہادتیں پیش کر چکے کہ عرفی دعا کی حقیقت کا انکار کرنا اور اجابت کو صرف خیالی اور بے معنی تسکین قلب سمجھنا ایسا خیال ہے جو میرے سے کم سمجھ آدمیوں کی سمجھ میں قرآن کی تسلیم و اقرار کے ساتھ مشکل سے جمع ہو سکتا ہے۔ یہ آیتیں جو میں نے اوپر نقل کیں کچھ پہیلیاں نہیں ہیں جن کا بوجھنا مشکل ہو۔ نہ معمے ہیں جو سمجھ میں نہ آسکیں۔ بلکہ یہ خدا کا صاف اور سیدھا کلام ہے جس سے انبیاء کرام کا خاص خاص باتوں کے لئے دعا کرنا مثلاً کسی کا بیٹا مانگنا کسی کا سلطنت چاہنا کسی کی دشمن پر فتح کی استدعا کسی کی آسمان سے مائدہ ملنے کی التجا، ایسی ثابت ہے کہ نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے۔ نہ اس کی تاویل ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام نے جو عموماً تمام انسانوں سے بڑھ کر خدا کے اسرار سے واقف اور "لا تبدیل لکلمات اللہ" کے حکم مستحکم سے آگاہ تھے، دعا کو اسباب حصول مقصد میں سے خیال کیا اور عالم اسباب سے ناامید ہو کر مسبب الاسباب سے دعائیں مانگنے لگے۔ کوئی کہنے لگا "رب هب لی من لدنك ذریة طیبة انك سمیع الدعاء" کوئی گڑگڑا کر پکارنے لگا "رب لا تذرنی فردا وانت خیر الوارثین" کوئی مانگنے لگا "رب هب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی" کوئی چلانے لگا "رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا" پس وہ شخص کہ قرآن کو منزل من اللہ مانتا۔ اور ان آیتوں کو جعلی اور نقلی نہ سمجھتا ہو کیونکر اتنے شواہد سے چشم پوشی کریگا۔ اور کس طرح اپنے نامکمل اور ناقص علم پر جو قانون فطرت کی نسبت ہے بھروسہ کر کے اجابت دعا کو خلاف قانون قدرت سمجھے گا اور عمداً دعا اور اجابت دعا کا منکر ہوگا۔ اے میرے سید اور مولے اگر قرآن سچا ہے اور یہ آیتیں قرآن ہی کی ہیں، تو میں اس کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی رائے و خیال سے میں اُسی وقت اتفاق کر سکتا ہوں جبکہ قرآن کو میں کلام الٰہی نہ سمجھوں اور ان آیتوں کو منزل من اللہ نہ مانوں۔ میرے نزدیک ان آیتوں کو ماننے اور

سمجھنے کے بعد دعا اور اجابت کے عرفی معنی سے انکار ایک ایسا امر ہے کہ جس کے سمجھنے سے میرا ذہن قاصر اور میری عقل عاجز ہے۔ فانظر یا سیدی الی ھذہ الاخبار، فای ذکر یلین من ھذا، وای شھادۃ اقوی منھا علی ان الدعاء لہ تاثیر فی نظام العالم وان اللہ تبارک وتعالی یسمع الدعاء ویقضی الحاجات، اھذہ الا قاویل کلھا علی کثرۃ معانیھا وفنون ورودھا وعن وجھاتھا التی حکیت عنھا، کلھا اشارات الی بطلان الدعاء العرفی وعدم اجابتہ الامر المسئول عنہ، فقد ذکرنا من القرآن ما فیھا کفایۃ لمن اکتفی، وقد استشھدنا ببعض من عشر سورۃ مما یدل علی صحۃ ما قلنا فی ما تقدم بما یکفی ویقنع من کان منصفا، فانظر یا سیدی ومولائی الی معاینۃ بعین الانصاف ھل تنظر فیہ من قصور، ثم ارجع البصر کرتین الی الفاظ ھل تری فیہ من فطور فقط۔

آپ کا خادم محسن الملک

اگلے خط میں میں اس سے بحث کروں گا کہ دعا کو جو عبادت کہا گیا ہے اُس سے کیا مطلب ہے اور آپ نے جو دلائل دعا کے اسباب حصول مقصد نہ ہونے کے بیان فرمائے ہیں۔ کہاں تک صحیح ہیں۔

چھٹا خط

۸- اگست ۱۸۹۲ء   بمبئی

جناب عالی - ۴- اگست کے عریضہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ آئندہ خط میں اس امر سے بحث کروں گا کہ دعا کو جو عبادت کہا گیا ہے اُس سے کیا مطلب ہے، اور آپ نے جو دلائل دُعا کے حصول مقصد کے اسباب میں سے نہ ہونے کے بیان فرمائے ہیں کہاں تک صحیح ہیں چنانچہ اسی کے متعلق یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ آپ رسالہ دعا والاستجابہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "دعا کو کسی معنی میں لو یعنی خواہ صرف خدا کے پکارنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے اور اُسے حاضر سمجھنے اور اُس کے الہ اور معبود برحق سمجھنے پر اقرار کرنے کے اور خواہ خدا سے کچھ مانگنے اور سوال کرنے کے دونوں صورتوں میں دعا عبادت ہے" اور اُس پر آپ بت وقال

لہ کل ذلک کان مقدرا لھم فاعطاہ اللہ لھم بفضلہ وکرمہ ولم یثبت من القرآن مالم یکن مقدرا اعطی لھم بالدعاء وان الدعاء رد القضاء واخر الاجل بدل المقدر وتغیر علم اللہ علی ما کان وما یکون وھذا عندنا محال۔ (منہ احمد)

دیکھا دعونی استجب لکم الخ اور دو حدیثیں مشکوٰۃ شریف کی سند آپ پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں اپنے تمہیدی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ ہر دعا بلاشبہ عبادت ہے مگر ہر عبادت دُعا نہیں ہے وہی پھر لکھتا ہوں کہ جس غرض سے آپ دونوں کو متحد اور مرادف مانتے ہیں وہ حاصل نہیں ہوتی۔ آپ کی غرض یہ ہے کہ سوال اور مانگنا کسی چیز کا دُعا کا عنصر نہ سمجھا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مانگنا نہ صرف دعا کا عنصر ہے بلکہ اس کی رُوح اور جان ہے۔ البتہ مانگنے کی حالتیں اور حیثیتیں مختلف، اور مانگنے والوں کے مراتب اور درجات جداگانہ ہیں۔ ادنےٰ درجہ سوال کا اغراض دنیوی کا مانگنا ہے اور اعلےٰ درجہ کا سوال بلا اظہار کسی حاجت دینی یا دنیاوی کے صرف اُس کی رحمت اور وصال اور تقرب کا چاہنا ہے۔ مگر ان سب پر مانگنے کا اطلاق ایک ہی معنی اور ایک ہی حیثیت سے ہوتا ہے اور چونکہ ہر حالت اور ہر درجہ میں دعا کے خشوع اور خضوع اور ابتہال الی اللہ اور اظہار عبودیت اور اقرار الوہیت ہوتا ہے، اس لئے کوئی دعا عبادت سے خالی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے دعا نہ صرف عبادت ہے بلکہ مغز عبادت ہے۔ اس لئے کہ اگر دُعا ادنےٰ درجہ کی ہو، اور صرف امید حاصل ہونے کسی مقصد کے مقاصد دنیاوی سے، یا امید نجات پانے کے کسی دنیاوی مصیبت سے۔ تاہم اُس مانگنے والے کی حالت کے لحاظ سے وہ دعا اُس کے حق میں اس کی عبادت کا مغز ہے۔ اس لئے کہ اُس کی عبادت بھی کسی غرض طمع اور خوف سے خالی نہیں ہوتی۔ اور عبادت میں اُس کا دل خدا کی طرف اتنا متوجہ نہیں ہوسکتا، بلکہ نہیں ہوتا جتنا دعا کے وقت۔ طلب حاجت یا رفع مصیبت کے لئے وہ دل وجان سے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اُسے قادر اور حاکم اور مختار سمجھ کر دوسروں کا خیال چھوڑ دیتا ہے، اور نہایت عاجزی اور ذلت اور کمال اضطراب اور بے قراری سے عقلاً و لساناً و ہیئتہً اپنی عبودیت و عجز اور خدا کی معبودیت و قدرت کا اظہار کرتا، اور اُس کا رواں رواں اور بال بال خدا کو دیکھنے لگتا ہے۔ اور اس بات کا اُسے پورا یقین ہوجاتا ہے کہ "لا فرج الا من لدن سیدہ ولا اخیلہ الا من عندہ۔ فیتردد لسانہ بانواع التضرع وتنصرف یدہ الا نحو السماء فی ضروب من التشکل والحرکات" کبھی بیقرار ہوکر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھاتا ہے کبھی مضطرب ہوکر سر زمین پر مارنے لگتا ہے کبھی آنکھوں سے دریا بہاتا ہے کبھی اُس کے شکرانہ کے گیت گاتا ہے۔ غرضیکہ ایک دیوانہ اور مجنون سکتہ انتہا بے اختیاری اور بے قراری کی حالت میں وہ حرکتیں کرتا ہے جن کی خبر خود اُسے نہیں ہوتی، اور وہ خود نہیں جانتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ایسی حالت

میں اُسے تقرب الی اللہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، اور یہ حالت دعا مانگنے والے کی خصوصاً اُس کی جو کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو، فرضی اور خیالی نہیں ہوتی بلکہ حقیقی اور اصلی ۔ مولانا معنوی نے اس حالت کی حقیقی تشبیہ حکایت کے پیرایہ میں کھینچی ہے ۔ اور نصوح[۱] کے واقعہ اور حالت کو اس طور پر دکھایا ہے کہ جس سے دعا اور اجابت کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ جو کوئی اسے دیکھے اور پڑھے، اُسے اس میں ذرا بھی

---

[۱] یہ حکایت اس طور پر مثنوی شریف میں بیان کی گئی ہے کہ نصوح ایک شخص تھا جو عورتوں کے لباس میں عورتوں کے نہلانے کا پیشہ کیا کرتا ۔ ایک روز اُس پر ایسی آفت آئی کہ اُس کی جان جانے میں کسر باقی نہ رہی یعنی وہ کسی شہزادی کو نہلا رہا تھا کہ اُس کے کان کا موتی گم ہو گیا ، اور موتی کی تلاش کے لئے دروازہ بند کر کے ہر ایک کی جامہ تلاشی ہونے لگی ۔ نصوح سمجھا کہ اب اُس کا بھید فاش ہوتا ہے ، اور معلوم نہیں کہ کس عذاب سے وہ مارا جاتا ہے اس بیقراری کی حالت میں جبکہ اُسے کوئی سہارا بچنے کا نظر نہ آتا تھا وہ خدا کی طرف جھکا ۔ اور سب کو بھول کر خدا کو پکارنے اور یہ کہنے لگا ؎

کاشکے مادر نزادے مر مرا — یا مرا شیرے بخوردے در چرا
نوبت جستن اگر در من رسد — وہ کہ جان من چہ سختیہا کشد
ایں چنیں اندوہ کافر را مباد — دامن رحمت گرفتم داد داد !!

وہ اسی حالت میں تھا کہ یہ آواز آئی ؎

جملہ را جستیم پیش آ اے نصوح — گشت بے ہوش آں زماں پرید روح
ہمچو دیوارے شکستہ در فتاد — ہوش و عقلش رفت و شد ہمچوں جماد
چونکہ ہوشش رفت از تن آں زماں — سرّ او با حق بپیوست از نہاں
جاں بحق پیوست چوں بے ہوش شد — موج رحمت آں زماں در جوش شد
بانگ آمد ناگہاں کہ رفت بیم — شد پدید آں گم شدہ درّ یتیم
آں نصوح رفتہ باز آمد بخویش — دید چشمش تابش صد روزہ بیش
مے حلالی خواست از وے ہر کسے — بوسہ مے دادند بر دستش بسے
بدگماں بودیم مارا کن حلال — لحم تو خوردیم از قیل و قال
گفت بد فضل خدا لطف دادگر — ورنہ زانچہ گفتہ شد ہستم بتر
چہ حلالی خواست مے باید ز من — کہ منم مجرم تر از اہل زمن
من ہمے دانم وآں ستار من — چند ہا و زشتیئے کردہ ام من
ہر چہ کردم جملہ نا دیدہ گرفت — طاعت نا وردہ آوردہ گرفت
نام من در نامۂ پاکاں نوشت — دوزخی بودم بخشیدم بہشت
از ہوس ہا تنگنا بودم زبوں — در ہمہ عالم نے گنجم کنوں
آفرینہا باد بر تو اے خدا — ناگہاں کردی مرا از غم رہا
گر سر ہر موئے من گردد زباں — شکر ہائے تو نیاید در بیاں

شبہ نہیں رہتا کہ خدا دعا کو نامعلوم طور پر قبول کرتا ہے، اور خدا پر یقین رکھنے والا بندہ گو وہ بدکردار ہی کیوں نہ ہو کبھی کبھی مصیبت کے وقت اس طرح خدا کو یاد کرتا، اور اسباب ظاہری سے مایوس ہو کر اس طور پر خدا کو پکارتا اور سب کو چھوڑ کر بے خودی کی حالت میں اس طرح اس کی طرف دیکھتا، اور دنیاوی حاجت اور وہ بھی ایسی جس کا مبدا جرم و عصیاں ہو کبھی کبھی بندہ پر ایسی حالت طاری اور خدا کی طرف ایسا متوجہ کر دیتی ہے، کہ دعا کرنے والا خدا تک پہنچ جاتا اور فنا فی اللہ کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ اور اسی حکایت سے اس کی بھی عمدہ مثال ملتی ہے، کہ خدا درحقیقت مسبب الاسباب ہے، اور ایسے وقت پر جبکہ کوئی صورت نجات کی نظر نہ آتی ہو وہ دعا سنکر ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے، کہ دعا کرنے والے کا مطلب حاصل ہو جاتا ہے اور ایسی استجابت سے داعی کی خدا کے ساتھ وہ کیفیت ہو جاتی ہے جو مجنوں کی لیلیٰ کے اور فرہاد کی شیریں کے ساتھ سنی جاتی ہے محبت اور عشق، جنون اور دیوانگی کی کوئی حرکت باقی نہیں رہتی جو دل سے زبان سے، اور ہاتھ سے پاؤں سے وہ نہ کرتا ہو، اور اپنے خدا کی رحمت اور مہربانی پر طرح طرح سے قربان نہ ہوتا ہو۔ اب اسے کوئی حکایت سمجھے یا اتفاق پر محمول کرے مگر مسلمان بلکہ کوئی آدمی بھی جو خدا کو ایسا خدا سمجھتا ہو، جو رحیم بھی ہے اور رحمن بھی۔ منعم بھی ہے اور مسبب الاسباب بھی۔ وہ ضرور اس کو دعا اور اجابت کی سچی تصویر مانے گا، اور اس حکایت کو ایک اصلی واقعہ کی سچی شبیہ سمجھیگا۔ وکیف لا یہ واقعہ ہی ایسا ہے جو سینکڑوں بندوں پر خدا کے رات دن گذرا کرتا ہے، اور ہزاروں دعا کرنیوالے اپنے خدا کی قدرت کا یہ تماشا دیکھا کرتے ہیں میں ایک لحظہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ایک دہریہ یا ایک لاادریہ یا شاک فی المذہب کی طرح آپ اسے ایک غلط افسانہ اور خیالی حکایت کہکر اس پر توجہ نہ کرینگے۔ بلکہ مجھے یقین ہے اور پورا یقین ہے کہ آپ خود اپنے کسی وقت اور کسی حالت کو جو آپ پر گذری ہو یاد کر کے اس کی تصدیق فرمائینگے۔ اس لئے کہ وہ تجربہ جو مجھے آپ کی ذات کا ہے، اور وہ حالات آپکے جن کو میں جانتا ہوں، مجھے اس بات کے کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کہ گو آپ نے دعا اور اجابت کے ایسے معنی بیان کئے ہیں کہ اس میں آپ بالکل عالم اسباب پر متوجہ اور مسبب الاسباب سے غافل معلوم ہوتے ہیں، مگر درحقیقت جیسا توکل خدا پر آپ کو ہے، اور اپنے تمام کاموں اور حاجتوں کو جیسا آپ خدا پر چھوڑتے ہیں، اور جس طرح خدا پردۂ غیب سے ایسے اسباب مہیا کر دیتا ہے جس سے آپ کی ناامیدی امید سے اور آپ کی محنت کامیابی سے بدل جاتی ہے، اور نصوح کیطرح دیوانہ ہو کر آپ خدا کے شکرانہ کے گیت گانے لگتے ہیں اس پر خیال کرنے سے مجھے اس بات کا تو ایک لحظہ کیلئے یقین نہیں ہوتا کہ آپ کی نظر صرف اسباب

پر ہے۔ مگر ہاں اس امر کی حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس کے آپ کیوں دعا کو اسباب حصول مقصد سے خارج سمجھتے ہیں ؂

دعا کے عبادت اور مخ العبادت ہونے کی نسبت ہمارے علما نے بہت عمدہ وجوہ بیان کئے ہیں، میں اُن میں سے بعض اقوال بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ملا صدر الدین حسینی استرآبادی شرح صحیفہ کاملہ میں اس مضمون کو بہت اچھی طرح سے لکھتے ہیں۔ وہ فرماتے

لا دعاء الا مع الاعتراف بالذلة والنقص والاضطرار والعجز عقلاً ولساناً وهيئة كما يروى عن جعفر بن محمد صادق انه جعل ظاهر كفيه الى السماء وقال هكذا التضرع وحرك اصابعه يميناً وشمالاً وقال هكذا التبتل ورفع اصابعه مرة ووضعها اخرى وقال هكذا الابتهال ومد يديه تلقاء وجهه الى القبلة وكان لا يبتهل حتى يذرف دموعه وتشخص بصره وهل خلوص العبادة الا بهذه الاحوال فكان الدعاء من اشرف العبادة ولانه لا يمتنع ظهور رحمة الله وسابغ كرمه في حق العبد من غير مسألته ويمتنع كرامة باجابته الا مع ظهور جوده واتصال رحمته حتى يطمئن بفضله ويثق بقبوله ويعلم انه العبد الذي دعا مولاه فلباه وسأله فاعطاه فكان الدعاء امتراء المزيد واستيجاب اسباب الرحمة مع الكرامة فوق الطاعة والعبادة ولهذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يرغب فيه الى اخيار امته ويسأله لنفسه عن صفوة امته ؂

ہیں کہ دعا جب ہی ہوتی ہے کہ جب عقل اور زبان اور ہیئت سے اقرار ذلت اور نقص اور اضطرار اور عجز کا کرے جیسا کہ امام جعفر بن محمد صادق سے مروی ہے کہ آپ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کر کے فرمایا کہ تضرع یہ ہے، اور اپنی انگلیوں کو داہنے بائیں حرکت دے کر فرمایا تبتل یہ ہے، اور اپنی انگلیوں کو ایک دفعہ اُٹھایا۔ اور پھر بند کر کے فرمایا کہ ابتہال یہ ہے، اور اپنے ہاتھ قبلہ کی طرف منہ کے سامنے پھیلا کر فرمایا کہ ابتہال نہ ہوگا اُس وقت تک کہ آنسو جاری ہوں اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاویں۔ اور اخلاص عبادت میں بجز ایسے حالات کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تو دعا گویا اشرف عبادت ٹھیری، اس لئے کہ اگرچہ بدُوں بندہ کے سوال کے اللہ کی رحمت اور اُس کے کرم کا ظہور بندہ کے حق میں ہو سکتا ہے مگر اجابت دعا کی کرامت حاصل نہیں ہو سکتی الّا اسی وقت کہ اُس کے جود کا ظہور اور اُس کی رحمت سے اتصال ہو جس سے اُس کے فضل پر بندہ کو اطمینان ہو جاتا ہے اور اُس کے قبول کرنے پر وہ بھروسہ کر لیتا ہے۔ اور خداوند تعالٰے بھی جان جاتا ہے کہ یہ میرا وہ بندہ ہے کہ جس نے اپنے مولٰے کو پکارا اور اُس نے

اُس کی دعا سُنی۔ اُس نے اُس سے مانگا اور اُس نے اُس کو عطا کیا۔ تو دعا کو زیادتی حاصل کرنے
اور اسبابِ رحمت کو مع کرامت کے جمع کرنے میں طاعت اور عبادت سے بڑی برتری ہے
اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چیدہ اور خاص لوگوں کو دعا کی رغبت دلاتے تھے
اور اپنے نفس کے لئے بزرگانِ امت سے دعا کراتے تھے۔ اور مُلّا صدرالدین نے بھی الدعاء
مخ العبادت کی وجہ نہایت خوبی سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دعا کے مغز عبادت ہونے

لما كان المخ من اعضاء الحيوان وهو
المغذي لها والقوم لا سند امنه بقائها
شبه الدعاء به لانه يعمل هذا العمل ووجه
تخصيصه بذلك من دون سائر العبادات
لاشتماله على حضور قلبي لا يوجد في غيره
فان من تعبد بالصلوة او الصوم او الحج او
غيرها يغلب عليه فيها الغفلة فاذا دعا استدعا
ذلك منه مزيد حضور في قلبه وذلك الحضور
هو مخ العبادة فلذا اجاز التخصيص ويوجد منه
تفضيل الداعي على العابد وذلك لما فيه
مع الحضور من التذلل واظهار الفاقة
وذل العبودية وعز الربوبية فكل داع
عابد ولا ينعكس والدعاء داب الانبياء
عليهم السلام ومفزعهم في الشدائد
على ما اخبره تعالى في سورة الانبياء
وغيرها بقوله انهم كانوا يسارعون في
الخيرات ويدعوننا رغبا ورهبا تنبيها على
علة الاجابة لدعائهم وانها ثواب لهم
بطاعتهم وتعجيلها جزاء لمسارعتهم الى
ما كلفوا به وفي ذلك حث على الطاعة۔

میں ایک لطیفہ ہے، اور وہ لطیفہ یہ ہے کہ
چونکہ مغز حیوان کے اعضاء کا حاصل ہے اور مضبوط
کرنے والا ہوتا ہے اور اعضاء کی بقا اُس سے
قائم ہے، اس لئے دعا کو اس کے ساتھ تشبیہ
دی گئی کیونکہ دعا بھی یہی عمل کرتی ہے اور جو
کیفیت حضورِ قلب کی دعا میں پائی جاتی ہے وہ
دوسری عبادت میں نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز، روزہ
حج یا اور کوئی عبادت انسان کرتا ہے تو ان
میں اکثر اس پر غفلت رہتی ہے۔ مگر جب دعا
کرتا ہے اور خدا کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو
اُس کے دل میں خدا سے توسل پیدا کرنے
کی ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور
حضورِ قلب زیادہ ہوتا ہے اور حضورِ قلب
اور توسل الی اللہ کیا ہے، یہی مغز عبادت ہے
اور اسی وجہ سے داعی کی فضیلت عابد پر
ثابت ہوتی ہے اس لئے کہ دعا میں تذلل
کا اظہار اور ذُلِ عبودیت اور عزِ ربوبیت مع
حضورِ قلب موجود ہے، پس داعی عابد ہے نہ
اُس کا عکس۔ اور خدا کے اس قول سے جو اُس
نے سورہ انبیاء میں انبیاء کی نسبت فرمایا ہے

کہ "انهم كانوا يسارعون في الخيرات ويدعوننا رغبا ورهبا"، دو باتیں معلوم ہوتی ہیں
اول یہ کہ شوق اور خوف خواہش اور ڈر دونوں حالت میں انبیاء دعا کیا کرتے تھے۔

اور یہ دونوں حالتیں وہ ہیں جن میں کسی نہ کسی چیز کی طلب مضمر ہوا کرتی ہے۔ دوسری یہ کہ ان کی دعا کی اجابت کا سبب یہ ہے کہ وہ نیک کام کیا کرتے تھے اور خدا اُن کی دعا قبول کرتا تھا تاکہ اُنہیں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہو۔

اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضورِ قلب اور خلوص الی اللہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب دل ذاتی اغراض سے فارغ ہو، اگر دعا کرنے والا ذاتی اغراض رکھتا ہے تو اُسے حضورِ قلب اور اخلاص کا درجہ حاصل ہی نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ دعا جس میں کوئی امر مسئول عنہ داخل ہو مخ العبادت ہو ہی نہیں سکتی چنانچہ اس شبہ کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

الداعی ما دام یبقی خاطرہ مشغولا بغیر الله فانه لا یکون داعیا له فاذا فنی عن الکل صار مستغرقا فی معرفة احد الحق فامتنع ان یبقی فی هذا المقام ملاحظا لحظه وطالبا لنصیبه فلما ارتفعت الوسائط بالکلیة فلا جرم حصل القرب فانه ما دام یبقی العبد ملتفتا الی غرض نفسه لم یکن قریبا من الله تعالی کان ذلک الغرض یحجبه من الله فثبت ان الدعا یفید القرب من الله فکان الدعا افضل العبادة۔

وہ فرماتے ہیں کہ "داعی کا دل جب تک خدا کے سوا اور چیزوں کی طرف متوجہ ہے داعی نہیں ہو سکتا اور جب سب سے الگ ہو کر خدا کی معرفت میں ڈوب جاتا ہے تو ناممکن ہے کہ اس وقت اُس کے دل میں کوئی غرض اور ارادہ باقی رہ جائے پس جب تمام واسطے درمیان سے اٹھ جاتے ہیں خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اور جب تک بندہ اپنی نفسانی خواہش کی طرف متوجہ رہتا ہے خدا سے قرب حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ یہی خواہش نفسانی اُسکو خدا سے دُور رکھتی ہے"۔ بلاشبہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا کو جو مغز عبادت کہا گیا ہے وہ اسی خیال سے ہے کہ اخلاص الی اللہ پورے طور پر ہو، اور اخلاص اُسی وقت پورا ہوتا ہے جبکہ کوئی ذاتی غرض باقی نہ رہے، مگر یہ درجہ انبیاء اور صدیق اور شہدا اور صالحین کا ہے جن کی منتہا آرزو اور منتہا سعی صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا سے تقرب اور توسل حاصل کریں، اور اپنے آپ کو اس کی ذات میں فنا کر دیں، اور اُس کے جلال و جمال کے مشاہدہ میں مستغرق، اور ہر حال میں قضاء الٰہی پر راضی اور ہر تکلیف و مصیبت پر خوش رہیں۔ مگر اس سے یہ امر کہ دعا میں کوئی امر مطلوب نہیں ہوتا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ برخلاف اُس کے بات کی تائید ہوتی ہے کہ "دعا کسی خواہش سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ بندے جو دنیا میں پھنسے ہوئے ہیں اور اپنی ذاتی اغراض کی طلب سے مستغنی نہیں ہیں، وہ اپنی حاجتیں اور مرادیں خدا سے مانگتے ہیں۔ مگر خدا سے مانگتے وقت ان کی حالت بھی اپنے درجہ کے موافق ایسی ہو جاتی ہے کہ معمولی عبادت کی بہ نسبت

دعا کے وقت خدا کی طرف زیادہ راجع اور زیادہ متوجہ ہوتے ہیں اور جو صاحب یقین اور معرفت کا درجہ رکھتے ہیں، اُن کی دعائیں گو اغراض نفسانی سے خالی ہوتی ہیں مگر وصال الٰہی اور رحمتِ ایزدی کی طلب سے خالی نہیں ہوتیں۔ اور اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ دعا محبت اور رضا بقضاء الٰہی کے خلاف نہیں ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی پوچھے کہ رضا بقضاء اللہ اعلیٰ ترین مقامات ہے تو انبیا نے جب اُن کو کسی قسم کی تکلیف پہنچی ہے کیوں دعا کی ہے۔ حالانکہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن سے بڑھ کر کسی کو درجہ محبت اور مرتبہ رضا نہیں دیا گیا خود دعا کی ہے بلکہ اللہ جل شانہٗ خود اپنے بندوں کی تعریف کرتا ہے " یدعوننا " کہ ہم سے دعا کرتے ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ دعا بھی اظہار احتیاج اپنے ہی محبوب سے ہے اسی لئے وہ منافیٔ رضا نہیں اور دعا میں لطف مناجات ہے کہ جس کے سبب سے اولیاء اللہ دعا کرتے ہیں اور اس میں اظہار جلال اور قدرت اللہ جل شانہٗ کا ہوتا ہے اور اس حیلے سے اللہ جل شانہٗ سے باتیں کرنے کا موقع ملتا ہے اور سوائے اس کے اور کوئی غرض دعا سے نہیں ہے کہ خود اللہ جل شانہٗ دعا کرنے کا حکم دیتا ہے کہ مجھ سے مانگو پس اگر دعا نہ کریں تو استغنا اور بے پروائی معلوم ہو ے

حق ہمے دائم کہ سے خواہد دلش — تا بود غوغا بہ گردش منزلش
کے کنم چنداں فغاں در حضرتش — تا فرود آید ز بالا رحمتش
چیست اُدعونی کدامست اِستلوا — گر نمے خواہد گدایاں را غلوا
آہ گریہ بر درش چنداں کنم — تا بخود آں غنچہ را خنداں کنم
اے اخی دست از دعا کردن مدار — با قبول و ردِ آنت چہ کار

شیخ ابوالحسن شاذلی فرماتے ہیں کہ دعا کرنے والے کو چاہیے کہ دعا میں ذوق اور فرحت اس کو مناجات سے ہو، اور یہ سمجھے کہ یہ ذریعہ محبوب کی یاد کا ہے، قضا حاجت و حصول مطلب پر کچھ التفات نہ کرے جس قدر دیر اجابت میں ہو اُتنا ہی شوق زیادہ ہو، اور سمجھے کہ ہم مقبولانِ بارگاہ الٰہی سے ہیں۔ اور مناجات کا ذریعہ اور باتوں کا وسیلہ بھی باقی ہے ایسے ہی دعا کرنے والوں کی شان میں مولانا کہتے ہیں ے

دل ز حرص مدعا خالی شدہ — ذوق عجز و بندگی حالی شدہ
گر اجابت کرد شاں فہو المراد — ورنہ با دیدار لقد آیند شاد
ہیچ نبود از دعا مطلوب شاں — جز سخن کردن باں شیریں زباں
درکستد رد لذتِ آں بیش تر — بہر تقریب سخن بارِ دگر

بلاشبہ اس قسم کی دعا اور اس طرح کی اجابت اصل عبادت اور مغز عبادت ہے اور اس سے آپ کا یہ قول ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اس طرح پر خدا کو پکارتا ہے خدا اس کو قبول کرتا ہے اور آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل مذہب کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ دعا عبادت ہے جو دل سے اور خشوع اور خضوع سے ہو اس کے قبول کرنے کا خدا نے وعدہ فرمایا ہے اور وہ کبھی نامقبول نہیں ہوتی اور استجابت دعا کی ٹھیک مراد عبادت کے قبول کرنے اور انسان کے دل میں جو حالت کہ صدق دل سے عبادت کرنے میں پیدا ہوتی ہے اسکے پیدا ہونے کے ہیں مگر یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ عام صدیقین اور عارفین اور فنا فی اللہ کے درجہ پر پہنچے ہوؤں کی ہوتی ہے جو لوگ اس درجہ پر پہنچے ہوتے ہیں وہ کسی غرض اور کسی مقصد کے لئے عالم اسباب پر نظر ہی نہیں کرتے بلکہ عالم اسباب کو لاشئے محض سمجھتے ہیں۔ وہ ملاحظ وسائط و اسباب سے بالکل بے خبر اور صرف مسبب الاسباب کی طرف متوجہ رہتے ہیں "صرف اللہ اعنھم عن ملاحظۃ الوسائط والاسباب الی مسبب الاسباب ورفع ھممھم عن الالتفات الی ما عداہ والاعتماد علی من سواہ، فلا یدعون الا ایاہ علما بان جمیع اصناف الخلق عباد امثالھم لایستغنی احد منھم الرازق وانہ ما من ذرۃ الا الی اللہ خلقھا وما من دابۃ الا علی اللہ رزقھا فلما تحققوا انہ لرزق عبادہ ضامن وبہ کفیل توکلوا علیہ فقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل" کما قال ذوالنون المصری لما سئل عن التوکل ان التوکل خلع الارباب وقطع الاسباب" وقال بعضھم ان فی المقدورات اسبابا خفیۃ سوی ھذہ الاسباب الظاھرۃ فلابد من التعلق باللہ تعالیٰ فی کل حال وترک کل سبب یوصل الی السبب حتی یکون الحق ھو المتولی لذالک تترک الاسباب ثقۃ باللہ تعالیٰ۔

مگر چونکہ عالم معاملہ میں یہ مثالیں اور یہ حالتیں نہ بیان کے لائق ہیں اور نہ نظیر کے قابل نہ ان کی تقلید ہو سکتی ہے نہ پیروی اس لئے وہ درجہ دعا کا جس کا اوپر ذکر ہوا اور وہ اجابت جس کی حقیقت اوپر بیان کی گئی ہماری بحث سے خارج ہے۔

ہم کو تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ عرفی اور عام معنی دعا کے کیا ہیں۔ اور اس کو کس سبب سے عبادت کہا گیا ہے چنانچہ میں پچھلے خط میں قرآنی شہادت سے ثابت کر چکا کہ دعا کے معنی ہیں خدا سے کسی حاجت کا مانگنا۔ اور اس عریضہ میں بیان کر دیا کہ بوجہ اس کے کہ دعا میں خشوع اور خضوع اور ابتہال الی اللہ ہوتا ہے وہ عبادت ہے اور نیز اس بات کو بھی ثابت کر چکا کہ ہر دعا عبادت ہے مگر ہر عبادت دعا نہیں ہے یعنی دونوں میں عموم اور خصوص مطلق کی نسبت ہے اور یہ امر ظاہر بھی ہے کہ دعا میں اگر کوئی امر مضمر نہ ہو اور داعی اس کو خصوص مقصد کے لئے مفید۔

نہ سمجھے تو نہ دعا کرنے والے کے دل میں رجوع الی اللہ کی تحریک پیدا ہو سکتی ہے نہ دعا کرنے سے اس کا دل تسلی پا سکتا ہے آپ نے اگرچہ دعا کرنے کا سبب نہایت عمدہ اور معقول بیان فرمایا ہے مگر اس سے میرے دل کو پوری تشفی نہیں ہوتی۔ آپ اپنے رسالہ الدعا والاستجابہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جب اس پر مصیبت آتی ہے اور اس کے دل کو اضطرار ہوتا ہے تو وہ کسی کی طرف استمداد اور استعانت کے لئے رجوع کرتا ہے اگر وہ امر کسی انسان کی مدد سے بالاتر ہے تو کسی ایسی ہستی سے امداد چاہتا ہے جو اس کے نزدیک اس امر میں مدد کر سکتی ہے مگر خدا نے ہم کو ایاك نعبد اور ایاك نستعین کی تعلیم دی ہے اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ ہم کسی امر میں سوائے خدا کے اور کسی سے مدد نہ چاہیں وہ کیسا ہی بڑا یا کیسا ہی چھوٹا ہو" مجھے اور تمام مسلمانوں کو آپ سے اتفاق ہو جاتا اگر آپ اپنے ان عمدہ الفاظ میں یہ اور بڑھا دیتے کہ "جس ہستی سے مدد چاہی جاتی ہے وہ مدد دینے کی قوت بھی رکھتی ہو اور مدد بھی دے سکتی اور دیتی ہو" ورنہ یہ آپ کا پاکیزہ اور عارفانہ بیان جس سے معرفت اور توحید کا اعلےٰ خیال ظاہر ہوتا ہے مثل ایشیائی شاعروں کی تعریف کے ہم نافہم آدمیوں کے نزدیک حقیقی نہ ٹھیریگا اس لئے کہ یہ بیان تو آپ کا نہایت شاندار، پر اثر، اور معرفت و حقیقت سے بھرا ہوا، اور توحید کا لب لباب ہے اور جس سے عام اسباب سے بالکل قطع نظر کرنے کی ہدایت پائی جاتی ہے اور دوسرا ارشاد آپ کا کہ دعا نہ اسباب حصول مقصد سے ہے نہ ان اسباب کی جمع کرنے والی ہے اس سے ایسا متناقض ہے کہ دونوں ایک دماغ کے نکلے ہوئے خیال معلوم ہی نہیں ہوتے۔ پہلے ارشاد سے آپ کے دوسرے کو نہ کچھ اتحاد ہے اور نہ کچھ مناسبت۔ ایک میں خالص توحید کا جلوہ نظر آتا ہے دوسرے میں اسباب پر بھروسہ کرنے اور خدا سے سرد کا دیکھنے کی تاریک تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ایک میں تو آپ یہ فرماتے ہیں ایاك نعبد وایاك نستعین پر جو خدا کی تعلیم ہے پورا عمل کرنا، اور نہ کسی بڑی نہ کسی چھوٹی چیز میں سوائے خدا کے دوسرے سے مدد کرنے کی خواہش دل میں لانی چاہیئے اور دوسرے مضمون میں آپ صاف صاف فرماتے ہیں کہ مطلب نہیں اسباب کے جمع ہونے سے ہوتا ہے جو خدا نے مقرر کر دیئے ہیں اور دعا نہ ان اسباب سے ہے اور نہ ان اسباب کی جمع کرنیوالی ہے "جس کو صاف اور سیدھے لفظوں میں اس طرح پر سمجھنا چاہیئے کہ خدا معینہ قانون میں جسے قانون قدرت کہا جاتا ہے نہ دخل دیتا ہے اور نہ دے سکتا ہے اور جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا ہے کہ ہم کو ایک ایسی بے درد قوت سے پالا پڑتا ہے جس کو ہم سے نہ ہمدردی ہے اور نہ جسکو ہمارے دکھ درد کا خیال ہے "فہلہ متعلقا بوہم، معتصما بحبلہ، متوکلا علیہ فی جمیع احوالہ، مستند اظہرہ الیہ فی جمیع متصرفاتہ"

بلکہ ہم کو خود اپنے لئے ان اسباب کا جمع کرنا اور انہیں پر بھروسہ رکھنا ضرور ہوتا ہے، اور کسی دوسری صورت خارجی قوت کو ہمارے فعل و عمل کے سوا اس میں دخل نہیں۔ ایسے تناقض اور مخالفت کی حالت اگر میں یہ سوال کروں تو قابل معافی ہونگا، کہ ان دونوں مخالف باتوں میں اتحاد ثابت کر کے مجھے غلط فہمی سے نجات دیجئے۔ مجھے حقیقت میں اپنے فہم پر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کی سیدھی سادی عبارت کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور فطرت انسانی کے معمولی خواص بھی نہیں جانتا آپ تو صاف صاف فرماتے ہیں کہ انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مصیبت کے وقت کسی کی مدد اور استعانت چاہتا ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ اس ہستی سے کیونکر مدد کی خواہش کر سکتا ہے جس کو مدد دینے کی طاقت رکھنے والا نہ سمجھتا ہو، اور کیونکر کوئی انسان کسی ایسی ذات سے کچھ مانگنے کی جرأت کر سکتا ہے جو دینے سے مجبور و معذور ہو۔ میں اپنی فطرت کو دیکھتا ہوں، تو مصیبت کے وقت اسی سے مدد مانگنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوتی ہے جس کی سخاوت اور فیاضی، مہربانی اور رحم کی امید ہو، جس کی نسبت ہمدردی اور دکھ درد پر خیال کرنے کا یقین ہو، اور جس کو تجربہ یا شہادت یا دیگر وسائل سے مدد کرنے والا سمجھتا ہوں۔ یہی خاصہ غالباً بلکہ یقیناً تمام انسانی فطرت کا ہے مگر جب کہ خدا قوانین فطرت کا پابند سمجھا جائے، اور قوانین فطرت بھی وہ جیکو ہم اپنے ناقص تجربہ سے قانون فطرت سمجھتے ہوں تو وہ کونسی انسانی فطرت ہوگی کہ ایسے خدا سے مصیبت کے وقت رجوع کریگی، اور اس سے دعا مانگیگی۔ دعا کا خیال تو اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ ہم یہ سمجھیں کہ اس سے مانگنا خود قانون قدرت کا کوئی فقرہ ہے! اور دعا علت و معلول کی زنجیر کی خود ایک کڑی ہے گو ہم اس فقرہ اور کڑی کی حقیقت سمجھنے سے عاجز ہوں غرضکہ گو دعا کے متعلق آپ نے نہایت لطیف اور پاکیزہ عبارت میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اور گو آپ نے اکثر آیات اور احادیث کی جو دعا کے متعلق ہیں تفسیر اور تشریح بہت عمدگی اور نہایت خوبی سے فرمائی ہے۔ مگر آخر نتیجہ آپ کی تقریر کا یہ نکلتا ہے کہ خدا سوائے مقررہ اسباب کے خود نہ مدد کرتا ہے نہ کر سکتا ہے پس جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ اگرچہ ایک نہایت عمدہ دلفریب اور خوبصورت خدا ذات و صفات کی تصویر ہے خط و خال اس کے نہایت سچے، تشبیہ اس کی نہایت پر شان مگر کسر اتنی ہے کہ اس میں جان نہیں ہے۔

غرض آپ کی دو مختلف تحریروں سے دو مختلف خیال پیدا ہوتے ہیں، پہلی تحریر ہمارے مطابق ہے اور دوسری ہمارے مخالف۔ پہلے خیال کو جو مانیگا

داعیاله فی جمیع اوقاته، سائلا منه کل حوائجه، مفوضا الیه سائر اموره۔ اور جو شخص آپکے دوسرے خیال کی غلطی میں پڑکر اور جو مطلب اصلی آپ کا ہے اسے نہ سمجھ کر صرف اسباب ہی پر نظر رکھیگا۔ فلا ریب فی انه یکون معرضا عن ربه، ناسیا ذکرہ۔ غافلا عن جنابه، مشغولا بما خوله، من اغراض دنیاه، ومکن له فیها، وملکه منها، فهو لا یذکر ربه، الا ناسیا، ولا یدعوه الا لاهیا، ولا یسئاله الا بطرا او ریاء، ویکون معتصما بالدنیا واسبابها، ویکون جاهلا بربه، فلیبقی محجوبا عنه طول عمرہ فی دنیاه، وفی الاخرة اعمی واضل سبیلا ✦

محسن الملک

اگلے خط میں اُن اعتراضات سے بحث کرونگا جو آپ نے یا اوروں نے دعا پر کئے ہیں فقط

ساتواں خط

مقام بمبئی ۲۰- اگست ۱۸۹۵ء

جناب عالی۔ اب میں ان اعتراضات کو بیان کرتا ہوں جو دعا اور اجابت دعا پر کئے گئے ہیں۔ اور ان کی دو قسمیں ہیں ایک مذہبی یعنی جو خود اہل مذہب نے بلحاظ مذہبی اصول کے کئے ہیں۔ دوسرے علمی جو فلسفہ اور سائنس کے ماننے والے کرتے ہیں! اس خط میں مَیں مذہبی اعتراضات سے بحث کرتا ہوں ✦

منجملہ اُن اعتراضات کے اہم مشکل وہ دو اعتراض ہیں جو آپ نے اپنے رسالہ الدعا والاستجابہ میں بیان فرمائے ہیں کہ اگر استجابت دعا کے معنی اُس سوال کے پورا کردینے کے قرار دیئے جائیں تو اس میں دو مشکلیں پیش آتی ہیں! ایک یہ کہ ہزاروں دعائیں نہایت عاجزی اور اضطرار سے کی جاتی ہیں مگر سوال پورا نہیں ہوتا جس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ خدا نے استجابت دعا کا وعدہ کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو امور ہونے والے ہیں وہ مقدر ہیں یعنی علم الٰہی میں ہیں اور جو نہیں ہونے والے ہیں وہ بھی علم الٰہی میں ہیں۔ ان مقدرات کے ہرگز برخلاف نہیں ہوسکتا پس اگر استجابت دعا کے معنی سوال کا پورا ہونا قرار دیئے جائیں تو خدا کا یہ وعدہ کہ ادعونی استجب لکم[1] ان سوالوں پر جن کا ہونا مقدر نہیں ہے کسی طرح صادق نہیں آسکتا۔ مضمون ادعونی استجب لکم کا وعدہ عام ہے اور اس میں کوئی چیز اور کوئی شخص مستثنےٰ نہیں ہے اور جبکہ یہ ثابت ہے کہ حصول سوال منحصر مقدر پر ہے

[1] مجھ سے مانگو کرمیں تمہاری سنونگا۔ (محمد مقدم)

تو استجابت دعا کا وعدہ جو خدا نے کیا ہے وہ کوئی معنی رکھتا ہے" اور پھر آپ نے اُس کے معنی بھی آئندہ چلکے بیان فرماتے ہیں۔ کہ استجابت دعا کی ٹھیک مراد عبادت کے قبول کرنے اور انسان کے دل میں جو حالت کہ صدق دل سے عبادت کرنے میں پیدا ہوتی ہے اُس کے پیدا ہونے کی ہوئی" اور اس تقریر سے آپ نے گویا ثبوت اس قول کا فرمایا جو ابتدا رسالہ میں آپ نے لکھا ہے کہ "دعا کے معنی ندا کے ہیں خدا کو پکارنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا اور اُس کو حاضر سمجھنا اور اس کے الٰہ اور معبود برحق ہونے کا اقرار کرنا دعا ہے۔ اور جو شخص کہ اس طرح پر خدا کو پکارتا ہے خدا اُس کو قبول کرتا ہے" اور یہی معنی آیت قال ربکم ادعونی استجب لکم اور آیت واذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوالی ولیومنوبی لعلھم یرشدون" کے آپ نے لئے ہیں۔ یہ بیان آپ کا جیسا کہ میں اپنے پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں ایک طرح سے نہایت صحیح اور درست ہے۔ اور اس بیان میں آپ ہی منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ چھ سو برس پہلے اسی خیال کو امام محی الدین بن عربی بھی ظاہر کر چکے ہیں چنانچہ اُنہوں نے فتوحات مکیہ کے پانچ سو تینتیسویں باب میں آیت "واذا سألك عبادی عنی فانی قریب الخ" کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا ہے اُسے میں نقل کرتا ہوں۔ وہ اول اشعار لکھتے ہیں پھر مضمون، میں ان سب کو بیان کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص درگاہ الٰہی میں حاضر ہو اُس کے لئے

ان الدعا مجاب من لا یشھد	دعا مجاب ہے یہی بات حق ہے ایسی کہ
ھذا ھو الحق الذی لا یجحد وھو القریب	اس سے انکار نہیں ہو سکتا اور خداوند تعالےٰ
بعلمه وبعینه وھو الذی فی کل حال یشھد	اپنی ذات اور اپنے علم سے قریب ہے۔
لکنه لما دعاك دعوته من قبل ذا اعطاك	اور وہی حال ہے کہ ہر حال میں موجود ہے لیکن
ھذا الشھد فاذا علمت فانه عن الذی	جب اُس کی دعوت نے مجھے طلب کیا اس
یدعو فمن ندعوه او من نقصد فادعوه	وجہ سے تجھ کو یہ مقام حضوری عطا کیا۔ جب
امر لا تکن ممن یری الدعا وا لجاب	تو نے جان لیا کہ وہ وہی ہے جو دعا کرتا ہے
لا بعد ثم اخبر انه یجیب سوال	پھر کس کو تو پکارتا ہے اور کس کا تو قصد کرتا ہے
السائلین فھو اخبار بان بیده ملکوت	اسی سے مانگ ہر ایک امر اور ان لوگوں میں سے
کل شیء واخبر بالاجابة لیتحفظ	مت ہو۔ جو دعا کو بڑا [illegible] سمجھتے ہیں۔
السائل ویراقب ما یسأل فیه لانه لا بد له	خداوند تعالےٰ نے خبر دی ہے کہ وہ سائلین کا
من الاجابة فقد یسأل العبد فیما لا خیر له	سوال قبول فرماتا ہے پس یہ خبر ہے اس امر کی

فیه لجهله بالمصالح فهو تنبیه من الله و
تحذیر ان لا یسئل الا فیما یعلم ان له فیه
الخیر الوافر عند الله فی الدنیا والآخرة
فمن اخذ هذه الآیة علی جهة التنبیه فلا
یسأل الله تعالی فی حاجة من حوائج الدنیا
علی التعیین ولکن یسأل فیما له خیر فیه مما
یعلمه الله مبهما لا یعین فاذا عین لابد فلیشا
فیه الخیرة وسلامة الدین واما تعیینه فی
السؤال فیما یرجع الی امر الدین فلیعین
ما شاء ولا مکر فیه ولا غائلة وکذلک ما
یسأل فیه مما یتعلق بالآخرة ولکن هنا
شرط ابینه فی هذا الذکر من اجل ما نری
فی الواقع من عدم الاجابة لاکثر الناس فیما
یسألون فیه ربهم فاعلم ان الله اخبر
انه یجیب دعوة الداع اذا دعاه وما دعاه
ایاه الا عین قوله حین ینادیه باسم من
اسمائه فیقول یا الله او یا رب او یا ذا الجلال
والاکرام وما اشبه ذلک فالدعاء نداء وهو
تابع بالله فالاجابة هی القدر الذی هو
الدعوة وبها سمی داعیا ان یلبیه الحق
فیقول لبیک فهذا لا بد منه من الله
فی حق کل سائل ثم ما یاتی بعد هذا النداء
فهو خارج عن الدعاء وقد وقعت الاجابة
کما قال فیوصل بعد النداء من الحوائج ما
قام فی خاطره مما شاء فلم یضمن فی هذا
الذکر اجابته فیما سئل فیه ودعاه من اجله
فهو ان شاء قضی حاجته وان لم یشأ لم یفعل

کہ خداوند تعالےٰ کے قبضۂ قدرت میں ہر امر کی
بادشاہی ہے اور نیز خداوند تعالےٰ نے اجابت
کی خبر دی تاکہ سائل اپنے حال کا تحفظ کرے
اور جس کا سوال کرنا ہے اس میں تامل کرے
اس لیئے کہ ہر سوال کی اجابت ضروری ہے
اور بندہ کبھی ایسی چیزیں طلب کرتا ہے جس
میں اس کی بہتری نہیں ہوتی بوجہ اس کے کہ
وہ مصالح امور کو نہیں جانتا پس خداوند تعالیٰ
کا خبر دینا اجابت کا یہ تنبیہ اور تحذیر ہے اس
بات کی کہ بندہ کسی قسم کا سوال نہ کرے مگر ان
امور کا جن کو جانتا ہو کہ ان کے مانگنے میں دنیا
اور آخرت کی بھلائی اللہ کے پاس میرے
لئے رکھی ہے پس جو شخص کہ اس آیت کو
تنبیہ کے طور پر پڑھیگا تو وہ خدا تعالےٰ سے
اپنی کسی اجابت کو دنیا کی حاجتوں میں سے
معین کر کے نہ مانگیگا بلکہ ان امور کا سوال
کریگا جن کی بہتری خداوند تعالےٰ نے اس کو
مبہم طور پر بتلا دی ہو اور تعیین کے طور پر
سوال میں خیریت اور سلامتی دین کو ضرور
ہی طلب کریگا اور ان امور میں جن کا مرجع
دین کی طرف ہے ان کو معین کر کے مانگنا سو
جو چاہے سو مانگے اس لئے کہ دین میں کوئی
ایسی بات نہیں ہے کہ جس میں کوئی خرابی یا
نقصان ہو اور ایسے ہی وہ امور جن کا تعلق
آخرت سے ہے لیکن یہاں ایک شرط ہے کہ
میں اس کو بیان کرتا ہوں اس وجہ سے کہ تم
اکثر لوگوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنے رب سے

ولهذا ما كل مسئول فيه يقتضيه الله تعالىٰ وذلك رحمة بعبده فانه قد يسأل فيما لا خير له فيه فلو ضمن الاجابة في ذلك لوتم ويكون فيه هلاكه في دينه وآخرته وربما في دنياه من حيث لا يشعرون فكرمه انه ما ضمن الاجابة في الدعاء خاصة كما بيناه وهذا غاية الكرم من السيد في حق عباده حيث ابقى عليهم ؁

سوال کرتے ہیں اور قبول نہیں ہوتا۔ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالے نے خبر اس بات کی دی ہے کہ وہ داعی کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اُس سے دُعا کرے اور داعی کی دعا خدا سے خاص اُس کا وہ قول ہے جو دعا کرنے کے وقت اس کے ناموں میں سے کوئی نام لیکر پکارتا ہے یعنی مثلاً کہتا ہے یا اللہ۔ یا رب یاذوالجود والکرم۔ اور مثل اس کے۔

پس دُعا بمعنی ندا ہے یعنی خداوند تعالے کا متوجہ کرنا پس اجابت اسی قدر دعا کے لیئے چاہیئے اور اسی دعوت کی وجہ سے اُس کو داعی کہتے ہیں اور وہ اجابت یہ ہے کہ خداوند تعالے اس کے پکارنے کا جواب دے اور وہ جواب یہ ہے کہ جب بندہ کہتا ہے یا اللہ تو خداوند تعالے فرماتا ہے لبیک یعنی میں موجود ہوں کیا کہتا ہے پس ہر سائل کے لئے خداوند تعالے کیطرف سے اس قدر جواب ہونا ضروری ہے اور دعا کے بعد جو ذکر کرتا ہے وہ دعا سے خارج ہے۔ جیسے کسی بندہ نے کہا یا اللہ تو اس کی اجابت ہو چکی اب ندا کے بعد اپنی حاجات ڈالی ہیں۔ یہ جو چاہتا ہے ملتا ہے پس اس آیت کی اجابت میں خداوند تعالے نے اُن چیزوں کو کہ جن کا سوال کرتا ہے اور جن کی وجہ سے اس نے ندا کی تھی شامل نہ فرمایا۔ پس اللہ تعالے کو اختیار ہے کہ چاہے اُس کی حاجت کو پورا کرے اور چاہے نہ کرے۔ اسی لئے یہ نہیں ہے کہ جو خدا سے سوال کیا جاوے اُس کو خداوند تعالے پورا ہی کرے اور یہ بندہ کے حال پر رحمت ہے اس لئے کہ بسا اوقات ایسی شئے طلب کرتا ہے جس میں بہتری نہیں ہوتی پس اگر اجابت اس صورت کو شامل ہوتی تو جو سوال کر رہا ہے وہ ہوتا اور اس کے ہونے میں بندہ کی دین اور آخرت کی ہلاکی ہوتی اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں ہلاکی ہوتی ہے اور بندہ کو خبر نہیں ہوتی پس خداوند تعالے کا یہ خاص کرم ہے کہ اس نے اجابت کو ہر سوال میں شامل نہ فرمایا اور اجابت کو خاص دعا کے ہی لئے رکھا۔ جیسے کہ ہم ابھی بیان کر چکے۔ اور یہ نہایت ہی کرم ہے آقا کی طرف سے اپنے بندوں کے حق میں کہ اس حکم کو اُن پر باقی رکھا۔ انتہٰی ؁

پھر باب پانچسو چھپن میں جہاں اسماء حسنے کی تشریح امام موصوف نے کی ہے المجیب کی شرح میں اجابت کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ مجیب ہو جس وقت کہ اللہ تعالے مجھ کو

كن مجيبا اذا الاله دعاكا
وسميعا لما دعاك مطيعا

ثم اعلم ان الاجابة على نوعين اجابة
امتثال وهي اجابة الخلق لما دعاء اليه الحق و
اجابة امتنان وهي اجابة الحق لما دعاه اليه
الخلق فاجابة الخلق معقولة واجابة
الحق منقولة لكونه تعالى اخبر بها عن نفسه
واما اتصافه بالقرب في الاجابة فهو
اتصافه بانه اقرب الى الانسان من حبل
الوريد فنسبة قربه من عبده قرب
الانسان من نفسه اذا دعا نفسه لامر ما
تفعله فتفعله فما بين الدعاء والاجابة
الذي هو السماع زمان بل زمان الدعاء
زمان الاجابة فقرب الحق من اجابة عبده
قرب العبد من اجابة نفسه اذا دعا
ها ثم ما يدعوها اليه يشبه في الحال
ما يدعو العبد ربه اليه في حاجة مخصوصة
فقد يفعل له ذلك وقد لا يفعل كذلك
دعا العبد نفسه الى امر ما فقد يفعل ذلك
الامر الذي دعاه اليه وقد لا يفعل لامر
عارض يعرض له

پکارے اور جس شے پکارتا ہے اُس کو سن
اور فرمانبرداری کر۔ پھر جاننا چاہیئے۔ کہ
اجابت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اجابت امتثال
ہے یعنی خلق کا قبول کرنا جس وقت کہ حق
تعالے ان کو اپنی طرف بلاوے دوسری اجابت
امتنان ہے یعنی خداوند تعالے کا قبول کرنا
جب خلق اس کو پکارے پس اجابت
خلق تو معقول ہے اس وجہ سے کہ
خداوند تعالے نے اجابت کی خبر دی ہے
کہ میں قبول کرونگا۔ اور خداوند تعالے کا
اجابت میں قرب سے متصف ہونا ایسا ہے
جیساکہ اُس کا متصف ہونا اس قرب سے
کہ وہ انسان سے اس کی رگِ گردن سے
زیادہ قریب ہے پس اس کی نسبت بندہ
سے قریب ہونے کی ایسی ہے جیسے انسان
کا قریب ہونا اپنے نفس سے اس وقت کہ انسان
اپنے نفس کو کسی کام کے کرنے کے لئے
متوجہ کرے جو نہ کرتا ہو۔ پس دعا اور اجابت
میں جو معنی سُننے کے ہے زمانہ نہ ہوگا۔
بلکہ جو دعا کا زمانہ ہے وہی اجابت کا زمانہ
ہے پس اپنے بندہ کی اجابت سے

خداوند تعالے کا قریب ہونا ایسا ہے جیساکہ بندہ کا اپنے نفس کی اجابت سے قریب ہونا
جبکہ انسان نفس کو کسی کام کے لئے متوجہ کرے۔ پھر بندہ کا نفس کو اپنی طرف متوجہ کرنا اس
حال کے مشابہ ہے کہ بندہ اپنے رب کو ایک حاجت خاص میں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور
اس کو پکارتا ہے تو خداوند تعالے کبھی اُس کی حاجت کے مطابق کر دیتا ہے اور کبھی نہیں کرتا
ایسے ہی بندہ کا اپنے نفس کو کسی امر کی طرف رغبت دلانا ہے کہ نفس کبھی اُس کو مان جاتا ہے جس
کی طرف رغبت دلاتا ہے اور کبھی نہیں مانتا بوجہ کسی امر کے جو بیچ میں پیش آجاتا ہے۔ انتہٰے

مولانا معنوی نے بھی اسی مضمون کو ایک حکایت کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

آں یکے اللہ می گفتے شبے — تا کہ شیریں گردد از ذکرش لبے
گفت شیطانش خمش اے سخت رو — چند گوئی آخر اے بسیار گو
ایں ہمہ اللہ گفتی از عتو — خود یکے اللہ را لبیک کو
می نیاید یک جواب از پیش تخت — چند اللہ می زنی با روئے سخت
او شکستہ دل شد و بنہاد سر — دید در خواب او خضر را در خضر
گفت ہیں از ذکر چوں وا ماندۂ — چوں پشیمانی ازاں کش خواندۂ
گفت لبیکم نمی آید جواب — زاں ہمی ترسم کہ باشم رد باب
گفت خضرش کہ خدا گفت ایں بمن — کہ برو با او بگو اے ممتحن
گفت آں اللہ تو لبیک ماست — ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست
نے ترا در کار من آوردہ ام — نے کہ من مشغول ذکرت کردہ ام
حیلہا و چارہ جوئیہائے تو — جذب ما بود و کشاد آں پائے تو
ترس و عشق تو کمند لطف ماست — زیر ہر یارب تو لبیکہاست
چونکہ نالہ زار بے شکر و گلہ — افتد اندر ہفت گردوں غلغلہ
ہر دمے صد نامہ صد پیک از خدا — یا ربے زد شصت لبیک از خدا

اس سے بلاشبہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس دعا کی اجابت کا خدا نے حتمی وعدہ فرمایا ہے وہ صرف اُس کو پکارنا ہے، اور اس سے یہ اعتراض غلط ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہر دعا کی اجابت کا وعدہ کیا ہے اور سوال کے پورا نہ کرنے سے اُس کے وعدہ کا خلف لازم آتا ہے اور ہم کو کسی بندہ کے کلام سے استدلال کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کی کہ ہر دعا کی اجابت کا وعدہ خدا نے نہیں کیا خود خدا نے اپنے کلام میں دوسری جگہ بیان فرما دیا ہے جس سے دعا کی اجابت کا مقید اور مشروط ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امام فخرالدین رازی آیت "واذا سألک عبادی عنی فانی قریب" کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ایک مشہور مشکل سوال ہے وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا مانگو میں قبول کرونگا اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جس وقت کہ وہ مجھ سے مانگے

فی الآیۃ سوال مشکل مشہور وھو انہ تعالیٰ قال ادعونی استجب لکم وقال فی ھذہ الآیۃ اجیب دعوۃ الداع اذا

دعان وکذالک ام من یجیب المضطر اذا
دعاه ثم انا نری الداعی یبالغ فی الدعاء
والتضرع فلا یجاب والجواب ان هذه
الاية وان کانت مطلقة الا انه قد وردت
اٰیة اخری مقیدة وهو قوله تعالی بل ایاه
تدعون فیکشف ما تدعون الیه ان شاء
ولا شک ان المطلق محمول علی المقید ثم
تقریر المعنی فیه وجوه احدها ان الداعی
لا بد وان یجد من دعائه عوضا اما اسعافا
بطلبته التی لاجلها دعا وذلک اذا وافق
القضاء فاذا لم یساعده القضاء فانه
یعطی سکینة فی نفسه وانشراحا فی صدره وصبرا
یسهل معه احتمال البلاء الحاضر وعلی کل حال
فلا یعدم فائدة وهو نوع من الاستجابة و
ثانیها ما روی القفال فی تفسیره عن ابی
سعید الخدری قال قال رسول الله صلی الله
علیه وسلم دعوة المسلم لا ترد الا لاحدی
ثلاث ما لم یدع باثم او قطیعة رحم اما ان
یعجل له فی الدنیا واما ان یدخر له فی الاخرة
واما ان یصرف عنه من السوء بقدر ما دعا
وهذا الخبر تمام البیان فی الکشف عن هذا
السؤال لانه تعالی قال ادعونی استجب لکم
ولم یقل استجاب له او فی الاخرة کان الوعد
صادقا وثالثها ان قوله ادعونی استجب
لکم یقتضی ان یکون الداعی عارفا
بربه والا لم یکن داعیا له بل لشیء متخیل
لا وجود له البتة فثبت ان شرط الداعی ان

اور ایسے ہی فرمایا ہے کہ کون ہے کہ جب
مضطر دعا کرے اور وہ اس کی دعا قبول
کرے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ داعی دعا و تضرع
میں نہایت ہی مبالغہ کرتا ہے اور قبول نہیں
ہوتی۔ جواب یہ ہے کہ یہ آیت اگرچہ مطلق ہے
مگر دوسری آیت مقید نازل فرمائی اور وہ یہ
ہے "بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون
الیہ ان شاء" کہ خدا ہی سے دعا مانگو کہ وہ جو
کچھ اس سے مانگو گے اگر چاہے گا پورا فرمائیگا۔
اور اس میں شک نہیں کہ مطلق مقید پر
محمول ہوا کرتا ہے اب معنوں کی تقریر اس میں
کئی طرح پر ہے اول یہ کہ داعی کے لئے ضرور ہے
کہ اپنی دعا کا عوض پائے یعنی اس کا سوال
پورا کر دیں جس کے لئے اس نے دعا مانگی اور
یہ جبھی ہوگا بشرطیکہ دعا قضا کے موافق ہوگی۔ اگر
قضا موافق نہ ہوئی تو داعی کے نفس میں تسکین
اور سینہ میں انشراح ہوگا اور صبر اس پر
آسان ہوگا۔ اس لئے کہ احتمال ہے کہ
طلب کے ساتھ کوئی مصیبت ہو۔ پس
ہر حال فائدہ سے خالی نہ ہوگا اور یہ بھی ایک
طرح کی اجابت ہے۔ دوسرے یہ کہ قفال
نے اپنی تفسیر میں ابی سعید خدری سے
روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ مسلمان کی دعا رد نہیں ہوتی تین
باتوں میں سے ایک ضرور ہوتی ہے جب
تک کہ کسی گناہ کے لئے یا قطع رحم کے
لئے دعا نہ کرے ۔

يكون عارفا بربه ومن صفات الرب سبحانه ان لا يفعل الا ما وافق قضاءه وقدره وعلمه وحكمته فاذا علم العبد ان صفة الرب هكذا استحال منه ان يقول بقلبه وبعقله يارب افعل الفعل الفلاني لا محالة بل لا بد وان يقول افعل هذا الفعل ان كان موافقا لقضائك وقدرك وحكمتك وعند هذا يصير الدعاء الذي دلت الآية على ترتيب الاجابة عليه مشروطا بهذه الشرائط وعلى هذا النقض بهذا السؤال"۔

۱۔ یا تو دنیا ہی میں اُس کی دعا کی اجابت جلد ہو جاتی ہے۔

۲۔ یا اس کے لئے آخرت میں جمع کر دی جاتی ہے۔

۳۔ یا بقدر اُس کی دعا کے اُس سے بُرائی دُور کر دی جاتی ہے پس اس حدیث سے اس سوال کا پورا پورا جواب حاصل ہو گیا اس لئے خداوند تعالےٰ نے فرمایا کہ مجھ سے دعا مانگو میں قبول کرونگا اور یہ نہیں فرمایا کہ ابھی قبول کرتا ہوں پس جب اس کی دعا قبول فرمائی اگرچہ آخرت ہی میں ہو تو وعدہ سچا ہوا۔ تیسرے یہ کہ قول خداوندی "ادعونی استجب لکم" چاہتا ہے کہ داعی اپنے رب کا عارف ہو ورنہ اس سے دعا کرنے والا نہ ہوگا بلکہ ایک شے متخیل ہوگی کہ جس کا وجود نہ ہو پس ثابت ہوا کہ داعی کی شرط یہ ہے کہ اپنے رب کو پہچانتا ہو اور اللہ سبحانہ کی صفات میں سے یہ بات ہے کہ وہ کسی کام کو نہیں کرتا جب تک کہ اس کی قضا اور قدر اور علم اور حکمت کے مطابق ہو۔ جب بندہ نے جان لیا کہ میرے رب کی صفت یہ ہے تو محال ہے کہ اپنے قلب اور عقل سے یہ کہے کہ اے رب فلانے کام کو ضرور ہی کر دے بلکہ یوں عرض کرے کہ اس کام کو کر دے اگر تیری قضا اور قدرت اور حکمت کے مطابق ہو پس اس وقت وہ دعا جس کی ترتیب اجابت پر آیت میں دلیل ہے ان شرائط کے ساتھ مشروط ہوگی۔ اس تقدیر پر سوال جاتا رہا اور اشکال مرتفع ہوا" انتہٰے۔

سوائے اس کے جس طرح پر قرآن مجید سے انبیا کی اکثر دعاؤں کا قبول ہونا پایا جاتا ہے اسی طرح اُس سے بعض دعاؤں کا مقبول نہ ہونا بلکہ بعض پر زجر و تنبیہ کا ہونا بھی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ میں اپنے پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ جس وقت حضرت موسےٰ نے دعا کی "رب ارنی انظر الیک" تو چونکہ یہ دعا خدا کے درجہ عزت اور جلال اور جمال کے شایاں نہ تھی اس کا یہ جواب ملا "لن ترانی" اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر معذرت کرنے اور یہ کہنے لگے کہ "سبحانک تبت الیک وانا اول المومنین"۔ اسی طرح جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے بچانے کے لئے دعا کی کہ "رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق و انت احکم الحاکمین" اس میں حضرت نوحؑ نے غلطی کی اور خدا کے وعدہ کو تمام دعاؤں کے

قبول کرنے کے اوپر محمول کرکے اپنے نا اہل فرزند کے بچانے کی دعا جس کے جواب میں بجائے قبول کرنے دعا کے خدا نے فرمایا "یانوح انہ لیس من اہلک انہ عمل غیر صالح" کہ اے نوح یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ یہ صالح نہیں ہے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس موقع پر تنبیہ بھی فرمائی کہ میرا وعدہ غلط نہیں ہوتا یہ خود تیری غلطی ہے کہ جو تو میرے وعدہ کو ایسا سمجھا ہے اور جس چیز کا تجھے علم نہیں ہے اس کا تو سوال کرتا ہے "فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم انی اعظک ان تکون من الجاہلین" پس یہ ارشاد صاف بندوں کو متوجہ کرتا ہے اس بات پر کہ وہ ایسا سوال ہی نہ کریں اور نہ جاہلانہ دعاؤں کے قبول ہونے کی امید رکھیں۔ اور جاہلانہ دعائیں کیا ہیں خدا سے ہر چیز کی جو اس کی مشیت اور اس کی قضا وقدر کے خلاف ہے۔ قبول ہونے کی امید رکھنا، بلکہ ہر دعا میں پہلے ہی سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو دعا اس کی مشیت اور اس کی قضا وقدر کے موافق ہوگی وہی قبول ہوگی۔ نہ یہ کہ جو دعا بندہ کریگا اور جو سوال وہ خدا سے مانگے گا وہ موافق اس کی نفسانی خواہش کے قبول ہوگی۔

اگر آپ اپنے رسالہ الدعا والاستجابہ اور تفسیر میں دعا کو اسباب حصول مقصود سے خارج نہ کرتے تو مجھے آپ کی دعا اور اجابت کے معنی میں کچھ اعتراض نہ ہوتا۔ میرا اعتراض آپ پر فقط یہ ہے کہ آپ نے دعا کو صرف ایک رخ سے دیکھا ہے۔ اور اس سے صرف ایک پہلو کو جو کہ نہایت عارفانہ اور موحدانہ ہے اختیار کیا ہے باقی دوسرے پہلوؤں کو چھوڑ دیا ہے اور آپ کی تحریر کا مطلب میری سمجھ میں اور شاید سب پڑھنے والوں کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ آپ عموماً دعا سے امر مسئول عنہ کو خارج کرتے ہیں اور سوائے اسباب کے مسبب الاسباب سے دعا کے قبول ہونے عقیدہ نہیں رکھتے[۱] اور یہ عقیدہ آپ کا میرے نزدیک غلط ہے۔ سب سے زیادہ وہ خیال جو آپ کے مطابق ہے وہ ہے جو حضرت محی الدین بن عربی نے ظاہر کیا ہے اور جسے میں اوپر لکھ چکا ہوں مگر وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ دعا اسباب حصول مقصد سے نہیں ہے اور نہ وہ یہ کہتے ہیں کہ مطلب تو صرف اسباب کے جمع کرنے ہی سے حاصل ہوگا دعا نہ اس کے اسباب میں سے ہے۔ نہ اس اسباب کی جمع کرنیوالی ہے جس کا نتیجہ گویا یہ ہوتا ہے کہ خدا سے کوئی حاجت مانگنا ہی نہ چاہئے۔ اور وہ حاجت کو پورا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک دوسرے موقع پر انہوں نے دعا کے مقبول ہونے کو صاف

[۱] الدعا الی اللہ عندنا فرض فرضہ اللہ علینا کما فرض الصلوٰۃ الخمس ولا یا عند الدعا حیۃ ولا اضطرار ولا شک انہ مجیب الدعوات ولا نبالی ما سئل عنہ مع الدعا یعطی ام لا۔ (سید محمد)

صاف قبول کیا ہے۔ اور دعا کرنے میں اوقات کی رعایت کی ہدایت فرمائی ہے۔ فتوحات مکیہ کے آخری باب پانچ سو ساٹھ میں فرماتے ہیں کہ "دعا کرنے میں اوقات کی رعایت

وعلیک بمراعاۃ الاوقات فی الدعاء مثل الدعاء عند الاذان وعند الحرب وعند افتتاح الصلوٰۃ فان المطلوب من الدعاء انما ھو الاجابۃ فیما وقع السئول فیہ من اللہ واسباب القبول کثیرۃ وتنحصر فی الزمان والمکان والحال ونفس الکلمۃ التی تذکر اللہ بھا من الذکر حین تدعوہ فی مسئلۃ فانہ اذا اقترن واحد من ھذہ الاربعۃ بالدعاء اجیب الدعاء واقوی ھذہ الاربعۃ الاسم ثم الحال

ضرور کرنی لازم ہے۔ جیسے اذان کے وقت۔ اور جہاد کے وقت اور نماز کے شروع کرنے کے وقت دعا کرنا۔ اسلئے کہ دعا سے مقصود یہ ہے کہ جن چیزوں کے لئے سوال کیا ہے ان میں اجابت ہو۔ اور قبول ہونے کے لئے اسباب بہت ہیں اور وہ منحصر ہیں زمانہ اور مکان اور حال اور خاص اس کلمہ میں جسکو تو اپنے سوال میں دعا کے وقت ذکر کرتا ہے پس اگر ان چار میں سے ایک بھی دعا کے ساتھ مل جائیگا تو دعا مقبول ہوگی۔ اور ان چاروں میں سب سے زیادہ قوی اللہ تعالےٰ کا نام ہے۔ پھر داعی کی حالت ہے۔ یہاں امام محی الدین بن عربی نے صاف صاف فرمایا ہے "فان المطلوب من الدعاء انما ھو الاجابۃ فی ما وقع السوال فیہ من اللہ" "المطلوب دعا سے قبول ہونا اس سوال کا ہے جو خدا سے کیا گیا ہو اور پھر اس پر فرماتے ہیں کہ "واسباب القبول کثیرۃ" کہ قبول کے اسباب بہت ہیں" فانہ اذا اقترن واحد من الاربعۃ بالدعاء اجیب الدعاء" کہ جس وقت کوئی ان اسباب قبول سے دعا متصل ہوگی وہ دعا قبول کی جائیگی یعنی وہ مطلوب حاصل ہوگا۔ اگر آپ بھی اس بات کو اسی طرح بیان فرماتے تو مجھے آپ سے پھر کچھ مخالفت نہ ہوتی۔ یہ اعتراض کہ بہت سی دعائیں قبول نہیں ہوتیں جیسا کچھ سخت اور مشکل خیال کیا جاتا ہے درحقیقت ویسا نہیں ہے اس لئے کہ خدا نے نہ سب دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے نہ کسی آیت سے قرآن مجید کے اس وعدہ کا ثبوت ہوتا ہے۔ بلکہ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے دعا کی اجابت مقید اور مشروط ہے البتہ اس پر یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر سب دعائیں قبول نہیں ہوتیں تو دعا کرنے سے حاصل کیا ہے۔ چنانچہ یورپ کے علما جو تمام چیزوں میں تجربہ اور محسوسات اور واقعات کو دیکھتے ہیں دعا کے مسئلہ کو بھی اپنی تحقیقات سے نہیں چھوڑا۔ اور منکرین دعا نے نہ صرف قیاس اور خیال سے کام لیا بلکہ مثل اور چیزوں کے دعا کے نتائج بھی علم الاعداد سے ظاہر کرنے کا ارادہ کیا، تاکہ تحقیقات سے بذریعہ رقوم اور ہندسوں

کہ اس بات کو ثابت کیا جائے کہ جس قدر دعائیں نامقبول ہوئی ہیں اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے بمقابلہ ان دعاؤں کی تعداد کے جو مقبول ہوئی ہیں۔ چنانچہ ایک عالم جیلٹ کالج فیلو ترینیٹی کالج ڈبلن اپنے لکچروں میں جو ۱۸۳۸ء میں چھپے ہیں اس عجیب تجربہ کی نسبت لکھتا ہے کہ یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہسپتالی تجربہ کیا جائے یعنی ایک ہی ہسپتال کے دو حصوں کو جدا جدا کیا جائے اور ان میں ایک ہی قسم کے بیمار بھیجے جائیں اور بہت احتیاط ان بیماروں کے تقسیم کرنے میں کی جائے۔ اور برابر برابر دونوں جدا جدا علاقوں میں رکھے جائیں ایک حصہ کے بیماروں کے لئے مذہبی آدمیوں سے کہا جائے کہ وہ بیماروں کی صحت کے لئے دعا مانگیں اور دوسرے حصہ کے بیماروں کو بغیر دعا کے چھوڑ دیں۔ اور پھر یہ دیکھا جائے کہ کس قدر فی صدی بیمار دعاؤں سے اچھے ہوئے اور کتنے بغیر دعا کے۔ اگرچہ معلوم نہیں ہوتا کہ خاص اس معاملہ کا تجربہ کیا گیا۔ مگر مسٹر گیلٹن اور دیگر مصنفین نے ایسے اعداد جمع کئے ہیں جو بحیثیت مجموعی دعا کے اصول کے خلاف ہیں مثلاً مسٹر گیلٹن کہتے ہیں کہ جتنے جہاز مشنریوں کے سمندر میں جاتے ہیں۔ وہ بھی بحساب اوسط ویسے ہی غرق ہوتے ہیں جیسے دیگر جہاز۔ اور بہت بے شمار مثالیں ایسی دعاؤں کے ملنے کی بیان کی گئی ہیں جو مقبول نہیں ہوئیں اور مقبول دعاؤں کی مثالیں ایسی شاذ و نادر ہیں کہ نامقبول دعاؤں کی بے شمار مثالوں کے سامنے ان کا گویا شمار ہی نہ کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ایک منکر دعا سے ایک مذہبی آدمی نے منت کی وہ تختیاں جو شکستہ جہاز کے ملاحوں نے اپنی جان بچنے کے شکریہ میں اور دعا کے قبول ہونے کے ثبوت میں نصب کی تھیں دکھا کر یہ کہا کہ دیکھو یہ خدا کی قدرت اور دعا کی اجابت کی کیسی نمایاں علامتیں اور کیسی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ منکر دعا نے اس کے جواب میں کہا کہ ان مظلوم بچوں اور عورتوں اور جوانوں اور بوڑھوں کی تختیاں کہاں نصب ہیں جن کو ڈوبنے سے پہلے جس قدر مہلت ملی تھی وہ دعا میں خرچ کی اور جنہوں نے موت کی خوفناک صورت دیکھ کر خدا کا دامن پکڑا اور جن کا خدا سمندر کی لہروں اور دریا کی موجوں کے پنجوں سے ان کو نہ بچا سکا مگر درحقیقت بہت سی دعاؤں کا مقبول نہ ہونا بھی دعا کے موثر اور مفید ہونے کے عقیدہ کو باطل نہیں کرتا۔ اس لئے کہ نیچر کا عمل جیسا کہ جسمانی عالم میں ہے ویسا ہی روحانی عالم میں بھی ہوتا ہے وہ لوگ جو صرف تدبیر کے قائل ہیں اور صرف ظاہری اسباب کے جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور جو ہر عقل کے نتیجہ کے معتقد ہیں، وہ بھی جس وقت مادی عالم کو دیکھیں تو اس بات کو قبول کریں گے کہ ان کے مادی عمل بھی بہت سے ضائع بیکار اور غیر منتج ہوتے ہیں

کتنے بیج زمین میں ڈالے جاتے ہیں، اور اُن میں سے کتنے بارآور ہوتے ہیں اور کتنا بڑا حصہ اس کا ضائع اور بیکار جاتا ہے، مگر باوجود اس کے کوئی اُن ضائع شدہ بیجوں کو ضائع اور غیر مفید نہیں سمجھتا۔ بلکہ نہ صرف خدا کے ماننے والے بلکہ صرف نیچر ہی پر اعتقاد رکھنے والے بھی اس بات کو مانتے ہیں، کہ جو بیج زمین پر ڈالا جاتا اور جو بظاہر ضائع معلوم ہوتا ہے اس کا بھی کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے، اور خدا کے ماننے والے تو اس پر یقین کرتے ہیں کہ ایک دانہ بھی ان دانوں میں سے جو زمین پر ڈالا گیا بیکار نہیں ہوتا اور کسی دوسرے مقصد کے لیئے خدا کا کوئی فرشتہ اُسے اُٹھا کرلے جاتا ہے۔ غرضکہ جب کہ نہ نیچر میں نہ مذہب میں کوئی ایسی شے مانی جاتی ہے جس کو تضیع عمل کہہ سکیں، اور مادی عالم میں کوئی عمل باوجود ضائع ہونے کے ضائع نہیں سمجھا جاتا، تو روحانی عالم میں روحانی عمل جن میں سے ایک دعا بھی ہے صرف ظاہری اثر پیدا نہ ہونے کی وجہ سے کیوں ضائع سمجھی جاوے، اور باوجود مینی شہادت کے کہ نیچر میں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا اور کائنات میں تضیع عمل کوئی چیز نہیں ہے اور انسان کے ہر عمل اور ہر کام کا کوئی ظاہری یا پوشیدہ نتیجہ ہوتا ہے کیوں ہم مذہبی آدمی ہو کر اس بات کا یقین نہ رکھیں کہ دعا بھی ضائع نہیں ہوتی اور وہ بھی بیکار اور بے مصرف نہیں جاتی۔ پس بعض دعاؤں کا قبول نہ ہونا دعا کے خلاف پر درحقیقت کوئی کافی اور عمدہ دلیل نہیں ہے وانك لتعلم یا سیدی ان الموجودات کلها مستندة الی ارادة الله وقدرته وعنایته التی هی علمه بوجه الخیر فی النظام وارتباط اجزاء النظام بعضها ببعض وترتب المسببات علی الاسباب۔ فاعلم ان من اسباب حصول الفعل ووجوده بعد تعلق علمه وقدرته وارادته واختیاره تکون الدعاء والطلب من الله والالحاح والتضرع من جملة اسباب الانجاح وحصول المراد والمقترح باذن الله۔ وهو الذی جعل الدعاء سببا لوجود المطلوب کما جعل سبب صحة المریض شرب الدواء۔

محسن الملک

میں اس خط کو اب تمام کرتا ہوں آپ کے دوسرے اعتراض سے جو تعلق تقدیر اور دعا کے ہے آیندہ خط میں بحث کرونگا۔

آٹھواں خط

مقام بمبئی ۲۶۔ اگست ۱۸۹۵ء

جناب عالی۔ اب میں آپ کے دوسرے اعتراض سے جو دعا کی نسبت ہے بحث کرتا ہوں۔ آپ اپنے رسالہ الدعاء والاستجابۃ میں فرماتے ہیں کہ "استجابت دعا کے معنی اُس سوال کے پورا کر دینے کے قرار دئے جائیں تو دوسری مشکل یہ پیش آتی ہے کہ جو امور ہونے والے ہیں وہ مقدر ہیں یعنی علم الٰہی میں ہیں اُن مقدرات کے برخلاف ہرگز نہیں ہو سکتا پس اگر استجابت دعا کے معنی سوال کا پورا ہونا قرار دئے جائیں تو خدا کا یہ وعدہ کہ "ادعونی استجب لکم" ان سوالوں پر جن کا ہونا مقدر نہیں ہے کسی طرح صادق نہیں آسکتا۔" یہ ایک پرانا اعتراض ہے جو ہمیشہ سے دعا پر ہوتا رہا ہے۔ اور اسلام کے علماء اور حکماء نے اپنے اپنے مذاق کے موافق اس کے جواب دئے ہیں۔ امام فخرالدین رازی نے اس اعتراض کو اس طور پر بیان فرمایا ہے کہ "دعا سے اگر ایسی شے مطلوب ہے۔ جس کا وقوع میں آنا خدا کے علم میں تھا۔ تو وہ ضرور واقع ہوگی دعا سے کیا فائدہ۔ اور اگر ایسی چیز مطلوب ہے جو ہرگز وقوع میں نہ آئیگی تو اس کا طلب کرنا بھی دعا سے بیکار اور عبث ہے" دوسرا اعتراض یہ ہے۔ کہ دنیا میں جس قدر حوادث ظہور میں آتے ہیں ان کے سلسلہ کا ایک موثر قدیم پر ختم ہونا ضرور ہے، اور نہ یا تو تسلسل لازم آئیگا یا دور، یا حوادث کا بغیر کسی موثر کے وقوع میں آنا۔ اور یہ سب محال ہے پس جب ان حوادث کے سلسلہ کا موثر قدیم پر منتہی ہونا ضروری ثابت ہوگیا، تو یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اس موثر قدیم نے اپنے قدیم اور ازلی ارادہ سے جس حادثہ کا وقوع میں آنا چاہا وہ ضرور واقع ہوگا۔ اور جس کا واقع ہونا اُس نے

احدها ان المطلوب بالدعاء ان
كان معلوم الوقوع عند الله تعالیٰ كان
واجب الوقوع فلا حاجة الى الدعاء و
ان كان غير معلوم الوقوع كان ممتنع
الوقوع فلا حاجة ايضا الى الدعاء و
ثانيها ان حدوث الحوادث فی هذا العالم
لا بد من انتهائها بالآخرة الى المؤثر القديم
الواجب لذاته والا لزم اما التسلسل
واما الدور واما وقوع الحادث من
غير موثر وكل ذلك محال واذا ثبت
وجوب انتهائها بالآخرة الى المؤثر القديم
فكل ما اقتضى ذلك المؤثر القديم وجوده
اقتضاء قديما ازليا كان واجب الوقوع
وكل ما لم يقتض المؤثر القديم وجوده

اقتضاء قدیما ازلیا کان ممتنع الوقوع ولما
ثبتت هذه الامور فی الازل لم یکن للدعاء
البتة اثر ولم عبروا عن هذا الکلام بان
قالوا الا قدر سابقة ولا قضیة متقدمة
والدعاء لا یزید فیها وترکه لا ینقص شیئا
منها فای فائدة فی الدعاء ۔ وقال علیه الصلوة
والسلام قدر الله المقادیر قبل ان یخلق الخلق
بکذا وکذا عاما وروی عنه علیه الصلوة
والسلام انه قال جف القلم بما هو کائن ۔
وعنه علیه الصلوة والسلام انه قال
اربع قد فرغ منها العمر والرزق والخلق
والجواب انها متناقضة لان اقدام
الانسان علی الدعاء ان کان معلوم الوقوع
فلا فائدة فی اشتغالکم بابطال الدعاء وان
کان معلوم العدم لم یکن لی انکارکم حاجة ثم
نقول کیفیة علم الله تعالی وکیفیة قضائه
وقدره غائبة عن العقول والحکمة الالهیة
تقتضی ان یکون العبد معلقا بین الرجاء
والخوف اللذین بهما تتم العبودیة وبهذا الطریق
صححنا القول بالتکالیف مع الاعتراف باحاطة
علم الله بالکل وجریان قضائه وقدره فی الکل
وبهذا الاشکال سألت الصحابة رسول الله
صلی الله علیه وسلم فقالوا ارأیت اعمالنا هذه
لشیء قد فرغ منه ام امر یستأنف فقال بل
شیء قد فرغ منه فقالوا ففیم العمل اذن
قال اعملوا فکل میسر لما خلق له فانظر الی
لطائف هذا الحدیث فانه علیه السلام علقهم

اپنے ازلی اور قدیم ارادہ سے نہ چاہا وہ ہرگز
واقع نہیں ہوسکتا۔ اور جبکہ یہ امور ازل میں
مقرر ہوچکے ہیں تو دعا کیا اثر کرتی ہے۔ اس
مطلب کو اس طرح بھی بیان کرتے ہیں کہ
قضا و قدر کا پہلے ہی تعین ہوچکا ہے دعا
اس کو زیادہ نہیں کرتی اور نہ دعا نہ کرنے سے
اس میں کمی ہوتی ہے۔ پس دعا سے کیا فائدہ
ہے چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ خدا نے دنیا کے پیدا کرنے سے بہت پہلے
تقدیروں کو معین کر دیا ہے! ور فرمایا کہ جو کچھ
ہونے والا ہے اس کو لکھ کر قلم خشک ہوچکا
ہے اور نیز آنحضرت نے فرمایا کہ چار چیزیں
ایسی ہیں کہ جو مقرر ہوچکیں ہیں۔ زندگی روزی
انسان کی فطرت اور اس کی عادتیں۔ اس کا
جواب امام صاحب یہ دیتے ہیں کہ" اس تقریر
میں تناقض ہے کیونکہ انسان کا اگر دعا پر متوجہ
ہونا خدا کے نزدیک معلوم الوقوع ہے تو دعا
کے ابطال میں کوشش کرنا بے فائدہ ہے
اور اگر معلوم الوقوع نہ تھا تو انکار کرنے کی کیا
ضرورت ہے اور نیز ہمارے نزدیک خدا کا
علم اور اس کے قضا و قدر کی کیفیت
انسانوں کی عقل سے پوشیدہ ہے اور خدا کی
حکمت اس بات کی مقتضی ہے کہ بندہ امید و بیم
کے درمیان رہے انہیں دونوں سے عبودیت
کامل ہوتی ہے اسی طریق پر انسان پر مکلف
ہونا ثابت ہوسکتا ہے۔ اور ہمارے اس اعتقاد
میں کچھ فرق نہیں آتا کہ خدا کا علم تمام

بين الامرين فرهبهم ما بين افراط المفوضة و غير منه ثم الزمهم العمل الذي هو منه رحمة العين فلم يبطل ظاهر العمل بما يفيد من القضاء والقدر ولم يترك احد الامرين للآخر واخبران فائدة العمل هو القدر المفروغ منه فقال كل ميسر لما خلق له يريد انه ميسر في ايام حياته العمل الذي سبق له القدر قبل وجوده الا انك يجب ان تعلم ههنا فرق ما بين الميسر والمسخر فتاهب لمعرفته فانه بمنزلة مسئلة القضاء والقدر وكذا القول في باب الكسب والرزق فانه مفروغ في الاصل لا يزيده الطلب ولا ينقصه الترك ۔

اشیاء پر محیط اور اس کی قضا وقدر سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اصحاب نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اسی مشکل سوال کا جواب طلب کیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ کیا یہ تمام اعمال مقدر ہو چکے ہیں یا ہر وقت نئے پیدا ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مقدر ہو چکے ہیں۔ اصحاب نے عرض کیا پھر اب عمل سے کیا فائدہ ہے آپ نے فرمایا تم عمل کئے جاؤ جن اعمال کی قابلیت انسان میں ہے وہ آسانی سے اس کو کر سکتا ہے[1] اس حدیث کے لطائف پر غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دو حالتوں کے درمیان معلق رکھا۔ تقدیر الٰہی سے جو معین ہو چکی ہے ان کو ڈرایا اور عمل کو بھی ان پر لازم کیا جو صمیم عبودیت ہے ظاہری عمل کو قضا وقدر کے بھروسہ پر ترک کرنے کا حکم نہیں دیا اور بتایا کہ عمل کا فائدہ ہے وہی تقدیر معین اس قول سے کہ کل میسر لما خلق لہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تھا کہ ہر شخص اپنی زندگی میں وہی عمل کر سکتا ہے جو اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان میسر ہے مسخر نہیں یعنی اپنی فطرت کے موافق آزادی سے ہر کام کر سکتا ہے خدا کی طرف سے اس پر کوئی دباؤ نہیں یہ مسئلہ گویا قضا وقدر کے مسئلہ کی مانند ہے اور کسب اور رزق کے بارہ میں بھی یہی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ دونوں مقدر ہو چکے ہیں طلب کرنے سے رزق زیادہ نہیں ہوتا اور نہ طلب کرنے سے اس میں کمی ہوتی ہے۔

ملا صدر الدین شیرازی نے اسفار اربعہ میں اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ شبہ اس طرح دفعہ کیا جا سکتا ہے کہ دعا اور طلب بھی منجملہ امور مقدرہ کے ہیں اور مطالب مقدرہ

واما الاشكال بان ما يرام بالسؤال عاد والطلب السؤال والالحاح لا نفاع فيه

حاصل ہونے کے لئے جیسے اور امور علتیں اور شرائط ہیں انہیں میں سے دعا

[1] وہ مضمون جو ما شاء اللہ عز وجل کے عنوان سے آپ نے ربیع الاول کے تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے گویا اس حدیث کی نہایت تحقیقات سے بھرا ہوا شرح ہے واللہ درک علی اللہ اجرک ۔ منہ عفی عنہ

واعطاء فعلم ان كان مما جرى قلم القضاء
لا انه بتقدير وجوده وارتسم لوح القدر
الالٰهي بتصوير ثبوته فالحاجة الى تكلف
الطلب فيه وتجشم السوال له وان لم
يجر به القلم ولم ينطبع به اللوح فلم الدعاء
وما فائدة الطلب لما يمتنع فيه حصول
المدعا ونيل المبتغى فمنهم من اجاب بان الطلب
والدعاء ايضاً مما جرى به قلم القضاء
وانطبع به لوح القدر من حيث انهما
من العلل والشرائط لحصول المطلوب
المقضي والمقدر وبالجملة فكلما قضي
وقدر لحصول امر من الامور فقد قضي
وقدر حصول اسبابه وشرائطه والا فلا
اذا اراد الله شيئاً هيأ اسبابه ومن جملة
الاسباب لحصول الشئ المدعو له ورود دعاء
الداعي وتضرعه واستكانته بل نسبة
الادعية والتضرعات الى حصول المطالب
ونيل المآرب في الاعيان كنسبة الافكار
والتاملات الى حصول النتائج والعلوم
في العقول والاذكار حبل من حبال
بحار القضاء وساقية من سواقي انهار القدر
(اسفار اربعه)

هو الدعاء لا ينافي القضاء كما
بيناه في كتبنا الحكمية وعن ميسر بن
عبد العزيز عن ابي عبد الله قال قال لي
يا ميسر ادع ولا تقل ان الامر قد فرغ
منه ان عند الله عز وجل منزلة لا تنال الا

بھی ہے جس امر کو خدا نے مقدر کیا ہے تو
اُس کے ساتھ ہی یہ بھی مقدر ہے کہ اُس امر
کے موجود ہونے کی جتنی علتیں اور شرائط
ہیں وہ بھی موجود ہونگی والا فلا۔ خدا تعالٰے
جس چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس
کے تمام اسباب مہیا کر دیتا ہے، اور اشیاء
کے حاصل ہونے کے جیسے اور اسباب ہیں ایسے
ہی دعا کرنے والے کی دعا اور عاجزانہ
حالت بھی ہے بلکہ دعا اور عاجزی کو حصول
مطالب سے ایسی نسبت ہے جیسے وجود
عقل اور ذہن میں فکر و تامل کو نتائج علمی سے
تعلق ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ دعا بھی بحر حکم
الٰہی کی ایک نہر ہے اور نہر قضاء الٰہی کا ایک
شعبہ ہے۔"

شرح اصول کافی میں اس شبہ کی نسبت
ملا شیرازی یہ لکھتے ہیں کہ "دعا قضا کے
منافی نہیں ہے جیسا کہ ہم اپنی حکمت کی
کتابوں میں بیان کر چکے ہیں میسر بن عبدالعزیز
نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے
یہ روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اے
میسر دعا کئے جا اور یہ نہ کہہ کہ جو کام ہونے والا
ہے وہ ہو چکا یعنی قضاء الٰہی کے موافق جو
ہونا ہے وہ ہوگا، اس لئے کہ خدائے
عزوجل کے نزدیک بعضے درجے ایسے ہیں
کہ وہ وہاں تک بغیر مانگنے کے نہیں پہنچ سکتا
اور اگر کوئی بندہ اپنا منہ بند کر لے۔ اور نہ
مانگے تو اسے وہ چیز نہ دی جائے گی۔ پس

بمسئلة ولو ان عبدا اسد فاه لم يسأل لم يعط شيئا فسل تعط يا ميسر انه ليس من باب يقرع الا يوشك ان يفتح لصاحبه فقد ظهر من كلامه ان الدعاء سبب من اسباب حصول المبتغى فكون الشئ متوقفا على سببه لا ينافي كونه مما قضى الله حصوله اذ كما جرى في القضاء حصوله فقد جرى ايضا حصول هذا السبب وكونه سببا عنه. ومن سخيف ما قاله بعض الظاهريين المتكلمين انه لا فائدة في الدعاء لان المطلوب ان كان معلوم الوقوع عند الله تعالى كان واجب الوقوع والا فلا يقع لان الاقدار السابقة والاقضية واقعة وقد جف القلم بما هو كائن فالدعاء لا يزيد ولا ينقص فيها شيئا وهذا ظن فاسد وقول سخيف صادر عن جاهل لا يعرف الحقائق عن مواضعها واصولها فان الدعاء مما يقاوم القضاء لا من حيث انه فعل العبد فانه من هذه الحيثية مما يحكم فيه القضاء لانه لو لم يقض عليه ان يدعو لم يكن يدعو ولكن من حيث ما علمنا الله عز وجل قال ادعوا ربكم فان الدعاء من هذه الحيثية انما ينبعث حيث ينبعث القضاء فلا تسلط للقضاء عليه فان كلا منهما من الله ولسان العبد والحالة هذه ترجمان الدعاء لا انه داعي بنفسه ولكن بامر الله عز وجل وكل من فعل شيئا بامر احد فيه لا بد الا امره كما امر الملك بعض خدامه ان يضرب ابنا للملك فان

مانگ جو مانگنا ہو کہ وہ تجھے ملیگی اے میسر کوئی دروازہ ایسا نہیں ہے کہ جو ٹھوکا جائے اور وہ نہ کھولا جائے پس امام علیہ السلام کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا ایک سبب ہے اسباب حصول حصول مقصد سے پس کسی چیز کا موقوف ہونا اپنے سبب پر اس بات کا مزاحم نہیں ہے کہ وہ قضا الٰہی میں لکھا جا چکا ہے اس واسطے کہ جس طرح قضا الٰہی اس پر بھی جاری ہو چکی ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کا سبب ہوگا۔" پھر ملا صدر الدین اسی مضمون کو اپنے طور پر دوسری طرح ادا کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ "دعا کو اس لئے فضول سمجھنا کہ جو کچھ ہونا ہے وہ ضرور ہوگا دعا سے نہ کوئی چیز کم ہوتی ہے نہ زیادہ، ان جاہلوں کا فاسد گمان اور بیہودہ قول ہے جو حقائق کو اپنے مواضع اور اصولوں سے نہیں پہچانتے دعا قضا کی مقاومت اس لئے نہیں کرتی کہ وہ بندہ کا فعل ہے اس لئے کہ اس حیثیت سے قضا اس پر حکومت کرتی ہے اگر قضا الٰہی دعا کرنے کیلئے نہ ہوتی تو داعی دعا ہی نہ کرتا بلکہ دعا قضا کے موافق ہے اس حیثیت سے کہ خدا نے ہم کو اس کی تعلیم کی ہے اور دعا کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے اس حیثیت سے دعا اسی جگہ سے نکلتی ہے جہاں سے قضا کا نفوذ ہوتا ہے پس دعا اور قضا دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں پس بندہ کی زبان اور اس کی

ید خادم والحالة هذه ید الملك ولو كان
العبد یده لم یستطع ان یمدها الی ابن
الملك ولبیت دون ذلك یده وانما
لتعلم ان الدعاء لا یحكم علی الله وانما
یحكم علینا والله غالب علی امره فاذا كان
الدعاء موصول الاصل بالموضع الذی
یتصل به القضاء فالقضاء والدعاء سواء
فیتعادلان والحكم لما غلب ومن غلب
سلب هذا ما ذكره بعض المحققین

حالت ترجمان حال ہے کیونکہ اپنی طرف سے
خود دعا نہیں کی بلکہ خدا کے حکم سے۔ اور
جو کوئی کسی کے کہنے سے کچھ کرے تو اس کا کرنا
گویا حکم دینے والے کا کرنا ہے، جس طرح
بادشاہ اگر اپنے بعض ملازموں کو اپنے بیٹے
کے مارنے کا حکم دے تو خادم کا ہاتھ اور یہ
حالت گویا خود بادشاہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور
اس حیثیت سے خادم کا ہاتھ اس کے بیٹے
پر اٹھتا ہے ورنہ اگر ہاتھ خادم ہی کا ہاتھ سمجھا
جائے تو کبھی اسے قدرت نہیں ہو سکتی کہ وہ بادشاہ کے بیٹے کی طرف اٹھ سکے غرضکہ یہ بات
صاف معلوم ہے کہ دعا خدا پر اثر نہیں کرتی بلکہ خود ہم پر۔ واللہ غالب علی امرہ۔ اور جبکہ دعا کی
اصل وہی ہے جو قضا کی جڑ ہے تو قضا اور دعا دونوں برابر ہیں۔

علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں اس شبہ کے جواب میں یہ لکھا ہے۔ والسبب
العقلی فیه ان كیفیة علم الله وقضائه غیر معلومة للبشر غائبة عن العقول والحكمة
الالهیة یقتضی ان یكون العبد معلقا بین الخوف والرجاء اللذین بهما تتم العبودیة
وبهذا الطریق صححنا القول بالتكالیف مع الاعتراف باحاطة علم الله تعالی و
بجریان قضائه وقدره فی كل وما روی عن جابر انه جاء سراقة بن مالك بن جعشم
فقال یا رسول الله بیّن لنا دیننا كانا خلقنا الان ففیم العمل الیوم فیما جفت به الاقلام
وجرت به المقادیر ام فیما یستقبل قال بل فیما جفت به المقادیر قال ففیم العمل
قال اعملوا فكل میسر لما خلق له وكل عامل بعمله مبنیه علی ما قلنا فان النبی صلی الله علیه
وسلم علقهم بین الامرین رهبهم بسابق القدر ثم رغبهم فی العمل ولم یترك احد الامرین
للآخرین فقال كل میسر لما خلق له یرید انه میسر فی ایام حیاته للعمل الذی سبق له
القدر قبل وجوده الا انك یجب ان تعلم الفرق بین المیسر والمسخر كیلا تغرق فی لجة القضاء والقدر
وكذا القول فی باب الرزق والكسب الحاصل ان الاسباب والوسائط والروابط معتبرة
فی جمیع امور هذا العالم ومن جملة الوسائط والوسائل فی قضاء الاوطار الدعاء والالتماس
كما ان شاهد فان الله سبحانه قد جعل دعاء العبد سببا لبعض مناجحه فاذا كان كذلك
فلا یرد ان یدعو حتی یصل الی مطلوبه لم یكن شیء ان ذلك خارجا عن قانون القضاء

السابق و ناعجا للکتاب لمہلودا لقی کلزمہ اس کا مطلب وہی ہے جو امام رازیؒ اپنی تفسیر میں بیان کر چکے ۔

اُن بیانات سے جو اوپر نقل کئے گئے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے اور گو خداوند تعالٰے نے تمام چیزوں کو مقدر کر دیا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہوگا ۔ مگر ہمارے عمل اور کسب اور محنت کو خاص دخل ہے اور ہم ہر چیز کے لئے اسباب پیدا کرنے پر مجبور اور مجبول ہیں ۔ اور چونکہ وہ چیز جسے تقدیر کہتے ہیں پردہ میں چھپی ہوئی ہے ہمارے افعال اور اعمال اس کے ظاہر کرنے والے ہیں اس لئے ہم کو ہر چیز کے لئے خواہ جسمانی ہو یا روحانی عالم شہادت سے تعلق ہو یا عالم غیب سے اُسی سڑک پر چلنا لازم ہے جو خدا نے ہمارے واسطے بنا دی ہے تاکہ ہم منزل مقصود پر پہنچیں وہ سڑک کیا ہے اپنی محنت و کسب سے اسباب مہیا کرنا مگر نہ صرف اسباب پر قانع رہنا اور اُس پر بھروسہ کرنا بلکہ مسبب الاسباب کی طرف ہمیشہ خیال رکھنا ۔ اور اس قوت کا جو ہر چیز میں اپنا کام کرتی ہے پیش نظر رکھنا اور اسی کو ہر سبب پر مقدم سمجھنا ۔ اور چونکہ پوشیدہ اسباب بہت سے ایسے ہیں جو ہم کو معلوم نہیں ہیں ، اور مسبب الاسباب کا تعلق اسباب کے ساتھ ایسا ہے جس کا راز ہم سے پوشیدہ ہے اس لئے بحیثیت ایک مذہبی آدمی ہونے کے ہم کو اپنے عمل میں کامیاب ہونے اور ان اسباب کے مہیا کر دینے کے لئے جو حصول مقصود کے لئے ہیں مسبب الاسباب سے رجوع کرنا ، اس سے بمنت دعا عاجزی اور گریہ و زاری سوال کرنا اور دعا مانگنا ، نہایت ضرور اور لازمی ہے ۔ اگر ہم تقدیر پر اس طرح بھروسہ کریں کہ جو ہونا ہے وہ خود ہوگا ، اور دعا کو یہ سمجھیں کہ یہی ہمارے مقاصد کے لئے کافی اور یہی ہماری حاجتوں کے لئے پورا ہونے کا ذریعہ ہے ، ہم ایک جاہل مسلمان اور خدا کی سنت اور عادت سے ناواقف اور اُس کے احکام کے برخلاف چلنے والے ہونگے اور اگر ہم صرف اسباب پر قانع مسبب الاسباب سے بے خبر اور دعا کو ان اسباب کی جمع کرنے والی چیزوں میں سے نہ سمجھیں جو حصول مقصود کے لئے ضروری ہیں ، تو ہماری علمی زندگی ایک بریہ یا لااد ریہ سے بدتر ہوگی وہ سیدھا رستہ جو ہم کو منزل مقصود پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ دعا کو ہم صرف اقوال اور الفاظ اور خیالات ہی پر محدود نہ سمجھیں ، بلکہ افعال اور اعمال کسب اور محنت سے علمی دعا کو قولی اور خیالی دعا سے ملا دیں یعنی اسباب کے جمع کرنے کی کوشش کریں اس لئے کہ دنیا عالم اسباب ہے اور اس میں کامیابی کے لئے خدا سے دعا کریں اس لئے کہ وہ مسبب الاسباب ہے ۔ اور اسباب کا جمع کرنا اور ان سے نتائج پیدا کرنا اُس کے اختیار میں ہے ۔ اور چونکہ ہم کو معلوم نہیں ہے کہ جسے تقدیر کہتے ہیں اس میں ہمارے لئے کیا رکھا ہے

اس لئے دعا اس کے ظاہر کرنے کے لیے ویسا ہی ایک ذریعہ ہے جیسا کہ ہمارا عمل ہمارا کسب پس ہم دعا اس لئے نہیں کرتے کہ جو کچھ خدا نے اپنے ارادہ اور مشیت سے ہمارے لئے مقدر کر دیا ہے اُسے وہ بدل دے اور ہمارے ارادہ اور خواہش کو اپنی مشیت اور مرضی پر مقدم کرے۔ بلکہ دعا سے یہ مقصود ہے کہ جو اس کی مرضی اور مشیت ہو اور اُسکے نزدیک جو ہمارے حق میں مفید ہو اُسے وہ ہمارے لئے ظاہر کرے اس سے نہ اسباب کا ترک کرنا لازم آتا ہے اور نہ اس دنیا کو ایک غیر منتظم عالم سمجھنا نہ تقدیر کی مخالفت اس سے مقصود ہے نہ خدا کی مرضی و مشیت کا اس سے پلٹنا منظور۔ اس لئے کہ جب ہم خدا سے دعا کریں گے۔ تو ہم اپنے آپ کو خدا کا جاننے اور ماننے والا بھی سمجھیں گے اور جب ہم خدا کے جاننے اور ماننے کا دعوےٰ کریں گے تو اس کے ساتھ ہم کو اس بات کا ماننا بھی لازم ہوگا۔ کہ ہماری مصلحت کو ہم سے بہتر جانتا ہے اور اپنی مرضی او مشیت ہمارے لئے بدل نہیں سکتا۔ اس یقین پر بھی اگر ہم اپنے اغراض نفسانی کو مقدم سمجھیں اور خدا سے اپنی دعا کے منظور ہونے پر اصرار کریں اور نامقبول ہونے کی صورت میں اس سے خفا ہو جائیں۔ اور اس سے بغاوت کرنے لگیں تو درحقیقت ہم نہ مسلمان ہوں گے نہ خدا پر ایمان رکھنے والے پس درحقیقت جو شخص خدا کے ماننے والا اور پکا مسلمان اور خدا سے دعا کرنے والا ہوگا وہ وہی کہے گا اور وہی خیال رکھیگا جو انبیا اور صدیقین اور شہدا اور صالحین کہتے آئے اور سمجھتے رہے ہیں کہ لا ابالی اصبحت غنیا او فقیرا فانی لا ادری ایھما خیرلی۔ اور اسی لئے سچے مسلمان دعا سے پہلے دعا کی توفیق پانے کی دعا کرتے رہتے ہیں توفیق کیا چیز ہے۔ بندہ کا ارادہ خدا کی قضا کے ساتھ مل جانا اور خدا سے وہی چیز مانگنا جو اس کی مرضی کے مطابق ہے۔ پس توفیق پہلی چیز ہے جو انسانی روح کو مشورہ دیتی ہے۔ کہ کیا چیز اس کو مانگنی چاہیئے۔ یعنی دعا کی اس شکل کو بتاتی ہے جس کا مانگنا نہ قانونِ قدرت کا شکست کرنا ہے نہ ارادہ الٰہی کا منسوخ کرنا، نہ تقدیر کے برخلاف کسی چیز کا ہونا لیکن چونکہ ہم نہیں جانتے کہ یہ قانون کیا ہے اور ارادہ الٰہی کیا ہے، اور تقدیر میں کیا لکھا ہے ان چیزوں کو ہم اسی وقت جان سکتے ہیں جب ان کا ظہور ہو پس دعا خود ایک نعمت ہے خدا کی طرف سے اور نیک دعا کی توفیق ایک خاص عطیہ ہے دعا کے سننے والے کی طرف سے پس جب کہ خدا پر ایمان رکھنے والے کی رائے دعا کے متعلق ایسی ہو تو دعا اس کی بجائے قوانین قدرت کے بدلنے اور اسباب سے کنارہ کرنے اور تقدیر کے خلاف خواہش کرنے کے درحقیقت قوانین قدرت اور عالم اسباب اور تقدیر الٰہی کے استحکام کے عقیدہ پر مبنی ہوگی۔ اگر ایک مسلمان دعا کرنے والا اس یقین واثق کے ساتھ دعا کرے کہ جس چیز کا میں سوال کرتا ہوں وہ مجھ کو مل جائیگی تو

ضرور ہے کہ اس یقین کی بنا اس امر پر ہوگی کہ جو کچھ میں مانگتا ہوں وہ ارادہ الٰہی اور تقدیر ایزدی کے مطابق ہے۔ غرضکہ جس طرح ہم مادی عالم میں اپنے اختیاری کام کرنے میں اس سبب سے کوتاہی نہیں کرتے کہ جو کچھ مقدر میں ہے وہ ضرور ہوگا بلکہ اپنے اور کسب و محنت کو تقدیر الٰہی کے ظاہر کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ تو کیا سبب ہے کہ یہی خیال اور یہی عمل ہمارا روحانی عالم میں قائم نہ رہے اور وہاں اس خیال سے کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ہوگا دعا کرنا چھوڑ دیں۔ جس طرح اس عالم شہادت میں تقدیر ایزدی کا ظہور ہمارے افعال پر منحصر ہے اس طرح کیوں ہم اس بات کو نہ مانیں کہ ہمارے بعض مقاصد دعا کرنے پر مشروط ہیں اور جبکہ تمام چیزیں ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں اور ہمارا علم اس جسمانی عالم کی نسبت بھی نہایت محدود اور ناقص ہے تو ہم روحانی عالم میں جو پوشیدہ اسباب اور خفیہ اسرار ہیں اور جو تعلق خدا کو بندوں کے ساتھ اور بندوں کو خدا کے ساتھ ہے اور دعا میں جو اثر اس نے رکھا ہے اس کا کیوں انکار کریں اور مذہبی آدمی ہو کر ان چیزوں سے جن کا ثبوت مذہب سے ہوتا ہے کیوں منکر ہوں"

"اعلم یا سیدی ان الدعاء غیر مناقض لقضاء اللہ تعالیٰ فان اللہ تعبد العباد بالدعاء لیکون مبدا لتواتر مزایا اللطف وکما ان حمل الکوز وشرب الماء لیس مناقضا للرضاء بقضاء اللہ تعالیٰ فی العطش وشرب الماء طلبا لازالۃ العطش ومباشرۃ سبب رتبہ مسبب الاسباب فکذلک الدعاء سبب رتبہ اللہ تعالیٰ وامر بہ وان التمسک بالاسباب جریا علی سنۃ اللہ تعالیٰ لیس مناقضا للرضاء بقضاء اللہ تعالیٰ" اگلے خط میں دیگر مذہبی اعتراضات کا جو دعا پر کئے گئے ہیں بیان کرونگا ٭

محسن الملک

تمت بالخیر

۱۰ر جولائی سنہ ۳۴ء

الخطبات الاحمدیہ فی العرب و السیرۃ المحمدیہ

اس کتاب میں ایک دیباچہ اور بارہ خطبے شامل ہیں۔ دیباچہ میں یہ بحثیں ہیں۔ مذہب کیا چیز ہے؟ سچے مذہب کے پرکھنے کا سچا اصول کیا ہے؟ اسلام صحیح طور پر کن احکام کا مجموعہ ہے۔ ان کتابوں پر بحث جو عیسائی اور مسلمانوں نے آنحضرت کی زندگی کے حالات پر لکھی ہیں۔ سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کا ذکر جس کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ خطبہ اول عرب کا جغرافیہ۔ عرب کے قبائل اور سلاطین پر محققانہ بحث۔ لفظ سارا سن کی تحقیق حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے حالات پر محققانہ بحثیں۔ حضرت ہاجرہ کی حریت پر بحث۔ خطبہ دوم عرب جاہلیت کی رسوم و عادات بت پرستی حجر اسود اور خانہ کعبہ کا ذکر۔ حج زمانہ جاہلیت میں رسوم ازدواج۔ خطبہ سوم۔ عرب جاہلیت کے ادیان پر بحث نہایت تفصیل سے اسلام کی مناسبت دیگر اسلامی مذاہب سے۔ خطبہ چہارم انسان کے لئے رحمت اور تمام انبیا کے مذاہب کی پشت و پناہ ہے۔ اسلام انسانی تمدن کے مطابق ہے۔ کثرت ازدواج۔ طلاق اور غلامی پر محققانہ بحثیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں سے مذہب کو اسلام سے کیا فائدہ پہنچا۔ خطبہ پنجم مسلمانوں کی مذہبی کتابوں پر محققانہ بحث۔ خطبہ ششم مذہبی روایتوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر مدلل بحث۔ خطبہ ہفتم قرآن مجید کی جمع و ترتیب اور نزول پر بحثیں۔ خطبہ ہشتم خانہ کعبہ کی مفصل تاریخ۔ خطبہ نہم آنحضرتؐ کے نسب نامہ پر محققانہ بحث۔ شجرہ نسب آنحضرتؐ مع شجرہ نسب مصنف کتاب۔ خطبہ دھم بشارات نسبت آنحضرتؐ کے جو توریت و انجیل میں ہیں۔ خطبہ یازدھم روایات شق صدر و معراج کی تحقیق۔ خطبہ دوازدھم جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت سے بارہ برس تک کے حالات ٭

اس کتاب کے شروع میں مرحوم سرسید کی رنگین عکسی تصویر بھی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوش خط اعلےٰ درجے کے کاغذ پر طبع کی گئی ہے ٭

قیمت بلا جلد ۳ے

قیمت مجلد ۳ے ۱۲

مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید احمد خان صاحب مرحوم و مغفور

مصنف مرحوم علیہ الرحمۃ کا مبارک نام ہی اس مجموعہ کی خوبی اور اوصاف کی نسبت کافی شہادت ہے۔ اور اس کی توصیف اور تعریف میں کچھ بھی لکھنا سراسر بے ادبی اور اُس کی کسر شان ہے۔ سرسید مرحوم کے مبارک نام اور اُن کے مشن (مدعا) سے شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ مسلمان ایسا ہو جو واقف نہ ہو۔ جو بیش بہا کارنامے اس مرحوم و مغفور نے اسلامی سلف کی ترقی تعلیم اور ہر قسم کی بہبودی کی خاطر اپنی گرانبہا زندگی میں کئے۔ ابھی اس قابل ہیں کہ رہتی زمانہ یا آئندہ ہر ایک قسم کے قومی کاموں کی تمہید اس کے مبارک نام سے تبرکاً و تیمناً شروع ہو چنانچہ عموماً مرحوم و مغفور کا ذکر خیر کسی نہ کسی طرح سے اس قسم کے جلسوں میں آنا شروع ہو گیا ہے ٭

اس کتاب مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید میں مرحوم کی تمام عرق ریزی شروع سے لیکر اختتام تک دیکھی پڑی ہے جیسا کہ انہوں نے مختلف طریقے سے مسلمانوں کی حالت گمنام کو رو باصلاح کرنے کی خاطر کوشش کی ویسا ہی یہ لکچرز بھی بےنظیر دل اور دماغ کے طرح طرح کے نتیجوں سے مملو ہیں۔ جو شخص اس مرحوم ہیرو کی اولوالعزمی استقلال صبر و تحمل۔ بردباری انکساری اور عالی حوصلگی نیرنگیاں جو ہر ایک پہلو سے وقتاً فوقتاً منہ دکھاتی رہی ہیں اندازہ کرنا چاہے۔ قوم اور قومی ہمدردی اور ملک کی بہتری اسلام کی حمایت سچی دلسوزی صاف بیانی اور اعلےٰ درجہ کی زبان اردو کی تحریر و تقریر۔ تہذیب اخلاق کا بیمثل نمونہ بننے کے لئے اپنی آئندہ زندگی میں ان سے اچھا سبق سیکھنا چاہے اُس کے واسطے اس مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سے بڑھکر کوئی ناصح مشفق اور رہبر کامل نہیں ہو سکتا۔ لقمان کی حکمت! ارسطو کا فلسفہ اور شکسپیر کی فصاحت اس کے آگے معمولی قرار دی جا سکتی ہے ٭

یہ بے بہا ذخیرہ زمانہ حال کی دینی اور دنیوی بہتری کیلئے ہی عزیز تر نہ ہوگا۔ بلکہ جوں جوں ضروریات آنے والی نسلوں کو پیش آئیں گی۔ خود بخود یہ مجموعہ عزیز تر ہوگا۔ ملکی و قومی لائبریریوں کی زیب و زینت ہوگا۔ عام پبلک جلسوں میں اس کے تذکرے نہایت شوق سے ہوا کرینگے۔ بڑے بڑے لکچرار اس مجموعہ سے مدد لیں گے۔ اردو لٹریچر کے سیکھنے والے اس سے سند لیا کریں گے۔

غرضیکہ یہ بےنظیر مجموعہ بےنظیر ہے بےنظیر ہے ٭

اس کے شروع میں مرحوم سرسید کی عکسی رنگین تصویر ہے اور ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۸۹۸ء تک کے کل لکچرز اس میں نہایت محنت سے جمع کر دئے ہیں! اور وہ لکچرز بھی اس میں ہیں جن کا اکثر سرسید مرحوم کے دوستوں نے آج تک نام تک سنا ہوگا۔ ۴۰۰ صفحے۔ نہایت اعلےٰ درجہ کا کاغذ۔ عمدہ چھپائی۔ خوش خط لکھائی۔ نیز اس سے پہلے جس قدر مجموعے لکچرز لوگوں نے چھاپے ہیں۔ وہ بالکل نامکمل ہیں ٭

قیمت بلا جلد ۳ے

قیمت مجلد للعہ

تہذیب الاخلاق مکمل

تہذیب الاخلاق جلد اول

یعنی عالیجناب نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب مرحوم نواب منیر نواز جنگ مصنف کتاب آیات بینات وغیرہ کے مضامین جو رسالہ تہذیب الاخلاق میں چھپے تھے آغاز اجرائے تہذیب الاخلاق تا اختتام ہر سہ جلد یہ وہی مضامین ہیں جنہوں نے مسلمانوں میں اپنی صداقت سے ایک تہلکہ ڈال دیا تھا اور یہ وہی مضامین ہیں جن کی تلاش ایک مدت سے خیرخواہان قوم و ملک کو تھی مگر افسوس کہ ان کو میسر نہ آتے تھے۔ ہم نے نہایت کوشش سے بہم پہنچا کر شائع کرنے ہیں۔ کتاب بہت عمدہ ولایتی کاغذ پر چھپی ہے۔ اور اس میں آٹھ نہایت دلچسپ مضامین ہیں۔ اگر کوئی شخص اسلام سے واقفیت حاصل کرنی چاہے یا اردو انشا پردازی اور معلومات کا ذخیرہ جمع کرنا چاہے۔ تو اس سے بہتر اور کوئی کتاب اس کے لئے نہیں۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات - - - - - - - - قیمت للعہ

تہذیب الاخلاق جلد دوم

عالیجناب آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خان صاحب بہادر بالقابہ کے گذشتہ ہفت سالہ تہذیب الاخلاق کے مضامین جن کی قوم کو از حد ضرورت تھی۔ از ابتدائے ۱۲۸۷ھ لغایت ۱۲۹۳ھ تک چھپکر تیار ہیں۔ اس میں سرسید کے وہ مضامین ہیں۔ جن کے پڑھنے سے ایک قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ تعداد میں یہ مضامین ایک کم سو ہیں۔ اخلاقی اور تمدنی مضامین کا مخزن ہیں۔ اسلامی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک کورس مضامین نگاری کے لئے اتالیق۔ اردو لٹریچر کی جان۔ یہ ہی دلچسپ مضامین ہیں جن کی مقبولیت سے سرسید کو کامیابی ہوئی۔ یہ ہی سچے اور بے لوث آرٹیکل ہیں جنہوں نے سرسید کا بول بالا کیا۔ مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا۔ اسلام اور اسلامی ہمدردی کا سبق دیا۔ ان مضامین کے پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصلاح قوم میں سرسید کو کس قدر ہلکانیں اور تکلیفیں پیش آئی ہیں مفصل حالات کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہونگے۔ اہل ملک کو عموماً اور اہل اسلام کو خصوصاً اس کتاب کے مطالعے کی کہاں تک ضرورت ہے۔ یہ امر کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو جاویگا۔ ایک ضخیم کتاب ہے جو ۶۴۰ صفحات پر نہایت خوش خط اور عمدہ چھپ کر تیار ہے۔ - - - - - قیمت سے

تہذیب الاخلاق جلد سوم

یعنی عالیجناب نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب بہادر مرحوم کے جملہ مضامین مندرجہ تہذیب الاخلاق ہفت سالہ از ابتدائے ۱۲۸۷ھ لغایت ۱۲۹۳ھ بعضامین کیا ہیں گوہر ہائے بے بہا ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کی لیاقت اور تحریر کو کون نہیں جانتا۔ تمام ہندوستان کے مجتہد فلسفہ دان لوہا مان گئے۔ آپ صرف عربی و انگریزی کے ہی فاضل نہ تھے بلکہ فرنچ لیٹن عبرانی اور سنسکرت میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے آپنے مضامین میں یہ سب جگہ ظاہر کر دیا ہے کہ مسلمانوں میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں۔ جو ہر زبان کے ماہر ہو سکتے ہیں۔ بلکہ سید سے راستے پر لا سکتے ہیں۔ اور مضامین میں اکثر جگہ مصنف مرحوم نے عبرانی اور انگریزی حروف میں حاشیے لکھے ہیں جو بجنسہ ہم نے چھاپ دئیے ہیں۔ نہایت عمدہ کتاب چھپی ہے اور مقبول عام ہوئی ہے۔ - - قیمت للعہ

تہذیب الاخلاق جلد چہارم

اس مجموعہ میں جناب مولوی مشتاق حسین صاحب انتصار جنگ جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی جناب سید محمود صاحب جناب شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب جناب خلیفہ سید محمد حسن صاحب مولانا نذیر احمد صاحب جناب وحید الدین سلیم صاحب جناب ظہور احمد صاحب کے تمام مضامین ہیں۔ ان کی تعریف صرف اسی قدر کافی ہے کہ تمام اہل ملک بخوبی مصنفین بالا اصحاب سے واقف ہیں اور ان کی تصانیف کو خرید سکتے ہیں۔ تمام اہل ملک ان لوگوں کے رتبہ اور قدر و جاہ و منزلت و فضیلت سے بخوبی واقف ہیں مضامین کیا ہیں ایک چلتا جادو ہے جو دلوں کو تسخیر کئے لیتا ہے اس مجموعہ کے چھپ جانے سے تہذیب الاخلاق کی چاروں جلدیں ہفت سالہ مکمل ہو گئیں۔ - - - قیمت ۲ للعہ

المشتہر

اللہ والیکی قومی دکان مالک حکیم حسن الدین خلف ملک فضل الدین تاجر کتب قومی بازار کشمیری لاہور